مومن دہلوی

ایک تحقیقی مقالہ جسے پی۔ ایچ ڈی کی
سند کے لئے پنجاب یونیورسٹی کو
پیش کیا گیا۔

ناظر حسن زیدی
ناظر
گورنمنٹ کالج۔ شیخوپورہ
1972
ناظر حسن زیدی

فہرست

پہلا باب

مومن کا عہد

دوسرا باب

مومن کے حالات زندگی

تیسرا باب

مومن کی شاعری

چوتھا باب

مومن کی روایت

– – – – –

پیش لفظ

مشرق کے باکمال جہان اور باتون مین بد نصیب واقع ہوئے ہین وہان اس معاملے مین بھی کم قسمت ہین کہ ان کے حالات زندگی پورے طور پر معلوم نہین ہوسکتے — عرب اور ایران کے شعراء کو دیکھئے — تذکرون مین دس دس بارہ بارہ صفحے ان کے کلام کے لئے مخصوص ہین مگر حالات زندگی دو چار سطرون سے زیادہ نہین ملتے — یہی کیفیت اردو کے شاعرون کی ہے — نکات الشعراء تذکرۂ میر حسن تذکرۂ ہندی گویان (مصحفی) تذکرۂ علی حسین گردیزی مخزن نکات (قائم) چمنستان شعراء (شفیق اورنگ آبادی) گلشن بیخار[1] سب کا یہی انداز ہے کہ نامور اساتذہ کا نام لکھنے سے پہلے دو چار سطرین ان کے القاب و مناقب مین صرف کردیتے ہین — لیکن ذاتی حالات تو کیا اکثر شاعر کی ولدیت تک درج نہین کرتے — سرسید احمد خان سے زیادہ واقعیت نگار کوئی کیا ہوگا تاہم اس معاملے مین ان کا بھی یہ عالم ہے کہ دلی کے باکمالون کا حال لکھتے ہوئے نثر مین شاعرانہ رنگین بیانی تو خوب کرتے ہین لیکن کوئی لفظ ایسا نہین لکھتے[2] جو ان کے حالات زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہو — حالانکہ

---

(۱) شیفتہ نے غالب اور مومن کے بیان مین نصف صفحہ محض القاب و صفات سے بھردیا ہے مگر حالات سے قطعی اعراض کیا ہے — دیکھئے گلشن بیخار ص ۱۲۱ و ۱۹۵

(۲) آثار الصنادید ص ۱۳۸ نیز ص ۱۲۹ تذکرۂ غالب و مومن — سرسید ان بزرگون کے مناقب مین دس دس سطرین لکھ کر بھی سیر نہین ہوتے — یہی کیفیت صدر الدین آزردہ کے ذکر مین ہے جن کی تعریف ایک صفحے مین کرنے کے بعد نام لینے سے پہلے ع ہزار بار بشویم دھن ز مشک و گلاب کی آرزو ظاہر کرتے اور پھر ان کا نام زیب قرطاس کرتے ہین —

انھی سید احمد خان کے تحقیق و تجسس کا یہ عالم ہے کہ اندرپرستھ اور قلعۂ کہنہ کی سنسان ویران عمارتوں پر رسّوں کے ذریعے چڑھ چڑھ کر ان کے عربی و فارسی کتبے نقل کرتے اور صنادید ہند کی ٹوٹی پھوٹی یادگاروں کے نقشے تیار کراتے ہیں — اب اسے مشرق کے ارباب کمال کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہئے اور اس معاملے میں سرسید احمد خان کو کیوں قصوروار ٹھہرائیے — سر ~~سید احمد خان~~ نذر اس کے برعکس دیار مغرب کے باکمالوں کو دیکھئے جن کی زندگی کے واقعات اس تفصیل سے قلمبند کیے گئے ہیں کہ بعض کے حالات کئی کئی مجلدات میں سمائے ہیں —

اردو شعراء کے تذکرہ نگاروں میں چند اشخاص البتہ ایسے ہیں جنھوں نے اس مجرمانہ غفلت کی ایک حد تک تلافی کی ہے — ان میں ایک حکیم قدرت اللہ خان قاسم ہیں جو اپنے بڑی تذکرہ مجموعۂ نغز میں اپنے معاصروں کے تھوڑے بہت حالات قلمبند کر گئے ہیں — دوسرے محمد حسین آزاد کہ انھیں جو معلومات گذشتہ اور موجودہ شاعروں کے متعلق کتابوں یا روایتوں سے ملیں انھیں آب حیات میں درج کردیا اگرچہ ہمارے پرانے تذکرہ نگاروں کی طرح انھوں نے بھی تحقیق و تفتیش کے معاملے میں سہل انگاری سے کام لیا مگر ان کی یہ خدمت کچھ کم نہیں کہ جس ادیب کے جتنے حالات معتبر یا نامعتبر انھیں ملے وہ انھوں نے ہم تک پہنچا دیے — ان میں پرانے تذکروں کی حکایات، راویوں کی روایتیں، پرانے بڈھوں کی داستانیں، معاصروں کی اطلاعات، دوستوں اور شاگردوں کی معلومات سبھی کچھ شامل ہے — ان کی یہ امانت ہمارے لئے غنیمت ہے — تحقیق کی روشنی رفتہ رفتہ غلط اور صحیح معتبر اور غیر معتبر میں امتیاز کر رہی ہے —

باین ہمہ مومن کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ قابل افسوس حد تک کم ہے — مجموعۂ نغز اور گلشن ہند میں مومن کا نام شامل نہ ہو سکا کیونکہ یہ تذکرے کافی پہلے کی تصنیف ہیں — آزاد البتہ

مومن کے دیکھنے والے تھے مگر انھون نے اپنا تذکرہ اس وقت لکھا جب مومن خاک کا پیوند ہو چکے تھے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے پرانے خاندانوں کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیا تھا کہ دوست احباب اعزہ اقربا کوئی کہین کوئی کہین ایک دوسرے سے جدا ہوکر بڑی حد تک حالات سے بے خبر ہوچکے تھے ۔آزاد کو جو حالات معلوم ہوئے وہ انھون نے معذرت (۱) کے ساتھ آب حیات کے دوسرے ایڈیشن مین شامل کردیے ۔اس سلسلے مین بھی آزاد کا شکریہ واجب ہے ورنہ مومن کے عزیز شاگرد نواب مصطفی خان شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشن بیخار (۲) (تالیف ۱۲۵۰ھ) مین ان کے ذاتی حالات سے قطعی اعراض کیا ہے ۔ان کے بیس سال بعد مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ گلستان سخن (تالیف ۱۲۷۱ھ) مین بھی اسی غفلت کا مظاہرہ (۳) کیا ۔ حالانکہ یہ دونون حضرات معاصر ہونے کے سبب مومن کے متعلق بہت کچھ لکھ سکتے تھے ۔ان دونون کو مومن سے عقیدت بھی تھی مگر افسوس کہ اس دور مین شاعر اور تذکرہ نگار دونون ذاتی حالات کو اہمیت دینے کے بجائے اخفا کا میلان زیادہ رکھتے تھے ۔خود نمائی سے یہ لوگ اتنا اجتناب کرتے تھے کہ گستغتی کو درج گزٹ کرانا باعث عار سمجھا جاتا تھا ۔

مومن کے انتقال (۱۸۵۲ء) سے نصف صدی بعد تک کسی شخص کو ان کی تصویر چھاپنے یا حالات شائع کرنے کی فکر نہ ہوئی (۴) ۔ ۱۹۲۴ء مین رسالۂ اردو (دکن) مین مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

---

(۱) آبحیات ص ۴۱۱

(۲) گلشن بیخار ص ۱۹۵

(۳) گلستان سخن ص ۲۹۸ ۔ اپنون کا یہ حال تھا تو غیرون کی شکایت کس زبان سے کرسکتے ہین ۔ گلشن بیخار کے جواب مین نظیر اکبرآبادی کے شاگرد قطب الدین باطن نے اپنا تذکرہ گلستان بے خزان لکھا اور شیفتہ کے ساتھ مومن کا بھی خاکہ اڑایا ۔

(۴) مولانا ابوالخیر برادر مولانا ابوالاعلی مودودی کا بیان ہے کہ میرے نانا مرزا شمشاد علی بیگ رضوان برادر مرزا قربان علی بیگ سالک حکیم مومن خان کے شاگرد رشید تھے ۔رضوان کے مختلف نوشتون سے جو حیدرآباد دکن کے ہنگامۂ ۱۹۲۸ء مین تلف ہوگئے انھین معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمن خان احسان کے بیٹے عبدالحکیم عیسی خان نے ۱۸۷۰ء مین مومن کا تذکرۂ عندلیب چمن کے نام سے طبع کیا تھا جو اب نایاب ہے ۔

نے مومن کی تصویر شائع کی اور کچھ حالات تحریر کیے ۔ ۱۹۲۸ء میں نیاز فتحپوری نے نگار کا مومن نمبر نکالا (۲) اور کسی قدر حالات فراہم کیے ۔ اگلے سال ضمیرالدین احمد عرش گیاوی نے دلی کی خاک چھان کر اور بچے کھچے بوڑھوں سے نیز مومن کے اخلاف سے مل کر حیات مومن لکھی اور جو کچھ معلومات مہیا ہوئیں انھیں اہل ذوق کے سامنے پیش کردیا ۔

۱۹۴۷ء تک مومن کے اکثر اخلاف کوچۂ چیلان دہلی میں مقیم تھے ۔ اس ہنگامے میں سب وہاں سے نکلے ۔ پاکستان آکر کچھ اشخاص لاہور میں اور کچھ کراچی میں آباد ہوگئے ۔ ان میں مومن کے سوتیلے نواسے عبدالحی (ابن عبدالغنی) اور مومن کی حقیقی پرنواسی اخترالنساء بیگم صاحبہ کراچی میں مقیم ہیں ۔ عبدالحی صاحب عالم ضعیفی میں حیات مستعار کے باقی دن پورے کر رہے ہیں ۔ انتہائے ضعف پیری نے نامہ و پیام اور مراسلت بلکہ گفتگو سے بھی کنارہ کش کردیا ہے ۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر نوے سال سے متجاوز ہوچکی ہے ۔ مومن کے بیٹے محمد نصیر تھے ۔ ان کے دختری اخلاف میں خدیجہ بیگم دل آرا بانو (اہلیہ حسین نظامی صاحب ابن مولینا حسن نظامی مرحوم) ہیں جو کراچی میں رہتی ہیں ۔ عجب اتفاق ہے کہ مومن کا سلسلہ نرینہ اولاد سے چلنے کے بجائے دختری اخلاف سے قائم ہوا ہے ۔

دہلی کے رہے سہے بوڑھوں میں جن سے میں اس سلسلے میں ملا پنڈت تربھون ناتھ زار اور حکیم اشتیاق حسین شوق ہیں ۔ ان صاحبان سے اگست ۱۹۵۷ء میں دہلی میں ملاقات ہوئی ۔ اول الذکر سے مومن کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا ۔ البتہ جناب شوق نے اپنے نانا راقم الدولہ ظہیر دہلوی کی

---

(۱) حیات مومن ص ۱۷

(۲) نگار کا یہ نمبر معروف ہے ۔ مومن کے پرستاروں نے محبت کے غلو میں انھیں غالب سے بلکہ تمام شاعروں سے بڑھانا چاہا ۔ اس افراط و تفریط سے جہاں مومن کو کچھ فائدہ پہنچا وہاں یہ نقصان بھی ہوا کہ ان کا کلام صحیح تنقید سے محروم رہا ۔ کلام کے حقیقی اوصاف بیان کرنے کے بجائے مداحوں نے دور از کار باتیں زیادہ لکھیں ۔

زبانی بعض باتین بیان کین جو اس مقالے مین حسب موقع درج کی گئی ہین ۔ مومن کے بعض غیر معروف واقعات و حالات مولانا ابوالخیر صاحب سے بھی معلوم ہوئے جو مولانا ابوالاعلی مودودی کے بھائی ہین اور مرزا شمشاد علی بیگ رضوان کے نواسے ہین ۔ رضوان مرزا قربان علی بیگ سالک کے حقیقی بھائی اور مومن کے شاگرد تھے ۔ عرب سرائے سوسائٹی اس دور کا ایک ماہنامہ تھا ۔ رضوان نے ۱۸۷۲ء مین مذکورہ مجلّے کی چار مختلف اشاعتون مین مومن کے ذاتی حالات قلمبند کئے تھے ۔ یہ مجلّہ باوجود کوشش کے نہ مل سکا ۔

یہ مسلّم ہے کہ شخصیت کی تشکیل مین ماحول اور حالات زمانہ دو زبردست عوامل ہین ۔ کسی شخص کے حالات کی جستجو کرنے مین اس کے ماحول اور عہد کا مطالعہ اسی لئے ناگزیر ہے ۔ مومن کے دادا حکیم نامدار خان شاہ عالم ثانی کے آغاز حکومت مین وارد دہلی ہوئے ۔ اس وقت مغلون کا یہ عظیم الشان دارالحکومت مختلف ملکی و غیر ملکی غارت گرون کے ہاتھ سے تاراج ہوچکا تھا ۔ قلعۂ معلّی بھی بقول آزاد ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ تاہم یہ وہ وقت تھا کہ تباہی کا سیلاب اپنے عروج تک پہنچنے کے بعد ایک معین سطح پر قائم ہوچکا تھا ۔ اس سے پہلے کی نصف صدی اضطراب و تلاطم کا انتہائی پرآشوب دور تھی جس مین امراء کی امارت شریفون کی شرافت اور اہل حرفہ کا کاروبار تباہ ہوتے رہے تھے ۔ ظاہر ہے کہ جب حکیم نامدار خان دہلی مین وارد ہوئے ہون گے تو انہون نے ان تمام حالات کا جائزہ لیا ہوگا ۔ حکیم موصوف درباری طبیب ہونے کی حیثیت سے شاہی منصب دار تھے ۔ ان کے گھر مین اس دور کے سیاسی حالات پر ضرور گفتگو ہوتی ہوگی ۔ وہ اور ان کے اہل و عیال اس فلاکت سے بھی آشنا ہون گے جو تقریبا اسی سال سے ملک کو تباہ کر رہی تھی اور جس کے اثرات ملک مین بالعموم لیکن دارالحکومت مین بالخصوص محسوس کئے جاتے تھے ۔ مومن اسی ماحول مین ۱۸۰۰ء مین پیدا ہوئے ۔ سنّ شعور تک پہنچتے پہنچتے وہ ان تمام حالات سے بخوبی واقف ہوچکے

تھے — امراء کی خواری شرفاء کی کس مپرسی نیز عام معاشی انحطاط کی داستانین وہ ہر روز سنتے ہونگے انھون نے اپنی آنکھ سے شاہجہان آباد کی وہ فلک بوس عمارتین بھی دیکھی ہون گی جو کسی زمانے مین امراء کے جاہ و جلال کا مرکز تھین مگر نادر شاہ، احمد شاہ ابدالیؔ اور مرہٹون کے حملون مین تباہ ہوگئین

مومن کے حسّاس دماغ پر ان تمام واقعات کا نقش بچپن مین قائم ہوچکا تھا اور جس طرح میر نے ذکر میر مین دھلی کی تباہی کا تذکرہ کیا ہے مومن نے بھی مختلف مواقع پر بالخصوص "یاد ایام عشرت فانی" والے قصیدے مین اس تباہی کا نقشہ کھینچا ہے جو انھون نے بچپن مین بہ چشم خود دیکھی تھی — راقم نے مومن کے ذاتی حالات کا پس منظر مہیا کرنے کے لئے مقالہ ھذا کے باب اول مین اس دور فلاکت کی تفاصیل پیش کی ہین جن کا نقش شاعر کے ذہن پر بیٹھا ہوا تھا — باب اول ہی مین انیسوین صدی کے ربع اول کے وہ حالات بھی درج کئے ہین جب دھلی ملکی و غیر ملکی غارت گرون کے ہاتھ سے نجات پاکر انگریزی اقتدار کے زیر اثر آگئی تھی — انگریز ایک بیرونی طاقت تھے تاہم ایک صدی پہلے کے حلاطم پرآشوب حالات کے بالمقابل ان کی حکومت امن و امان کی علمبردار تھی — دھلی نے ایک صدی کے خلفشار اور خانہ جنگی سے آزاد ہوکر ذرا اطمینان کا سانس لیا تھا — لوگ نسبتاً پرسکون حالات پاکر اپنے اپنے مشاغل مین لگ گئے تھے — مومن کی جوانی اسی دور مین بسر ہوئی — اگرچہ ان کا خاندان شاہی جاگیر و منصب سے محروم ہوکر معاشی اعتبار سے نقصان مین تھا تاہم رنگین مزاج شاعر کی جوانی نے اس پرسکون عہد مین اپنے تمام شوق جی بھر کر پورے کئے جس کا اشارہ نواب مصطفی خان شیفتہ[1] رام بابو سکسینہ[2] اور کریم الدین نے اپنے تذکرون مین کیا ہے[3] — اس دور کا خاکہ تیار کرنے مین معاصرانہ تصانیف سے مدد

---

(۱) گلشن بیخار ص ۱۹۶
(۲) تاریخ ادب اردو مترجم ص ۳۵۶
(۳) طبقات الشعراء ص ۲۲۳

مدد لی گئی ہے اور مومن کے حالات جستہ جستہ جو کچھ فراہم ہوئے مقالے کے دوسرے باب مین درج کردیے گئے ہین ــ باب اول مین ان تمام مشاغل وتفریحات کا بیان بھی کیا گیا ہے جو انیسوین صدی مین اہل دہلی کا معمول تھین جن سے مومن کی شخصیت کی تعمیر ہوئی اور جن کا اثر ان کی شاعری اور انداز کلام پر پڑا ــ

ان تمام ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوسکا اس کا بیشتر حصہ اس مقالے کے دوسرے باب مین پیش کیا گیا ہے ــ

مجھے احساس ہے کہ میری تمام مساعی کے باوجود مومن کے حالات بڑی حد تک گمنامی کے پردے مین چھپے ہوئے ہین ــ ہمین ان کی معاش اخراجات خانگی حالات اور حیات معاشقہ کے متعلق بہت کم معلومات مل سکی ہین ــ ممکن ہے کہ دور زمانہ کی نامحسوس گردش اخفا کے اس پردے کو ہٹا دے اور کوئی باخبر شخص اپنے بہتر ذرائع سے مومن کی نجی زندگی کو منظر عام پر لاسکے ـــــ وہی زندگی جس کا بچپن کوچۂ چیلان کے مدرسے مین گزرا جس کی جوانی دلی کے ان کوچون مین بسر ہوئی جو اپنی حسن خیزی کی بدولت 'اوراق مصور' کہلاتے تھے اور جس کی کہولت حویلی مومن خان کے دالان[(1)] مین شطرنج رمل اور شاعری کے مشغلون مین ختم ہوگئی ــ

---

(۱) ستمبر ۱۹۵۷ء مین راقم الحروف نے کوچۂ چیلان جاکر مومن کا آبائی مسکن دیکھنا چاہا ــ یہ حویلی کسی زمانے مین ایک وسیع احاطے اور متعدد مکانات پر مشتمل ہوگی ــ انقلاب روزگار کے بیرحم ہاتھ نے اسے توڑ کر پست و نابود کردیا ــ ۱۸۵۷ء مین کوچۂ چیلان کے اکثر ذی وجاہت اشخاص انگریزون کے خون آشام جذبۂ انتقام کا نشانہ بنے اور بیشتر عمارات اصلاح و تعمیر شہر کے نام پر ڈھائی گئین ــ اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے ــ اب کوچۂ چیلان مین ایک مکان کی دیوار پر کارپوریشن والا حویلی مومن خان کا بورڈ لگا ہوا ہے ــ ظاہر ہے کہ یہ مکان اصلی حویلی کا ایک حقیر سا حصہ ہے جسے مومن کے آبائی مسکن کی یادگار سمجھ سکتے ہین ــ

یہ عجیب افسوس ناک اتفاق ہے کہ تمام معاصر تذکرے (گلستان سخن، گلستان بےخزاں تذکرہ صدر الدین آزردہ، تذکرہ بےجگر، عمدہ منتخبہ وغیرہ) مومن کے ذاتی حالات سے خالی ہیں سبھوں میں چند تنقیدی بلکہ تعریفی جملے ہیں اور بس۔ مومن کے حالات اور ادبی آثار کی جستجو میں خدا بخش لائبریری انڈیا آفس لائبریری اور کتب خانہ برٹش میوزیم کی فہرستوں سے رجوع کیا لیکن ان گرانمایہ خزانوں میں مومن کے متعلق کوئی نئی چیز نہ ملی۔ الور اور ٹونک کے کتب خانوں میں مومن کے چند خطوط اور چند غزلوں کا سراغ ضمیر الدین احمد صاحب عرش گیاوی کو ملا تھا مگر ان کی پیہم کوشش کے باوجود ان کی رسائی ان چیزوں تک نہ ہوسکی۔ دس گیارہ سال پہلے مولانا غلام رسول مہر نے بھی یہ کوشش کی مگر ہنگامہ ۱۹۴۷ء نے ان تمام چیزوں کو اس طرح تلف کردیا کہ ان کا نشان تک نہ مل سکا۔ نئی دہلی کے نیشنل آرکائیز (National Archives) اور لائبریریوں میں پچھلی صدی کے جو اخبار نظر سے گزرے ان کی اشاعتوں میں مومن کی تاریخہائے وفات اور تعزیت اور تعریف کے چند جملے دیکھے جن سے مومن کے ذاتی حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ لاہور کے آثار قومی (واقع مقبرہ انارکلی) میں سید احمد صاحب شہید کے متعلق کپتان وڈ وغیرہ کے مراسلات دیکھے جن کے مندرجات مقالہ ہذا کے باب اول میں نقل ہوئے ہیں لیکن ان سے مومن کے ذاتی حالات کا کچھ تعلق نہیں۔ رضا لائبریری رامپور میں دیوان مومن کے دو قلمی نسخے موجود ہیں جن میں سے ایک ۱۸۵۹ء کا مکتوبہ ہے ان میں مومن کی پانچ غزلیں ایسی درج ہیں جو نسخۂ نول کشور میں نہیں ہیں ان کی تفصیل مومن کی تصانیف کے بسلسلہ بیان کی گئی ہے۔

بعض علم پرور حضرات کو مومن سے خصوصی دلچسپی ہے اور ابھی بقید حیات ہین ان مین قاضی عبدالودود صاحب ، تمکین کاظمی ، مولانا امتیاز علی عرشی ، ضیا احمد صاحب بدایونی ، مختار الدین احمد آرزو اور مالک رام کے اسمائے گرامی ممتاز ہین — مین نے ان حضرات مین سے بعض سے بالمشافہہ گفتگو کر کے اور بعض سے خط و کتابت کر کے استفادہ کیا ہے جس کا شکریہ مجھ پر واجب ہے — بعض صاحبان کو خطوط لکھے لیکن انھون نے جواب سے دریغ کیا — مومن کے اخلاف کے علاوہ جو کراچی اور لاہور مین مقیم ہین مولانا غلام رسول مہر اور مولانا ابوالخیر (برادر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) قدیم روایتون اور سرمایون کے امین ہین — ان حضرات سے مومن کے متعلق اکثر گفتگو ہوئی ہے — ان کی بیان کردہ روایات اس مقالے کی زینت ہین اور میرے نزدیک ان کی زبانی روایات بعض صاحبان کی تحریری روایات پر ترجیح رکھتی ہین — کلب علی خان صاحب فائق رامپوری نے بھی کافی توجہ سے مومن کے حالات فراہم کئے ہین اور ان سے خط وکتابت کر کے مختلف فیہ امور مین راقم نے ان سے مشورہ کیا ہے — فائق رامپوری اور تمکین کاظمی دونون کو مومن سے انتہائی دلچسپی ہے اور دونوں نے مومن پر کتابین لکھی ہین — تمکین کاظمی کی کتاب اگرچہ مکمل ہے لیکن وہ چند سیاسی وجوہ سے ابھی ایک مثال اسے طبع نہ کرا سکین گے [1] — فائق کی کتاب عنقریب مجلس ترقی ادب لاہور سے شایع ہونے والی ہے — مجھے ان دونون کتابون سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملا — استاد محترم سید وقار عظیم صاحب نے اس مقالے مین ہر ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے اور ان کی شفقت نے اکثر اشکالات رفع کر کے مجھے تحقیق اور کاوش کا راستہ دکھایا ہے —

---

۱ — افسوس کہ یکم جون ٦١ء کو موصوف کا انتقال ہوگیا — اب معلوم نہین کہ ان کے اخلاف اس کتاب کو کب طبع کرا سکین گے —

ان سب حضرات کا شکر یہ مجھ پر واجب ہے۔

یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک میں چند فصلیں ہیں ۔ پہلا باب مومن کے عہد پر روشنی ڈالتا ہے ۔ اس میں ان معاشرتی حالات کا بیان ہے جو انیسویں صدی کے نصف اول میں شمالی ہند بالخصوص صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں پائے جاتے تھے اور جنہوں نے مومن کی شخصیت پر واضح اثر ڈالا ۔ دوسرے باب میں مومن کے ذاتی حالات سے بحث کی گئی ہے اور ان غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے جو مومن کے متعلق عام طور پر مشہور ہیں۔ تیسرے باب میں مومن کی خصوصیات کلام کا بیان ہے اور تقابلی مطالعے سے ان کے کلام پر تنقید کی گئی ہے ۔ چوتھا باب مومن کی فنی روایت کا احاطہ کرتا ہے ۔ اس میں ان مآخذو منابع کا ذکر ہے جن سے مومن نے اکتساب فیض کیا اور جن کے اثر سے ان کے کلام میں ایک مخصوص ذاتی آہنگ پیدا ہوا ۔ " خون جگر کے معجزہ فن کی نمود " کا فریضہ جن شاگردوں نے ادا کیا اور اس طرح مومن کی روایت کو قائم رکھا ان کا ذکر بھی اسی باب میں ہے۔

پہلا باب

مومن کا عہد

مومن انیسوین صدی عیسوی کے نصف اول مین یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۲ء تک زندہ رہے۔ هندوستان کی سیاسی زندگی مین یہ دور وہ هے کہ جب شمالی هند پر انگریز چھائے هوئے تھے اور سال بہ سال ایک علاقے کے بعد دوسرا علاقہ ان کے تصرّف مین آتا جارہا تھا۔یہان تک کہ ۱۸۲۹ء مین پنجاب اور اس کے توابع ان کے زیرنگین هوگئے اور پورا شمالی هند اس غیر ملکی طاقت کے زیر اثر آگیا(۱)۔اهل هند کے لئے جنهین همیشہ اپنی معاشرت اور ثقافت سے حد درجہ وابستگی رهی هے یہ کوئی اچھی فال نہ تھی لیکن اس معاشرتی اور ثقافتی نقصان کی طرف سے آنکھین بند کرلی جائین تو اتنا فائدہ ضرور هوا کہ اس مسلسل بدنظمی انتشار اور اختلال نے جو اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد پوری ایک صدی تک هندوستان پر چھایا رها اب انگریزی تسلط کے زیر اثر رفتہ رفتہ نظم وضبط کی صورت اختیار کرلی(۲)۔ چونکہ مومن کا عہد مکمل انتشار اور کامل نظم وضبط کے دو مختلف و متضاد زمانون کے درمیان کا عبوری دور هے اس لئے اس عہد کا کوئی واضح خاکہ بنانے کے لئے ضروری هے کہ اس سے پچھلی صدی کے حالات پر بھی سرسری نظر ڈالی جائے۔

---

(۱) کننگھام ۔ تاریخ سکھ ص ۲۹۲

(۲) ~~Britishxindia~~ Wyatt Tilby : British India, p.204

یہ عرصہ یعنی پوری اٹھارویں صدی ابتری تلاطم اور آشوب کا وہ بھیانک دور تھا جس میں ہندوستان فتنہ و فساد کے مختلف عناصر کی آماجگاہ بنا رہا ـ محمد معظم بہادر شاہ کے مرتے ہی (۱۷۱۲ء) تخت نشینی کے مسلسل ہنگامے شروع ہوگئے جو ہر بادشاہ کے مرنے اور نئے تاجدار کے تخت نشین ہونے پر تازہ ہوتے رہے ـ ہر ہنگامہ ہندوستان کی سیاسی وحدت پر ایک تباہ کن ضرب لگاتا اور اس کے اثرات مدتوں بعد تک محسوس ہوتے رہتے ـ ملک ایک آفت سے سنبھلنے نہ پاتا تھا کہ دوسری مصیبت نازل ہوجاتی تھی ـ لطف یہ کہ درمیانی وقفہ بھی سکون و استحکام کے بجائے آشوب و تلاطم کا بدترین زمانہ ہوتا ـ خود سر خود غرض امرا جنھیں ایک مضبوط مرکزی حکومت ہی قابو میں رکھ سکتی ہے درمیانی وقفے میں اپنے بجا و بیجا مطالبے پورے کرانے کی فکر میں رہتے ـ ان کا یہ انداز فکر فطری تھا ـ تخت نشینی کی جنگ گو بظاہر دو شہزادوں کا ذاتی معاملہ ہوتا تھا لیکن حقیقت میں یہ ان امراء ان کی افواج اور ان کے حوصلین کے لئے بھی مرگ و حیات کی حیثیت رکھتا تھا جو سر سے کفن باندھ کر ان جھگڑوں میں شریک ہوتے اور کسی ایک دعویدار کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرتے تھے ـ اس کی تباہی ان کی تباہی و بربادی کا سبب بنتی اور اس نے اس کی کامیابی کی صورت میں ان کے مطالبے بھی جائز سمجھے جاتے تھے ـ مگر کوئی ملک خواہ کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو ہر سال یا ہر دس پانچ سال بعد ان ہنگاموں کی تاب نہیں لا سکتا ـ اس نوع کی خانہ جنگیاں ملک کی اقتصادی اور تجارتی بدحالی کا پیش خیمہ بنتی ہیں دبے ہوئے فتنے سر اٹھاتے ہیں اور شورش پسند عناصر جو موقع کی تاک میں رہتے ہیں تباہی و بربادی کو اور مکمل بناتے ہیں لوٹ ہوتی ہے افلاس و بدحالی کا منحوس سایہ ملک پر چھا جاتا ہے اور ہر طرف فلاکت و نحوست کا مار سیاہ جھومتا نظر آتا ہے !

اٹھارویں صدی عیسوی میں یہی کچھ ہوا ـ اورنگزیب عالمگیر کی واضح وصیت[1] کے باوجود کہ تینوں شاہزادے ملک کے مختلف حصوں پر الگ الگ حکومت کریں معظم اعظم اور کام بخش میں تخت کے لئے خونریز لڑائیاں ہوئیں ـ معظم کابل اور پنجاب کا صوبہ دار تھا ـ بڑا بیٹا ہونے کی بنا پر باپ کے مرنے کی خبر سنتے ہی پایۂ تخت کی طرف بڑھا ـ مارچ ۱۷۰۷ء میں جاجو کے پاس جو آگرہ اور دھولپور کے درمیان واقع ہے[2] اس کے اور اعظم کے درمیان ایک خونین معرکہ ہوا جس میں فریقین کے پندرہ بیس ہزار سپاہی ہلاک ہوئے ـ اعظم نے جوش شجاعت میں پے درپے حملے کئے اور جب عین کشت وخون کے ہنگامے میں اسے اپنے دونوں بیٹوں کے کام آنے کی خبر ملی تو دنیا نظر میں سیاہ ہوگئی ـ غم و غصہ کے جنون میں بیخود ہوکر موت کے طوفان میں گھس گیا ـ کسی نے تاک کر ماتھے پر گولی ماری ـ گرا اور ٹھنڈا ہوگیا[3] ـ

ڈیڑھ سال بعد کام بخش کے ساتھ جنگ ہوئی اور ہولناک خونریزی کی داستان ایک بار پھر دہرائی گئی[4] ـ ۱۷۱۲ء کے اوائل میں محمد معظم بہادر شاہ کا انتقال ہوا ـ اس کے چاروں بیٹوں میں تخت وتاج کے لئے پھر ہنگامے ہوئے جن میں معزّالدین جہاندار شاہ کامیاب ہوا مگر دس ماہ تک شعلۂ مستعجل کی سی چمک دکھاکر اپنے بھتیجے فرخ سیر ابن عظیم الشان کے ہاتھ سے قتل ہوا ـ اس مختصر عرصے میں وہ شراب نوشی عیاشی اور راگ رنگ میں اس درجہ غرق رہا کہ جب فرخ سیر کی فوجیں دارالسلطنت کے پاس آپہنچیں تو خواب غفلت سے بیدار ہوا لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا گرفتار ہوا اور گلا گھونٹ کر مارڈالا گیا ـ سر قلم ہوکر نیزے پر چڑھا اور شہر میں پھرایا گیا

(۱) ایشوری پرشاد : تاریخ ہند ص ۳۲٦ و ۳۲۸
(۲) Keene: History of India, p.141
(۳) سیرالمتاخرین حصۂ دوم ص ۳۰۵
(۴) Irvine: Later Moghals, Volume I, p.61

نعش کی دن تک بے گور وکفن پڑی چرخ کج رفتار اور زمانۂ غدّار کی بے وفائی کا ماجرا سناتی رہی —

فرخ سیر کی تخت نشینی مین امیرالامراء سید حسین علی خان اور اس کے بھائی قطب الملک سید عبداللہ خان کا ~~حصہ~~ کچھ حصہ تھا جو سادات بارھہ (1) سے تھے — بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر سید حسین علی

---

(۱) سادات بارھہ کے مورث اعلی سید ابوالفرح واسطی محمود کے تیرھوین حملے مین ھندوستان آئے اور پٹیالہ کے نزدیک آباد ھوئے — ان کی اولاد گنگا جمنا کے بالائی دوآبے (اضلاع مظفر نگر و میرٹھ) مین پھیلی — ان کا پیشہ سپہ گری تھا اور یہ لوگ اپنی ثابت قدمی کے سبب ہراول کے بہترین سپاہی سمجھے جاتے تھے — اورنگ زیب کے عہد مین ایک سید یعنی سید میان اپنی فرض شناسی کے صلے مین دو ھزاری کے منصب پر فائز ھوا — ایک اور جانباز سید عبداللہ اجمیر اور بیجاپور کی صوبہ داری پر سرفراز ھوا — اس کے دو بیٹے سید حسین علی اور سید حسن علی شجاعت اور تدبیر ملک مین مشہور ھوئے — بہادر شاہ کی جنگ تخت نشینی (۱۷۰۷ء) مین جانبازی دکھائی اور سہ ھزاری کا منصب حاصل کیا — جنگ جاجو مین مقدمۃ الجیش تھے — ان کی جماعت گھوڑون سے اتر کر پیدل لڑی اور ایسی دلاوری دکھائی کہ ھاری ھوئی بازی جیت لی — جہاندار شاہ کے مقابلے مین عظیم الشان کے طرفدار رہے اور اس کے قتل کے بعد (۱۷۱۲ء) اس کی بیوہ کی منت سماجت پر فرخ سیر کی حمایت مین جہاندار شاہ سے لڑے اور اسے شکست دے کر فرخ سیر کو تخت نشین کیا (۱۷۱۳ء) — ان کی سطوت اتنی بڑھی کہ یہ دونون بھائی بادشاہ گر کہلائے — محمد شاہ ان سے بدظن ھوا اور ایک شخص میر حیدر سے حسین علی خان کو قتل کرادیا (۱۷۲۱ء) دوسرے بھائی حسن علی خان نے اپنی فوج سے محمد شاہ پر حملہ کیا مگر شکست کھائی — گرفتار ھوا اور مارا گیا — سادات بارھہ اب بھی اضلاع مظفر نگر و میرٹھ مین آباد ھین — تنومندی جرأت اور فضول خرچی ان کی خصوصیات ھین (ارون جلد اول کلکتہ ایڈیشن ص ۲۰۱ تا ۲۳۵ سیرالمتاخرین جلد سوم ص ۲۲۱) —

فرخ سیر کی حمایت کا بیڑا نہ اٹھاتا تو فرخ سیر کو جہاندار کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی ۔ اس لحاظ سے وہ سید بھائیون کا بےحد ممنون تھا جواسے شاہ شطرنج کی طرح اپنے اشارون پر چلاتے تھے ۔ مگر کچھ تو سید بھائیون کی بڑھی ہوئی ہوس اقتدار نے اور کچھ حاسد امراء کی پیہم ریشہ دوانیون نے آخر فرخ سیر کو سیدون سے برگشتہ کردیا ۔یون بھی ایک تاجدار جس کی رگون مین اولوالعزم اسلاف کا خون گردش کر رہا ہو ماتحتی و زبردستی کی زندگی بسر کرنے پر رضامند نہین ہوسکتا ۔ غرض تیموری خون مین جوش آیا ۔ فرخ سیر نے سیّدون کے اثر سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن یہ حرکت مذبوحی بیکار اور بعد از وقت تھی ۔ سیّد بھائیون نے جنھین خود اپنی زندگی خطرے مین نظر آرہی تھی اسے شاہی حرم سرا سے گرفتار کرواکر نکالا اور آنکھون مین سلائی پھیر کر اندھا کر دیا ۔ اس کے بعد اسے زندان مین ڈال دیا گیا جہان دو ماہ تک انتہائی تکالیف اٹھانے کے بعد جلّادون کے خنجر اور گلوگیر پھندے نے اسے قید حیات سے آزاد کیا (۱) ۔ فرخ سیر خوش لہجہ وخوش اطوار ہونے کے علاوہ نہایت صاحب جمال شاہزادہ تھا ۔ اس کے قتل کے بعد اہل دہلی مدتون اپنے مظلوم شہنشاہ کے لئے روتے رہے ۔ اس واقعے نے اس نفرت کو شدید تر کردیا جو سیّد بھائیون کے خلاف لوگون کے دلون مین مشتعل ہوچکی تھی اور بہت جلد ان کی تباہی کا باعث بنی (۲) ۔

فرخ سیر کے قتل کے بعد سیّد بھائیون نے فروری ۱۷۱۹ء مین رفیع الدرجات کو تخت نشین کیا (۳) ۔ یہ شہزادہ دق مین مبتلا تھا اور چار مہینے بعد یعنی ۲ جون ۱۷۱۹ء کو معزول کردیا گیا ۔

(۱) Irvine : Later Moghals, Volume I, p.392.

(۲) - do - p.428.

(۳) - do - p.449.

چند روز بعد اسی عارضے مین فوت ہوگیا – اس کے بعد رفیع الدولہ (۱) کو تخت نشین کیا گیا مگر وہ بھی ستمبر ۱۷۱۹ء مین مرگیا – اب سیدون نے روشن اختر ابن جہاندار شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھادیا –

روشن اختر (جو آگے چل کر محمد شاہ کے نام سے معروف ہوا) اور اس کی والدہ مہم مکانی سیدون کے احسان مند ہونے کے باوجود شروع سے ان کی بیخ کنی کے درپے تھے – چنانچہ نواب محمد امین سعادت خان کے ذریعے انھون نے نظام الملک کو خفیہ خطوط بھجوائے جس مین یہ التجا تھی کہ ہمین سیدون کے پنجے سے نجات دلاؤ – دربار مین سیدون کے خلاف سازش کی آگ سلگتی رہی حاآنکہ برہان الملک سعادت خان نے ایک شخص میر حیدر کو حسین علی خان کے قتل پر مستعد کیا –

ایک روز جبکہ امیرالامرا سید حسین علی بادشاہ کی خدمت سے فارغ ہوکر پالکی مین سوار واپس جارہے تھے میر حیدر چند مغل سپاہیون کے ساتھ آگے بڑھا – ہاتھ مین ایک عرضی تھی جسے پیش کرنے کے بہانے پالکی تک پہنچ گیا – حسین علی (۲) حقّہ پیتے پیتے عرضی دیکھ ہی رہے تھے کہ میرحیدر نے فرشتۂ مرگ کی طرح حملہ کیا اور کٹار سینے مین بھونک کر کام تمام کردیا (۱۷۲۱ء) – دوسرا بھائی سید عبداللہ قطب الملک جو دہلی سے باہر تھا یہ خبر سنتے ہی اپنی فوج سمیت پایۂ تخت کی طرف بڑھا لیکن ہوا بدل چکی تھی – عبداللہ خان نے محمد شاہ کے مقابلے کی پوری تیاری کی مگر رنگ بدلا دیکھ کر اطاعت اختیار کرلی پڑی – قید ہوا اور اسی عالم مین طبعی موت سے یا شاید زہر کے اثر سے قید مین وفات پائی (۳) – اس طرح ان دونون کجکلاہ بھائیون کا خاتمہ ہوا جو تاریخ ہند

(۱) Irvine: Later Moghals, Volume I, p.451

(۲) - do - p.

(۳)

مین بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہین اور جو کامل دس سال تک عملاً حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے —

سیدون کے خاتمے سے محمد شاہ کو ایک گونہ اطمینان ہوا مگر اور ہزارون بکھیڑے تھے جو اس کا سکون قلب غارت کر رہے تھے اور جن سے بچنے کے لئے اس نے شراب ناب کے دامن مین پناہ لی — جاٹون نے آگرہ سے دھلی تک لوٹ مار کا ھنگامہ گرم کر رکھا تھا — پنجاب مین سکھون کی سرکشی انتہا (۱) کو پہنچ چکی تھی — مرھٹون کی ترکتازیون نے آگرہ اور دھلی کے نواح تک شور مچانا شروع کردیا تھا — دکن کے ساحلون پر اور بنگال مین یورپین طاقتین پانون جما رہی تھین — حکومت کی کمزوری کے سبب دارالخلافہ مین ھنگامے برپا رہتے تھے — بادشاہ خود بادۂ گلرنگ مین غرق تھے اور مغلیہ سلطنت کی جڑون کو گھن کھا رہا تھا — پھر بھی ایک حد تک سلطنت کا ظاہری ڈھانچا قائم تھا کہ ایک آفت تازہ نازل ھوئی یعنی کابل کی طرف سے نادرشاہ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا — مست الست بادشاہ تو فکر انجام سے بے پروا تھے مگر صوبہ دار کابل نے بروقت کمک کے لئے لکھا — یہان کون سنتا تھا — اس سے پہلے نادرشاہ کے وہ سب مراسلے جن مین اس نے اپنے سیاسی مفرورین کی واپسی کے لئے (۲) لکھا تھا غرق پئے ناب ھوتے رہے — حتی کہ اس کے ایلچی اور قاصدون کو مناسب جواب دینے کے بجائے قتل کردیا گیا — نادرشاہ ان واقعات سے آگ بگولہ ھوگیا — کابل اور پشاور کو پامال کرتا ہوا لاھور پہنچا — راستے مین گجرات وزیرآباد اور ایمن آباد کے قصبے کہ بجائے خود شہر تھے اس طرح برباد ھوئے کہ کچھ باقی نہ رہا — نادری فوج نے بے دریغ قتل عام کیا اور لوٹ مار کے بعد ان قصبون کو

---

(۱) ~~Tilby~~ Cunningham : History of ~~Sikk~~ Sikhs , 103

(۲) Irvine: Later Moghals, Vol.I, p.333

آکے ۱۳ کو تباہ کر ڈالا ـ زکریا خان ناظم لاہور نے مقابلے کے لئے فوج کو ترتیب دیا مگر گجرات اور وزیرآباد کا حشر دیکھ چکا تھا ـ معمولی سی ردوبدل کے بعد جب حریف کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوگیا تو خود نادرشاہ کے سامنے حاضر ہوکر قلعے کی چابیان پیش کردین ـ اس طرح لاہور تباہی[(۱)] سے بچ گیا ـ یہان نادرشاہ نے کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد دہلی کا رخ کیا جہان محمد شاہ رنگ رلیون مین مست جان بوجھ کر اس طوفان سے بے خبر بنا بیٹھا تھا جو سر پر کوک رہا تھا اور چند روز بعد قہر خداوندی کی صورت مین دہلی پر نازل ہونے والا تھا ـ

نادر شاہ طوفان باد وباران کی طرح اواخر جنوری ۱۷۳۹ء مین کرنال پر خیمہ زن ہوا ـ اب بادشاہ سلامت کا نشہ اترا ـ نظام الملک اور چند دوسرے امرا کو فوج دے کر بڑھایا اور خود بہ نفس نفیس چند روز بعد پانی پت کی طرف چلے جہان شاہی فوج رکی پڑی تھی ـ یہان سے یہ لشکر کرنال کی طرف بڑھا اور فروری ۱۷۳۹ء کے آخری ہفتے مین آرام طلب کم حوصلہ شاہی فوج نادرشاہ کے جنگجو لشکر سے مقابل ہوئی ـ جو بارہ میل کے حلقے مین پھیلا ہوا تھا ـ انجام پہلے ہی سے[(۲)] معلوم تھا ـ غرض تیس ہزار سپاہی اور سو سردار کام آئے ـ سپہ سالار یعنی امیرالامرا خان دوران نے بہادری سے جان دے کر حق نمک ادا کردیا ـ مرتے مرتے یہ وصیت کی کہ جس طرح ہوسکے نادر کو[(۳)] دہلی نہ جانے دینا یہین سے واپس کرنے کی تدبیر کرنا اور بادشاہ کو اس کے آہنی پنجے کی گرفت سے محفوظ رکھنا ـ محمد شاہ کو جب خدائے قہار کی قدرت صاف صاف نظر آگئی تو صلح کی گفت و شنید شروع کی ـ نظام الملک نے پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ دینے کا وعدہ کرکے نادرشاہ[(۴)]

---

(۱) Irvine Vol I P. 332

(۲) Hanway Vol II P. 364

(۳) Irvine Vol II P. 128

(۴) Ibid P. 356

کو کرنال سے واپس چلے جانے پر رضامند کرلیا – امرا کی باہمی رقابت نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھایا اور بنی بنائی بات کو بگاڑ دیا – برہان الملک سعادت خان نے یہ سوچ کر کہ اس مصالحت سے نظام الملک آصف جاہ کا اعزاز اور بڑھ جائے گا (۱) در پردہ نادرشاہ سے کہا کہ اس حقیر رقم پر سمجھوتا کرکے آپ نے دھوکا کھایا – اگر دہلی چلے چلئے تو بے شمار دولت ہاتھ آئی – غرض خواہ اس وجہ سے خواہ کسی اور سبب سے نادرشاہ کی نیت بدل گئی – اپنے ایک سردار کو دلّی پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا اور خود چند روز بعد محمد شاہ اور امرائے شاہی کو ساتھ لے کر (جن کی حیثیت نظر بندوں کی سی تھی) دہلی پہنچا – یہاں دو دن قیام کرنے پایا تھا کہ لوگوں نے غالباً نادرشاہ کے قتل کی افواہ سن کر یا ننگ و ناموس کے تقاضے سے (کیونکہ نشۂ فتح و ظفر سے مست ہوکر نادری فوج بدعنوانیاں کر رہی تھی) (۲) ایرانی سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کیا – نادر شاہ نے اول تو تحمل کیا مگر جب پے در پے اطلاعیں ملتی رہیں تو اگلے روز دن چڑھے روشن الدولہ کی مسجد میں تلوار غلاف سے نکال کر بیٹھ گیا – یہ گویا قتل عام کا اعلان تھا (۳) – فوج جو اب تک رکی ہوئی تھی خون کی پیاس بجھانے کے لئے دوڑ پڑی –

۱۱ مارچ ۱۷۳۹ء کی خونیں صبح تھی کہ نادرشاہی فوج جو نشۂ فتح اور جوش انتقام سے بے قابو ہو رہی تھی سیلاب آتش کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی – قتل و غارت کا دیو جبڑے کھول کر دھاڑا اور جہاں آباد کے طول و عرض پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ملک الموت کے پروں کا سایہ چھا گیا – چھ گھنٹے تک قتل و غارت کا وہ ہنگامہ (۴) گرم ہوا کہ ایرانیوں کی تیغ بے زنہار

(۱) Irvine Vol II P. 356
(۲) Keene Vol I P.146 Irvine P. 366
(۳) Irvine Vol II P. 367
(۴) Keene Vol I P.146

سے مرد عورت ضعیف توانا گناہ گار بے گناہ کسی کو پناہ نہ ملی - گلی کوچون مین خون کے نالے
بہ گئے - وہ مال دولت جو تین صدیون سے اس شہر مین جمع ہوئی تھی چند لمحون مین اپنے پرائے
مالکون کو چھوڑ کر شے آقاؤن کے ہاتھ مین چلی گئی - دوپہر ڈھلے جب کہ قتل و خون کا پہیہ (۱)
ہولناک ڈراما نقطۂ عروج پر تھا سفید ریش محمد شاہ کے امرا انتہائی عاجزی سے گردن جھکائے
نادر کے حضور مین آئے جس نے ان کی التماس پر فوج کو ہاتھ روکنے کا حکم دیا - اتنے عرصے مین (۲)
تیس ہزار انسانون کا خاتمہ ہوچکا تھا -

نادر شاہ نے آٹھ ہفتے دہلی مین قیام رکھا - لوٹ مار اور تاوان مین جو کچھ حاصل ہوا
اس کا اندازہ پندرہ بیس کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے - بے شمار ہاتھی گھوڑے اور دیگر چوپائے
اس کے علاوہ ہین - غرض جب ۵ مئی ۱۷۳۹ء کو یہان سے ایران واپس ہوا تو ان خزانون اور تخت
طاؤس کے ساتھ حکومت مغلیہ کی عظمت بھی لوٹ کر لے گیا - دارالسلطنت ہند تیس چالیس سال سے
اندرونی و بیرونی خلفشار کے باعث بدحال ہو رہا تھا - یہ نادرشاہی ضرب ایسی لگی کہ بالکل مضمحل
ہوگیا - حکومت کی شان و شوکت امرا کے دربار شہرون کی آبرو رعیت کی خوشباشی علمی و ادبی
سرگرمیان تجارت کاروبار غرض وہ تمام چیزین جو تمدن کی جان اور کسی دارالحکومت کی رونق ہوتی
ہین اس طرح غارت ہوئین کہ پھر نظر ہی نہ آئین - سارا شہر ماتم کدہ بن گیا - اس عہد کے شعرا
نے جن مین نظیر اکبرآبادی اور سودا پیش پیش ہین جو شہر آشوب لکھے ہین ان مین اس خرابی
کا صحیح عکس نظر آتا ہے -

---

(۱) ~~جادوناتھ سرکار جلد دوم ص ۲۰۸~~ میرزا مہدی کوکبی - جہانگشائے نادری ص ۳۹۱

(۲) Keene Vol I P. 160

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑے ہیں کہیں پڑے موقول

کسی کے گھر نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاقم
ہزار گھر میں کسی ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ دل ہے گھروں کے غم سے داغ
اور ان مکانوں میں ہرسمت رینگتے ہیں الاغ

جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر مشغول

دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانوں کے مانوس
گروہ دل پر از امید ہوگئے مایوس
گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئے ناموس

ملی نہ ڈولی انہیں تھے جو صاحب چوڈول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
اور ایک گود میں بچہ گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا جیسے کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول[1]

مختصر یہ کہ دہلی کا وجود تو قائم رہا مگر اس طرح جیسے کہ جسم بے جان یا خانۂ ویران -
اہل دہلی اس مہلک صدمے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ۱۷۴۸ء میں نادر شاہ کا سپہ سالار احمد شاہ ابدالی (جو اس کے قتل کے بعد عنان حکومت سنبھال چکا تھا) کابل سے گذرتا لاہور کو پامال کرتا دہلی کی طرف بڑھا - محمد شاہ کا انتقال ہوچکا تھا اور اب اس کا بیٹا احمد شاہ سریر آرا

---

[1] کلیات سودا حصہ دوم ص ۱۲۹

آرائے سلطنت تھا ۔ نادر شاہی حملے کی سی تباہ کاریاں ایک دفعہ پھر واقع ہوئیں مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جب دونوں لشکر دہلی کے پاس ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تو احمد شاہ ابدالی کے میگزین میں آگ لگ گئی جس سے سخت جانی نقصان کے علاوہ اس کے گولہ بارود کا ذخیرہ بھی برباد ہوگیا اور اس طرح اسے شکست اٹھاکر واپس جانا پڑا[1] ۔ اگلے سال پھر حملہ آور ہوا اس مرتبہ اس کا پلہ بھاری تھا[2] ۔ شہنشاہ دہلی کو دب کر صلح کرنی پڑی یعنی پنجاب کا صوبہ ابدالی کے حوالے کردیا ۔ رہی سہی قوت اس طرح ٹوٹ گئی ۔ احمد شاہ کے شش سالہ عہد حکومت میں (۱۷۵۲ ۔ ۱۷۴۸ ء) بادشاہت کا وقار بالکل مٹ گیا ۔ جاوید خان خواجہ سرا سیاہ و سفید کا مالک تھا ۔ بادشاہ سلامت ماہ پیکر کنیزوں اور مہ جمال طوائفوں کے جمگھٹے میں داد عیش دیتے تھے ۔ انجام یہ ہوا کہ عمادالملک غازی الدین وزیر نے گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا اور اس کے بجائے جہاندار شاہ کے ایک بیٹے عزیزالدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کردیا[3] ۔ عالمگیر ثانی بھی عمادالملک غازی الدین کے ہاتھ میں کھلونا تھا مگر درپردہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح وزیر کے ہاتھ سے نجات حاصل کرے ۔ اسی اثنا میں یعنی ۱۷۵۶ ء میں احمد شاہ ابدالی نے پھر حملہ کیا ۔ دہلی اور نواح دہلی میں حسب معمول قتل و غارت کے ہنگامے برپا ہوئے مگر ابدالی نے بادشاہ کی ذات سے درگذر کی ۔ عالمگیر ثانی نے احمد شاہ ابدالی سے اپنی درماندگی اور وزیر کی چیرہ دستی کا حال بیان کیا ۔ ان دنوں عمادالملک اودھ کی طرف گیا تھا ۔ ابدالی نے اسے وزارت سے معزول کرکے نجیب الدولہ کو وزیر بنادیا ۔ ابدالی کو دہلی سے واپس ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ جاہ طلب عمادالملک فوج جمع کرکے اور ملکسر کو اپنی مدد کے لئے بلا کر دہلی پر حملہ آور

(1) Twilight of the Moghal, p.13

(2) Irvine: Later Moghals, Volume II, p.140

(3) ایشوری پرشاد ۔ تاریخ ہند ص ۳٦۲

(4) ایضاً ص ۳٦۵

ہوا ۔ عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ نے کچھ دن محصور رہنے کے بعد عمادالملک سے جنگ کی اور بقول میر ایسی خونریزی واقع ہوئی کہ بڑے بڑے بہادرون کا دل دہل گیا عمادالملک کامیاب ہوا اور بدستور بادشاہ و بادشاہت دونون پر اس کا تصرف ہوگیا ۔ نام کو عالمگیر ثانی بادشاہ تھے مگر فی الواقع وزیر مختار مطلق تھا ۔ پھر بھی عمادالملک کو اطمینان نہ ہوا ۔ پچیس سال پہلے سید بھائیون نے کامل اقتدار کے باوجود فرخ سیر سے بدگمان ہوکر اسے قید اور قتل کیا تھا ۔ عمادالملک نے وہی داستان دوہرائی ۔ عالمگیر ثانی کو ایک خدارسیدہ درویش سے ملانے کے بہانے فیروز شاہ کے کوٹلے مین لے گیا جہان دو جلادون سے اسے قتل کرادیا (١٧٥٩ء)(١)

معلوم نہین کہ اٹھارہوین صدی کی قسمت مین کتنے مصائب اور کتنی آفتین لکھی تھین ۔ لوگ ایک تباہی سے سنبھلنے نہ پاتے کہ دوسری تباہی آموجود ہوتی ۔ حوادث مصائب آفات اور تباہیون کا یہ سلسلہ ایسا تھا کہ کسی طرح ختم ہونے مین نہ آتا تھا ۔ دہلی اور دربار شاہی کا یہ حال تھا ۔ باہر کے صوبون کی حالت اس سے بدتر تھی ۔ پنجاب مین سکھ آگرہ کے گردونواح مین جاٹ دکن اور وسط ہند مین مرہٹے تلاطم بپا کر رہے تھے ۔ عالمگیر ثانی کے قتل کے وقت اس کا بیٹا عالی گوہر (شاہ عالم) دہلی کے ہنگامون سے الگ مشرقی صوبون کا انتظام کر رہا تھا ۔ باپ کے قتل ہونے پر احمد شاہ ابدالی کے فرمان سے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ۔ پھر بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ دارالسلطنت کا رخ کرتا ۔ بارہ سال اسی طرح گذر گئے ۔ اس عرصے مین بکسر کی لڑائی مین کلائیو سے شکست کھاکر بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی چھبیس لاکھ روپے سالانہ کے بدلے کمپنی بہادر کو دے چکا تھا(٢) ۔ مرہٹہ سردارون

---

(١) Twilight of the Moghals, P. 14.

(٢) Keene: History of India, Volume I, p. 182.

مین سے سیندھیا کے ساتھ کچھ موافقت تھی ـ اس نے شاہ عالم کو الہ آباد سے بلایا اور جنوری ۱۷۷۱ء مین دھلی کے تخت پر بٹھا دیا ـ (۱) سندھیا کو فرزند جگر بند کا خطاب ملا ـ (۲) ایک باقاعدہ معاھدے سے اس کی شخصیت تسلیم کی گئی اور شاھانہ عنایات کا مورد ھوا ـ

اب شاہ عالم اطمینان سے اپنے آبائی تخت پر متمکن ھوا ـ مگر کیفیت یہ تھی کہ تمام صوبے ھاتھ سے نکل چکے تھے ـ صرف دوآبہ کے اضلاع اور دھلی کے آس پاس کا علاقہ باقی رہ گیا تھا ـ سلطنت شاہ عالم از دھلی تا پالم مین کچھ مبالغہ سہی مگر زیادہ نہین ـ بقول آزاد ان دنون لال قلعہ ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ تھا اور شاہ عالم اس کا متولی ـ نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خان وزیر تھا ـ ۱۷۸۵ء مین ضابطہ خان کے مرنے پر اس کا بیٹا غلام قادر وزیر بنا ـ وہ بظاھر سندھیا سے موافقت رکھتا تھا مگر درپردہ اس کے اقتدار سے ناخوش تھا ـ شاہ عالم نے ان دنون کچھ کوشش کی کہ مرھٹون کے اثر سے آزاد ھوجائے مگر سندھیا کی گرفت سخت تھی ـ اس نے مستقل مرھٹہ فوج قلعے مین رکھ کر اس قسم کی تمام تدابیر کا سدّ باب کردیا ـ کور نمک غلام قادر بہرحال موقع کی تاک مین تھا ـ ۱۷۸۸ء مین جب میدان خالی پایا تو نمک حرامی پر اتر آیا ـ بادشاہ کو پچھاڑ کر سینے پر چڑھ بیٹھا اور آنکھین نکال لین ـ (۳) کچھ دنون بعد میرٹھ کی لڑائی مین مرھٹون کے ھاتھون اسیر ھوا اور سندھیا کے حسب الحکم برے حال سے مارا گیا ـ

اب سیندھیا عملاً دھلی کے تخت وتاج کا مالک تھا ـ (۴) شاہ عالم بصارت سے عاری قوت و اقتدار سے محروم بساط سیاست پر ایک معمولی مہرے کی حیثیت رکھتا تھا ـ ۱۸۰۳ء مین سندھیا اور بھونسلا

---

(۱) Keene: History of India, Volume I, p.186

(۲) Twilight of the Moghals, p.19

(۳) تاریخ ھند ایشوری پرشاد ص ۳۶٦ نیز Twilight of the Moghals, p.15

(۴) Marhatta conquest in the North, p.63.

نے انگریزون سے جنگ کی ۔ کرنل ویلزلی نے انھین پے در پے شکستین دین ۔ آخر دیوگاؤن کے مقام پر صلح نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے سندھیا کو مختلف اضلاع کے علاوہ دوآبے کا علاقہ بھی انگریزون کو دینا پڑا جس مین آگرہ اور دہلی کے شہر شامل تھے چنانچہ لارڈ لیک نے ۸ ستمبر ۱۸۰۳ء کو دہلی پر قبضہ کرلیا ۔ (۱) اور پوری ایک صدی کے بعد اس دارالسلطنت کو امن و اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا ۔

اس جائزے سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس سو سال کے عرصے مین اہل ہند پر کتنی آفتین نازل ہوئین ۔ مرکزی حکومت کمزور ہوتے ہوتے بالآخر پارہ پارہ ہوگئی ۔ اودھ اور دکن کے صوبے وزیرون نے دبا لئے ۔ کابل اور سرحد کا علاقہ نادرشاہ کے حوالے کرنا پڑا ۔ پنجاب احمد شاہ ابدالی کی نذر ہوا ۔ بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کے قبضے مین چلی گئی ۔ وسط ہند مالوہ اور گجرات مین مرہٹون کی عملداری ہوگئی ۔ غرض شاہ عالم کے زمانے مین سلطنت کا صرف نام باقی رہ گیا ۔ ان حالات مین رعایا کے انتظام اور امن و امان کا سوال باقی نہین رہتا ۔ اس پر طرہ یہ کہ ملک کے طول و عرض مین مختلف سیاسی نیم مذہبی نیم عسکری جماعین آفت برپا کر رہی تھین ۔ سکھون نے لاہور سے لے کر سہارنپور اور دہلی تک تاخت و تاراج اور پے درپے کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا ۔ آگرہ کے نواح مین جاٹون نے تباہی مچا رکھی تھی ۔ یہان تک کہ سورج مل جاٹ نے آگرہ اور دہلی کو تاراج کرکے دیوان خاص کی زرنگار چھت اور قیمتی پتھر تک لوٹ لئے ۔ (۲) مرہٹے لوٹ مار کرتے کرتے علا تخت دہلی کے مالک بن گئے ۔ شہرون کی آبادی مین غنڈون اوباشون نے اور جنگلون مین پنڈاری رہزنون نے قتل و غارت کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا ۔ یہ سب آفتین بجائے خود ملک کو برباد

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۔ جلد ہفتم دہلی ص ۱۶۲

(۲) Percival Spear : Twilight of the Moghals, p.60.

کردینے کے لئے کافی تھین کہ نادرشاہ نے ۱۷۳۹ء مین دوپہر کے اندر دھلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ــ دس سال بعد اس کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے بھی سلسلہ شروع کیا اور بارہ سال مین ملک کو پامال کر ڈالا ــ مغل بادشاہون کی حیثیت شی کی مورتون جیسی ہوگئی جنھین امیر اور وزیر جب چاہتے تھے پوجتے تھے اور جب چاہتے پاش پاش کردیتے تھے ــ اس افراتفری مین شریفون کسی شرافت تاجرون کی تجارت اھل حرفہ کے پیشے عالمون کے علمی مشاغل ملک کی اقتصادیات تجارت زراعت غرض خلقت کے تمام کاروبار معطّل ہوگئے ــ قتل و غارت افلاس و نکبت کا دور دورہ تھا ــ بادشاہون کے تاج امراء کی زندگی اھلکارون کی نوکری غریبون کے روزگار کسی چیز کو ثبات نہ تھا ــ ان حالات مین اخلاق عالیہ کے قائم رہنے کا سوال پیدا ھی نہین ہوتا ــ اسی اخلاقی پستی کی تصویرین حاتم ناجی سودا اور نظیر اکبرآبادی کے شہر آشوبون مین نظر آتی ھین ــ دور اضطراب کے ان سچے مرقعون مین صاف نظر آتا ھے کہ بادشاہ بےوقار تھے ــ امرا معاملہ فہمی اور انتظام و تدبیر سے دور ہوکر خود غرض اور وطن فروش بن چکے تھے (1) ــ بے سروسامان سپاھیون کی ڈھالین تلوارین بنیون کے گھر رھن پڑی رھتی تھین ــ سوارون کے گھوڑے مریل بےجان سے رھتے تھے ــ جب کوئی معرکہ پیش آتا تھا تو ان سوارون پیادون کو گریز کے سوا اور کوئی مضمون نہ سوجھتا تھا ــ خدمتگار شاگرد پیشہ بجائے خدمتگزاری کے آقا سے تمسخر کرتے ــ امراء کے دربار سونے پڑے رھتے ــ ملازمون کو نوکری نہین ملتی اور ملتی تو مہینون تنخواہ میسر نہین آتی ــ کسان فصلین بوتے ھین تو وہ مختلف لشکرون کی ترکتازیون سے پامال ہوجاتی ھین ــ ان تمام حالات کا عکس اس دور کی نظمون مین نظر آتا ھے ــ بقول آزاد "بیدرد ظاھربین کہتے ھین کہ

---

(1) Central Construction of Moghal Empire, page 359.

سودا نے دربار اور اہل دربار کی ہجو لکھی ہے - غور سے دیکھئے تو ملک کی دلسوزی نے اپنا مرثیہ خود کہا ہے -(١)

انہین ہے اپنی امارت سے بس یہی منظور	کہ ہون دو مورچھل اور ایک کاہشی سمور
نہ رسم صلح کی سمجھین نہ جنگ کا دستور	جوان مین قاعدہ دان تھے ہوئے وہ ان سے دور
قماش ان کی طبیعت کا سب طرح سے ثمشول

جو مصلحت کے لئے جمع ہون صغیر و کبیر	تو ملک و مال کی فکر اس طرح کرے ہین مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھے ہے بخشی کو تدبیر	کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر
کہ شامیانے کے بانسون پہ روپیے کے ہین خول

پڑے جو کام انھین تب تو نکل کے کھائی سے	رکھین وہ فوج جو ہو تے بھرے لڑائی سے
پیادے ہین سو ڈرین سر منڈائے نائی سے	سوار گر پڑین سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب مین گھوڑا کسی کے نیچے الول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش	کہین پلاؤ تو باورچی وان پکاوے آش
کرین قناتون مین دربان بیٹھے پردہ فاش	تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہین کہ شا اٹھ کے چاندنی کا جھول

قوی ہین ملک مین مفسد امیر ہین سو ضعیف	ٹکے کہان جو میں دین کے ہون انھون سے حریف
نہ کچھ ربیع مین حاصل نہ درمیان خریف	ہین عامل ان کے محالات پر سو یون ہین ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اول

---

(١) آب حیات ص ١٥٠

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند — سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند — جو ایک شخص تھا بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے — کہو جو اس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے — روپے کی شکل نہیں دیکھی ہے خدا جانے
کہ اس زمانے میں چھپتا بنے ہے وہ یا گول (۱)

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا — کہ میں نشان کے ہاتھی اپر نشانہ تھا
نہ تھو چارے کا راتب کا نے ٹھکانا تھا — ملے تھے دہاں جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ ودکان نہ غلہ و بقال (۲)

اس اضطراب مسلسل اور تلاطم پیہم کا نتیجہ یہ تھا کہ شرفا کے گھرانے برباد ہوگئے — عمارتیں پیوند خاک ہوگئیں — عوام اس ہلچل میں تباہ ہوگئے — آبرو والے عزت سے ہاتھ دھو بیٹھے وہ تمام اخلاقی اقدار جو کسی منظم معاشرت کا معیار ہوتی ہیں یکسر مٹ گئیں — افلاس نکبت فلاکت اور بے روزگاری نے غیرت و خودداری کا فاتحہ پڑھ دیا ؎

عزیز تھے سو ہوئے چشم میں سبھوں کی حقیر — حقیر تھے سو ہوئے سب میں صاحب توقیر
عجب طرح کی ہوائیں ہیں اور عجب تاثیر — اچنبھے خلق کے کیا کیا بیان کروں میں نظیر
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

---

(۱) کلیات سودا جلد دوم ص ۱۲۸

(۲) محمد شاکر ناجی بحوالہ آب حیات ص ۱۲۸

دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس　　پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانوں کے مانوس
گروش دل پر از امید ہوگئے مایوس　　گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئے ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں تھے جو صاحب چوڈول (۱)

پھر یہ دردناک حالات سناتے وقت غزل کی ایمائیت برقرار رکھتے ہیں اور پردے میں اپنا مطلب ادا کرتے ہیں :- (۲)

خرابی دل کی کیا ابنوہ درد وغم سے پوچھو ہو　　وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں　　آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا
دیتا ہے روشنی مرے سینے میں داغ ایک　　اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں　　تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج وتخت کا

لیکن نثر میں یہ ماجرا صاف صاف بیان کرتے ہیں - حق تو یہ ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے اس باب میں سودا کے مخمس شہر آشوب کا جواب ہیں - احمد شاہ ابدالی کی تاخت وتاراج سے دہلی پر جو گذر گئی اس کا عبرتناک خلاصہ یہ ہے کہ :

" روزے .... راہم بروبرانۂ تازۂ شہر افتاد - بر ہر قدم گریستم وعبرت گرفتم - چوں پیشتر رفتم حیران تر شدم - مکان ہارا نشناختم و دیارے نیافتم - از عمارت آثار نہ دیدم - از ساکنان خبر نشنیدم ؎

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ اینجا نیست
از ہر کہ نشان جستم گفتند کہ پیدا نیست

(۱) شہر آشوب - سودا

(۲) مومن نے اپنی نوجوانی میں گزشتہ صدی کی اس تباہی کے آثار دیکھے تھے - چنانچہ اس قصیدے میں جس کا مطلع یہ ہے ؎ یاد ایام عشرت فانی نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
اس ویرانی وبربادی کا نقشہ کھینچا ہے -

خانہا نشستہ دیوار ہا شکستہ خانقاہ بےصوفی خرابات بے مست خرابہ بود ازین دست تا بدان دست ـ جوانان رعنا رفتند ـ پیران پارسا گذشتند ـ کو محل ہا خراب کوچہ ہا نایاب وحشت ہویدا انس ناپیدا ـ رباعی استادے بیادم آمد ـــ

افتاد گذارم چو بویرانۂ طوس ۔ چوزے دیدم نشستہ برجائے خروس
گفتم چہ خبرداری ازین ویرانہ ۔ گفتا خبر این است کہ افسوس افسوس (۱)

یہ نقشہ اس اٹھارویں صدی عیسوی کا ہے جس میں اندرونی و بیرونی ہنگاموں سے اہل ہند پس کر رہ گئے ـ مسلسل بدامنی سے ہر متنفس کا خواب وخور حرام اور آسودگی و آسائش خیال محال ہوگئی۔ ان واقعات کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیسوین صدی کے آغاز مین جب انگریزون نے شہر دہلی پر قبضہ کیا تو ان کی روایات کشور کشائی اور انتظام و انصرام کی شہرت کے پیش نظر عوام نے اس تبدیلی کو ناگوار نہین سمجھا ـ شاہ عالم ثانی کو لال قلعے مین محدود کرکے سوالاکھ روپے ماہوار کی پنشن مقرر کردی گئی ـ شہر دہلی اور مضافات کا انتظام انگریزون نے سنبھال لیا ـ (۲)

---

(۱) ذکر میر ص ۹۹

(۲) Tilby: British India, Volume II, p.204. نیز تاریخ ہند از ذکاءاللہ جلد نہم ص ۲۶۲

انیسوین صـــــــدی

کامل ایک صدی کے اضطراب مسلسل کے بعد دھلی ایک غیر ملکی مگر منظم طاقت کے زیرحکومت آئی — سیندھیا اور ھلکر کے ساتھ انگریزون کا جو عہد نامہ ھوا تھا اس کے بموجب ۸ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک نے دھلی پر قبضہ کرلیا —(۱)

انگریز ایک بیرونی طاقت تھے جو ھندوستان کے ساحلی مقامات پر سترھوین صدی مین بہ سلسلۂ تجارت وارد ھوئے — دو صدیون کے اندر رفتہ رفتہ ان کا اقتدار اتنا بڑھا کہ دکن اور شمالی ھند کے اکثر حصون پر حاکمانہ حیثیت سے قابض ھوگئے — مدارس بنگال اور بہار مین ان کے حسن انتظام نے دلون مین جگہ کرلی تھی اور متعدد عیوب کے باوجود ان صوبون کے عوام انگریزی عملداری کو سابقــــہ طوائف الملوکی سے بہتر سمجھنے لگے تھے — دلّی والون نے جو سکھون جاٹون اور مرھٹون کی مسلســـل تاخت و تاراج سے برباد ھوچکے تھے حکومت کی اس تبدیلی کو اچھی نظر سے دیکھا — ھر شخص اطمینان کے ساتھ اپنے شغل مین لگ گیا — ایک مدت کے بعد لوگون نے امن و امان کی صورت دیکھی — سکون و اطمینان کے سرچشمے جو طوائف الملوکی کے ھنگامون مین خشک ھوچکے تھے دوبارہ ابلے — علوم و فنون صنعت و حرفت اسباب معاش و معیشت اور ان تمام ذرائع کو فروغ نصیب ھوا جو تمدن کی ترقی کے ضامن ھوتے ھین —(۲)

---

(۱) Encyclopaedia Britanica, Volume VII, see Delhi, p.162

(۲) Since our Fall, p.101, Tilby: British India, Vol.II,p.204
Twilight 82 140
سرسید، اسباب بغاوت ھند (اصل سوم)

تاریخ مین کسی دور کی روزمرہ یا سال بہ سال تبدیلیون کا حال ضبط نہین کیا جاتا ۔یہ کام روزنامچون کا ہے جن مین احکام حکومت کے بموجب تفصیلی حالات درج کیے جاتے ہین ۔ انیسوین صدی کے اوائل کی بابت ہمین ایسا کوئی روزنامچہ نہین ملتا جس سے اس خوشگوار تدریجی تغیّر کا حال معلوم ہوسکے جو انگریزی عملداری کے بعد واقع ہوا ہوگا ۔ اندازے سے کہ سکتے ہین کہ ابتدائی پندرہ بیس سال ایک طمانیت بخش عبوری دور کے ہون گے جن مین لوگون کو کچھ سوچنے سمجھنے کا ہوش آیا ہوگا ۔ اس کے بعد روز بروز حالات پر سکون ہوتے گئے ۔عوام کو اپنی معاش اور خانگی امور کے دوش بدوش دوسرے معاملات پر غور کرنے کی مہلت ملی تو انھون نے اپنی سماجی مجلسی علمی اور مذہبی اصلاح و ترقی کا خیال کیا ۔یہ نصف صدی جو ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء تک پھیلی ہوئی ہے اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس مین مختلف علمی اور مذہبی تحریکین پھلتی پھولتی رہین ۔علمی انجمنون کا قیام تعلیمی ادارون کا اجراء سماجی اصلاحون کی سرگرمیان اور مذہبی تحریکون کا وجود اس روح فعالیت کی خبر دیتے ہین جو نصف صدی کے اس پرسکون دور مین جاری و ساری تھی اور جسے بجاطور پر گذشتہ ایک صدی کے اختلال و اضطراب کا ردّ عمل کہنا چاہئے ۔اس عہد کی سرگرمیون کو تین حصون مین تقسیم کرسکتے ہین :-

(۱) علمی تحریکین

(۲) سماجی اصلاح

(۳) مذہبی تحریکات

ان کا تجزیہ حسب ذیل ہے :-

علمی تحریکیں

عہد مغلیہ میں درباری زبان فارسی تھی ۔ اس کے ساتھ عربی کو متعدد دیگر وجوہ سے اہمیت حاصل تھی ۔ ذی علم اور ملازمت پیشہ افراد انہی دو زبانوں کی تحصیل کیا کرتے تھے ۔ مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ان زبانوں پر بھی زوال آنا شروع ہوا یہاں تک کہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں زبان ریختہ جو اب تک صرف شاعروں کی طبع آزمائی کے لئے مخصوص تھی عام بول چال کی زبان قرار پائی ۔ شاہ عالم اور احمد شاہ ثانی کے زمانے میں یہ زبان منجھ منجھا کر سرکار اور دربار کے لائق ہوگئی ۔ لال قلعے میں اگرچہ بدستور سابق درباری زبان فارسی تھی مگر ۱۸۳۶ میں "صاحبان انگلستان" نے ملکی دفاتر کے لئے اس عوامی زبان کو اختیار کرلیا تھا (۱) ۔ جسے کبھی ہندی کبھی ہندوستانی اور کبھی اردو کہ کر پکارا جاتا تھا ۔ وارن ہسٹنگز اور معاملات میں متعصب سہی مگر ایشیائی زبانوں کی طرف خاص توجہ رکھتا تھا (۲) ۔ انگریز افسر جو ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان آتے تھے ۔ یہاں آکر باقاعدہ اردو کی تحصیل کرتے تاکہ اہل ملک سے ان کی ملکی زبان میں بات چیت کرسکیں (۳) ۔ اس مقصد کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی کورٹ آف ڈائرکٹرز نے برطانیہ اور ہندوستان میں مختلف علمی ادارے قائم کئے تھے جن میں فورٹ ولیم کالج کا نام سرفہرست ہے ۔ اس زبان سے انگریزوں کی دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ ان میں سے بعض نے زبان اور شاعری کے علاوہ ہماری ملکی معاشرت بھی اختیار کرلی ۔ بعض ان حدود سے بھی آگے بڑھ گئے اور نصرانیت ترک کرکے دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے ۔

---

(۱) تذکرۂ یورپین شعرائے اردو ص ۸ نیز Legacy of India, p.387

(۲) Tilby: British India, p.99

(۳) تذکرۂ یورپین شعرائے اردو ص ۸

یہ مشرق پرست یورپین کسی ایک ملک طبقے یا فرقے سے متعلق نہ تھے — ان میں جرمن فرانسیسی انگریز رومن کیتھولک پروٹسٹنٹ وغیرہ سبھی شامل ہیں — مردوں کے دوش بدوش بعض خواتین بھی اردو شاعری کی دلدادہ تھیں مثلاً ایلن کرسچیانہ عرف رقیہ بیگم مسز آرچیشن المخلص بہ جمعیت (۱) جو اردو کے علاوہ فارسی میں بھی دسترس رکھتی تھی خفی جوبلیک صاحب کی بیٹی تھی ا.. لی المخلص بہ ملکہ جو فلاکر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ کی دختر تھی — وہ مولوی عبدالغفور نساخ سے تلمذ کا شرف رکھتی تھی اور آخر میں مشرف بہ اسلام ہوگئی —(۲) مردوں میں بعض ایسے ہیں جو کئی کئی دیوانوں کے مالک ہیں — الیگزنڈر ھیدرلی آزاد کا دیوان مختصر سہی مگر سراسر انتخاب ہے — جارج پرنس شور پانچ دیوان دیوان بغل میں دبائے ہوئے ہے — ہرتھالیو گارڈنر صبر امیر مینائی کا شاگرد اور قادرالکلام سخنور ہے — اس کا بھائی رابرٹ گارڈنر اسبق اس سے زیادہ فصیح اور صاحب دیوان ہے وہ غزلوں کے علاوہ واقعاتی نظمیں سہرے اور مرثیے بھی لکھتا ہے — نیتھنیل گارڈنر شکر کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے — شاہ نصیر کی طرح سنگلاخ زمینوں میں غزلیں نکالتا ہے — اسی جماعت میں الویس رین ھارڈٹ المخلص بہ صاحب الملقب بہ مظفرالدولہ ظفریاب خان بھی ہے جو جنرل سومبر اور بیگم شمرو کا بیٹا ہے اور سردھنہ و دہلی میں مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتا ہے(۳) ان کے علاوہ ایس ڈبلیو فیلر المخلص بہ عابد کوئیس کوئینس فراسو پامر ڈی کاسٹا پیٹرک گارڈنر شوق ٹامس ھیدرلی غرض بیسیوں افراد ہیں جو نہ صرف اس زبان کے بلکہ دیسی معاشرت کے دلدادہ تھے اور جن میں سے بعض مشرقی رنگ میں ایسے ڈوبے کہ اپنا آبائی مذہب ترک کرکے ملت اسلام میں داخل ہوگئے — چنانچہ اپنی دختر فلاکر صاحب اور الیگزنڈر ھیدرلی آزاد آخر میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے — ان عاشقان اردو

---

(۱) تذکرہ یورپین شعرائے اردو ص ۳۱
(۲) ایضاً ص ۳۲
(۳) گلستان سخن ص ۲۱۸ —

مین سے اکثر نے اپنی مادری زبان کی طرح اردو ادب سے وابستگی کا ثبوت دیا اور معمولی بول چال سے گذر کر باقاعدہ علمی بنیادون پر اس کی تحقیق کی ـ بعض نے مقامی اساتذہ کی شاگردی اختیار کرکے اردو مین شعر کہنا اختیار کیا اور اتنا بڑھے کہ صاحب دیوان ہوگئے ـ بعض خاندان ایسے بھی نکلے کہ جن کے بیشتر افراد فارسی اور اردو مین صاحب کمال کہلائے چنانچہ فرخ آباد کا سکنر ضلع ایٹہ اور میرٹھ مین گارڈنر اسکنر اور ہیدرلی خاندان ان خصوصیات کے حامل تھے[1] ـ یہ لوگ تحصیل زبان کے علاوہ ملکی رسم و رواج معاشرت تہذیب اور مذہب کا بھی ایسا مطالعہ کرتے تھے کہ سراسر ہمارے رنگ مین رنگے جاتے تھے ـ ہماری معاشرت تہذیب و تمدن اور ملکی روایات[2] ان کے خون مین بس جاتی تھین ـ یہ لوگ اسی ملک مین پیدا ہوتے اور یہین پیوند خاک ہوکر وفاداری بشرط استواری کا حق ادا کرتے ـ

ترقی و تعمیر کی اس نصف صدی مین جو علمی تحریکین قائم ہوئین ان کے نام اور مراکز یہ ہین :

(۱) فورٹ ولیم کالج ـ کلکتہ
(۲) دہلی کالج
(۳) ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی
(۴) مختلف انفرادی اور بالواسطہ عوامل ـ

---

(۱) تذکرۂ یورپین شعرائے اردو ص ۸ تا ص ۵۵

(۲) مثال کے بطور الیگزنڈر ہیدرلی آزاد کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جو نواب زین العابدین خان عارف کا شاگرد تھا ـ اسے شاعری کے علاوہ آیورویدک اور طب یونانی سے بھی دلچسپی تھی ـ مریضون کو مفت دوا دیتا تھا اور اکثر مزاجی خصوصیات مین ہندوستانی تھا ـ اس کے اشعار مین ہماری مذہبی اور شاعرانہ روایات نیز ہماری معاشرت کا سراغ ملتا ہے ـ مثلاً :ـ

مرغ سلیمان ہو یا ہو کبوتر جن و بشر ہو کوئی ہو
نامہ مرا لیجائے وہان تک جس کا گذر ہو کوئی ہو

مد نظر ان سیم تنون کو فرق مراتب خاک نہین
کام سے اپنے کام ہے ان کو صاحب زر ہو کوئی ہو

ہو وین گے ہم ممنون اسی کے برق پہ کچھ موقوف نہین
آگ ہمارے گھر مین لگا دے شمع و شرر ہو کوئی ہو

حال شکستہ دیکھ کے میرا روئے ارادت بھیر لیا
فیض اٹھا آزاد ہر اک سے اہل ہنر ہو کوئی ہو

انگریزون کی یہ خصوصیت قابل تعریف ہے کہ وہ جس زبان کی تحصیل کرتے ہین اس کی معاشرت مین ڈوب جاتے ہین ـ آج کل بھی لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز مین شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر رسل انہی خصوصیات کے حامل ہین ـ

(۱) فورٹ ولیم کالج | یہ ادارہ قلعۂ کلکتہ مین لارڈ ویلزلی کے حکم سے بتاریخ ۴/ مئی ۱۸۰۰ء اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ کمپنی کے انگریز ملازمون کو دیسی زبان کی تعلیمی سہولتین بہم پہنچاکر ملکی ملازمت کے لئے موزون بنائے اور ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور ترجمہ کے ذریعے اردو مین ایسی کتابون کا اضافہ کرے جن کی زبان سلیس ہو[1] — اس سے پہلے وارن ہیسٹنگز نے جو اپنی چیرہ دستیون کے باوجود ملکی زبانون کا شائق تھا دیسی کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا مگر اسے چندان فروغ نصیب نہ ہوا — فورٹ ولیم کالج کا منصوبہ پورے اہتمام اور کمپنی کی منظوری سے بروئے کار لایا گیا تھا — لارڈ ویلزلی کی تجویز یہ تھی کہ تصنیف وتالیف کے علاوہ کالج مین فارسی عربی سنسکرت اردو ہندی اور بنگالی کی تعلیم کا بھی انتظام ہو نیز لاطینی یونانی اور انگریزی پڑھانے کا بھی بندوبست کیا جائے — لیکن کمپنی کے ڈائریکٹر اتنے لمبے چوڑے منصوبے کے حامی نہ ہوئے — صرف اتنا منظور کیا کہ کالج مین تصنیف وتالیف کے علاوہ انگریز ملازمون کو فارسی اور اردو کی تعلیم دینے کا بندوبست کیاجائے — اس مقصد کے لئے ہر ملازم کو تیس روپے دیے جاتے تھے — پڑھانے والون مین کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے اساتذہ بھی تھے جو طلبہ کو اردو کی تعلیم دیتے تھے[2] —

کالج کے پہلے پرنسپل جان گلکرائسٹ تھے جو چار سال بڑی محنت وانہماک سے کام کرتے رہے وہ خود بھی ملازمون کو اردو پڑھاتے تھے — ان کی کوشش سے ہندوستان کے اکثر ادیب اور ذی علم اشخاص ملک کے طول وعرض سے کھنچ کھنچ کر کلکتہ آگئے[3] اور معقول مشاہرون پر تصنیف وتالیف کا کام انجام دینے لگے — ڈاکٹر گلکرائسٹ کے اہتمام سے کالج مین اردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہوا —

---

(۱) G. T. Garret Legacy of India P. 387
(۲) حامد حسن قادری — داستان تاریخ اردو طبع دوم ص ۸۲
(۳) میرتقی میر کو بھی کالج کے مصنفین مین شامل کرنے کی تحریک کی گی تھی مگر وہ ضعیف العمر ہونے کی بنا پر معذور رکھے گئے — ان کی جگہ میر شیرعلی افسوس کا انتخاب ہوا (گلشن ہند ص ۱۲۱) —

گلکرائسٹ ١٨٠٢ء مین بوجہ علالت پنشن لے کر ولایت چلے گئے — وہان پہنچ کر بھی انھین اردو سے وہی شغف رہا — وہ لندن مین ١٨١٦ سے ١٨١٨ء تک نجی طور پر انڈین سول سروس کے امیدوارون کو مشرقی زبانون کی تعلیم دیتے رہے — اسی سال وہ اورینٹل انسٹیٹیوٹ مین جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اعلی ملازمون کی لسانی تربیت کے لئے قائم کیا تھا اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے (١) سان کا انتقال ١٨٢١ء مین بمقام پیرس ہوا — وہ متعدد کتابون کے مصنف ہین جن کی فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی تالیف لنگوسٹک سروے کی جلد نہم مین دی ہے (٢) —

گلکرائسٹ مخلص اور محنتی ہونے کے علاوہ بہت دلچسپ انسان تھے — علوم مشرقی کی تحصیل کے بہ سلسلہ اس نے ہندوستان کے مختلف شہرون کی سیر کی تھی اور تالیف قلوب یا یگانگت کے خیال سے لباس اور وضع و قطع مین اس ملک کے باشندون کا طریقہ اختیار کیا تھا — یہ اس کی نیک نیتی کا ثمرہ تھا کہ اس کے ولایت جانے کے بعد بھی کالج ایک مدت تک اسی نہج پر کام کرتا رہا — گلکرائسٹ کے بعد ٹامس روبک پرنسپل مقرر ہوا — اس شخص نے گلکرائسٹ کو تالیف و تصنیف کے کام مین کافی مدد دی تھی اور خود بھی چند کتابین فن جہاز رانی پر لکھی تھین — اس تمام عرصے مین جو جو انیسوین صدی عیسوی کے ربع اول پر مشتمل ہے بہت سی کتابین تصنیف ہوئین جن مین سے بعض کالج کے مطبع مین اور بیشتر کلکتہ کے دوسرے مطبعون مین طبع ہوکر ملک کے طول و عرض مین پھیل گئین — ان مین سے بعض اہم کتابین جنھون نے اردو کے اسلوب نگارش پر مستقل اثر ڈالا اور اسے رنگین مقفی و مسجع انشاء کے بکھیڑے سے آزاد کیا حسب ذیل ہین :

---

(١) سید محمد — ارباب نثر اردو ص ٢١ نیز رام بابو سکسینہ حصہ دوم ص ٦

(٢) یہان زیادہ اہم کتابون کے نام لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے : —

١ — انگریزی ہندوستانی لغت جو نو سال کی محنت سے ١٧٩٢ء مین تیار ہوئی —

٢ — ہندوستانی علم اللسان ٣ — قواعد اردو ١٨٠٩ء

٤ — مشرقی زبان دان (مقدمۂ زبان) ٥ — ہندی کی آسان مشقین

٦ — رہنمائے اردو ١٨٠٢ء ٧ — بیاض ہندی (فورٹ ولیم کالج کے مصنفون کی تالیفات کے انتخاب —

٨ — قصص مشرقی (ترجمہ از انگریزی) طبع کلکتہ ١٨٠٠ء

٩ — مکالمات انگریزی و ہندوستانی طبع لندن ١٨٢٠ء —

حکایات وقصص :

باغ و بہار یعنی قصۂ چہار درویش	میر امن دہلوی
آرائش محفل یا قصۂ حاتم طائی	حیدر بخش حیدری
طوطا کہانی ماخوذ از ابن نشاطی دکنی	حیدر بخش حیدری
قصۂ مہر و ماہ	حیدر بخش حیدری
لیلی مجنوں	حیدر بخش حیدری
ہفت پیکر	حیدر بخش حیدری
گلزار دانش	حیدر بخش حیدری
مذہب عشق یا قصۂ گل بکاولی	نہال چند لاہوری
نثر بے نظیر	بہادر علی حسینی
اخلاق ہندی ترجمۂ نگار دانش (ماخوذ از ہتوپدیش)	بہادر علی حسینی
قصۂ امیر حمزہ	خلیل اللہ خان اشک
سنگھاسن بتیسی	للولال کوی
پریم ساگر	للولال کوی
لطائف/ ہندی	للولال کوی

اخلاق وحکم :-

گنج خوبی ترجمۂ اخلاق محسنی	میر امن
باغ اردو ترجمۂ گلستان	شیر علی افسوس
اخلاق ہندی (ماخوذ از مفرح القلوب)	بہادر علی حسینی
خرد افروز ترجمۂ عیار دانش	حفیظ الدین احمد
اخوان الصفا	اکرام علی
ترجمۂ کریما	مظہر علی خان ولا
گلزار دانش	حیدر بخش حیدری

تاریخ :

واقعات اکبر ترجمۂ اکبر نامۂ ابوالفضل	خلیل اللہ خان اشک
تاریخ شیر شاہی	مظہر علی خان ولا
آرائش محفل (ماخوذ از خلاصۃ التواریخ سبحان رائے)	شیر علی افسوس
تاریخ نادری (نایاب)	حیدر بخش حیدری
تاریخ آسام	بہادر علی حسینی
تاریخ فرشتہ	کاظم علی جوان

مذہب :

ترجمۂ تنبیہہ الغافلین (شاہ رفیع الدین)	بینی نراین جہان
گلدستۂ حیدری	حیدربخش حیدری
ترجمۂ عہدنامۂ جدید	~~مولوی لطف اللہ~~ مرزا محمد فطرت
ترجمۂ قرآن مجید (چند پارے)	مولوی امانت اللہ
گل مغفرت یا دہ مجلس	حیدر بخش حیدری
مراثی مسکین	میان مسکین

تذکرے :

گلشن ہند	مرزا علی لطف
تذکرۃ الشعرا	بینی نراین جہان
چار گلشن	بینی نراین جہان

ان تالیفات کے علاوہ جن کا ذکر اختصار سے ہوا مختلف موضوعات مثلا اصول حکومت صرف و نحو طعام پزی آداب مجلس وغیرہ متفرق موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔[1] کالج کے باہر بھی اس تحریک کے اثر سے بعض تصانیف وجود مین آئین جن مین سلاست و سادگی کا وہی رنگ نظر آتا ہے۔ محمد حسین کلیم مرزا قتیل انشا وغیرہ نے بعض عمدہ تالیفات پیش کین لیکن یہ مسلم ہے کہ جو کتابین کالج مین لکھی گئین ان کی دلکشی کو دوسری تصانیف نہین پہنچتین۔ یہ کہنا بجا ہے کہ اس کالج نے اردو کے فروغ کے لئے ربع صدی مین بہت کام کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری موجودہ سلیس نثرنگاری جس کا آغاز سرسید اور غالب سے منسوب کیا جاتا ہے اسی کالج کی مرہون منت ہے۔

(۱) ارباب نثر اردو سید محمد ۔ پیش نامہ ۔ تاریخ ادب اردو ۔ بابو رام بابو سکسینہ ۔ حصہ دوم ص ٦

(۲) دهلی کالج

اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اہل ملک دیسی زبانون کے دوش بدوش انگریزی اور سائنسی علوم کی تعلیم حاصل کرسکین (۱) ۔اس کالج کی سرگزشت یہ ہے کہ غازی الدین فیروزجنگ ابن آصف جاہ دوم نے دہلی مین مشرقی علوم کا مدرسہ قائم کیا تھا ۔یہ مدرسہ ۱۷۹۲ء سے مشرقی اور مغربی علوم کی مشترکہ درسگاہ بنا اور بڑھتے بڑھتے ۱۸۲۵ء مین مدرسے سے گذر کر دہلی کالج بن گیا ۔ یہان مشرقی علوم کے علاوہ انگریزی اور سائنسی مضامین کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور اس مین وسطانی جماعتون سے لے کر اعلی مدارج تک تھے جن کا معیار ہمارے موجودہ تعلیمی نقطہ نظر سے میٹرک اشر میجیٹ بی اے اور بی ایس سی جیسا تھا ۔ ۱۸۲۱ء مین یہ کالج مدرسۂ غازی الدین والی عمارت سے کتب خانۂ دارا شکوہ مین منتقل ہوگیا (۲) ۔ ہنگامۂ غدر کے بعد سات سال تک بند رہا ۱۸۶۴ مین دوبارہ کھلا مگر بالآخر ۱۸۷۷ء (۳) مین توڑ دیا گیا ۔

---

(۱) تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت ۔ سید ہاشمی ص ۲۷۳

(۲) غدر کے ہنگامے مین اس کالج نے سخت نقصان اٹھایا ۔ دلی کے بعض سخت گیر متعصب اس ادارے کو نصرانیت کا اڈا سمجھتے تھے ۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جون ہی دہلی مین فساد کی پہلی چنگاری اڑی مذہبی دیوانون اور غنڈون کا ایک گروہ لاٹھیان اور پتھر لئے اپنا فرض ادا کرنے آپہنچا الماریان کھڑکیان اور شیشے چکنا چور کرڈالے ۔ قیمتی سائنسی آلات پاش پاش کردیے ۔ کتابون کو جلا غرض دوتین گھنٹے مین کالج کو ایک ویرانہ بنا ڈالا جہان راکھ اور مٹی کا ڈھیر پڑا رہ گیا ۔ مسٹر ٹیلر اور ماسٹر رامچندر گرتے پڑتے بھاگے ۔ آخرالذکر بچ نکلے مگر مسٹر ٹیلر مارے گئے ۔

(۳) مرحوم دہلی کالج ۔ ڈاکٹر عبدالحق ص ۱۶ تا ۱۸

اس کالج نے مختلف علوم کی ترویج اور اهل هند کی ذهنی بیداری کے لئے جو کچھ کیا قابل تحسین هے - اس کی کارگذاری کا نقشہ دکھانے کے لئے محض اتنا کھدینا کافی هے کہ اس کے اساتذہ مین ڈاکٹر اسپرنگر مسٹر ٹیلر مولانا امام بخش صہبائی (۱) مولوی مملوک العلی ماسٹر رامچندر جیسے حضرات تھے - جو شاگرد اس کالج نے پیدا کئے وہ بھی اپنے وقت کے بہترین عالم نکلے - مثلاً شمس العلماء محمد حسین آزاد شمس العلماء ذکاءالله خان شمس العلما ڈاکٹر نذیراحمد صاحب سرسیداحمد خان رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہم جن پر یہ ادارہ هزار ناز کرسکتا هے اور جو خود بھی اس مادر علمی کے عاشق تھے - ڈاکٹر نذیراحمد صاحب تو کالج پرستی کے معاملے مین یہان تک غلو کرتے تھے کہ اپنی ذهنی ترقی اور اصلاح مزاج کو سراسر کالج کا عطیہ بتاتے تھے (۲) - ان حضرات کا حال محتاج تعارف نہین تاهم اس خیال سے کہ ان کی زندگی کے بعض گوشے اب تک غیرمعروف هین کچھ تفصیل یہان دینا مناسب هے :-

مسٹر ٹیلر ۱۸۲۵ء مین جب کالج کھلا تو یہ بمشاهرہ ۱۷۵ روپے کالج کے سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ مقرر هوئے - انگریزی کے علاوہ جو ان کی مادری زبان تھی علوم مشرق سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور کالج کے طلبہ کے حق مین بہت شفیق تھے - ۱۸۳۷ء مین کالج کی مجلس انتظامیہ نے ان کو پرنسپل بنا دینے کی سفارش کی تھی مگر یہ صورت امکان پذیر نہ هوئی اور ان کے بجائے مسٹر بتروس کا تقرر هوا کہ وہ بھی حسن خدمت کارگزاری اور انتظامی امور کے دوش بدوش مشرقی علوم کے ماهر تھے - (مرحوم دهلی کالج ص ۱۲٦) - مسٹر ٹیلر نے هنگامۂ غدر مین شمس العلما آزاد کے والد مولوی محمد باقر

---

(۱) مومن کو شعبۂ فارسی کی صدر مدرسی پیش کی گئی تھی مگر انھون نے کمی تنخواہ کے پیش نظر قبول نہ کی - تب مولوی امام بخش صہبائی صاحب کا تقرر هوا - مرحوم دهلی کالج ص ۵۹

(۲) ما اصابنی من حسنۃ فی الدنیا اوفی الآخرۃ - فمن الکالج انھی کا مقولہ هے -

کے گھر پناہ لی — وہاں سے نکل کر کوٹھی اور گوشۂ عافیت ڈھونڈھنے نکلے تھے کہ باغیوں کے ہاتھ پڑ گئے اور مارے گئے —

مسٹر اے اسپرنگر — ایم ڈی — اسسٹنٹ سرجن بنگال — مسٹر بتروس کے بعد یہ بحیثیت پرنسپل متعین ہوئے — عربی کے فاضل تھے اور اس وجہ سے شہر میں ان کی بڑی وقعت تھی — ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سیکرٹری بلکہ روح رواں تھے — تاریخ یمینی کے مرتب تھے — حماسہ ابوتمام اور متنبی کے عمدہ نسخے بہم پہنچائے تھے — تعلیمی ژرف نگاہی کے علاوہ انتظامی امور میں بھی یکتا تھے — فروری ۱۸۲۸ء میں کارخاص پر یعنی فہرست کتبخانۂ شاہان اودھ تیار کرنے کے لئے لکھنئو بھیجے گئے — وہاں سے دو سال بعد ۱۲ جنوری ۱۸۵۰ء کو واپس آئے اور تب ہی ان کی خدمات حکومت بنگال کو واپس دے دی گئیں — (مرحوم دھلی کالج — ص ۱۲۸)

مولوی مملوک العلی نانوتہ ضلع مظفرنگر کے باشندے اور بڑے جید عالم تھے — ذہن خداداد اور حافظے کی یہ حالت تھی کہ غیر متعلق علوم کی کتابیں ایک روز دیکھ کر اگلے دن بہ سہولت پڑھا سکتے تھے — سرسید احمد خان آثارالصنادید کے باب چہارم میں بڑی شیفتگی کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر علوم کی کتابیں دنیا سے ناپید ہوجائیں تو یہ اپنی قوت حافظہ سے انہیں دوبارہ پیدا کرسکتے ہیں[له] — بڑے محقق ومدقق تھے — طلبہ کے حق میں شفیق اور بہت خندہ جبین بزرگ تھے — تحریراقلیدس سنن ترمذی وغیرہ کا اردو ترجمہ ان سے یادگار ہے (مرحوم دھلی کالج ص ۱۵۲ آثارالصنادید)

امام بخش صہبائی عربی اور فارسی کے زبردست عالم اور اردو وفارسی کے خوش بیان شاعر تھے — ۱۸۲۰ء میں شعبۂ فارسی کی صدر مدرسی خالی ہوئی تو مرزا غالب اور حکیم مومن خان کے انکار پر یہ عہدہ صہبائی کو ملا جن کا تقرر بمشاہرہ چالیس روپے ہوا — غالب مومن اور آزاد آزردہ سے دوستانہ

له آثار الصنادید باب چہارم ۵۵

مراسم تھے - ۱۸۵۷ء مین فتح دھلی کے بعد اس تہمت کی پاداش مین کہ انھون نے جہاد کا فتوی دیا تھا گولیون کی باڑھ سے جمنا کے کنارے قتل کیے گئے (باغی علماء ص ۳۹ / قاموس المشاہیر ص ۲۲۱) شعرا کا ایک تذکرہ اور ترجمہ حدائق البلاغت ۱۸۴۲ء ان سے یادگار ہین -

ماسٹر رامچندر | پانی پت کے ایک کایستھ خاندان سے تھے - ان کے والد سندر لال نائب تحصیلدار تھے - گیارہ سال کی عمر مین ایک گونگی لڑکی سے ان کی شادی کردی گی - پندرہ سال کے تھے کہ ملازمت (محرری) اختیار کرنی پڑی - ۱۸۲۱ء مین دھلی کالج مین داخل ہوئے اور تیس روپے کا سینیئر وظیفہ حاصل کیا - تین سال بعد فارغ التحصیل ہوکر اسی کالج مین یورپین سائنس پڑھانے پر مامور ہوئے - سائنس اور ریاضی مین انھین تبحر حاصل تھا - انھی دنون ایک رسالہ فوائد الناظرین جاری کیا جس مین علمی بحثین ہوتی تھین - علم مثلث اور مخروطی تراشون پر ان کی کتاب برطانیہ عظمیٰ تک مشہور ہوئی [1] - دوسری مشہور کتابین عجائب روزگار، مشاہیر یونان و روما کلیات و جزئیات ہین- طلبہ مین بڑے معزز و محترم تھے لیکن چونکہ اپنا مذہب ترک کرکے نصرانیت اختیار کرلی تھی اور مناظرے کے مرض مین مبتلا ہوگئے تھے اس لئے اہل دھلی ان سے برگشتہ رہنے لگے تھے (مرحوم دھلی کالج) سیرالمصنفین حصہ اول ص ۲۸۱ -

---

دھلی کالج کے اساتذہ مین مولوی رشید الدین بھی تھے جو اذان جمعہ کی بندش سے برہم ہوئے اور احتجاج کے بطور مستعفی ہوگئے - مولوی رجب علی جو بعد مین حکومت پنجاب کے میر منشی ہوئے اور حیدرآباد دکن مین ارسطو جاہ کے لقب سے سرفراز ہوئے انھی رشید الدین صاحب کے شاگرد تھے جو فارغ التحصیل ہوکر کالج کے اساتذہ کی صف مین داخل ہوئے - ریاضی و ہیئت کے استاد تھے اور ذہین و طباع آدمی تھے - آزاد جب غدر کے ہنگامے مین دھلی سے فرار ہوئے تو جگراؤن مین سید رجب علی

[1] ڈاکٹر عبدالحق. مرحوم دہلی کالج ص ۱۳۱

کے گھر مین پناہ لی جو آزاد کے والد محمد باقر کے شاگرد تھے ۔ مولوی صدرالدین آزردہ بھی ان دنون یہین روپوش تھے ۔

شمس العلماء نذیر احمد ولد سعادت علی | ضلع بجنور کے ایک گانو رہپھر مین پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم بجنور مین اور پنجابی کٹرے کی مسجد (دھلی) مین پائی ۔ پھر دھلی کالج مین وظیفہ یاب ہوکر طالب علم ہوئے ۔ کچھ عرصہ محکمۂ تعلیم مین ملازم رہے ۔ پھر سرسالار جنگ اول کی دستگیری سے حیدرآباد پہنچے جہان مختلف مدارج پر فائز ہوتے ہوئے بالآخر ۱۷۰۰ روپے ماہوار پر بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے ۔ ریاست کی سازشون کے سبب پنشن لے کر نکلے اور باقی عمر دھلی مین تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف مین گزار دی ۔ ۱۹۱۲ء مین انتقال ہوا ۔ ابن الوقت، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا رویائے صادقہ وغیرہ نیز ترجمۂ قرآن مجید ان کی تصانیف ہین ۔ ان کی زبان مین غضب کی روانی ہے ۔ دھلی کا روزمرہ لکھنا گویا ان پر ختم تھا ۔ لیکن عبارت مین محاورہ کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ بعض جگہ ناگوار اور بعض جگہ مبتذل ہوجاتا ہے (سیرالمصنفین حصہ دوم ص ۱۹۸ ۔ حیات النذیر)

ماسٹر پیارے لال آشوب دھلوی | ان کا نسب راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے ۔ ۱۸۳۸ء مین پیدا ہوئے ۔ دھلی کالج اور آگرہ کالج مین تعلیم پائی ۔ ماسٹر رامچندر اور مولانا صہبائی کے عزیز شاگرد تھے ۔ بریلی گوڑ گانون اور دھلی کے اسکولون مین ہیڈ ماسٹر رہے ۔ ۱۸۶۲ء مین لاہور پہنچکر کیوریٹر ہوئے ۔ ۱۸۸۲ء مین انسپکٹر مدارس ہوگئے ۔ ڈائرکٹر تعلیم پنجاب میجر فلر کے منظور نظر ماتحت تھے ۔ چنانچہ مولانا حالی اور آزاد کی ملازمت و ترقی انہی کی سفارش سے ہوئی ۔ قصص ہند جلد اول و سوم ترجمۂ تاریخ انگلستان وغیرہ ان کی کاوش قلم کا نتیجہ ہین ۔ فن شعر مین بھی دخل تھا ۔ ۱۹۱۰ء مین انتقال ہوا (حیات آشوب ۔ مرحوم دھلی کالج) ۔

محمد حسین آزاد دھلوی | ۱۸۳۸ء مین پیدا ھوئے ۔ دھلی کالج مین تعلیم پائی ۔ ذوق کے قابل فخر شاگرد تھے کہ استاد کے نام کو زندہ کر گئے ۔ ان کے باپ سید محمد باقر غدر کی داروگیر مین قتل ھوئے ۔ یہ بحال تباہ کیسے کو سنبھالے لکھنؤ مدراس جگراؤن وغیرہ کی خاک چھانتے ھوئے بالآخر لاھور پہنچے ۔ ۱۸٦۱ء مین ڈپٹی لیٹر آفس مین نوکر ھوئے ۔ تین سال بعد پوسٹ ماسٹر جنرل کی سفارش اور پنڈت من پھول کی سعی سے محکمۂ تعلیم مین ملازم ھوئے ۔ کرنل ھالرائڈ اور میجر فلر ان کے قدرشناس تھے ۔ اتالیق پنجاب کی سب ایڈیٹری پر فائز کیا ۔ انھی دنون یعنی ۱۸۷۴ء مین محفل مناظمہ کی بنیاد ڈالی ۔ فارسی کے ذوق نے ایران کی سیر کرائی ۔ ۱۸۸۷ء مین دوبارہ ایران گئے ۔ اسی سال شمس العلماء کا خطاب ملا ۔ اگست ۱۸۸۹ء مین آثار جنون ظاہر ھوئے ۔ اسی عالم مین بیس سال بعد ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا ۔

آزاد کی تصانیف مین قصص ھند جلد سوم آب حیات نیرنگ خیال دربار اکبری جامع القواعد سخندان فارس نگارستان فارس کا مقام بہت بلند ہے ۔ نظم مین ان کی یادگار "نظم آزاد" ہے ۔ ان کا انداز تحریر بے حد دلنشین شگفتہ اور حسین ہے جس کی تقلید اب تک کسی سے ممکن نہین ھوئی ۔ قوت بیان اور زور تحریر کے لحاظ سے وہ اردو کے میکالے سمجھے جاتے ھین ۔ (جامعہ اکتوبر ۱۹۲۷ء)
(سیر المصنفین جلد دوم ص ۱۳۱) قاموس المشاہیر (مقدمہ نظم آزاد از آغا محمد باقر) ۔

ذکاء اللہ خان | ۔ ۱۸۲۷ء مین دھلی کے ایک اعلیٰ ذی عزت خاندان مین پیدا ھوئے جس کے افراد مدت سے قلعے مین شاہزادون کی اتالیقی پر فائز تھے ۔ دھلی کالج مین تعلیم پائی اور تحصیل علم کے بعد وھین بیس روپیے ماھوار پر علم ھندسہ پڑھانے پر فائز ھوئے ۔ ۱۸۵۱ء مین محکمۂ تعلیم مین داخل ھوئے جہان سے ۱۸۸۰ء مین پنشن حاصل کی ۔ مختلف فنون مین ان کی تصانیف کی تعداد ایک ایک سو پچاس کے قریب ہے ۔ تاریخ ھندوستان کی دس جلدین ان کی قابل فخر یادگار ھین ۔ علی

کامون مین باقاعدگی سے انہماک رکھتے تھے ـ ان کا قاعدہ تھا کہ تصنیف وتالیف کے لئے جو چند گھنٹے مخصوص کردیے تھے ان مین پابندی سے یہ شغل جاری رکھتے تھے ـ اس معمول مین کبھی ناغہ نہ ہوتا تھا ـ کمرے کی دیوار مین جہان سرلگا کر بیٹھتے تھے ایک گڑھا پڑ گیا تھا ـ ضعیف العمری مین بتاریخ ۷ نومبر ۱۹۱۰ء انتقال ہوا (ذکاءاللہ از سی ایف اینڈ ریوز ـ قاموس المشاہیر ص ۲۲۵) ـ

اس درسگاہ مین طلباء کو مختلف سہولتین حاصل تھین ـ اول چند سال تک یہان کوئی فیس نہ لی جاتی تھی ـ وظائف کی رقم اور تعداد کافی پرکشش تھی ـ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۳۹ء تک وظیفے بند کردیے گئے ـ اگرچہ ان کا اجراء دوبارہ ہوا مگر اس پیمانے پر نہ ہوسکا ـ اس کے ساتھ طلباء سے حسب استطاعت فیس بھی وصول کی جانے لگی اگرچہ اس کی رقم نہایت معمولی ہوتی تھی ـ چار سالہ دور ابتلاء کے بعد جو لارڈ ولیم بنٹنک اور مسٹر (بعد ازان لارڈ) میکالے کی غلط اندیشیون کا نتیجہ تھا لارڈ آکلینڈ کے حکم سے مشرقی علوم کو دوبارہ فروغ ہوا اور وظائف جاری کیے گئے [۲] ـ طلباء کی تعداد جو گھٹ کر آدھی رہ گئی تھی پھر بڑھ گئی ـ اگرچہ اکثر ہندو اور مسلمان اپنے سخت مذہبی عقائد اور بعض توہمات کی بنا پر اس کالج کو بے دینی و الحاد کا کارخانہ سمجھتے تھے پھر بھی یہان مختلف جماعتون کے طلبہ کی تعداد تین چار سو کے درمیان رہتی تھی [۱] ـ ذیل کے نقشے سے اس کا اندازہ ہوسکے گا :-

---

(۱) مرحوم دہلی کالج از ڈاکٹر عبدالحق ص ۱۰۹ ـ

(۲) ایضاً ص ۱۲۱

تعداد طلبه

سن عیسوی	هندو	مسلمان	عیسائی	میزان
۱۸۳۵ — ۳۶	۲۰۱	۱۵۸	۵	۳۶۴
۱۸۳۶ — ۳۷	۱۳۴	۱۰۸	۷	۲۴۹
۱۸۳۷ — ۳۸	۱۱۴	۱۸۹	۸	۳۱۱
۱۸۳۸ — ۳۹	۱۴۰	۸۰	۶	۲۲۶
۱۸۳۹ — ۴۰	۱۰۵	۷۳	۱۱	۱۸۹ } (۱)
۱۸۴۰ — ۴۱	۹۳ ~~۸۳~~	۷۰	۳	۱۶۶ }
۱۸۴۱ — ۴۲	۲۱۴	۱۰۲	۱۰	۳۲۶
۱۸۴۲ — ۴۳	۱۴۶	۱۲۸	۱۲	۲۸۶
۱۸۴۳ — ۴۴	۱۷۹	۱۱۱	۱۵	۳۰۵
۱۸۴۴ — ۴۵	۲۹۹	۲۳۶	۱۵	۴۵۰
۱۸۴۵ — ۴۶	۲۳۰	۱۳۲	۱۳	۳۷۵
۱۸۴۶ — ۴۷	۲۰۹	۱۰۷	۱۸	۳۳۴
۱۸۴۷ — ۴۸	۲۳۴	۱۰۹	۱۶	۳۵۹

جو مضامین یہاں پڑھائے جاتے تھے ان کی تعداد کافی تھی اور طلبہ کے لئے انتخاب مضامین کا میدان خوب وسیع تھا — فارسی عربی سنسکرت اور انگریزی ادبیات نیز دینیات کے علاوہ جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور جن کا معیار ثانوی تھا (ہمارے موجودہ انٹرمیجئیٹ اور بی — اے کے برابر) ان کی تفصیل یہ ہے[۲]:—

---

(۱) طلبہ کی تعداد میں یہ کمی غالبا وظیفے بند کردئیے جانے کے سبب تھی —

(۲) علاوہ ازیں کالج کے طلبہ بعض قواعد کے تحت ایم — اے کے امتحان میں بھی شرکت کرتے تھے جیساکہ ڈاکٹر عبد الحق صاحب کی رپورٹوں سے ظاہر ہے دیکھئے ص ۱۲۱

پولیٹیکل سائنس یعنی اصول حکومت

ریاضی (حساب الجبرا اور ہندسہ) تاریخ جغرافیہ طبیعیات کیمیا الہیات حفظان صحت فلسفہ و منطق وغیرہ

یہ اس ہمدرد و دلسوز ادارے کا مختصر خاکہ ہے جس نے عوام کے مذہبی تعصب بعض ارباب حکومت کی مخالفت اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کی تباہ کاری کے باوجود پچاس سال تک علم و فن کی شمع روشن رکھی جس کے شاگرد اس کی پرستش کرتے تھے اور جسے ہمارے باقیات الصالحات بزرگ یعنی ڈاکٹر عبدالحق بڑی حسرت سے مرحوم دھلی کالج کہ کر پکارتے تھے ۔

۲ ۔ ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی

یہ انجمن دراصل دھلی کالج کی ضمنی پیداوار (Bye Product) تھی ۔ کالج مین غیر ملکی زبانون کی کتابین استعمال ہوتی تھین اور جن کا دیسی متبادل سراسر نایاب تھا ان کے پڑھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ یا تو اساتذہ انھین سبقاً سبقاً اور جزواً جزواً شاگردون کے لئے ترجمہ کرتے جاتے تھے یا مقررہ معاوضے پر ان کتابون کا مکمل اردو ترجمہ کرکے کالج مین پیش کردیتے تھے اس کام مین ماسٹر رامچندر صاحب پیش پیش تھے کہ انھین انگریزی علوم کے علاوہ انگریزی تہذیب اور عیسائی مذھب سے بھی شغف تھا ۔ مگر یہ دوھرا کام استادون کے لئے باعث زحمت اور شاگردون کی راہ مین سنگ گران تھا ۔

اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے ۱۸۴۲ء مین دھلی کے شرفاء نے (۱) جن مین ھندو مسلمان امراء اور انگریز افسر برابر کے شریک تھے ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بنیاد رکھی ۔ مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم کی

(۱) مرحوم دھلی کالج از ڈاکٹر عبدالحق ص ۱۲۰

کتابین ترجمہ کرکے چھاپی جائین تاکہ طلبہ کو یہ کتابین ارزان قیمت پر دستیاب ہوسکین ۔ اس انجمن نے قابل تعریف سرگرمی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا ۔ مالی مشکلات اور دیگر دقتون کے باوجود انجمن[۱] مذکورہ نے ۱۱۷ کتابین ترجمہ کین جن کے مضامین کی مختصر تفصیل یہ ہے :۔

اصول حکومت و سیاست یعنی روم یونان اور انگلستان کی پولیٹیکل سائنس
پولیٹیکل اکانمی، پلوٹارک کی کتاب المشاہیر
قانون مال، قانون فوجداری سول کلاہ کا شہ
ریاضیات، رامائن مہابھارت نلدمن
گلستان، الف لیلہ لغات مناجات
طبیعیات کیمیا الہیات سنسکرت ڈرامے
کالیداس اور عرب شعرا کا کلام بعض دواوین کی تالیف
جغرافیہ حفظان صحت مساحت رسالہ مقناطیس
حرکیات و سکون، علم المناظر، دینیات وغیرہ ۔

۲ ۔ دیگر انفرادی کوششین اور بالواسطہ عوامل

دیگر عوامل جن سے ہماری زبان اور علوم کو فروغ نصیب ہوا چھاپہ خانون کا قیام اخبارات کی اشاعت اور بعض اشخاص کی انفرادی کوششین ہین ۔

شمالی ہند مین سب سے پہلے بنگال کے مبلغ پادریون (مشنریون) نے چھاپہ خانے قائم کیے ۔[۲] مقصد یہ تھا کہ مختصر رسائل اور کتابچے چھاپ چھاپ کر دین عیسوی کی اشاعت کی جائے ۔ اس کے

(۱) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ص ۲۷۳

(۲) Legacy of India, p.388.

بعد سیرام پور کے مشنریوں نے پوری بائبل کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کر کے اسے پانچ جلدوں میں شائع کیا (۱۸۱۹ ـ ۱۸۱۶ء) ـ یہ لوگ دیسی زبان میں تقریریں بھی کرتے تھے اور ان کا یہ شیوہ آج تک جاری ہے ـ چھاپہ خانوں کی برکت سے مسلمانوں نے بھی قرآن شریف اور مذہبی رسائل و کتب چھاپ کر تبلیغ کا فریضہ انجام دیا ـ اسی صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جس کا اپنا مطبع تھا ـ[1]

ہمارے ملک میں طباعت کی تاریخ دو صدی سے زیادہ پرانی نہیں ـ اگرچہ پرتگال کے عیسائی مبلغوں نے ۱۵۵۷ء میں چوبی پلیٹوں سے مختصر رسائل چھاپنے شروع کردیے تھے مگر باقاعدہ ٹائپ کی طباعت اٹھارویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی ـ جان گلکرائسٹ کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۰۱ء میں انگریزی اخباروں کے چار چھاپہ خانوں میں فارسی اور ہندی رسم الخط کے ٹائپ کی طباعت ہوتی تھی ـ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کی بعض تالیفات کلکتہ کے مختلف مطابع سے شائع ہوئیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے :ـ[2]

مراثی مسکین سنگھاسن بتیسی قصہ چہار درویش ہرکارہ پریس سے
توتا کہانی اور اخلاق ہندی ٹیلیگراف پریس سے
مثنوی میر حسن کلکتہ گزٹ پریس سے ـ

اخباروں کی روز افزوں اشاعت نیز سیرام پور اور غازی پور کے عیسائی مبلغوں کی سرگرمی نے طباعت کو بڑی ترقی دی ـ دسمبر ۱۸۲۳ء میں پریس آرڈی نینس نے چھاپہ خانوں پر پابندیاں عائد کیں مگر اس کے باوجود یہ مفید فن ترقی کرتا رہا ـ ۱۸۳۰ء میں بنگال میں صرف بنگالی زبان کے ۱۳ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے ـ ممالک متحدہ، آگرہ و اودھ میں بھی انہی دنوں بہت سے مطبع وجود میں آئے ـ

---

(۱) رام بابو سکسینہ جلد دوم ص ۱۸

۲ـ عتیق الرحمٰن ہندوستانی اخبار نویسی ص ۶۹

۱۸۳۲ء مین مسٹر سیموئیل گرینو نے کانپور مین انگریزی چھاپہ خانہ قائم کیا ۔ میرٹھ اور آگرہ مین بھی اخبارون کے مطابع قائم ہوئے ۔ دھلی سے سید محمد باقر کا اردو اخبار ۱۸۳۸ء مین اور سید الاخبار ۱۸۳۷ء مین جاری ہوئے ۔ ۱۸۲۸ء مین بنارس مین کئی چھاپہ خانے قائم ہوئے ۔ کانپور مین مسٹر آرچر نے لیتھو کا مطبع قائم کیا تھا جس کی شہرت سن کر نواب غازی الدین حیدر نے موصوف کو لکھنؤ بلا لیا اور شاہی مطبع کا مہتمم مقرر کیا ۔ چنانچہ ہفت قلزم اور مناقب حیدری انہی کی زیر نگرانی طبع ہوئین ۔ انیسوین صدی کے نصف آخر مین منشی نولکشور کے کانپور اور لکھنؤ والے مطبعون نے اس سرگرمی اور خلوص سے کام کیا کہ ہزارون پرانی قلمی کتابین طبع ہوئین جن کی بدولت ہمارے علوم و فنون بالخصوص اسلامی علوم محفوظ ہوگئے ۔ پنجاب اس معاملے مین ذرا پیچھے رہا ۔ ۱۸۴۰ء کے قریب لدھیانہ مین امریکی مبلغون نے اپنے رسائل چھاپے ۔ ۱۸۵۰ء مین منشی ہرسکھ رائے کا مطبع کوہ نور وجود مین آیا انہی دنون جنوبی ھند مین مدراس کے مقام پر کئی مطبع قائم ہوئے (استفادات از ھندوستانی اخبار نویسی مصنفہ عتیق الرحمن انجمن ترقی اردو ھند)

ان دنون دیسی حکومتون مین سب سے زیادہ امن و سکون شاہان اودھ کے علاقے مین تھا ۔ یہ حکومت کمزور سہی مگر تمام بیرونی ھنگامون سے محفوظ تھی ۔ یہان غازی الدین حیدر کے عہد مین (۱۸۱۴ ۔ ۱۸۲۷ء) تکلف کے ساتھ ٹائپ کا مطبع دارالسلطنت لکھنؤ مین قائم ہوا جس مین سب سے پہلے ہفت قلزم چھپی ۔ اسی زمانے کے قریب آرچر صاحب نے کانپور مین لیتھو کا مطبع قائم کیا اور پھر نصیرالدین حیدر (۱۸۲۷ ۔ ۱۸۳۷ء) کے حکم سے لکھنؤ مین بھی ایک مطبع کھولا ۔ اور چھاپے خانے بھی کھلے ۔ ۱۸۴۸ء مین لیتھو کے چھوٹے بڑے مطبعون کی تعداد بارہ تھی جن مین مطبع مصطفائی(1)

---

(1) رام بابو سکسینہ حصہ دوم ص ۳۶

شامل تھا ۔ دھلی اور لاھور نسبتاً بعد مین جاگے اور یہان کے چھاپہ خانون نے خاص طور پر اخبارون کے ذریعے اشاعت زبان کا حق ادا کیا چنانچہ دھلی کے مطبع سلطانی سے سراج الاخبار (۱۸۴۳ ء) (۱) مولوی محمد باقر (والد محمد حسین آزاد) کا اردو اخبار (۱۸۳۵ ء) اور لاھور سے جام جہان نما (۱۸۲۲ ء) شائع ھونے لگے ۔ مطبع کوہ نور لاھور (۱۸۵۰ ء) اودھ اخبار پریس (۱۸۵۸ ء) اور مطبع نولکشور کچھ بعد کی چیزین ھین ۔

انفرادی کوششون مین سید انشا اور قتیل کی مشترکہ تالیف دریائے لطافت ۱۸۰۹ ء امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدائق البلاغت ۱۸۴۲ ء محمد حسین آزاد کی جامع القواعد ۱۸۴۵ منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی ۱۸۴۶ ء رجب علی بیگ کا فسانۂ عجائب اس کے جواب الجواب اور دیگر ادیبون اور شاعرون کی تالیفات شامل ھین ۔ لطف کی بات یہ ھے کہ اس صدی کے نصف اول مین جہان دھلی اور لکھنؤ کے ادباء و شعرا اردو زبان کو ترقی دے رھے تھے سات سمندر پار پیرس مین گارسان دی تاسی اس زبان کی ترویج و ترقی کا علم بلند کر رھا تھا ۔ یہ شخص عربی و ترکی کا ماھر اور اردو زبان کا عاشق تھا ۔ ~~ایسوین صدی کے عشرۂ چہارم مین ھندوستان آیا تھا اور اردو زبان سیکھی تھی ۔ فرانس واپس جاکر بھی اسے اردو سے وھی شغف رھا~~ ۔ اس کے تبحر علمی کے اعتراف کے طور پر تگال سوسائٹی اور ھندوستان نے خطابات اور سپاس نامے پیش کیے ۔ فرانس کی مجلس عالیہ نے اپنی رکنیت سے سرفراز کیا ۔ روس لندن اور کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کا رکن بنا ۔ اس کے شاگردون مین انگریز فرانسیسی اور اطالوی سبھی شامل تھے ۔ دی تاسی نے منطق الطیر آثار الصنادید شگفتہ باغ و بہار اخوان الصفا کا فرانسیسی مین ترجمہ کیا تھا ۔ اردو کے اس سرگرم مبلغ کے خطبات و رسائل فرانسیسی

---

(۱) منشورات کیفی ص ۱۱۲

زبان مین شائع ہوتی تھے - اسے اردو سے اتنا شغف تھا کہ جو کتابین رسائل اور پوتھین یہان چھپتی تھین ان مین سے اکثر کے نسخے اسے پیرس مین پہنچ جاتے تھے[1] - گارسان دی تاسی کے خطبات جو اس نے پیرس وغیرہ مین پڑھے انجمن ترقی اردو ھند نے ترجمہ کرکے شائع کیے ھین -

---

[1] حامد حسن قادری داستان تاریخ اردو ص ۳۵

۲ ـ سماجی اصلاحـیـن

انیسوین صدی کے آغاز مین کچھ ایسے مردان حق بھی خاک ہندوستان کی خاک سے اٹھے جنھون نے ہندوؤن اور مسلمانون کے غلط عقائد و رسوم کی اصلاح کی ـ راجہ رام موہن رائے کی کوششون سے ہندوؤن کے عقائد کی بہت اصلاح ہوئی ـ یہ بزرگ بنگال کے باشندے اور برہمو سماج کے بانی تھے ـ ان کی مسلسل ترغیب و تبلیغ سے ہندوؤن کو بت پرستی اور رسم ستی کی قباحتون کا احساس ہوا ـ انگریز اس وحشتناک رسم سے متنفر ضرور تھے مگر لارڈ ولیم بنٹنک نے ۱۸۳۲ء مین صرف اس وقت رسم ستی کو خلاف قانون قرار دیا جب راجہ رام موہن رائے کی پیہم تبلیغ سے ہندوؤن کے مزاج اور ذہن اس رسم کے خلاف[2]

---

(1) Legacy of India, p.292.

(۲) رام موہن رائے پچھلی صدی کے بڑے ہوشمند صاحب نظر انسان تھے جو اپنی مادری زبان بنگالی کے علاوہ فارسی عربی سنسکرت اور انگریزی مین کافی دستگاہ رکھتے تھے ـ بنگال کے ایک برہمن خاندان مین ۱۷۷۲ء مین پیدا ہوئے اور اپنے اصلاحی عقائد کی بدولت نوجوانی ہی مین انگشت نما ہوگئے ـ بت پرستی کے خلاف فارسی زبان مین تبلیغ کی جس سے ہندوؤن کا دیندار طبقہ بہت برہم ہوا ـ تاہم یہ بت پرستی ستی اور بیہودہ رسوم کے خلاف جہاد کرتے رہے ـ ۲۳ جنوری ۱۸۳۰ء کو برہمو سماج کی بنیاد رکھی جو کفر کی تاریکی مین توحید کا چراغ اور رام موہن رائے کی نسبت سے ہندوؤن کے لئے زیادہ قابل قبول تھی ـ اسی سال اکبر شاہ ثانی نے انہین شاہی ملازمت مین لے کر راجہ کا خطاب دیا اور اپنے وکیل کی حیثیت سے اضافۂ پنشن کی درخواست کے ساتھ شاہ انگلستان کی خدمت مین بھیجا ـ یہ اس مقصد مین کامیاب ہوئے ـ اگلے سال انھون نے دارالعوام مین رسم ستی کی تنسیخ کے لئے قرارداد پیش کی ـ پیرس مین گارسان دی تاسی سے بھی ملے تھے ـ دو سال بعد لندن مین بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۸۳۳ء انتقال کیا ـ

ہموار ہوچکے تھے[1] — اس کے ساتھ ساتھ عقد بیوگان کی تحریک بھی انہی کی بدولت کامیاب ہوئی — اس طرح سماج سے ان دو قبیح رسموں کا خاتمہ ہوا جو ہندو معاشرت کو تباہ کرنے کی ذمہ دار تھیں اور جن کی بدولت طبقۂ نسواں بیوگی کی تکلیف دہ زندگی بسر کرنے یا جل کر ہلاک ہونے پر مجبور تھا —

اس دور میں مسلمان بھی اپنے عقائد و رسوم کی اصلاح پر متوجہ ہوئے — دہلی میں خانوادۂ ولی اللہی کتاب و سنّت کا علم بردار تھا اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے رہا تھا — اسی خاندان کے ایک پرجوش مرد یعنی سیّد احمد شہید اور ان کے جان نثار خلیفہ شاہ اسمعیل شہید اور شاہ عبدالحی نے تقریر و تحریر کے ذریعے مسلمانوں کی ان تباہ کن رسوم کی اصلاح کرنے کا بیڑا اٹھایا جو ہندوؤں کے ساتھ صدیوں کے میل جول کے باعث ان میں راہ پا گئی تھیں — مسلمان گھرانوں میں پیدائش سے لے کر موت تک سیکڑوں رسمیں[2] تھیں جنھیں ملکی معاشرت نے مذہب کا درجہ دے دیا تھا — پیدائش، مونڈن، چھٹی، ختنہ، بسم اللہ، تیجا، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی، نکاح، منڈھا، برات غرض مختلف تقریبوں کے اتنے لوازم تھے کہ اگر انھیں نباہا جاتا تو فضول خرچی ناداری اور قرض کا سامنا کرنا پڑتا تھا ورنہ برادری میں انگشت نمائی ہوتی تھی — شاہ اسمعیل شہید نے تقویۃ الایمان لکھ کر مسلمانوں کو ان رسوم اور شرک و بدعت سے بچنے کی تلقین کی — اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے[3] — عقد بیوگان کی ترویج کے لئے بھی ان بزرگوں نے قولاً و فعلاً[4] کوشش کی کیونکہ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی جائز بلکہ واجب کام سے گریز کرنے لگے تھے — اگرچہ بعد میں سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی پوری قوت جہاد کی طرف مڑ گئی تاہم جو کچھ ان بزرگوں نے کیا اس سے اسلامی معاشرے کی بہت سی برائیاں بڑی حد تک ختم ہوگئیں —

---

(1) (Encyclopaedia Britanica, Vol.18, p.966), Robert: History of British India, p.325, Oxford University Press 1947.

(۲) تقویۃ الایمان ص ۸۵، اصلاح رسوم ص ۲۹

(۳) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ص ۲۸۲

(۴) چنانچہ سید احمد شہید صاحب نے یہ اصلاح پہلے اپنے ہی گھر سے شروع کی تھی — دیکھئے سیرۃ ص ۸۱ —

مذہبی تحریکیں

اس سے پہلے بیان ہوچکا ہے کہ بنگال میں راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی تھی جو ہندو مذہب اور معاشرت کی اصلاح (۱) کا ادارہ تھا ۔ اس ادارے نے اپنے حسب استطاعت خاطر کام کیا اور ہنود کو بت پرستی توہم پرستی اور دیگر قبیح رسموں سے بچنے کی ترغیب دی ۔ دوسری تحریک جس نے اس صدی میں فروغ پایا آریہ سماج (۲) کی تھی ۔ جس نے ہندوؤں کو بت پرستی سے بچنے اور سرافگندگی کے بجائے سربلندی جدوجہد اور تبلیغ مذہب کا جنون بخشا ۔

مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کے دو بڑے مرکز فرنگی محل لکھنؤ اور مدرسۂ رحیمیہ یعنی مدرسۂ [illegible] خاندان ولی اللہ (دہلی) تھے ۔ فرنگی محل خالص تعلیمی درسگاہ تھی جہاں معقولات کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی اور جو تبلیغ کی طرف زیادہ راغب نہ تھی ۔ مگر ولی اللہی دائرہ جو معقولات کے بجائے کتاب و سنّت اور حدیث کی تعلیم کا مرکز تھا (۳) تبلیغی جوش سے معمور تھا ۔ فرنگی محل کے برخلاف جہاں ~~موسیقی بھی درس نظامی کا ایک جزو تھی جہاں~~ معقولات سے خاص اعتنا کی جاتی تھی یہاں قال اللہ اور قال الرسول کا غلغلہ بلند رہتا تھا ۔ دودمان ولی اللہی کے چشم و چراغ یعنی شاہ عبدالعزیز / شاہ عبدالغنی / شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے دم سے یہاں رشد و ہدایت کا چراغ روشن تھا اور یہ آستانہ دہلی کے دیندار خاندانوں (۴)

---

(۱) Legacy of India, p.292.

(۲) اس تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی تھے ۔ اصلی نام پنڈت مول شنکر ولد امبا شنکر تھا ۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک برہمن خاندان سے تھے مگر ۱۲ سال کی عمر میں بت پرستی سے تائب ہوئے ۔ باقی عمر ہندو دھرم کی اصلاح میں صرف کی ۔ بت پرستی توہمات اور رسم ستی کے خلاف تھے ۔ ۱۸۸۳ء میں وفات پائی (قاموس المشاہیر ص ۲۲۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دوم ص ۲۹۵

(۳) شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ~~[illegible]~~ ۱۲۷ (۴) آثار الصنادید جلد چہارم ص ۲۵

کا مرجع و مرکز تھا چنانچہ مومن کے والد حکیم غلام نبی خان اور خود حکیم مومن خان اس خانوادے کے معتقد تھے -

اگرچہ یہ خاندان عربی اور فارسی کا مخزن تھا مگر ان زبانون کے انحطاط اور اردو کے رواج کے پیش نظر ان بزرگون نے وقت کے بدلے ہوئے تقاضون کو پہچانا اور تبلیغ و ہدایت کے لئے زبان اردو کی طرف توجہ کی - سب سے پہلے شاہ رفیع الدین صاحب نے کلام اللہ کا اردو ترجمہ کیا جو آج بھی مقبول ہے - اس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر (۱۲۳۰ - ۱۱٦۷ ھ) نے ایک لاجواب اور جامع و مانع ترجمہ کیا (۱۸۰۳ع) اور تفسیر موضح موضح القرآن تحریر کی - شاہ اسمعیل صاحب نے اصلاح عقائد و رسوم کے لئے صراط المستقیم اور تقویت الایمان لکھین -

شمالی ہند کے طول و عرض مین یہ خانوادۂ عالی اپنی بے لاگ دینی خدمات کی بنا پر معزز و محترم تھا بے شمار مرید اس کے حلقۂ عقیدت مین داخل تھے - مگر یہان صرف ایک آتش بجان سخت کوش بزرگ کا ذکر جمیل کافی ہوگا جس نے مسلمانون مین علمی حیثیت سے دینداری کی روح پھونکی انھین کتاب و سنت کے احکام یاد دلائے اور تحریر و تقریر کے ذریعے حج ہجرت اور جہاد پر آمادہ کیا - اس غیور و جسور بزرگ کا نام سید احمد شہید ہے -

سید صاحب رائے بریلی مین بتاریخ ۲۹ نومبر ۱۷۸٦ء پیدا ہوئے[(۱)] - علم و فضل ان کے خاندان مین موروثی تھا مگر تکمیل کے لئے نوجوانی مین دہلی کا سفر اختیار کیا اور مدرسۂ رحیمیہ مین داخل ہوکر شاہ عبدالعزیز اور دیگر اکابر سے علوم ظاہر و باطن کی تحصیل کرتے رہے - پھر کچھ عرصے بعد امیرخان کی فوج مین شامل ہوگئے جو اس وقت میوات اور راجپوتانے کے جنوبی مشرقی علاقون پر قابض تھا - امیرخان کی باقاعدہ حکومت نہ تھی - آزادانہ تاخت و تاراج کیا کرتا تھا اور راجپوتانے کے غیر مسلم راجاؤن سے

---

(۱) سیرۃ سید احمد شہید از ~~مہر~~ غلام رسول مہر ص ٥٦

خراج (۱) وعشر کے بطور بے شمار دولت حاصل کرلیتا تھا ـ اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اطراف کے حکمران حتی کہ خود انگریز اس سے پہلو بچاتے اور مصالحت کے خواہان رہتے تھے ـ ۱۸۱۲ء مین اس کے پاس پچاس ہزار سوار بارہ ہزار پیادے اور بھاری توپخانہ موجود (۲) تھا ـ وہ ایک قابل قائداور بہادر سپاہی تھا ـ اس کی فوج نہایت اصلح تھی اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجون مین بہترین ساز و سامان رکھنے والی فوج سمجھی جاتی تھی (۳) ـ امیرخان بے اصول وبےترتیب ہونے کے باوجود بہت جری سپاہی تھا ـ انگریز اس عظیم الشان طاقت کو قلب ہند مین آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہوسکتے تھے ـ وہ امیرخان سے ٹکرائے نہین بلکہ جو عناصر اس کے لئے یاوری اور کمک کا سرچشمہ ہوسکتے تھے انھین ایک ایک کرکے توڑتے رہے یہان تک کہ اس کی فوج مین بھی انگریزی ریشہ دوانیان خاصی پھیل گئین ـ اس وقت انگریزون نے مصالحت کے پردے مین امیرخان کو علاقہ ٹونک کی باقاعدہ حکومت قبول کرلینے اور تاخت وتاراج سے دستبردار ہوجانے کے لئے کہا ـ امیرخان جو اپنی فوج کی بددلی یا دیگر وجوہ سے کچھ دل برداشتہ ہورہا تھا اس پیشکش کو قبول کرنے کے متعلق سوچنے لگا ـ سیداحمد صاحب اس کے مشیر ومصاحب تھے ـ انھون نے امیرخان کو بہت سمجھایا کہ اس نام نہاد حکومت کے فریب مین نہ آو اور آزادی کو غنیمت سمجھو ـ بایں ہمہ امیرخان کچھ ایسا بد دل ہوچکا تھا کہ ٹونک کی نوابی قبول کرلی اور اپنی فوج کو منتشر کردیا (۴) ـ اس نے بہت چاہا کہ سیداحمد صاحب اس کے ساتھ رہین مگر سید صاحب جو نواب کی اس خودخریدہ غلامی سے ناخوش تھے اس کے لشکر سے دہلی واپس چلے آئے (۱۸۱۶ء) (۵)

---

(۱) سیرۃ سیداحمد شہید از مہر ص ۸۹
(۲) تاریخ ہند مصنفہ مل و والسن جلد ہشتم ص ۹۲۲ بحوالۂ سیرۃ غلام رسول مہر ص ۸۹
(۳) لارڈ ہیسٹنگز اور ہندوستانی ریاستین مصنفہ موھن سہنا ص ۱۱ بحوالۂ غلام رسول مہر ص ۹۱
(۴ و ۵) سیرۃسید احمد شہید از مہر ص ۱۱۰ بہ تغیر الفاظ

اس واقعے کے بعد سید صاحب کچھ عرصہ تبلیغ و اصلاح کی خدمات انجام دیتے رہے (۱) — اسی دوران مین آپ نے حج بیت اللہ کا قصد کیا — اپنے مریدون اور عام مسلمانون مین یہ اعلان کردیا کہ جس کا جی چاہے میرے ساتھ حج کے لئے چلے — سفر اور واپسی کے جملہ اخراجات کا مین خود کفیل ہون گا —

اگرچہ سید صاحب درویش مشرب اور تہی دست تھے مگر دولت توکل سے مالا مال تھے — لوگون کو ان کے قول پر کامل اعتماد تھا — عازمین حج جوق جوق جمع ہونے لگے اور جولائی ۱۸۲۱ء مین سید صاحب وطن سے اس بے سروسامان قافلے کو لیکر نکلے (۲) — گنگا کے راستے کلکتے پہنچنے اور وہان سے جہازون مین روانہ ہونے کی تجویز تھی — الہ آباد تک پہنچتے پہنچتے اہل قافلہ کی تعداد سات سو سے متجاوز ہوگئی — اب اسے غیبی امداد کہئے یا اس دور کے مسلمانون کی دینداری کہ جہان جہان سے یہ قافلہ گذرتا وہان کے مسلمان ان کی مہمانداری کا فریضہ بڑے جوش و خروش سے انجام دیتے (۳) — مولینا غلام رسول مہر نے سیرت سید احمد شہید مین یہ حالات بڑی شرح وبسط سے بیان کئے ہین — قیام الہ آباد اور کلکتہ کی تفاصیل ملاحظہ کیجئے جس سے اندازہ ہوگا کہ اس دور کے خواص و عوام کے دل مین مذہبی تحریکون کا کتنا احترام تھا :

---

(۱) اسی زمانے مین سید صاحب کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوکر حکیم مومن خان نوجوانی کی رنگین مزاجی کے باوجود سید صاحب سے بیعت ہوئے (۱۸۱۸ء) — اگرچہ سفر حج یا جہاد مین کبھی اپنے پیرو مرشد کے (رفیق) نہ ہوئے لیکن زبان قلم سے لوگون کو ترغیب وتحریص کرکے اس مبارک تحریک کی طرف راغب کرتے رہے — ان کی جہادیہ مثنوی اس جوش و خروش کی آئینہ دار ہے —

(۲) سیرۃ سید احمد شہید از مہر ص ۱۹۰

(۳) تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت — سید ہاشمی ص ۲۷۰

" اگلے روز الہ آباد پہونچے ۔ گھاٹ پر شیخ غلام علی رئیس محمد تقی اور ان کے بھائی (۱) عبداللہ شاہ اجمل کے فرزند شاہ ابوالمعالی قلعہ الہ آباد کے داروغہ بختی میان رنجیت خان میواتی مولوی کرامت علی صدر امین حافظ اکرام الدین دھلوی حافظ نجابت علی سوداگر محمد حسین عبدالقادر شیخ سارنگ وغیرہ استقبال کے لئے موجود تھے ۔ یہ سب سید صاحب کے ارادت مند تھے ۔ لیکن شیخ غلام علی نے ھر ایک سے کہ دیا تھا کہ دوران قیام الہ آباد مین کوئی صاحب سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دین ۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا جائے ۔ ھان اپنے مکان پر لے جاکر پان کھلائین عطر لگائین نذرین پیش کرین کھانا نہ کھلائین ۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الہ آباد مین ٹھہرے رھے پورے قافلے کی مہمان نوازی شیخ غلام علی ھی نے فرمائی اور کس شان و اھتمام کے ساتھ ؟ کہ آج اسکی تفصیلات سن کر شاید اکثر لوگ سمجھین کہ خیالی افسانہ بیان ھورھا ھے ۔ (۲) حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اس کی محض سرسری کیفیت ھم تک پہنچ سکی

قیام و طعام | شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والی بنارس کے مختار تھے ۔ انھون نے سید صاحب کو ایک کوٹھی مین ٹھہرایا ۔ باقی قافلے کے لئے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی ۔ پورے قافلے کے لئے دونون وقت کا کھانا قیام گاھون پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا ؟ ایک ایک وقت مین کئی کئی چیزین تیار ھوکر آتین حلا قورما پلاؤ زردہ شیرمال تازہ شمائی خمیری روٹیان ۔ اس وقت تک ساتھیون کی تعداد ساڑھے سات سو تک پہنچ چکی تھی ۔ لیکن شیخ صاحب کے تکلف مین کوئی کمی نہ آئی ۔ اندازہ کیا گیا ھے کہ کم از کم ایک ھزار روپے روزانہ صرف کھانے پر صرف ھوتے تھے اور یہ اس زمانے کا خرچ ھے جب جنسین بےحد ارزان تھین ۔

---

(۱) اقتباس از سیرۃ سید احمد ص ۱۹۲

(۲) ایضا ص ۱۹۶

نذرین | شیخ صاحب دن مین دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لئے آتے - ایک مرتبہ بعد نماز ظہر دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب - دونون مرتبہ بیش بہا نذرین اپنے ساتھ لاتے - خلا نہایت قیمتی پارچے عمدہ بندوقین پستول اور تلوارین - بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے - واقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام مین شیخ صاحب نے اس طریق پر جو نذرین پیش کین وہ بہ حیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہونگی - (1)

سید صاحب ہتھیارون کو دیکھ کر فرماتے کہ شیخ بھائی ہم تو حج کے لئے جا رہے ہین وہان ہتھیارون کا کچھ کام نہین - واپس آکر جہاد کے لئے نکلین گے تو لے لین گے - شیخ صاحب عرض کرتے " حضرت اول تو یہ معلوم نہین کہ آپ کب اور کس جگہ سے علم جہاد بلند کرین گے دوسرے خدا جانے مین اس وقت تک زندہ رہون یا نہ رہون اور یہ آرزو دل مین رہ جائے - ابھی لے لیجئے اور جہان جی چاہے بطور امانت رکھوا دیجئے -

عازمین حج کی خدمت | اسی دوران مین شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر مین کام آئین گے - قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک جوڑی نئے جوتے مردون کو دو دو پاجامے دو دو انگرکھے دو دو ٹوپیان اور ایک ایک چادر، مستورات کو دو دو پاجامے دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیے - سب کو سر عام ایک ایک روپیہ دیا - سید صاحب کے اقربا کی خدمت مین دس دس روپے فی کس پیش کیے - علماء کی خدمت مین ان کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذرین گزرانین -

رخصتی نذرانہ | رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت مین جو سامان لائے وہ بیس پچیس کشتیون مین لگا ہوا تھا - اس مین مشروع کمخواب پشمینے نینو ڈھاکے کی ململ ململ محمودی بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری شال بھی - ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے - دو

---

(1) سیرۃ سید احمد ص ۱۹۶

نہایت خوبصورت مطلّا اور مذہب قرآن مجید نذر کیے - ایک مکہ معظمہ کے لئے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لئے - تمام اہل قافلہ کے لئے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے - جس میں ایک سو بیس تھان صرف ہوئے - دو سو چالیس تھان گاڑھے کے ان کے علاوہ تھے - تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں - سید صاحب کی بی بیوں یا اقربا کے لئے جو پارچے تیار کرائے ہوں گے ان کی کیفیت معلوم نہ ہوسکی"[1] -

<u>کلکتے کے ہدایا</u> | کلکتے کے والوں کے تحائف و ہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوسکا[2] - اس کی سرسری کیفیت یہ ہے -

۱ - منشی امین الدین - پانچ ہزار نقد - تین سو جوڑے جوتے - چار گٹھڑی کپڑے - ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا ململ وغیرہ دوسرے میں سوسی اور چھینٹ کے تھان باقی گٹھڑیوں میں مڑا کپڑا دو نہایت خوب صورت گھوڑیاں - پانچ ہزار روپے اس غرض سے پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقاء کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کرکے بازار سے کھایا ہو - پانسو احرام دیے -

۲ - امام بخش سوداگر - تین سو روپے بیس اشرفیاں پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے دو شیشیاں عطر کی جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا - ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے بہ اصرار واپس کر دیا -

۳ - غلام حسین تاجر - چار جہاز پورے سامان رسد سمیت نذر کیے - چونکہ انتظام ہوچکا تھا اس لئے سید صاحب نے یہ نذر بہ شکریہ واپس کردی - غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کردیا - یقین ہے بڑی رقم بھی دی ہوگی - اس کا ذکر کہیں نہیں آیا - ایک کوٹھی نذر کی جو سید صاحب نے اسے واپس دے دی مراجعت پر سید صاحب اسی کے ہاں ٹھہرے تھے -

(۱) سیرۃ سید احمد شہید ص ۲۲۱ (۲) اقتباس از سیرۃ سید احمد شہید ص ۲۲۱ تا ۲۲۳

۲۔ شیخ رضائی سعد الدین ناخدا منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چارسو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہوچکے ہیں عمرے کے لئے باندھے جائیں ۔ ہمارے احرام حج کے لئے استعمال کیے جائیں ۔

سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دیدیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو اسے تین جوڑے نئے بنوادئے جائیں ۔ باقی لوگوں کے لئے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کردیاجائے چنانچہ ایک سو کو تین تین جوڑے اور بقیہ کے لئے دو دو جوڑے سلوادیے گئے ۔(۱)

اس قافلے کو سفر حج میں تین سال لگ گئے ۔ ۱۸۲۲ء میں بہ خیروعافیت واپسی ہوئی اور ہر شخص اپنے گھر واپس پہنچا ۔ سفر میں نیز دوران قیام مکہ میں سید صاحب نے مختلف ممالک کے اہل الرائے سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا(۲) اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلمانان ہند میں شوق جہاد پیدا نہ ہو وہ کسی نہ کسی غیر مسلم طاقت کے محکوم رہیں گے ۔ اس خیال کو جامۂ عمل پہنانا آسان نہ تھا ۔ انگریز بنگال سے لے کر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ تک چھا چکے تھے ۔ پنجاب پر سکھ قابض تھے ۔ دکن میں مرہٹوں کی عملداری تھی ۔ اسلام کا آخری شہباز یعنی امیر خان جس سے سید صاحب کی امیدیں وابستہ تھیں اپنے پر و بال نچواکر ٹونک کی حدود میں خانہ نشین ہوچکا تھا ۔ کسی طرف سے مالی یا فوجی امداد ملنے کی صورت نہ تھی ۔

اس کے باوجود سید صاحب اپنے ارادے پر قائم تھے ۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اول پنجاب کے سکھوں سے جہاد کیاجائے جو مسلمانان پنجاب پر بے پناہ مظالم توڑ رہے تھے ۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد حسب موقع مزید تجاویز پر عمل کیاجائے مگر بغیر سازو سامان کے مشرق کی طرف سے پنجاب پر

(۱) اقتباس از سیرۃ سید احمد شہید ص ۲۲۱ تا ۲۲۳

(۲) تفصیلات از سیرۃ سید احمد شہید صفحات ۲۲۲ تا ۲۳۵

حملہ کرنا ناممکن تھا — لہذا یہ طے پایا کہ رفیقوں کی مختصر جماعت کو بیوات راجپوتانہ اور سندھ و کابل سے گذار کر سرحد کے راستے سکھ فوجوں سے مقابلہ کیاجائے — انہیں پٹھانوں کی اسلامی حمیت پر بھروسا تھا اور سمجھتے تھے کہ صوبۂ سرحد اس معاملے میں ہر طرح ان کی امداد کرے گا مگر افسوس کہ یہ خیال غلط ثابت ہوا —

سید احمد صاحب نے اپنے حسب تجویز ہجرت و جہاد کا علم بلند کیا[1] اور جس طرح چار سال قبل سفر حج کے لئے بے سروسامانی سے نکلے تھے اسی طرح ۱۷ جنوری ۱۸۲٦ء کو پانچ سو مجاہدوں کی مختصر جماعت لے کر وطن سے نکلے[2] — بہیش بینی کی راہ سے اتنا انتظام ضرور کرلیا تھا کہ صوبجات متحدہ میں اپنے معتمد جان نثاروں کو اس کام پر معین کردیا تھا کہ اسلحہ اور روپے کی فراہمی و ترسیل کا سلسلہ قائم رکھیں — چنانچہ یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا[3] — غرض فتحپور گوالیار ٹونک اجمیر عمرکوٹ سے ہوتے بندیل کھنڈ کے پہاڑوں اور راجپوتانے کے ریگستان کی صعوبتیں جھیلتے حیدرآباد سندھ پہنچے — حیدرآباد سے شکارپور کوئٹہ بولان اور قندھار ہوتے ہوئے کابل میں داخل ہوئے[4] — وہاں سے کوچ کرکے ۲۰ نومبر ۱۸۲٦ء کو پشاور پہنچے — اس سفر میں مجاہدوں کے اس قافلے نے بے اندازہ مصائب برداشت کئے مگر مقصد کی دھن انہیں پست ہمت یا درماندہ ہونے کے بجائے آگے بڑھےبڑھنے کی ہمت بخشتی تھی — ایک قلندر کا ولولہ تھا جو سبھوں کو

ع   عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

لئے جارہا تھا سوادی شوق کے یہ مسافر[5] مصائب کی جن منزلوں سے گذر رہے تھے وہ ان کی شان عزیمت

(۱) رنگین مزاج مومن اپنے پیر کے ساتھ جہاد بالسیف میں تو شریک نہ ہوئے مگر جہاد بالقلم کا حق ادا کرتے رہے اور اپنے اشعار سے مجاہدوں کی روح گرماتے رہے — ایک قطعے کے مقطع میں سید صاحب کے خروج کی تاریخ بھی کہی ہے؎

وہ شاہ سلک ایمان کہ جس کا سال خروج
امام برحق مہدی نشان علی فر ہے
۱۲۴۱ھ

(۲) سیرۃ ص ۲۸٦
(۳) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت — سید ہاشمی ص ۲۹۰
(۴) سیرۃ سید احمد شہید ص ۳۲۱
(۵) سوانح احمدی میں اس پہلے قافلے کی تعداد دو ہزار لکھی ہے ص ۱۳۹

کی آئینہ دار تھین اور شاید ان خطرناک مہمات کی تربیت گاہ تھین جن سے اس قدوسی جماعت کو آئندہ دوچار ہونا تھا ۔

آگے طے دریائے الفت مین نہ جانے کیا ہو
چین جبین یار ہے جو موج ہے ساحل کے پاس

" اب آپ اس سفر پر ایک نظر پھر ڈال لین ۔ جس مین کم و بیش دس مہینے بسر ہوئے ۔ اور مسافت ڈھائی تین هزار میل سے کم نہ ہوگی ۔ رائے بریلی سے بندھیل کھنڈ ہوتے ہوئے گوالیار اور ٹونک پہنچے ۔ پھر راجپوتانے کے بے آب و گیاہ ریگ زار طے کیے (۱) ۔ جنوب مشرق سے سندھ مین داخل ہوئے تو شمال مغرب سے باہر نکلے ۔ اس کے بعد بلوچستان کا صحرائی علاقہ قیامت خیز گرمی پھر خشک پہاڑ، خطرناک درے دشوار گذار گھاٹیان اکثر کھانے کی تکلیف پانی کی قلت زیادہ تر حواتر سفر بیشتر غازی پیدل ان تمام مقامات مین سے سفر کی مشکلات کا اندازہ آج کے حالات کی بناء پر نہین بلکہ سوا سو سال پیشتر کے حالات کی بناء پر کرنا چاہئے ۔ تاریخ ہند کے اوراق کو خوب کھنگال لو اور پھر بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی جماعت مل سکتی ہے جس نے احیاء دین اعلاء کلمۃ الحق اور آزادی بلاد مسلمین کے لئے ایسی صعوبتین دلی عشق و شیفتگی کے ساتھ قبول کی ہون ۔ جس طرح سید صاحب کی جماعت نے قبول کین ؟ اس ساری مدت مین ایک شخص کی زبان پر بھی کبھی حرف شکایت نہ آیا ۔ راحت و آسائش کو چھوڑ کر اذیتون کے مواج سمندر مین کود پڑنے پر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو پشیمانی نہ ہوئی ۔ یہ تھی وہ قدوسی جماعت جسے سید صاحب نے چند برسون مین تیار کیا ۔ یہ تھی وہ جماعت جسے ہم سوا سو برس تک یا تو مجانین کا گروہ سمجھتے رہے یا دینداری کی رگ جوش مین آئی تو تکفیر کے تیر اس پر برسانے لگے ۔ یا بدرجہ آخر اسے ناقابل توجہ قرار دے لیا ۔ حالانکہ

(۱) آغشتہ ایم ہر سر خارے بہ خون دل   قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

اس تاج عزیز کو ہزار سالہ اسلامیت ہند کا سرجوش سمجھنا چاہئے - اگر اس تاج کو اپنے دامن سے نکال پھینکیں تو تاج وتخت یا مادی عظمت و جبروت کے لئے ایک ہنگامۂ مسلسل کے سوا ہمارے پاس کیا رہ جاتا ہے ؟ اسی ہنگامے کی ہمہ سوز آگ آخر ہمارے تاج وتخت اور عظمت و جبروت کو بھی خاکستر بنا گئی " -(۱)

پشاور پہنچنے کے بعد چار سال پیہم رنجیت سنگھ کے لشکروں سے محاربات مین گزرے(۲)- اس عرصے مین لشکر اسلام نے جس کی تعداد اب ایک ہزار ہزار سے زیادہ ہی رہنے لگی تھی سکھ نوجون کو جو ہری سنگھ نلوہ اور جنرل ونطوراکی کمان مین آتی تھین کئی بار شکست دی - بعض مواقع پر شب خون مار مار کر غنیم کو تباہ کیا - کبھی کھلے میدان مین کئی گنا لشکر کو پسپا کیا -(۳) مجاہدون کی شیردلی کا یہ عالم تھا کہ کبھی باقاعدہ فوج کی صورت مین کبھی دس بارہ کی ٹولیون مین اور کبھی محض تنہا لڑ دشمن سے بھڑ جاتے تھے(۴) اور تائید ایزدی سے مظفر و منصور ہوکر واپس آتے تھے - واپس آتے تھے اور سید صاحب سے خوشنودی کا پروانہ حاصل کرکے سرخرو ہوتے تھے - بعض جانباز ایسے بھی تھے جو بے خوف و ہراس دشمن کے لشکر مین اس طرح ڈوبے کہ پھر حوض کوثر ہی پر نکلے - ان سب کے دلون

---

(۱) اقتباس از سیرۃ سید احمد شہید ص ۳۵۱

(۲) Cumighan: History of Sikhs, p.185-189.

(۳) کپتان سی ایم ویڈ پولیٹیکل اسسٹنٹ دربار رنجیت سنگھ کا مکتوب بنام ایچ پرنسپ سیکرٹری گورنر جنرل از کیمپ دسوہہ مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۳۱ء - ان سرفروشون کی جانبازی کا یہ عالم تھا کہ کنور شیر سنگھ بار بار ان کی قلیل جماعت سے زک اٹھاتا تھا اور بعض معرکون مین کئی کئی سو مقتول اور زخمی میدان مین چھوڑ کر ہٹنے پر مجبور ہوتا تھا - لڑائی سے پہلے اپنے درباری نجومیون شنکرناتھ اور مدھ سودھن سے فال اور مشورے طلب کرتا اور پھر بھی سید صاحب کے مجاہدون کی مختصر جماعت سے شکست کھاتا تھا -

(۴) کپتان ویڈ کا خط بنام ریزیڈنٹ دہلی مورخہ ۱۳ / ستمبر ۱۸۳۰ء

میں ولولہ موج زن تھا جوان کے آتشین نفس قائد کی روح کو گرما رہا تھا[1] اور جس کا اظہار بعض مواقع پر ان کی شان عزم و استقلال کو اس طرح نمایاں کرتا تھا:

" مفلس بن جاؤں یا دولت مند منصب سلطنت پر پہنچ جاؤں یا کسی کی رعیت بن جاؤں — بزدلی کی تہمت لگے یا شجاعت کی ستائش کی جائے — میدان جہاد سے کامیاب ہوکر زندہ لوٹوں یا شہید ہوجاؤں اگر میں دیکھوں کہ میرے مولا کی رضا اسی میں ہے کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تنہا میدان جنگ میں آؤں تو خدا کی قسم دل و جان سے تنہا سینہ سپر ہوجاؤں گا اور لشکروں کے ہجوم میں گھستے وقت دل میں ذرا سا بھی کھٹکا نہ ہوگا — "

" مجھے نہ بہادری جتانا مقصود ہے نہ ریاست حاصل کرنا چاہتا ہوں — اس کا ثبوت یوں مل سکتا ہے کہ (سکھوں کے) بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں میں سے جو شخص دین محمدی کو قبول کرے میں سو زبان سے اس کی مردانگی کا اعتراف و اظہار کروں گا — اور ہزار جان سے اس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا — جب آپ اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں کوئی عذر و حیلہ روا نہیں رکھتے حالانکہ وہ آپ جیسا انسان ہے بلکہ آپ کی برادری میں سے ہے تو میں احکم الحاکمین کے فرمانوں کی بجا آوری میں کیوں کر عذر کرسکتا ہوں — حالانکہ وہ تمام انسانوں کا خالق ہے اور سارے جہان اسی نے بنائے ہیں " —[2]

اس عزیمت میں ان کے سرفروش مجاہد برابر کے شریک تھے — ان میں سے کسی ایک نے بھی عزم و استقلال کی کمی نہ دکھائی — مایوسی ناکامی فاقہ کشی بے سروسامانی[3] پٹھانوں کی عین موقعے پر

---

(۱) اسی جانبازی کی بدولت مجاہدوں کی یہ مختصر جماعت اکتوبر ۱۸۳۰ء میں پشاور پر قابض ہوگئی — رنجیت سنگھ اتنا مضطرب ہوا کہ صوبہ سرحد کا کچھ علاقہ دے کر سید صاحب سے صلح کرنے پر آمادہ ہوگیا — مکتوب سی ایم ویڈ — مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۳۰ء

(۲) سیرۃ سید احمد شہید ص ۳۸۷

(۳) کپتان ویڈ — پولیٹیکل اسسٹنٹ دربار رنجیت سنگھ کا خط مورخہ ۱۹ مئی ۱۸۳۱ء بنام ریزیڈنٹ دہلی

دغابازی دشمن کی ناگہانی یورش کسی موقع پر ان کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی ۔ معرکۂ شیدو میں گودڑی شہزادے نے جس استقلال سے باقاعدہ پسپائی کی ہے اس کی تفصیل پڑھئے اور سوچئے کہ کیا زینوفن کے دس ہزار کی یا انطونی، ہنی بال، اور نپولین کے لشکروں کی پسپائی اس سے زیادہ شاندار داستانیں سنا سکتی ہے ۔

گودڑی شہزادے کی شہادت | " جو غازی یورش کر کے سکھ لشکر گاہ تک چلے گئے تھے یا خار بندی سے گذر کر لشکر گاہ کے اندر پہنچ گئے تھے ۔ انھوں نے اپنے پیچھے فرار کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گئے ہوں گے ۔ انہیں یقینا معلوم نہ ہوگا کہ کیا صورت پیش آئی ۔ میرا خیال ہے کہ اسی عالم حیرت میں وہ پیچھے ہٹے ۔ سکھوں کے ایک جیش نے درانیوں کا تعاقب کیا ۔ دوسرے نے ستہ والوں کا پیچھا کیا ۔ باقی کوئی گروہ کہیں نہ ٹھہر سکا ۔ صرف گودڑی شہزادے نے بھاگنا گوارا نہ کیا ۔ سکھ لشکر گاہ سے پیچھے ہٹ کر شیدو گاؤں میں مورچا قائم کرلیا (1) ۔ سکھوں نے پورا زور لگایا لیکن بہادر شہزادے نے مقابلہ نہ چھوڑا ۔ جب شیدو پر سکھوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو وہ لڑتا ہوا قدم بہ قدم گاؤں سے باہر نکلا ۔ ایک ایک ساتھی شہید ہوتا رہا اور شہزادہ پیچھے کی طرف ہٹتا گیا ۔ جب قبرستان میں پہنچا تو خود بھی خون شہادت میں تیرتا ہوا مالک حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا ۔ یاد ہوگا کہ ڈیڑھ دو مہینے پیشتر سید صاحب کی بیعت کی تھی تو کہا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا ۔ شیدو کے میدان میں اس صادق العہد نے اپنے اس پیمان پر خون شہادت سے مہر لگادی ۔ اداء فرض کی سرخروئی کا یہی درجہ علیا ہے جو ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہئے ۔"

---

(1) انھی جانبازوں کی جرأت نے رنجیت سنگھ کو اتنا مضطرب کر رکھا تھا کہ ہر سپہ سالار کو انعام و اکرام کا لالچ دے دے کر حوصلہ بڑھاتا تھا (مکتوب کپتان ویڈ مورخہ ۱۵ جون ۱۸۳۰ء بنام مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی ۔

منظورہ مین ہے :

شجاعت رستمانہ نمودہ تسنہا بسیارے را بے سر ساخت ۰۰۰۰۰ وباجماعت خود کانہم بنیان مرصوص قدم فشردہ داد شجاعت داد وثمن جنت گرفتہ جان بہ جان آفرین سپرد ۔

رستمانہ شجاعت سے کام لیتے ہوئے بہت سے دشمنون کو موت کے گھاٹ اتارا ۰۰۰۰۰۰۰ اپنی جماعت کے ساتھ جو استقامت مین سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی حیثیت رکھتی تھی قدم جماکر داد شجاعت دی اور جنت لےکرجان کو جان آفرین کے حوالے کیا ۔" (۱)

دوسرے معرکون مین بھی ان سرفروش مجاہدون نے ایسی ہی رستمانہ شجاعت دکھائی ۔معرکہ مایار مین سید ابومحمد عبدالرحمن اور رسالدار عبدالحمید نے جس طرح جان دی اس سےاس والہیت و شیفتگی کا اندازہ لگائیے جو ان غریب الوطن جانباز مجاہدون کو اپنے قائد سے تھی جس کی ماتحتی مین وہ کلمۃ الحق کو سربلند کرنے کے لئے اپنے گھر سے ہزارون میل دور خون شہادت مین غلطان ہوئے ۔ :

" قاضی گل احمد الدین پشاوری کا بیان ہے کہ مین موضع شیو سے سوار ہوکر سید صاحب کے پاس تورو جا رہا تھا ۔توپون کی آواز سنی تو مین نے جانا کہ لڑائی شروع ہوگئی ۔لڑائی مین شریک ہونے کی غرض سے گھوڑے کو ایڑ لگائی ۔مایار پہنچا تو درانی شکست کھاکر میدان سے جاچکے تھے ۔ مولوی مظہر علی صاحب کو مجروحین و شہداء کی لاشین اٹھوانے کا حکم ہوا ۔سید صاحب نے مجھے بھی فرمایا کہ مولوی مظہر علی صاحب کے ساتھ جاؤ ۔مین نے میدان مین پھرتے پھرتے ایک جگہ سید ابومحمد کو زخمی پڑے ہوئے دیکھا ۔زخم ایسے کاری کہ جان تو ان مین تھی لیکن ہوش حواس بجا نہ تھے ۔

---

(۱) اقتباس از سیرۃ سید احمد شہید ص ۳۹۵

مین نے کئی بار ان کے کان مین پکار کر کہا ــ " سید ابومحمد ! حضرت امیرالمومنین کو فتح حاصل ہوئی" وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے اور " الحمدللہ " کہ رہے تھے ــ مجھے کچھ جواب نہ دیا ــ مین نے ساتھیون کو آواز دی ــ کمبل مین رکھ کر انہین اٹھالیا ــ کچھ دیر بعد جان بحق ہوگئے ــ (۱)

عبدالرحمن دکنی | عبدالرحمن دکنی سوارون مین تھے ــ یہ اعلی درجے کے پھکیت اور بھرمار تھے جب سید صاحب کے سوار درانیون کے ہجوم مین بکھر کر پیچھے ہٹے تو عبدالرحمن اپنی جگہ پر جمے ہوئے ڈٹ کر دشمنون کا مقابلہ کرتے رہے ــ کچھ دیر تک گھوڑے پر بیٹھے بندوق کے فائر کرتے رہے پھر اتر بیٹھے اور پیدل ہوکر قواعد بھرماری سے بندوق مارنے لگے ــ آٹھ نو درانی سوارون نے انہین نرغے مین لے لیا ــ آخر بہادر عبدالرحمن نے بندوق چھوڑ کر تلوار سنبھال لی ــ تنہا نو دس سوارون کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے رہے کہ اکثر کو زخمی کیا اور خود محفوظ رہے ــ ایک درانی سوار نے تاک کر پیچھے سے نیزہ مارا ــ یہ گرے تو اس نے تلوار سے سر قلم کر ڈالا ــ " (۲)

" رسالدار عبدالحمید خان کو بلا حکم حملے کی اجازت نہ تھی ــ جب حاجی عبدالرحیم خان نے سید صاحب کے ساتھ محبت و عقیدت کے جوش مین خود حملہ کردیا اور ان کے آس پاس کے سوار بھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے پیچھے چلے تو مولوی احمداللہ ناگپوری محمد سعید خان عظیم آبادی قاضی مدنی وغیرہ جو رسالدار کے قریب کھڑے تھے سمجھے کہ حملے کا حکم ہوچکا ہے ــ اس پر رسالدار نے بھی حملہ کردیا ــ ان کے پاس دو گھوڑے تھے ایک سبزہ رنگ دوسرا سمند ــ دونون پر باری باری سوار ہوتے تھے ــ جنگ مایار کے دن سمند کی باری تھی جس طرف باگ اٹھاکر جاتے صفون کو چیر کر رکھ دیتے ــ پاس کے لوگون نے بعد مین بیان کیا کہ بار بار کہتے تھے کاش! آج سبزہ گھوڑے کی باری

---

(۱) سیرۃ سید احمد شہید ص ۲۰۵

(۲) من از بیگانگان ہرگز نہ نالم ــ اپنون کی یہ غداری لشکر اسلام کو کمزور کرتی رہی تاآنکہ نومبر ۱۸۳۰ء مین یوسف زئیون نے اپنا خون آشام منصوبہ مکمل کرکے سید صاحب کے رفیقون کا قتل عام کیا جس کی تفصیل کپتان ویڈ نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۷ نومبر ۱۸۳۰ء مین تحریر کی ہے ــ

ھوتی تو دل کا ارمان نکل جاتا ۔ تین چار مرتبہ ساتھیون کو لیکر درآنیون مین گھسے اور تلوارین مارتے ہوئے ان کی صفون سے پار نکل گئے ۔ رسالدار کے بھی کی حلکے سے زخم لگے لیکن آپ نے کچھ خیال نہ کیا اور برابر حلے کرتے رہے ۔ جب زخمون سے چور ہوگئے تو گھوڑے سے گر پڑے ۔ جسم ذرا فربہ تھا زرہ کی کڑیان گوشت مین گھس گئی تھین ۔ راوی کا بیان ہے کہ انہین میدان سے اٹھاکر ملیار لائے تو جس کی نظر محبوب رسالدار پر پڑتی بے اختیار اشکبار ہوجاتا ۔ لیکن خود رسالدار بالکل صابر و شاکر تھا ۔ ایک مرتبہ بھی تکلیف کا کوئی کلمہ زبان پر نہ آیا ۔ پھر تورو مین وفات پائی ۔"[1]

جانبازی کا یہی جذبہ سیداحمد صاحب کے دست راست شاہ اسمعیل شہید مین تھا ۔ معرکۂ بالا کوٹ مین جوان مجاہدون کا " تھرماپلی " تھا جب مرگ و ہلاکت کی تصویر صاف نظر آرہی تھی آپ نے میدان جنگ مین ہلاس سونگھ کر ڈبیا کو پھینک دیا اور اطمینان سے کہا کہ یہ ہماری آخری ہلاس ہے ۔ چند گھنٹے بعد برستی گولیون کی آگ مین داد شجاعت دیتے ہوئے شربت شہادت پیا ۔[2] اللہ اکبر ! کیا قدوسی جماعت تھی اور کیا ملکوتی جذبہ تھا ؎

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا اجرے دھد این عاشقان پاک طینت را

یہ محاربات چار سال تک جاری رہے ۔ بالآخر ٦ مئی ١٨٣١ء کو معرکۂ بالا کوٹ مین پٹھانون کی غداری کے باعث[3] لشکر اسلام اس طرح برباد ہوا کہ صرف تھوڑے سے جانباز باقی بچے ۔ سید احمد صاحب اور شاہ اسمعیل شہید ہوگئے اور اس طرح یہ تحریک غیر معین عرصے کے لئے دب

---

(١) اقتباس از سیرۃ سیداحمد شہید ص ٢٥٣

(٢) ایضا ص ٢١٧

(٣) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ١٧٢ ٢٩٨ سیرۃ سید احمد شہید ص ٢١٩

گئی ۔ باقی ماندہ مجاہد بار بار جمع ہوکر مقابلے کرتے رہے مگر اصلی قوت اور تحریک کے قائد ختم ہوچکے تھے لہذا یہ مجادلے اس آگ کی چنگاریاں تھیں جو چار سال تک بھڑک کر خاموش ہوچکی تھی اور اب صرف چند شرارے اس کی راکھ میں باقی رہ گئے تھے ۔ (١) (٢)

بایں ہمہ سید احمد اور شاہ اسمعیل شہید کی روشن کی ہوئی آگ بجھتے بجھتے اپنا جلوہ دکھاتی رہی ۔ واقعۂ بالاکوٹ کے بعد تیس سال تک باقی ماندہ مجاہد اور ان کی نسلیں اپنے سرفروش اسلاف کی امانت کو سینے سے لگائے رہیں اور انگریزوں سے جہاد کرتی رہیں ۔ ان لوگوں نے ستانہ اور ٹوپی پر حملے کئے اور سر نیول چیمبرلین کی مہم امبیلا (١٨٦٣ ء) کو بے پناہ ساز و سامان کے باوجود ناکام بنا دیا ۔ بقول ولیم ھنٹر "یہ لوگ مذہبی تعصب کی بنا پر قبائل کو بھڑکاتے تھے ۔ انھوں نے تین بار قبائل کی بڑے پیمانے پر جتھہ بندی کی اور انگریزوں کو بڑی بھاری اور مہنگی جنگوں میں مبتلا کیا" بالآخر انگریزوں کی حکمت عملی نے جوڑ توڑ اور زر پاشیوں کے ذریعے نیز اندرون ملک میں وھابی مقدمات چلا چلا کر اس تحریک کو ختم کیا ۔

بہار اور یوپی کے مسلمانوں کو آخر تک اس تحریک سے قلبی تعلق رہا ۔ بالاکوٹ کی تباہ کن شکست کے بعد بھی وہ بدستور چوری چھپے مجاہدوں کو روپیہ بھیجتے رہے ۔ اس طرح جو لوگ عملی طور پر شریک نہیں ہوسکتے تھے وہ مالی اعتبار سے معاون تھے اور جو طبقہ اس سے بھی قاصر تھا وہ بہی خواہی اور خیر طلبی سے حق امانت ادا کرتا تھا ۔ شعراء دعائیہ قصیدوں اور ہمت افزا نظموں سے مجاہدوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ مومن کا یہ مقطع پڑھئے اور اس شعلۂ شوق کی

---

(١) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ص ٣١٢

(٢) سیرۃ ص ٢٣٠

لپک دیکھئے جو ہمارے کوچہ گرد حسن پرست شاعر کے دل میں رقصاں تھا —

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے

جلد مومن لے پہنچ اس مہدی دوران تلک

اس جائزے سے یہ اندازہ لگانا سہل ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی شمالی ہند میں علمی مذہبی اور سیاسی تحریکات فروغ پانے لگی تھیں — اٹھارویں صدی کے برعکس جو مصائب تباہی آشوب و انتشار اور جمود کا بھیانک خواب تھی انیسویں صدی امن و اطمینان عزم و ہمت اصلاح و تجدید اور تعمیر و ترقی کا زریں دور ثابت ہوئی — عوام بے کھٹکے اپنے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے تھے —(۱) کاروبار زراعت و تجارت میں دوبارہ پائداری پیدا ہوچکی تھی — انگریزی استعماری کوششوں کے باوجود لوگوں پر معاش و اطمینان کے دروازے کھلتے جارہے تھے (۲) — اس دور کی مختلف مذہبی سیاسی اور علمی تحریکیں اس تغیر عظیم کا پتہ دیتی ہیں (۳) جو اہل ہند کے مزاج میں رونما ہوچلا تھا — فعالیت کی ایک رو تھی جو مختلف مظاہر حیات میں مسلسل ظہور کر رہی تھی !

---

(۱) Percsival Spear: Twilight of the Mughals, p.86.

پوری ایک صدی کی ابتری کے بعد ملکی اور مالی امور کی تنظیم ہوئی — سرچارلس مٹکاف اور سیٹن نے ۱۸۰۷ء میں بندوبست اراضی کیا — ۱۸۱۵ء میں ڈکیتی اور رہزنی کے انسداد کی تدبیر ہوئی جو لارڈ ولیم بینٹنگ کے عہد میں پورے طور پر کامیاب ہوئی ص ۹۲ — فریزر نے عدالتی نظام قائم کیا — محکمۂ تعمیرات عامہ کی داغ بیل پڑی — چنانچہ دور شاہجہانی کی نہر جمن جو نادرشاہی حملے کے بعد سے اٹی پڑی تھی ۱۸۲۰ء میں دوبارہ جاری ہوئی — ۱۸۳۰ء میں نہر جمن مشرق شرقی نکالی گئی — ص ۱۰۵ — ۱۸۲۰ء میں پختہ سڑکیں تعمیر ہوئیں ص ۱۳۷ اور انگریزوں نے اکثر شہروں میں مستقل سکونت اختیار کرلی —

(۲) تاریخ مسلمانان ہند و پاکستان از سید ہاشمی ص ۳۱۱

(۳) برٹش انڈیا از شبلی جلد دوم ص ۲۰۲ Since our Fall, p.101.

دلّی
مومن کے عہد میں

"دہلی اگرچہ اس لحاظ سے بدنصیب تھی کہ کئی بار بنی اور کئی بار لٹی ۔ مگر ثقافتی اعتبار سے جو رتبہ ہندوستان کے شہروں میں دلّی کو حاصل رہا ہے کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہوا ۔ علی الخصوص عہد شاہجہان کے بعد سے جب لال قلعہ تعمیر ہوا اور مغل تہذیب و شائستگی آگرہ سے ہٹ کر دلّی میں مرکوز ہوگئی تو دلی ہر علمی مجلس اور ادبی جوہر کا معیار بن گئی ۔ ہندوستان کی ہزار سالہ تہذیبی روایات کا ورثہ اہل دہلی کے سوا اور کسی کے پاس نہ تھا[1] ۔ تہذیبی تسلسل اور وحدت سے دہلی کی معاشرت اتنی منظم اور منضبط ہوگئی تھی کہ اسے قریب قریب مذہب کا درجہ حاصل ہوچکا تھا ۔ چنانچہ ملنے جلنے کے طریقوں نشست و برخاست دید بازدید معاملہ و مراسلہ بات چیت ملاقات و مشافہہ اور دیگر ہزاروں مراسم کے لحاظ سے دہلی کو ایسی خصوصیت اور ایک ایسا امتیاز حاصل ہوگیا تھا جو کسی اور شہر کو حاصل نہ تھا ۔ ہر بات میں سلیقہ اور آداب، ہر کام میں آئین اخلاق، زندگی میں ایک منظم وضع اور دستور کی پابندی موجود تھی ۔ مولانا حالی نے حکیم محمود خان کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں اہل دہلی کی معاشرت کے اس پہلو پر خاصی روشنی پڑتی ہے[2] "

---

(1) Twilight of Mughals, p.60.

(٢) بحث و نظر ص ٤٣ (ڈاکٹر سید عبداللہ) اقتباس

" دلی کی جان اس کی آن بان تھی — یہ ایشیائی تہذیب کے دودھ سے پلی بادشاہت کی گودون مین کھیلی علم وفن[1] نے پروان چڑھایا — راجہ بھرت سے لیکر تیموری خانوادے تک کی رنگینیان اس سرزمین پر رچتی رہین — جسے دیکھو اعلی زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ' چلتی پھرتی تصویر[2]' پشتینی شرافت' رگون مین اور رگون کے دوڑتے ہوئے خون مین بسی ہوئی — جو بات کلچر کی جان سمجھ کر اورون مین فخریہ بیان کی جاتی وہ ان کے ناخنون مین پڑی ہوئی — ہندو مسلمان بھائی بھائی تھے — دونون خواضع' ملنسار' دکھ درد کے شریک' دونون جسم و روح کے بلونت' علم و فن کے پتلے' کیا مجال جو حد سے گذرین — ایک دوسرے کا پاس مذہب بھی ملت بھی — یہ پڑھے لکھے امیر اشرافون کا طور طریق تھا — ان پڑھ اجلاف بھی انجان طور پر تمیز تہذیب کے دلارے بن گئے — گیا امیر مال مین غریب کمال مین مست تھا —

دلی کی جان اس کی آن تھی جس مین زندہ دلی کی بجلی دوڑتی چمکتی رہی — اس سے بات بات پر حسن رچا — حسن نے انداز پیدا کیا — بادشاہت نے نوازا — آب و ہوا نے بڑھایا — ادنی اعلی امیر غریب بچہ بوڑھا پڑھے لکھے ان پڑھ سب خوشباش خوش خوراک خوش مزاج بن گئے — برس کے بارہ مہینے چہل پہل رہنے لگی جب دیکھو میلے ٹھیلے سیر تماشے ناچ رنگ ہو رہے ہین — جہان اپنا پرایا اس طرح مزے اڑاتا پھرتا کہ زندگی مزے کی موج شانتی کی سوت دکھائی دیتی — "

(دلی کا آخری دیدار از وزیر حسن ص ۷ و ص ۱۱)

---

(۱) Twilight of the Mughals کا مصنف اس دور کی دہلی کو یورپ کے مہذب ترین اور سب سے زیادہ خوش اطوار شہروار سیلز سے تشبیہ دیتا ہے — ص ۸۲

(۲) اہل دہلی کے حسن اور بانکپن کا باہر والون نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے — امیر خسرو دہلی کے بتان سادہ کی تعریف مین صفحے کے صفحے سیاہ کردیتے ہین — میرتقی میر جو حسن کے انفرادی اور خارجی اوصاف بیان کرنے کے بجائے تکنیک مجرد کیفیت پیش کرنے کے عادی ہین اپنا تاثر اس طرح بیان کرتے ہین —

(۳) میلہ ٹھیلا کوئی نہ بچتا تھا — دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
کھانا پیر دل لگی نہ بچا تھا شوق — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آتی

یہ اقتباسات فراغت و سکون کے اس دور کا نقشہ پیش کرتے ہیں جب انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی سکون و آسودگی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی ـ پچاس سال کے مسلسل دور امن و امان نے ہر شخص کو مطمئن کردیا تھا ـ (۱) عالم فاضل طالب علم صنعت کار دستکار ملازم اہل حرفہ تاجر اپنے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے تھے ـ انگریزوں کے استحصالی منصوبوں کے باوجود زندگی تمام بیرونی خرخشوں سے پاک ہوکر ایک لگے بندھے نظام کی پابند تھی ـ ہر طبقے کا رہن سہن، کاروبار، مشاغل اور تفریحیں معین تھیں ـ پست و بلند امیر غریب کا فرق ہمیشہ سے ہے لیکن ہر جماعت اپنی حدود میں سکون و طمانیت محسوس کرتی تھی ـ مولوی نذیر احمد صاحب کے چھدّی بھڑبھونجے سے لیکر امرا کے گروہ تک درجہ بہ درجہ مختلف طبقے تھے جو سب اپنے اپنے حال میں مست تھے ـ لال قلعے پر تیموری پرچم بدستور لہرا رہا تھا لیکن شہر میں انگریزی عملداری تھی جسے اب برا کہئے یا بھلا، ان دنوں امن و امان طمانیت و فراغت کی پیغامبر تھی (۲) ـ لال قلعے کے اکثر ملازم بلکہ امرائے خاص اور ان کے متعلقین تک شہر میں رہتے تھے ـ

انگریز اپنی سہ صد سالہ شاہی روایات کی بدولت وقار حکومت کے تقاضوں کو کماحقہ سمجھتے تھے عدل و انصاف انتظام و احترام مذہبی رواداری کا انہیں پورا خیال تھا ـ انیسویں صدی میں جو صنعتی انقلاب یورپ میں برپا ہوا اور نت نئی ایجادات سے زندگی کا حسن جتنا نکھرا اس کا اثر ہندوستان تک پہنچنا لازمی تھا ـ یہاں کے باشندے جب بھاپ اور بجلی سے چلنے والے کارخانوں کا حال یا دیوپیکر آہنی مشینوں کی کارگذاریاں سنتے تو محوحیرت رہ جاتے ـ انھوں نے اس دیس میں عظیم الشان کارخانوں بلند بالا مشینوں جہاز سازی کے گماٹوں کو کہاں دیکھا تھا ـ بجلی کی روشنی اور دیگر برقی معجزات

(۱) تاریخ ہند شمس العلما ذکاء اللہ خان جلد نہم ص ۲٦۲

(۲) امن و امان کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۲۷ء میں غالب نے دہلی سے کلکتہ تک بارہ سو میل کا سفر گھوڑے اور کشتی کے ذریعے طے کیا ـ راستے میں جابجا ٹھہرتے، منڈیاں بھناتے، بسہولت منزل مقصود پہنچے اور دو سال بعد بہ حفاظت واپس آئے ـ

ان کے لئے موجب حیرت تھے — ریل ڈاک تار فوٹوگرافی گراموفون دیا سلائی گھڑی یہ سب چیزیں ان کی نظر میں اعجوبہ تھیں — انگریزوں کے مذہب اور معاشرت سے متنفر ہونے کے باوجود ملکی باشندے ان سے مرعوب ہوچکے تھے — اقبال حکومت الگ اپنا جادو جگا رہا تھا — ہر طرف سے امن و انتظام کی ہوا چل رہی تھی اور ہر جانب سے فتح الباب کی خبریں آرہی تھیں — اس صورت میں انگریزوں کی برتری کا اعتراف بجز کون نہ کرتا — عوام ان کی اہلیت فراست اور ملک داری کے قائل تھے — برطانوی سیاست مختلف حیلوں اور ہتھکنڈوں سے بالخصوص اپنے بے نظیر تدبر سے عوام و خواص علماء امراء اور دیسی فرمانرواؤں کو اپنے حلقۂ اطاعت میں[1] داخل کر رہی تھی — ہر کوئی ان کی عدل پروری انتظام و انضباط کا مداح اور فراست و تدبر کا معترف تھا — اگرچہ بعض علماء انگریزوں کو ملحد و بے دین کہتے اور ان کی عملداری کو کفار کی حکومت سمجھتے تھے مگر انھی میں بعض ایسے بھی تھے جو شاہ انگلستان کو ظلّ اللہ اور بادشاہ عادل قرار دیتے تھے — انتہا یہ ہے کہ ہنگامۂ غدر میں بعض عالموں نے "فتوی جہاد" پر دستخط کرنے سے انکار کردیا اور صاف کہ دیا کہ بادشاہ عادل سے جنگ کرنا جہاد[2] نہیں بلکہ بغاوت ہے —

مولوی نذیر احمد جو اپنی مختلف صلاحیتوں کے علاوہ بڑے دیدہ ور انسان تھے برطانوی حکومت کو خدا کی برکت سمجھتے تھے اور ہنگامۂ غدر ان کے نزدیک دو چار دن کے قل غپاڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا —[3]

انیسویں صدی میں انگریز کی مستاجرانہ حکومت کا جادو اس طرح سر پر چڑھ کر بول رہا تھا کہ اس ملک کے شعراء سیاست دان اور اہل الرائے حضرات انگریزوں کو غیرملکی سمجھنے کے باوجود ان سے[4]

---

(۱) برٹش انڈیا از ثلبی ص ۱۷۰
(۲) ابن الوقت ص ۱۳
(۳) ایضا ص ۳۱
(۴) بہ استثنائے مومن کہ وہ اس فرقۂ ضالّہ سے ناخوش ہیں اور جابجا اپنی کبیدگی کا اظہار کرتے ہیں —
این عیسویان بہ لب رسانند — جان من و جان آفرینش
مپرس تاچہ کنم در قصاص دین مومن — خدا بدست من انداز دین بتان فرنگ

ہر طرح تعاون کر رہے تھے اور ان کی مداحی پر فخر کرتے تھے ۔ راجہ رام موہن رائے گوپال کرشن گوکھلے، مولوی نذیر احمد، شمس العلماء آزاد، (اگرچہ اپنے باپ کے قتل کا زخم کھائے ہوئے ہیں) شمس العلماء ذکاء اللہ خان، شمس العلماء حالی، مولینا محمد اسمعیل میرٹھی، ناسخ، منیر شکوہ آبادی، شاہ نصیر سب کے سب صاحبان فرنگ کے مداح ہیں ۔ مرزا غالب جو زندگی میں حسن ترتیب اور نظم و ضبط کے عاشق تھے جابجا بڑے جوش کے ساتھ ان ایجادات ذرائع نقل و حمل حمل سازوسامان آباد شہروں اور بھرے بڑے بازاروں کا ذکر کرتے ہیں جہاں باقاعدہ تجارت کی برکت سے ملک ملک کی چیزیں (بالخصوص ان کی محبوب چیز یعنی شراب پرتگالی) مناسب قیمت پر دستیاب ہونے لگی تھیں ۔ آئین اکبری مرتبہ سرسید احمد خان صدر الصدور مراد آباد کی تقریظ میں وہ دانایان فرنگ کی خوبیاں بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں : (۱)

گر ز آئین میرود با ما سخن	چشم بکشا و درین دیر کہن
صاحبان انگلستان را نگر	شیوہ و آئین اینان را نگر
حق این قوم است آئین داشتن	کس نداند ملک بہ زین داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند	ھند را صد گونہ آئین بستہ اند
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند	حرف چون طائر بہ پرواز آورند (گراموفون)
ہین نمی بینی کہ این دانا گروہ	در دو دم آرند حرف از صد کروہ (تار)
آتشے کز سنگ بیرون آورند	این ہنرمندان ز خس چون آورند (دیاسلائی)
تا چرا فسون خواندہ اند اینان بر آب	دود کشتی را ہمی راند در آب (جہاز)
رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ	شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ (بجلی)

(۱) کلیات غالب فارسی ص ۱۱۰ ۔ ۱۱۱

از فرنگ آمده در شہر فراوان شده است ‏ ‏ ‏ جرعہ را دین عوض آرید ہے ارزان شده است

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین ‏ ‏ ‏ اک تیر میرے سینے مین مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب ‏ ‏ ‏ وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہین کہ حف نظر ‏ ‏ ‏ طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

نئے حاکمون کی ذہنیت تاجرانہ تھی تاہم رعایا کو ان پر اتنا اعتماد ہوچکا تھا کہ وہ گذشتہ صد سالہ تباہیون کو بھول کر اپنے اپنے مشاغل مین بہ اطمینان زندگی بسر کر رہے تھے - زندگی مین ایک نظام اور معاشرت مین ایک مطمئن مسرت بخش وضع قائم ہوچکی تھی - کلکتے سے دہلی تک اور دہلی سے پشاور تک ملک مین ایک منظم حکومت قائم تھی - ریل ڈاک اور تار کی بدولت زمان و مکان کا بعد گھٹ گیا تھا - سکون و طمانیت نے لوگون کو خوش باشی کی طرف راغب کردیا تھا - مختلف تیوھارون تقریبون کے علاوہ تفریحات کے بہت سے ذریعے تھے جو زندگی کو خوشگوار بنانے مین امداد کرتے تھے - دلی والون کی خوش باشی کا یہ عالم تھا کہ " شہر کے تیج تیوھار کے سوا بھی ان منچلون سے باھر کی رعنائیان نہ چھوٹتین - کالکا کا میلہ ہویا میرٹھ کی نوچندی، حضرت پیران پیر صابر ہو یا خواجہ اجمیری کا عرس ہو یہ ھرجگہ وارد ہین - ان باتون سے طبیعت مین اپنے آپ ایسی ھلکت پڑگئی کہ عید شب برات ہو یا نہ ہو ان کے دل کا کنول کھلا رہتا - شستہ صورت، شگفتہ مزاج، مرنجان مرنج سڈول جسم، چوڑا بھرا ہوا سینہ - ان کے ہان زندگی کا دوسرا نام گویا ہنستے کھیلتے آنا اور چلے جانا تھا - یہ ان مہاراجاؤن کی پرجا، ان آقاؤن کے خادم تھے جو ہندی تمدن کی آن بان تھے جنھون نے ہندوستان فتح ہی نہین کیا بلکہ اسے اپنا مالوف وطن، پیارا گھر بنایا - اور جس طرح انسان اپنا (1)

---

(1) Garratt : Legacy of India , p. 287.

پیارا گھر بساط بھر سجاتا ھے انھون نے بھی اپنی زبان سیاست، تعمیر، معاشرت، ذھنیت، موسیقی، شاعری، خوش وقتی اور علم و فن[1] سے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا ـ یہی وجہ تھی کہ رنگین راجا اور پرجا خالی دنون مین بھی دن عید اور رات شبرات مناتی تھی ـ گرمی مین گرمی جاڑے مین جاڑے برسات مین برسات کے ٹھاٹھ رھتے ـ

گرمی آئی فجر کی نماز سے فارغ ھو کوئی جمنا گیا کوئی جنگل نکل گیا کہین دیکھو تو کسرت ھو رھی ھے کچھ بھلے مانس لمبو پر محلے کے اردگرد مونڈھے بچھائے ادھر ادھر کی باتین لڑا رھے ھین کچھ محلسرا مین امیر امرا کی مصاحبت مین جا پہنچے ـ ـ ـ صحن مین طرح طرح کے پھول بہار دکھا رھے ھین ـ ایک طرف کورے کورے شکے گھڑونچیون پر سلیقے سے رکھے ھین صراحیان ھین جن پر اجلی اجلی صافیان لپٹی ھوئی ھین ـ چاندی کے نقشین کٹورے ڈھکے ھوئے ھین ـ بیچون بیچ مچھلی بھون ھے جس کے گرد تخت بچھے ھین ـ ان پر سفید سفید ین سکھ کی چاندنیان سفید بگلا سی ـ کشتی کشتی گاؤ تکیے چنبیلی کے جال کے براق سی سوزنیان بچھی ھین ـ آنکھ مین میل اس فرش فروش پر میل نہین ـ اندر جاؤ تو روشن کھلا کھلا سا مکان خوبصورت شہ نشین سفید جھلک در و دیوار جن سے آنکھون مین نور آئے طاقون مین گلدان گلدانون مین پائین باغیچے کے بنے ھوئے گلدستے پیش مین آگن بلبل دیش طوطا مینا لال اور پھدڑیون کے پنجرے لٹک رھے ھین ـ صحن مین ایک طرف کا یکین ... کہین باتین ھو رھی ھین ـ سب کے سب ڈھونٹ مین تیزی بڑھی تو خسخانون مین آبیٹھے ـ فراشی پنکھا چل رھا ھے ـ خس کی ٹٹیون پر ھزارے سے پانی چھڑکا جا رھا ھے ـ یہ امیر امرا کا حال ھے ـ دوسرے ملازم پیشہ دکاندار اور متوسط طبقہ بھی چین سے گذارتے ـ

---

(1) Garratt : Legacy of India , O.302.

شام کے وقت نہا دھو سفید براق سے کپڑے پہن سب عطرون مین بس گئے ۔ گلے مین موتیا کے کنٹھے ڈالے ۔ کوئی چوک پہ آیا کوئی چاوڑی نکل گیا ۔ کسی نے چاندنی چوک کی سیر کی ۔ یہان جابجا شربت کی دکانین لگی ھین ۔ بڑے بڑے اولے فالودہ تخم ریحان ڈال ڈال کے طرح طرح کے شربت دکاندار دے رہا ہے ۔ کٹورے پہ کٹورے اترے چلے جاتے ھین ۔ سقے کھڑے چھل بلا رہے ھین ۔ بھری مشک کاندھے پر جس پر کھاروے کا تربتر کپڑا پڑا ہوا ہے ۔ رات ہوئی ۔ کوٹھون پر پلنگ بچھے ۔ سفید دودھ سی چادرین پڑی ھین ۔ سرھانے مولسری موتیا چمپا چنبیلی کے پھول پڑے ھین ۔ خس کی گیلی پنکھیان جھل رہے ھین ۔ کوئی کھری چارپائی پر پڑا کروٹین بدل رہا ہے ۔ چاندنی راتین ہوئین تو یار دوست فالیز گئے ۔ خوب خربوزے تربوز کھائے، کبڈی کھیلی ناچ گانا سنا، صبح نہا دھوکر گھر آگئے ۔ (اقتباس از دلی کا آخری دیدار مصنفہ سید وزیرحسن ص ۲۶ تا ص ۲۸)

برسات مین قطب پر پھول والون کا میلہ لگتا ۔ دلی کے بے فکرے سیرتماشے کے رسیا ھزارون کی تعداد مین وہان پہنچتے ۔ دوتین دن تک وہان جی بہلاتے ۔ جھرنے مین کدائی ہوتی ۔ کوئی پھسلنے پتھر پر پھسل رہا ہے ۔ کہین ناچ ہورہا ہے کہین چہل، چھچھورے پھبتیان ہورہی ھین کہین پہلوانون کے کھالے ہورہے ھین کوئی امریون مین جھولے پر کھڑا پینگ بڑھا رہاھے ۔ کہین کنکوے بازی ہورہی ہے کوئی تکلین لڑوا رہا ہے ۔ تیسرے پہر شمسی تالاب پر میلہ لگا ۔ میان شہید کے شاگرد تیرنے کے کمال دکھا رہے ھین ۔ کوئی آلتی پالتی مارے تیر رہا ہے کوئی چت ہے ۔ ایک ھے کہ مینڈک کی طرح ملاحی تیرتا چلا آتا ہے ۔ ایک نے جوگیا آسن مارا پھر شیر کی طرح اسدی تیرنے لگا ۔

دکانین مکان راتون رات سج گئے ۔ حلوائیون نے رنگ برنگ لوزاتین تھالون مین سجائین ۔ کہین گرم گرم کچوریان اندرسے کی گولیان اتر رہی ھین کہین پستہ بادام کے نقل لگے ھین، کہین موتی چور مونگ پھلی کے لڈو مغزی قلاقند بالوشاھی پھینیان برفی پر سونے چاندی کے ورق جھلمل جھلمل کررہے ھین

لوہے کے چرخی پنکھوں کی چائین چائین کا شور مچا ہے ۔ کنجڑوں کی سہانی آوازین الگ ستم ڈھارہی ہین کہین دیگین کھڑک رہی ہین ۔ دودھ پھینیان حلوا پوری ملائی کی برف کی چکھوتیان ہورہی ہین ۔ کوئی بارہ مصالحے (مسالے) کی چاٹ اڑا رہا ہے ۔ کوئی دھی بڑے کے چٹخارے لے رہا ہے ۔ الا ے لوہ شکورا گکسروالا آیا ۔ یہ جگت مین جواب نہین رکھتا ۔ کارچوبی ٹوپی کارچوبی جوتی چکن کا انگرکھا ۔ بچون کا غول پیچھے پیچھے ۔ دولہ بنے چلے آتے ہین ۔ بڑا سا خوبصورت حقہ ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار پانچ گز کی نے جس پر تمامی لپٹی ہوئی گنگا جمنی مہنال چلم سے خمیرے کی مہکار چلی آتی ہے ۔ سڑک پر سے کوٹھون پر سے انعام لیتے چلے آتے ہین ۔ یہ شعر زبان پر بہت چڑھا ہوا ہے ۔ لہک لہک کر پڑھا جا رہا ہے ؎

حقہ نہین ہے حضرت والا کے ہاتھ مین
گویا کہ کہکشان ہے ثریا کے ہاتھ مین

باہر کے ان سیر تماشون کے علاوہ گھریلو تفریحین اور دیگر علمی مشاغل بہتیرے تھے ۔ ہر محلے مین کئی ٹھکانے ایسے ہوتے تھے جہان ہر فن کے شوقین اپنے لئے تفریح وتسکین کا سامان پاتے تھے ۔ "کہین شطرنج(۱) ہو رہی ہے ۔ کہین چوسر کہین علم کی بالی جمی ہے ۔ حقائق و معارف کے دقیق مسائل طے ہو رہے ہین ۔ صغری کبری پھڑک رہے ہین ۔ رمل جفر سے لیکر فقہ حدیث تک کی نجانے کیا کیا بحثین ہوتین ۔ شاعری کا عام چرچا تھا ۔ استاد ذوق اور مرزا غالب کے اہالی موالی جا بجا تھے ۔ مشاعرون مین ان کی لے دے رہتی ۔ زاغ زغن کی چونچین جدا ہوتین ۔ ایک کہتا ہے اردو مین مرزا نوشہ کی طرز جدید تو واقعی اپنا جواب نہین رکھتی دوسرا کہتا " غالب شعرا کے شمار مین

---

(۱) اقتباس از دلی کا آخری دیدار تالیف سید وزیر حسن ص ۳٦

تو ہین نہین ایک تو انھون نے قصیدے نہین کہے کہ قصیدہ فن کی کسوٹی ہے ۔ دوسرے بے استادے ہین ۔ اپنی خفت مٹانے کو تو مولوی عبدالصمد نامی انھون نے زبردستی استاد گھڑا ۔ کوئی خضر راہ ملا نہین ۔ جبھی تو بیچارے تخیل کے اندھیرے مین ٹپے ٹوئیان مارتے پھرتے ہین ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکان اپنا

میر صاحب تمہین خدا کی قسم ذرا دیکھنا اس مین کہان کا فلسفہ آن ٹھسا ! " ۔ اس پر میر صاحب (علی احمد) ہنسنے لگے اور کہا " بھئی تم جو چاہو سمجھو مگر عرش تک ان کی (ذوق کی) رسائی بھی دیکھ لو ؎

بشر جو اس تیرہ خاکدان مین پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
و گرنہ قندیل عرش مین بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

مختلف فنون کی بالخصوص شاعری کی وہ گرم بازاری تھی کہ ہندو، مسلمان، ادنیٰ، اعلیٰ، ذی علم، بے سواد، جاہل، رند، مولوی سب شعر کہنے سننے اور مشاعرون مین شرکت کرنے کے عاشق تھے ۔ میر حسن، مصحفی اور قدرت اللہ خان قاسم نے اپنے تذکرون مین متعدد اہل حرفہ کا ذکر کیا ہے جو دن بھر اپنے پیشون مین مشغول رہنے کے باوصف شعر کہنے کے لئے وقت نکال لیتے تھے ۔ ان مین کلو حجام بھی (1) ۔

(1) سودا سے تلمذ کی نسبت رکھتا تھا اور اپنی استعداد کے بموجب بھلا برا شعر کہہ لیتا تھا ؎

ہے جی مین کہ اک روز یہ ان آنکھون سے پوچھون
بچتے نہین کس واسطے بیمار تمھارے

اس شوخ کے کوچے مین نہ جایا کرو حجام
چھن جائین گے اک روز یہ اوزار تمھارے

کل میان حجام سب کا مونڈ تے پھرتے تھے سر
آج اس کوچے مین ان کی بھی حجامت ہوگئی

قیاس کہتا ہے کہ شاید اپنے استاد سے فرط عقیدت کے سبب کلو نے میر کے حق مین کچھ اشارے کنائے کیے ہون گے جس پر میر نے وہ ہجو لکھی جس کا مطلع ہے ؎

سنو یارو ٹک ذرا بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام

اس مین کلو کو جی بھر کر سخت سست کہا ہے ۔ اسکے ذلیل پیشے جراحی مرہمون کے ڈبون اور صافیون کا خوب خاکہ اڑایا ہے ۔

ہے جو بال سے باریک مضمون باندھتا ہے ۔ شورش قبالہ نویس ہے ۔ محمود بیگ شعور سپاہی ہے ۔ محمد امان نثار معمار ہیں (۱) جنھیں ریختہ سے غیرمعمولی شغف ہے اور جو میر سے ٹکر لیتے ہیں ۔ میاں عاشق مزدور ہیں (۲) ۔ غلام احمد تصویر نیچہ بند ہیں ۔ غرض میاں پل کا جیسے پہلوان ہیں ۔ ہر پیشے میں کوئی نہ کوئی موزوں طبع نکل آتا تھا جو اپنی بساط بھر شعر گوئی و شعر فہمی کی داد دیتا ۔ مشاعرے میں ان سبھوں کو جگہ ملتی ۔ یہ صورت حال میر کو ناپسند تھی تو ہوا کرے (۳) ۔ وہ اس فن شریف کو اراذل واجلاف کے شایان نہیں سمجھتے نہ سمجھیں ۔ لیکن زمانے کا مزاج کون بدل سکتا ہے ۔ ان دنوں گلی کے لونڈے، گھر کی عورتیں، اعلیٰ، ادنیٰ، سب تھوڑا بہت شعر سے مس رکھتے تھے ۔ پیشے یا مذہب کی بھی تخصیص نہ تھی ۔ پنڈت نراین داس ضمیر پنواڑی تھے ۔ سدھ سنگھ شگفتہ لوہار تھا ۔ بھوگے لال شوق اسلامی روایات لکھنے میں ماہر تھا ۔ مہرچند مہر بہیشکار تھا (۴) ۔ ہرگوپال تفتہ اور بال مکند بے صبر کافی معروف ہیں ۔ غرض فقیر سے لیکر بادشاہ سلامت تک ہر شخص بادۂ سخن سے سرخوش تھا ۔ دکاندار، خوانچہ والے، میوہ فروش تک موزوں الفاظ اور مقفی عبارت میں آواز لگاتے ۔ فقیر بھیک مانگتے تو حرف سوال یا دعائیہ فقروں کے بجائے منظوم کلام اور مرزا غالب جیسے شعراء کی غزلیں خوش آوازی سے پڑھتے (۵) ۔

---

(۱) آبحیات ص ۲۱۶ — حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

(۲) دہلی کی آخری شمع ص ۵۰

(۳) صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف — کسب کرتے جن کی طبیعتیں تھیں لطیف

(۴) گلشن بے خار ص ۱۱۱ و ص ۱۱۳

(۵) اردوئے معلّی ص ۱۹۹ ۔ فقیر جو دردمنّت کش دوا نہ ہوا والی غزل پڑھ کر غالب کو آبدیدہ کر دیتا ہے ۔

اس دور کی معاشرت میں حسن اس قدر رچ گیا تھا کہ عوام و خواص حسب مقدور خوش خوراکی خوش پوشی اور خوش گفتاری پر مائل تھے ۔ طبیعتوں میں نفاست تھی ۔ ذی علم اور خواص سے قطع نظر ادنیٰ طبقے کے آدمی اور مختلف پیشہ ور بھی ان خصوصیات کو نباہتے تھے ۔ سڑک پر پانی پلانے والے سقے اس سلیقے سے کٹورا بجاتے کہ جلترنگ کی آواز یاد آتی ۔ میاں پانی پلاؤں ؟ آبحیات کے دو گھونٹ برف کی کھرچن ؟" پیاسو سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی" وغیرہ کلمات اس طرح ادا کرتے کہ خواہ مخواہ آدمی کو پانی پینے کی خواہش ہوتی ۔ حقہ پلانے والوں کا پیشہ کوئی پیشہ ہے لیکن اس کی بھی یہ دھج ہوتی (۱) :

اے لو ۔ وہ شکورا کگھوا والا آیا ۔ یہ جگت میں جواب نہیں رکھتا ۔ کارچوبی ٹوپی کارچوبی جوتی چکن کا اونچی چولی کا انگرکھا بچوں کا غول پیچھے پیچھے دولھا بنے چلے آتے ہیں ۔ بڑا سا خوبصورت حقہ ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار پانچ گز کی نے جس پر تمامی لپٹی ہوئی گنگاجمنی مہنال چلم سے خمیرے کی مہکار چلی آتی ہے ۔ سڑک پر سے کوٹھوں پر سے انعام لیتے چلے آتے ہیں ۔ یہ شعر زبان پر بہت چڑھا ہوا ہے ۔ لہک لہک کر پڑھا جارہا ہے ؎

حقہ نہیں ہے حضرت والا کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

بازار حسن میں بیٹھنے والیاں یعنی ارباب نشاط خوش پوشی اور جامہ زیبی ہونے کے علاوہ نوشت و خواند سے بہرہ ور ہوتی تھیں ۔ اکثر اپنے کوٹھوں پر معلموں (۲) کو بلا کر ان سے باقاعدہ اردو

---

(۱) دلی کا آخری دیدار از ظہیر حسن ص ۸۳

(۲) طوائف ~~کولٹیرچے~~ کو از بر ہیں دیوان ان کے ۔ ~~مکرمی شاہد احمد صاحب~~ حالی

فارسی کی تحصیل کرتین ۔ مشہور شعرا کا کلام انھین یاد ہوتا[1] ۔ ان کی خوبی یہی تھی کہ موسیقی کے ساتھ ادبیات اور علم مجلسی کی بھی ماہر ہوتی تھین ۔ مجلسی آداب، حاضر جوابی، نکتہ سنجی ان کے خمیر مین شامل ہوتی تھی اور دلی مین تو کم مگر لکھنؤ مین اکثر آزاد مزاج شائستہ اشخاص اپنی اولاد کو مجلسی تہذیب سکھانے کے لئے بے تکلف ان کے کوٹھون پر آنے جانے کی اجازت دیتے تھے[2]

جن طوائفون کا درجہ کچھ بلند تھا وہ بازار مین بیٹھنے کے بجائے اپنے گھرون مین رہتین ۔ یہ ڈیرے دارنیان کہلاتی تھین اور تمیز تہذیب مین خاص مقام رکھتی تھین[3] ۔ بعض ارباب نشاط اپنی

---

(۱) امراؤ جان ادا از مرزا رسوا ص ۱۶۵ ۔ طوائف کو ازبر ہین دیوان ان کے ۔ حالی مکرمی شاہد احمد صاحب مدیر ساقی نے ایک محفل رقص و سرود کا بیان کرتے ہوئے دہلی کی ایک طوائف کا حوالہ دیا ہے جسے کسی صاحب نے طعنہ دیا کہ کیا چھوٹی چھوٹی غزلین گا رہی ہو ۔ کوئی لمبی چیز سناؤ ۔ اب جو اس ناظورہ نے ایک خمسہ شروع کیا تو دو گھنٹے کی خبر لائی ۔ لیل و نہار مارچ ۱۹۵۸ء

(۲) طوائفین اس دور کی سوسائٹی مین بے حد دخیل تھین ۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا مین کئی مقامات پر یہ نقشے دکھائے ہین ۔ ص ۲۰۶

(۳) سید وزیر حسن نے اپنی تالیف مین ان کا بیان بہت دلآویز طریقے سے کیا ہے " یہ تمیز تہذیب کی گویان ہوتین ۔ ان کا ادب قاعدہ کیا بتاؤن کہ دیکھے سے جی خوش ہو آنکھین کھلین ۔ یہ ڈیرے دارنیان کہلاتی تھین ۔ ان کے وقتون ایسی ویسی رنڈی ہی نہ تھی ۔ ان کی بات چیت، گانا چاؤ چونچلا، سگھڑاپا وہ تھا کہ لاکھون عورتون مین پہچان لو ۔ کنوارے لڑکے لڑکیان ان کے سامنے پڑتے ایسا بھتاتین جیسے کوئی استانی جی سے سہم جاتا ہو ۔ بات بات مین نی نکالتین ۔ ماں باپ کے سامنے فضیحتیان کرتین ۔ لوگ بچون کو ان سے ادب قاعدہ سکھواتے ۔ ایک اس زمانے کی رنڈیان ہین ۔ ایک دفعہ شادی مین دیکھا تھا آغا تو بالکل پہلوان جچتی تھی ۔ یہ سرانچے کا بانس ۔ ہتھنی کی ہتھنی ۔ رنڈاپا سا چھایا ہوا ۔ گنوار و زبان ۔ بات کرے تو معلوم ہو جیسے کوئی لڑتا ہو " ۔

دلی کا آخری دیدار ص ۷۸

(1)

محفل میں صرف گنے چنے آدمیوں کو آنے کی اجازت دیتیں — نواب مصطفی خان شیفتہ کسی محبوبہ رمجو المتخلص بہ نزاکت کا بھی انداز تھا — دھلی کی ایک ناظورہ نازنین یعنی امامن جس کا قطعۂ وفات مومن نے بڑی دلسوزی سے لکھا ہے اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے —

---

(۱) اردو ادب میں رقابت کے مضامین بالاکثر طوائفوں سے متعلق ہیں — ادب میں معاشرت کے نقوش محفوظ رہتے ہیں چنانچہ ایسے اشعار کے مضامین سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ طوائف کس طبقے کی ہے اور اس کی عریاں انقاد طبع کیا ہے — اشعار کے لطیف نقاب کے پیچھے ان نوچیوں یعنی بساط عیش کی نوخیز دلرباؤں کے مکھڑے دمکتے نظر آتے ہیں جو ہوس پیشہ تماش بینوں کی تیز نگاہوں کی تاب نہیں لاتیں اور شرما کر رہ جاتی ہیں — وہ گار آزمودہ جہاں دیدہ طوائفیں بھی ملتی ہیں جو بے تمیز بیباک نوجوانوں کو نظروں نظروں میں ڈانٹ دیتی ہیں وہ ماہر فن شعلہ پیکر دلربائیں بھی سامنے آتی ہیں جن کے نزدیک عاشقوں کو تباہ کر دینا محض ایک کھیل ہے اور گرمی محفل سے زیادہ نہیں —

آنکھ اس نے بزم میں نہ اٹھائی تمام شب — کس بے ادب کو عرض ہوس ہر نگہ میں تھی
ممنون

گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جاتے ہے — غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخ کرے
غالب

کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ — ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے
مومن

میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا — غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
مومن

ہائے اس برق جہان سوز یہ آنا دل کا سمجھے جو کری ہنگامہ جلانا دل کا

شیفتہ

طوائفون کا یہ انداز کسی ایک شہر سے مخصوص نہ تھا - پنجاب سے لے کر یوپی کے مغربی اضلاع تک جو جو شہر تہذیب وتمدن کا مرکز تھے اس جنس کے سرمایہ دار تھے - یہ طبقہ اناث بدنام ہونے کے باوجود انیسوین صدی کی معاشرت مین بے حد دخیل تھا - شادی بیاہ ہولی دوالی عید بقرا عید پر یہ رئیسون کے دیوان خانون تک اور محرم مین حرم سرا تک باریاب ہوتین اور انعام واکرام پاتی تھین (پرسیوال اسپیر ص ١٣) ڈیرہ دار طوائفون کی حویلی کافی بڑی ہوتی تھی جس مین کئی کئی نوجوان اپنے اپنے کمرون مین جو چلمن اور فرش فروش سے آراستہ ہوتے رہتی تھین - طوائفون کے علاوہ ڈومنیان بھی شوہر دار - بے شوہر شوخ - بیباک غرض ہر مزاج کی ہوتی تھین ذوق نظر کی تسکین کرتی تھین چنانچہ مرزا غالب بھی ایک ستم پیشہ ڈومنی کے بسمل ہین - مومن کی غزلون اور ایک مثنوی مین ان تمام طبقون کی ارباب نشاط بیباک جلوہ گری اور پس چلمن کی جھلکیان دکھاتی نظر آتی ہین - جذبۂ حسن پرستی کی تسکین کے لئے خانہ زاد کنیزین اور وہ عورتین بھی موجود تھین جو حالات کے ماتحت کسی ایک شخص کی محکوم و پابند ہوجاتی تھین اور جنھین خانگی یا داشتہ کہا جاتا تھا - مثنوی قول غمین مین ہم حسن و تمکنت - حاضر جوابی اور خوش مذاقی کے جس پیکر لطیف سے دوچار ہوتے ہین وہ اسی آخری زمرے کی فرد ہے -

اسلام نے شاعری کی حوصلہ افزائی نہین کی ۔ بلکہ اس سے اجتناب ہی کا اشارہ کیا ہے ۔ تاہم اس رنگین دور مین فن شعر علوم متداولہ مین داخل تھا اور دیندار علماء بھی اس کی باقاعدہ تحصیل کرتے تھے ۔ پابند شریعت مولوی نذیر احمد صاحب، مولوی مملوک العلی جیسے ثقہ جو ریزیڈنٹ سے مصافحہ کرنے کے بعد ہاتھ دھونا ضروری سمجھین، جامع کمالات مفتی صدرالدین آزردہ، سرسید احمد خان محقق کامل مولوی امام بخش صہبائی سب کے سب بادۂ سخن سے سرشار ہین ۔ شعرگوئی و شعرفہمی (1) ان دنون تہذیب کے لوازم مین داخل تھی ۔

شاعری کے اس ہمہ گیر شوق کو پورا کرنے کے لئے کافی وسائل موجود تھے ۔ مدرسے اور درسگاہین جن مین ادبیات کی تعلیم لازمی تھی اس شوق کو ہوا دیتی تھین ۔ یہان لوکے بیت بحثی سیکھتے ۔ ہر محلے مین ایک دو بزرگ ایسے ہوتے جو اپنی بے استعدادی کے باوجود گلی کے لونڈون کو شعر کا چسکا لگا سکتے اور انھین فن کا مبادیات بتلا سکتے تھے ۔ اس کے بعد معمولی استعداد کے شعرا کا طبقہ تھا جو خود کسی با کمال کے حلقۂ تلمذ مین ہوتے اور دو چار نو مشقون کی استادی کا فریضہ بھی

---

(1) نواب نصیرحسین خیال اپنی کتاب داستان اردو ص ۱۲۷ مین شیخ محمد جان شاؔد کے حوالے سے ناقل ہین کہ غدر کے زمانے مین مین (محمدجان شاد) بار مین رہتا تھا ۔ ایک صبح قیصر باغ کی طرف آنا پڑا ۔ انگریزون اور باغیون کی فوجین پڑی تھین ۔ بیلی گارد کا محاصرہ تھا ۔ مین اس طرف سے جانے لگا ۔ ایک بھنگی ہاتھ مین جھاڑو لئے سوچ مین کھڑا تھا ۔ مجھے دیکھ کر بولا میان صاحب جان کی خیر مناؤ ادھر نہ جاؤ ۔ مین نے کہا کہ کیا خبر ہے ۔ جواب دیا کہ گورے کمک کو آپہنچے ہاولاک اور جنرل آوٹرم بھی آہی چلے ہین اور کیا کہون ۔ دیکھون ہین کوئی قبل کوئی بعد آئے گا" ۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا کہ حلال خور بھی انیس جیسے استادون کا کلام پڑھتے تھے ۔

انجام دیتے — ان سے اوپر ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شاہ نصیرؔ جیسے استادون کا حلقہ تھا جن کی محفلین اس فن کا گہوارہ تھین — یہ لوگ بالعموم اپنے گھرون پر فنی مجلسین گرم رکھتے تھے اور اپنے حلقے سے باہر کم نکلتے تھے — مگر وہ جگہ جہان چھوٹے بڑے سب جمع ہوتے اور جسے فن کا اکھاڑہ کہنا چاہئے، مشاعرہ تھا — کسی شوقین کے مکان پر مقررہ تاریخ کو شعرا جمع ہوجاتے اور ایک معینہ طرح مین طبع آزمائی کرکے اپنے کمال کا اظہار کرتے[1] — عشاء کے بعد یہ مجلس شروع ہوتی اور آدھی رات یا پچھلے پہر تک قائم رہتی — بانی مشاعرہ موسم کے مطابق شربت، حقہ، اور پان پھول سے حاضرین کی تواضع کرتا تھا — محفل کو حتی المقدور اچھے فرش فروش سازوسامان سے آراستہ کیا جاتا عود و اگر سلگتا، فانوس روشن ہوتے، پان اور عطر پیش کیا جاتا — بانی محفل یا صدر کے اشارے پر ہر شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر مسند پر آتا اور اپنا کلام سناتا[2] — شائستہ صحبتون مین شاعر کو بلانے کے بجائے یہ دستور تھا کہ جب نوبت بہ نوبت شمع کسی شخص کے سامنے آتی تو وہ اپنی غزل پڑھتا — اچھے اشعار پر داد دی جاتی — نومشقون کا بھی دل بڑھایا جاتا — رہے باکمال استاد سو انھین دل کھول کر داد دی جاتی[3] — یون بھی ان کے شاگردون کی تعداد اتنی ہوتی تھی کہ بجائے خود ایک گروہ بن جاتا جو

(۱) Garratt : Legacy of India , p.294.

(۲) لکھنؤ کی حالت پر سرمشاعرہ داد دینے سے گریز کرتی تھی — بالعموم اچھی صحبتون مین اختتام محفل پر برسبیل گفتگو شعرا کو داد دی جاتی تھی — انیسوین صدی کی تہذیبی فضا مشاعرون کے غلغلے سے اس طرح گونج رہی تھی کہ اس کی آواز فرانس مین گارسان کے کان تک پہنچتی تھی — وہ اپنے دوسرے خطبے مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء مین بڑی رنگینی کے ساتھ ان محفلون کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے :—

" ہندوستانی ادب کے شعبون مین سب سے مقدم شاعری ہے اور اسے بڑی کامیابی اور ذوق و شوق کے ساتھ ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس مقدس آگ کو خاص ادبی جلسون کے ذریعے سے جن کا نام مشاعرہ ہے زندہ رکھا جاتا ہے — ہندوستانیون مین اس قسم کے ادبی جلسون کا خاص ذوق ہے یہان تک کہ اور لوگ بھی جن کا پیشہ شاعری نہین ہے شوقیہ طور پر معینہ ایام مین (عموماً پندرہ یوم مین) اپنے گھرون پر شام کے وقت ایسے جلسے کرتے ہین وہ شہر کے ان تمام اصحاب کو جو شعر سے ذوق رکھتے ہین

دعوت دیتے اور ان سے درخواست کرتے ہین کہ اس موقع کے لئے فلان بحر مین شعر کہنے کی زحمت فرمائیے"
(خطبات گارسان دی تاسی مترجم ص ۱۲)

واہ وا' سبحان اللہ' کے نعروں سے محفل کو گرما دیتا ۔ بعض بگڑے دل شعرخوانی کے جوش میں صف محفل سے گز بھر آگے نکل جاتے ۔ دلچسپی یا تنوع کے خیال سے کچھ ایسے سادہ لوح بھی شریک محفل کرلئے جاتے تھے جو فن سے بیگانہ ہوتے مگر خود کو استاد کامل سمجھتے ۔ ان کے اشعار جو معنی سے خالی' وزن سے عاری اور ردیف قافئے کی قید سے آزاد ہوتے تھے لوگوں کو بے تحاشا ہنساتے اور اس طرح وہ جمود جو فن کی حالت سے پیدا ہوجاتا ٹوٹ جاتا تھا[1] ۔

آب حیات میں ان شگفتہ محفلوں کی بڑی پیاری تصویریں ملتی ہیں ۔ آزاد کے مرقعوں میں یہ ساری صورتیں ایسی الگ الگ نظر آتی ہیں کہ ہر شخص کو صاف پہچان سکتے ہیں ۔ یہ کون ؟ میرسوز ہیں جو شعر پڑھتے میں بتانے کے فن کی وہ رعایت کرتے ہیں کہ خود مجسم مضمون بن جاتے ہیں ۔ زلف کا مضمون ادا کررہے ہیں ۔ وہ دیکھئے ع ' کالا نہ ہسنی (افعی) ترا برا ہو' کہتے کہتے اس طرح لوٹ گئے کہ گویا سچ مچ ناگن نے ڈس لیا ہے ۔ لوگ سنبھالنے کو دوڑے کہ نجانے آصف الدولہ کے استاد پر کیا گذر گئی[2] ۔ یہ بزرگ کون ہیں جن کی سفید ڈاڑھی پر نور برستا ہے اور گلے میں ململ کا کرتا چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے ۔ یہ حکیم آغا جان عیش[3] ہیں جو خود تو خیر سے شاعر ہیں ہی مگر ستم یہ کرتے ہیں کہ گرمی محفل کے لئے ایک دبلے چہرے' چگی داڑھی والے سادہ لوح گاؤدی کو ساتھ لگا لاتے ہیں جو شکل صورت سے خاصہ کٹ پڑھتی معلوم ہوتا ہے ۔ اسے مہمل و مضحکہ شعر کہہ کہہ کر دے دیتے اور مشاعرے میں پڑھواتے ہیں ۔ ہدہد تخلص بھی عنایت کردیا ہے کہ

---

(۱) مثلاً ہد ہدالشعرا ہدہد ۔ دیکھئے آبحیات ص ۲۷۱

(۲) آبحیات ص ۱۹۸

(۳) آبحیات ص ۲۷۰

طائرون کا سرتاج ہے اور حضرت سلیمان کا قاصد خوشخبر ۔ اس سے یہ معنی شعر پڑھواکر محفل کو کشت زعفران بنائے اور موقع بہ موقع چھوٹے بڑے استادون کے سہر شعوںگین بھی لگوادیتے ہین ۔ بطور نمونہ دو شعر میان ہدہد کے بھی سن لیجئے ۔

جو تیری مدح مین مین اپنی چونچ وا کردون | تو رشک باغ ارم اپنا گھونسلا کردون
مین کھانے والا ہون نعمت کا اور میرے لئے | فلک کہے ہے مقرر مین ماجرا کردون

یہ تیکھے نقشے کڑے تیورون والے بزرگ عبداللہ خان اوج ہین جو کوک کر شعر پڑھتے اور استاد ذوق کو صحت محاورہ کا سبق پڑھاتے ہین ۔ وہ دیکھئے سر راہ بیچارے آزاد کو روک رکھا ہے ۔ اپنا مطلع سنا رہے ہین ۔

یان جو برگ گل خورشید کا کھوکا ہوجائے
ڈھول دستار فلک پر لگے تروکا ہوجائے

یعنی اپنے استاد سے کہدینا کہ محاورہ اس طرح بندھتا ہے[1] ۔ غالب کی عظمت مسلم مگر اوج انھین بھی نہین بخشتے ۔ ایک اوچھا سا چرکا ان کے بھی لگا دیا ہے ۔

ڈیڑھ جزبھی تو ہے مطلع و مقطع غائب | غالب آسان نہین صاحب دیوان ہونا

یہ زمین سخن کے پہلوان شاہ نصیر ہین ۔ ذوق اور مومن کے استاد ہین مگر عجب مقدر ہے کہ دونون شاگرد رشید ان سے منحرف ہوگئے ۔ پکا سانولا رنگ مزاج کی تیزی سے خبردیتا ہے ۔ اپنے فن کے استاد کامل

---

(۱) ذوق کے محاورے پر تعریض ہے جو ایک شعر مین تڑکا ہونے کے بجائے سحر ہونا نظم کرگئے تھے ۔

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہوجائے
صبا وہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہوجائے
ذوق ۔ آب حیات ص ۲۶۸

ھین ـ قفس کی تیلیان نفس کی تیلیان جان کا لوھا ارمان کا لوھا ـ محل کی مکھی عسل کی مکھی سر پر طرہ مار گئے ھین ـ اس قسم کی سنگلاخ زمینون مین جہان دوسرے شاعر قدم رکھتے گھبرائین ان کا اشہب قلم سرپٹ جاتا ھے ـ ان کڈھب طرزون مین غزل کیا دوغزلہ سہ غزلہ لکھ دینا ان کے بائین ھاتھ کا کھیل ھے ـ یہ نوعمر صاحبزادے جو سٹے سٹائے سے بیٹھے ھین نواب مرزا داغ ھین ـ ذوق کے شاگرد ـ نوعمری کے سبب مزاج مین جھجھک ھے ـ نومشق ھین مگر پچھلے مہینے مشاعرے مین غزل پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے تو غالب بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے ـــ

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ھین
ادھر جاتا ھے دیکھین یا ادھر پروانہ آتا ھے

یہ جامہ زیب خوش پوش خوش وضع صاحب جن کی نظرون سے حسن پرستی کا نشہ ٹپکتا ھے حکیم مومن خان ھین ـ میرمشاعرہ نے تین چار بار جا جاکر التجا کی ھے تب آئے ھین ـ کیفیت مین ڈوب کر بڑے سوزناک لہجے سے غزل پڑھ رھے ھین اور انگلیون کی کنگھی ھے کہ برابر زلفون مین پھر رھی ھے ـ یہ بزرگ جن کے چہرے پر انکسار اور خوش خلقی کا ملا جلا رنگ ھے شیخ ابراھیم ذوق ھین ـ کیون نہ ہو ـ بادشاہ کے استاد ھین ـ آدھی دلی ان کی شاگرد ھے[1] ـ شاگردون کی فوج اور شہزادون کی پلٹن ان کی جلو مین چلتی ھے ـ یہ ذی شان پیر مرد جس پر بڑھاپے مین بھی حسن و بانکپن کی نمود ھے مرزا نوشہ ھین ـ ابھی پالکی سے اترے ھین ـ غزل ان کی یان سات شعر ھی کی تو ھوتی ھے مگر سراسر انتخاب ـ بہت مشکل پسند اور مشکل گو ھین ـ پرواز خیال اتنی بلند ھے کہ ہر شخص سمجھ نہین سکتا ـ مگر سمجھین یا نہ سمجھین داد سب دیتے ھین ـ ان کے شاگرد کم ھین اور ان کی تقلید کرنی

---

(۱) گلستان سخن از صابر ص ۳۰۱ ـ

نہایت دشوار ہے ـ تاہم میان ھدھد غالب کے رنگ مین کہہ لیتے ہین ـ کل ہی ایک غزل کہی ہے ـ مطلع انہی کے منہ سے سنئے [1]ـــ

مرکز محور گردون بہ لب آب نہین

ناخن قوس قزح شبہۂ مضراب نہین

حضرت ظل سبحانی ابوظفر سراج الدین ظفر مشاعرون مین شرکت نہین فرماتے ـ اصولاً یہ بات ہے بھی ان کے رتبے سے گری ہوئی ـ تاہم ان کی غزل زربفت کے خریطے مین آتی ہے [2]ـ شاہی نقیب خریطے کو تین بوسے دیکر کاغذ نکالے گا اور غزل پڑھے گا ـ[3]

اگرچہ مشاعرے کے تمام شعراء ایک طرح مین غزل کہتے تھے اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ معینہ طرح مین ردیف قافئے کی تکرار سے ایک ناگوار یکسانیت پیدا ہوجاتی ہوگی مگر ایسا نہ تھا ـ شعراء تلامیذ الرحمن ہوتے ہین ـ ہر شخص اپنی بساط کے بموجب کوشش کرتا تھا کہ طرح کے قوافی مین بہترین مضمون ادا کرے ـ سامعین کو صاف اندازہ ہوجاتا تھا کہ کون سا مضمون یا کون سا قافیہ

---

(١) آب حیات ص ٤٧٢ ـ دھلی کا یادگار مشاعرہ ص ٥١

(٢) خطبات گارسان ڈی تاسی ص ١٦

(٣) ان مین ذہین طباع نومشق غرض ہر درجے اور ہر مذہب کا شخص شریک ہوتا تھا ـ ان مین مضمون کے چور بھی ہوتے تھے جو دوسرون کے نازک مضامین نظم کر لاتے تھے ـ انہی مین وہ خوش خرید سوداگر بھی ہوتے تھے جو غزل فروش استادون سے غزلین خرید کر مقطع مین اپنا تخلص ڈلوالیتے اور برسرمحفل پڑھ کر داد لیتے تھے ـ روئے فلک سیاہ مصحفی مرحوم لکھنؤ مین برملا غزلین بیچتے تھے دلی مین مرزا مکرم اور میرخان کمترین کی غزل دو دو پیسے مین بکتی تھی ـ آخرالذکر سعداللہ خان کے چوک مین کھڑے ہوکر اپنی غزلین بیچتے تھے ـ آبحیات ص ٣٠٧ و ص ٣٧٢ نیز خطبات گارسان دی تاسی ص ١٢٨ ـ

کس شاعر کے ہاں بہترین طریقے سے بندھا ہے — اسے حسب دلخواہ داد ملتی اور اس طرح نئے پرانے کہنے والوں کو تنوع مضامین اور کاوش طبع کا شوق بڑھتا — اگرچہ رشک شاعروں کا خاصہ ہے اور اس کے سبب بعض دفعہ مشاعروں میں بے لطفی بھی ہوجاتی ہے مگر انصاف پسند طبیعتیں نوجوانوں کا دل بڑھانے سے دریغ نہ کرتی تھیں اور بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ کسی غیر معروف یا نوعمر شاعر کی اچھی غزل سن کر پرانے استاد اپنی غزلیں ہاتھ سے رکھ دیتے کہ بس اس کے بعد غزل پڑھنا لاحاصل ہے —(۱)

ان شگفتہ محفلوں میں آداب مجلس کی پابندی کے باوجود بعض اوقات دو دو لطیفے بھی ہوجاتے تھے — اتنی گنجائش بہرحال ملتی تھی کہ اشارے کنائے میں کسی شاعر کو اس کی عام غلطیوں سے آگاہ کردیا جائے اور یہ دستور آج بھی اسی طرح موجود ہے — غالب اپنی مشکل گوئی کے لئے بدنام تھے — حکیم آغا جان عیشؔ نے ایک دفعہ برسر مشاعرہ ان پر تعریض کی اور اپنی غزلیں غزل کے یہ دو شعر پڑھے جن میں غالب کی مشکل پسندی پر طنزیہ اشارہ ہے —

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے ۔۔۔ مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر ان کا کہا یہ آپ جانیں یا خدا سمجھے

ان اعتراضات سے سلیم الطبع شاعر راہ راست پر آجاتے تھے — چنانچہ غالب جیسے زبردست استاد نے بھی کچھ تو ان اعتراضات سے اور کچھ تقاضائے وقت کے سبب مشکل پسندی ترک کرکے سادہ گوئی اختیار کرلی تھی — پھر جب ایک مشاعرے میں انھوں نے اپنی وہ دل آویز غزل پڑھی جس کا مطلع ہے ع

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

تو غزل تمام کرنے اور حسب دلخواہ داد پانے کے بعد بطور تعریض یہ مصرع پڑھا(۲) ع

---

(۱) آبحیات ص ۳۷۱ — خلیقؔ کا حال جنھوں نے اپنا یہ مطلع پڑھ کر خواجہ حیدر علی آتش کو حاضر کیا تھا —

مثل آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو ۔۔۔ صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

(۲) دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ ص ۸۱

اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے

حکیم آغا جان عیش اس کنائے کو بھلا کیوں نہ سمجھتے - فورا جواب دیا ع

غنیمت ہے کہ ہم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے

اس میں بھی طنز ہے کہ مرزا صاحب آپ نے بعد از خرابی بسیار یہ رنگ اختیار کیا ہے - خیر غنیمت ہے -

بعض اساتذہ جن کا احترام خاص و عام سب کرتے تھے نو مشق شاعروں کو برسر مشاعرہ اصلاح دے دیتے تھے یا نووارداں بساط سخن کو مناسب داد دے کر حوصلہ افزائی کرتے تھے - میر جیسے بلند نظر استاد کا کسی اچھے شعر پر اتنا ہی کہدینا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا ہزار تحسین و آفرین کے برابر سمجھا جاتا - (۱)

مشاعروں میں آنے والوں پر بالعموم کوئی پابندی نہ ہوتی تھی - ہر طبقے اور ہر صلاحیت کا آدمی شریک محفل ہوکر اپنی غزل سنا سکتا تھا - البتہ امراء کے مشاعروں میں چیدہ چیدہ شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا - بن بلائے اشخاص شریک نہ ہوسکتے تھے - اس کے باوجود ع

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

کے تقاضے سے محض ہنسنے ہنسانے کی خاطر بعض ایسے تحفہ عجائب المخلوقات قسم کے شاعر بھی شریک کئے جاتے تھے جنھیں فن کی مبادیات تک سے واسطہ نہ ہوتا - مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے

---

(۱) چنانچہ جب مصحفی نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

اور میر نے مصحفی سے مکرر پڑھنے کی فرمائش کی تو مصحفی نے بڑی نیازمندی سے سلام کیا اور کہا کہ میں دیوان میں اس شعر پر یہ لکھ دوں گا کہ حضرت نے اسے دوبارہ پڑھوایا تھا آبحیات ص ۳۰۸ -

دھلی کے آخری یادگار مشاعرے میں ایک مجھول الحال میر صاحب کا بڑا پرلطف نقشہ کھینچا ہے۔[1] یہ بزرگ : " غزل ھمیشہ فی البدیہ پڑھتے تھے ۔ لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی ۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ھی نہ تھی ۔ صرف قافئے اور ردیف سے کام تھا ۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے شر میں بیان کرنا شروع کیا ۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے ھوئے رھے ۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا کر شعر کو ختم کردیا ۔ انھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ھوگئی ۔ یہ بھلا کب دبنے والی اسامی میں ۔ چوکھا لڑتے ۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ھوجاتے ۔ یہ کھڑے ھوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا ۔ معترض کو ڈانٹا اور میر صاحب کا دل بڑھایا ۔ پھر وھی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ھوا ۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا ۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسے سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ھوجاتا ۔"

ان دلچسپ اعتراضوں کی نوعیت کیا ھوتی تھی ؟ سنئے :

" اب میر صاحب نے غزل شروع کی ۔ کیا پڑھا خدا ھی بہتر جانتا ہے بس اتنا معلوم ھوا کہ کھیر، تیر پھیر قافیہ ہے اور ہے ردیف ہے ۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ھوگیا اور تعریفیں شروع ھوئیں ۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا ۔ اعتراض ھوا اور میر صاحب بگڑے ۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے ۔ غزل میں میر صاحب نے ایک مصرعے کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ھوگیا ۔ مولوی مملوک العلی صاحب

---

(۱) اقتباس از دھلی کی آخری شمع ص ٦٦ ۔ ٦٧

نے کہا ۔ اجی میر صاحب یہ مصرع بحر طویل مین جا پڑا ۔ میر صاحب چمک کر بولے مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یون ہی سنی سنائی باتون پر اعتراض ٹھونک دیا ۔ پہلے مطوّل پڑھئے مطوّل (۱) جب معلوم ہوگا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہین " مولوی صاحب بڑے چکرائے ۔ کہنے لگے میر صاحب بھلا مطوّل کو بحر طویل سے کیا واسطہ ۔ مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ ۔ آپ کا جوجی چاہتا ہے کہ جاتے ہین ۔ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی ۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا ۔ انھون نے کہا " مولوی صاحب مطوّل مین بحر طویل کی بحرین نہین تو اور کیا ہے ؟ آپ ہمارے میر صاحب کو علمیت کے دباؤ سے خاموش کردینا چاہتے ہین " ۔ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہوگئے کہنے لگے جی ہان مولوی صاحب آپ سمجھے ہون گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطوّل پڑھی ہی نہین ۔ حضرت مین تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہون ۔ کل ہی اس کی بحر مین غزل کہنے بیٹھا تھا ۔ لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرع کوئی بونے دو سو صفحے مین لکھا ۔ وہ تو بیاس کے صفحے ہی ختم ہوگئے جو مصرع ختم ہوا ورنہ ~~دوسو صفحے مین لکھا~~ خدا معلوم کہان تک جاتا ۔" مرزا نوشہ نے کہا میر صاحب آپ سچ فرماتے ہین ۔ ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہان دیکھی ہے ۔ آپ کا مصرع بحر طویل مین نہین رباعی کی بحر مین ہے ۔ میر صاحب نے بڑے زور سے ہین کی اور بگڑ کر کہا واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھٹک گئے ۔ رباعی کی بحرین آپ کو معلوم بھی ہین ۔ بھلا بتائیے تو سہی کون سی کتاب مین ہین ۔ یہ سوال ذرا ٹیڑھا تھا ۔ مرزا صاحب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا " مین تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کردیا ہے ۔ مرزا صاحب اربعین پڑھئے

(۱) علم معانی و بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطوّل ہے ۔

اربعین (۱) ۔ جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحرین کون کون سی ہین " ۔ غرض اس طرح کی خوش مذاقی مین کوئی گھنٹہ بھر گذر گیا ۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھون نے نیند کے خمار سے آنکھین صاف کردین " ۔ (اقتباس از دھلی کی آخری شمع ص ٦٦ تا ٦٩)

ان محفلون مین شہر کے زندہ دل جمع ہوکر اپنی قادرالکلامی کا اظہار کیا کرتے ۔ کبھی کبھی خوش مذاقی سے گذر کر بات طنز و تعریض تک بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حریفانہ کشاکش تک بھی پہنچ جاتی ۔ بالخصوص جبکہ دو باکمالون کی پشت پر شاگردون کا ایک جم غفیر ہوتا تو فوجداری کی صورت پیدا ہوجاتی کیونکہ ان دنون معیار رکھنے پر پابندی نہ تھی ۔ چنانچہ لکھنؤ کا وہ مشاعرہ جس مین زمانہ کیا عاشقانہ کیا طرح تھی آتش اپنی قرابین سے مسلح ہوکر گئے تھے اور اگر حریف کی طرف سے تحمل کا اظہار نہ ہوتا تو نوبت خونریزی تک پہنچتی (۲) ۔ مصحفی نے لکھنؤ ہی کے ایک اور مشاعرے کا واقعہ لکھا ہے جس مین مرزا علی نقی محشر اور اس کے حریف مرزا علی مہلت مین تلخ کلامی کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ دونون گومتی پار جاکر تیغ آزمائی کرین اور انفرادی جنگ سے اس جھگڑے کو نبٹائین ۔ اس شریفانہ ڈویل مین علی نقی محشر کا حریف مہلت ہلاک ہوا ۔ کچھ مدت بعد اس کے وارثون نے محرم کے ہنگامے مین علی نقی محشر کو ٹھنڈا کرکے انتقام کی پیاس بجھائی (۳) ۔ اس قسم کے واقعات نازک مزاج اشخاص کو بددل کردیتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ غالب یا مومن (۴) جیسے نازک طبع ان مشاعرون مین شریک ہونے سے گریز کرتے تھے جہان تلخ کلامی کا اندیشہ ہو ۔

---

(۱) اربعین فی اصول الدین امام غزالی کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعی کی بحرون سے متعلق کردیا ۔

(۲) آب حیات ص ۳۵۷ (۳) گلشن بے خار ص ۱۷۲ [handwritten: گلستان بے خزان ص ۲۲۸]

(۴) مومن ایک مشاعرے مین بلاوے کا جواب یون دیتے ہین :

" بس صاحب بس ۔ مجھے تو معاف ہی کیجئے ۔ اب دھلی کے مشاعرے شریفون کے جانے کے قابل نہین رہے ۔ ایک صاحب ہین وہ اپنی امت کو لیکر چڑھ آتے ہین (ذوق کی طرف اشارہ ہے) شعر سمجھنے

(بقیہ حاشیہ ص ۸۸ پر ملاحظہ فرمائیے)

ان تفاصیل سے یہ اندازہ لگا لینا غلط ہوگا کہ دہلی یا دوسرے شہروں کے عوام یکسر شاعری میں محو رہتے تھے ـ بیشک یہ شوق اٹھارہیں اور انیسویں صدی میں عام تھا اور آج تک کم و بیش موجود ہے مشاعرے کے علاوہ گنجفہ، پتنگ بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، قماربازی جیسے بیہودہ مشاغل بھی تھے جن کا رونا حالی نے مسدس میں رویا ہے ـ بایں ہمہ ان تباہ کن مشغلوں کے دوش بدوش کچھ ایسے اشغال بھی تھے جو عوام کو ہرزہ گردی سے بچاکر سلامت روی اور نکوکاری کی طرف مائل کرتے تھے ـ اکثر شہروں میں اہل اللہ کی درگاہیں، علماء کے مدرسے، دیندار عالموں کی مجالس وعظ ـ لوگوں کو خدا پرستی و نیک کرداری کی طرف راغب کرتی تھیں ـ نوجوانوں میں ورزش اور کشتی کا شوق تھا ـ اکھاڑوں میں جسمانی ورزش لکڑی، بانک، پٹے، اور شمشیرزنی کی مشق کی جاتی تھی ـ برسات کی شاموں اور چاندنی راتوں میں کبڈی کھیلنا عام تھا ـ دریا چڑھنے پر تیراکی کے مقابلے ہوتے تھے جن کی تصویریں نظیر اکبرآبادی کے کلام میں موجود ہیں ـ عوام کے دوش بدوش خواص بھی ان مردانہ مشاغل میں حصہ لیتے تھے[1] ـ پاکیزہ

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

کی تو کسی کو تمیز نہیں ـ مفت میں واہ وا سبحان اللہ کا غل مچاکر طبیعت کو منغص کردیتے ہیں ـ دوسرے صاحب (حکیم آغا جان عیش کی طرف اشارہ ہے) ہیں وہ ھد ھد کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں پر حملہ کرتے ہیں ـ خود تو میدان میں نہیں آتے اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں ـ اس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ ؎

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں ناخن قوس قزح تشنۂ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کرسکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گذرا ـ
(دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ ص ۲٦)

(۱) اس دور میں عورتوں کو خانگی مصروفیت سے بہت کم فرصت ملتی تھی ـ مگر وہ گھریلو کاموں ہی سے ورزش کے فوائد حاصل کرلیتی تھیں ـ چکی پیسنا ان دنوں معیوب و متروک نہ تھا اور یہ اس عہد کے اکثر گھرانوں میں رائج تھا ـ امرا اور شاہی خاندان کی بعض خواتین شہسواری چوگان بازی شمشیرزنی کی مشق کرتی تھیں ـ انیسویں صدی کے زوال آمادہ ماحول میں بھی جبکہ خاندان شاہی کے مرد اکثر شریفانہ و مردانہ خصائل سے عاری ہورہے تھے بعض خواتین مثلاً نواب زینت محل، شاہ آبادی بیگم، تاج محل وغیرہ سواری اور تفنگ اندازی کی مشق کیا کرتی تھیں ـ نوبت پنج روزہ ص ۵۱ نیز دیکھئے مغل ایمپائر از ایس ایم جعفر، ص ۹۹ نور جہاں کی تفنگ اندازی کا ذکر ـ

(۱) Legacy of India, p.293.

طبع اشخاص فارغ اوقات مین خوش نویسی کی مشق کیا کرتے[1] ۔ علماء و شعراء مین بعض ایسے بھی تھے جو جامع سیف و قلم کہلانے کے مستحق تھے ۔ صاحب گلزار آصفیہ نیز عبدالحلیم شرر خواجہ عبدالروف عشرت وغیرہ نے اپنی یادداشتون مین دربار لکھنؤ، حیدرآباد، رامپور، مٹیا برج کے اکثر باکمالون کا ذکر کیا ہے جو تلوار لگانے، گولی سے رسی، روپیے، یا چراغ کی لو اڑا دینے، اور پٹے لاٹھی یا رومال سے اپنے کوہ پیکر مسلح حریف کو گرا دینے مین حیران کن کمال دکھا سکتے تھے ۔ اسی طرح سرسید نے آثار الصنادید کے باب چہارم مین اپنے وطن مالوف یعنی دہلی کے لوگون کا جو بیان کیا ہے مبالغے سے پاک ہے[2] :

" اگرچہ لوگ یہ خیال کرین گے کہ مین نے جو اس شہر کے لوگون کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطن ہوگا ۔ لیکن جن لوگون کے مزاج مین انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر جان لین گے کہ مین نے جو حال لکھا ہے وہ افراط وتفریط سے خالی ہے ۔ حقیقت مین یہان کے لوگ ایسے ہین کہ شاید اور کسی اقلیم کے نہ ہون گے ۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنرون کا گلدستہ ہے ۔ ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے ۔ ہر ایک کی جبلت مین اخلاق ایسا سمایا ہے کہ اگر ایک ایک بات ان کی لکھی جاوے تو ہزار ہزار اخلاق کی کتاب بن جاوے ۔ اس پر حلم ویسا ہی ہے مروت ویسی ہی ہے دوست پرستی کا کچھ بیان نہین ۔ بغض اور حسد کا نشان نہین ۔ ہزارہا آدمی ہون گے جنھون نے خواہشات نفسانی چھوڑ کر طریقہ سنت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کیا ۔

مردم او جملہ فرشتہ سرشت	خوشدل و خوشخوی چو اہل بہشت
ہر سر موبرتن ایشان ہنر	وامدہ در موئے شگافی بصر
بیشتر از علم و ادب بہرہ مند	زاہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

(1) Legacy of India, p.298.

(2) آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۰

اگرچہ بعض بعض جوان آزاد مزاج آوارہ طبع بھی ھین اور بقول سعدی علیہ الرحمہ کے " در ایام جوانی چنانکہ افتد و دانی " آوارہ مزاج اور لہو و لعب مین بھی مصروف ھین اور بجز عشقبازی اور واھیات کے اور کچھ کام نہین رکھتے لیکن اس پر بھی سب باتین ایک حیا کے ساتھ ھین اور ٹٹی کے اوجھل شکار کھیلتے ھین ۔ اینہم غنیمت است کہ کچھ تو حیا ھے ۔ اور ھزارون جوان سادہ رو نیکخو ایسے ھین کہ باوصف جوانی اور عالم شباب کے مطلق واھیات کی طرف متوجہ نہین اور وہ طریقہ سلامت روی اور نیک طینتی اختیار کیا ھے کہ دیکھنے سے تعلق ھے "[1]

اس دور مین کچھ دھلی ھی پر منحصر نہین ھر جگہ اور شریف گھرانے مین غیرت، خودداری، اصول پرستی اور شرافت کو انسانیت کا جوھر سمجھا جاتا تھا ۔ دھلی اور دوسرے شہرون مین بہت سے بزرگ اتنے محتاط تھے کہ کسی ایسے معتقد یا مرید سے نذر قبول نہ کرتے تھے جس کی وجہ معاش مشتبہ ھو ۔ بداطواری، بے اصولی، بے وفائی یا غداری کسی حال مین قابل درگذر نہ تھی خواہ اسپر دولت و حکومت ھی کا ملمع چڑھا ھوا ھو ۔ چنانچہ جب حکیم احسن اللہ خان (مومن کے پھوپھی زاد بھائی)[2] اپنے آقا بہادر شاہ ظفر سے بیوفائی کے مرتکب ھوئے تو ان پر وہ لعنت ملامت پڑی کہ دھلی سے نکلنے پر مجبور ھوئے باقی عمر جے پور مین بسر کی اور اگر کبھی دھلی آنا ھوا تو گھر سے باھر نکل کر کسی کو صورت دکھانے کی جرات نکر سکتے تھے ۔[3] اس کے برعکس دوستی، رفاقت اور وفاداری کی نہایت درخشان مثالین دیکھنا

---

(۱) مومن کا بھی انداز تھا ۔

(۲) غالب از غلام رسول مہر ص ۳۱۸ ۔

(۳) یہی انجام مرزا الٰہی بخش کا ھوا ۔ غدارون کا یہ سرخیل انگریزون کا مخبراعلی اور ان کے ایجنٹون کا پشت و پناہ تھا ۔ انگریزون کو ایک ایک لمحے کی خبر پہنچاتا تھا ۔ جمنا پر کشتیون کا پل اسی نے برباد کروایا تھا جس سے مجاھدون کو رسل و رسائل اور رسد کی بڑی سخت دقت ھوئی ۔ غرض ھزارون کو برباد کروایا ۔ اس غداری کے صلے مین مرزا الٰہی بخش کو ۲۲۸۳۰ روپے سالانہ کی پنشن اور موضع سہلا اور اسودا جاگیر مین ملے باین ھمہ دلی والے اس کی شکل دیکھنے سے بیزار تھے ۔

چاهو تو متعدد هین ـ واجد علی شاه کی معزولی پر ان کے مصاحب خاص فخر الدوله مرزا محمد رضا برق نے جلاوطنی مین آخر دم تك اپنے ولی نعمت کا ساتھ دیا ـ گویا ان کا یه شعر ان کے حسب حال هوگیا ہے

برق جو کہتے تھے آخر وهی کر کے اٹھے

جان دی آپ کے دروازے په مر کے اٹھے

اسی طرح آتش کے مرنے کے بعد ان کے یار صادق میر دوست علی خلیل نے تجهیز و تکفین کا فریضه انجام دیا اور مرحوم دوست کے اهل و عیال کی کفالت کرتے رهے[1] ـ نواب الهی بخش خان معروف اور حسام الدین حیدر خان مین یگانگت کامل تھی ـ آزاد کے والد سید محمد باقر اور ذوق مین پورا اتحاد تھا ـ غرض اس نوع کی مثالین عام تھین ـ

آثار الصنادید مین ایك صدی پہلے کے حالات پڑھ کر مسرت اور حیرت کا ملا جلا احساس دل پر طاری هوتا هے ـ آج جبکه علم و هنر حاصل کرنے کے مواقع پہلے سے بہت زیاده هین هم هر فن کے باکمالون کی کمی محسوس کرتے هین اور زندگی کے هر شعبے مین قحط الرجال سے دوچار هین مگر اس دور مین مختلف فنون کے کاملون کی وه کثرت تھی که بقول حالی اگر ایك اٹھ جاتا تھا تو اس کی جگه پر کرنے کے لئے اس سے بہتر شخص نکل آتا تھا ـ ان باکمالون مین شاعر، عالم، مورخ، عارف، عابد، درویش، خطاط، جفار، مہندس، هئیت دان، انشاءپرداز، داستان گو، حلوائی، باورچی، کبابی غرض هر فن کے استاد تھے ـ نیچے دی هوئی فہرست پر ایك نظر ڈال کر اندازه کیجئے که ان دنون دهلی مین[2] هر فن کے کامل کس تعداد مین موجود تھے :-

---

(۱) آب حیات ص ۳۲۸

(۲) لکھنؤ مین بھی یہی کیفیت تھی ـ اٹھاروین صدی مین جو باکمال دهلی سے هجرت کر کے وهان پہنچے تھے ان کی اولاد وهین رس بس گئی تھی ـ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے مین ان سب باکمالون کا ذکر کیا هے اور انیس دبیر آتش ناسخ جیسے اساتذه سے لیکر حلوائیون، کبابیون، پتنگ سازون تك کا بیان بہت لطف سے بڑی رعایتون کے ساتھ کیا هے

(۱) بزرگان دین (فقراء) شاہ غلام علی (جن کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر رہتے تھے) عبد الغنی احمد سعید، محمد آفاق، فخر الملۃ والدین، مولانا محمد فخر الدین، قطب الدین، کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر رنج، مولانا محمد حیات، رسول شاہی، نقشبندی، قادری اور چشتیہ سلسلے کے متعدد بزرگ وغیرہ وغیرہ نیز دیگر مجذوبین و قلندر ۔

(۲) مجاہد ۔ شاہ اسمعیل شہید، سید احمد شہید (ساکن رائے بریلی)

(۳) علماء شاہ عبد العزیز شاہ عبد اللہ عبد القادر شاہ رفیع الدین شاہ عبد الغنی (پسران شاہ ولی اللہ کہ یہی ایک خاندان بجائے خود علم کا خازن تھا ۔) زبدۃ المحدثین محمد اسحق نبیرۂ شاہ عبد العزیز ۔ خاتم المحدثین نذیر حسین شاہ صاحب، صدر الدین آزردہ جن کا نام لینے سے پہلے سرسید عزیلب 'ہزار بار بشویم دھن ز مشک و گلاب' کا اہتمام کرتے ہیں ۔ مولوی مملوک العلی جیسے تھے کہ ریزیڈنٹ سے مصافحہ کرنے کے بعد ہاتھ دھونا ضروری سمجھیں ۔

(۴) محقق ۔ فضل امام خیر آبادی ۔ فضل حق خیر آبادی ۔ امام بخش صہبائی ۔

(۵) شعراء ۔ غالب مومن ذوق عارف شیفتہ آزردہ نیر رخشاں فراغ شاہ نصیر ممنون سراج الدین ظفر مرزا ہرگوپال تفتہ بالمکند بصیر نراین داس ضمیر ۔

(۶) اطبا ۔ حکیم احسن اللہ خان غلام نجف خان ۔ ایسے حکیم کہ "جہاں مسیحا ناامید ہوئے وہ بیمار ان کے نسخے سے جی گیا ۔ جن کے نسخے کا ہر حرف ہوالشافی اور ہر نفس نفس عیسی ہے" حکیم شریف خان، محمود خان اعظم ۔

(۷) خوشنویس ۔ محمد امیر پنجہ کش، آغا صاحب، شنکر ناتھ، بدر الدین، علی احمد مہرکن ۔

(۸) مصور ۔ مرزا شاہرخ ۔ غلام علی خان

(۹) موسیقار ۔ ہمت خان ۔ ناصر احمد جو بہت اچھے بین نواز بھی تھے ۔ رحیم سین " کہ چھ

راگ چھتیس راگنی اس کے تار ساز کے بال باندھے غلام اور کنیز ھین " (آثارالصنادید) بہادرخان ستارنواز —

یہ تھے وہ باکمال جن کے نام صفحۂ قرطاس پر اب تک گلدستے کی سی بہار دکھاتے ھین اور جن سے پچھلی صدی کی محفل آراستہ تھی — اسی طرح ہر شہر مین مختلف فنون کے ماہر بہ فرق مراتب موجود تھے — دربار اودھ، دربار رامپور، دربار حیدرآباد، مٹیا برج، مرشد آباد، عظیم آباد، فرخ آباد، ٹانڈہ، بنارس کی ریاستین، چھوٹی جاگیرین، زمینداریان، تعلقے یہ سب کے سب باکمالون کا گہوارہ تھے اور ان کی پرورش کا حق ادا کرتے تھے (۱) —

شمالی ھند مین آبادی کی اکثریت ھندو تھی — مسلمان کل آبادی کا آٹھوان حصہ تھے مگر علوم و فنون، ایجاد و تخلیق، دستکاری اور ھنر مین ھندوؤن سے بہت آگے رہتے تھے — شہرون مین ان کی آبادی مضافات کی نسبت کچھ زیادہ ہوتی تھی جیساکہ آج تک چلی آتی ھے — پھر بھی دونون فرقون مین کشمکش یا عداوت نہ تھی (۲) — دونون کا خون تعصب کے زہر سے پاک تھا — نفرت کی آگ جو آج کل سینون مین مشتعل ھے ان دنون مطلق نہ تھی — ھندو مسلمان ایک دوسرے کے رفیق اور تیج تیوہاری تیوہار مین شریک رہتے تھے — (۳) اختلاف مذھب کے باوجود استادی شاگردی دوستی رفاقت ھمدردی کا حق ادا ہوتا تھا — غالب، ذوق اور شاہ نصیر کے ھندو شاگرد بہت سے تھے غالب آزارہ رو کے ھندو شاگرد اور ارادت مند بھی کافی تھے جنھون نے ھنگامۂ غدر مین ان کی دستگیری کی کیونکہ غدر مین اور اس کے بعد مسلمانون کی حالت سخت زبون ہوگئی تھی — ان مین مرزا ہرگوپال تفتہ نورچشم شیو نرائین آرام چھج مل، بالمکند بےصبر، پیارے لال آشوب کے نام نمایان ھین —

---

(۱) گلزار آصفیہ ص ۳۰۱

(۲) G.T. Garratt: Legacy of India, p.288.

(۳) مغل ایمپائر ص ۳۸۹ —

ان دنوں نیجاہ و ذی علم ہندو گھرانوں کی معاشرت اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ معمول(۱) پڑھے لکھے ہندوؤں کا لباس شیروانی پاجامہ اور پگڑی یا ٹوپی ہوتا تھا۔ بول چال میں طرز فکر میں عقائد میں آداب نشست و برخاست میں مسلمانوں سے اتنے مشابہ ہوگئے تھے کہ تمیز کرنا دشوار تھا۔(۲) بزرگان دین یا درویشوں سے عقیدت رکھنا کتاب کا آغاز بسم اللہ اور حمد و نعت سے کرنا تعزیہ داری کا اہتمام استخارہ تعویذ گنڈوں اور دعاؤں پر اعتقاد گفتگو میں انشاءاللہ سبحان اللہ وغیرہ کلمات کا استعمال المختصر متعدد اسلامی خصوصیات کے حامل تھے۔ کسی قسم کی باہمی کشمکش نہ تھی۔ راشدالخیری نے چار سطروں میں اس یک جہتی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:

" دور جہالت تھا یا ظلمت(۳) لیکن وضعداری کی شاداب بیلوں میں تعلقات کے ایسے سدابہار پھول کھل رہے تھے کہ بوستان ہند ہزار ہزار سر پٹکے مگر وہ رنگ اب میسر نہ ہوگا۔ خلوص کی دیوی کا جوبن نکھرا ہوا صاف شفاف دودھ ان کی گھٹی میں تھا۔ ملکۂ محبت کی آغوش میں پروان چڑھے۔ جوانی نے انسانیت کا سہرا سر سے باندھا ضعیفی نے کامیابی کے پھول نچھاور کیے۔ شاد رہے اور آباد گئے "

---

(۱) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد دوم ص ۵٦۸

(۲) اسلام کے بنیادی عقائد توحید نبوت اور قیامت ہیں۔ اس دور کے ہندو شعراء کا کلام دیکھ لو عقیدوں کا پتہ چل جائے گا چکبست نے راماین کے ایک سین میں رامچندرجی کی زبان سے جن عقائد کا اظہار کیا کرایا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس ایک نفس اوتار کو خدائے واحد کا محض ایک برگزیدہ بندہ سمجھتے تھے۔

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بےخبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

دیا شنکر نسیم اپنی لاجواب مثنوی کو حمد نعت اور منقبت سے شروع کرتے ہیں۔ آج کل کے گئے گذرے دور میں بھی ان ہندو گھرانوں کی موجودہ نسل اپنی پوشاک اور بول چال میں اسلامی انداز دکھاتی ہے۔ تصویروں میں منشی نولکشور کی نورانی داڑھی اور رتن ناتھ سرشار کی ترکی ٹوپی دیکھ کر کون ہے جو انہیں مسلمان نہ سمجھے گا۔

(۳) وداع ظفر ص ۵

اس زمانے مین دلی کی گھریلو زندگی ہو یا یہان کا عام طور پر ملنا جلنا اٹھنا [illegible] میں ڈوب گیا تھا ۔ یہ ایک ایسا روشن ہیرا تھی جس کے کئی پہلو ہون اور ہر پہلو نئی جوت [illegible] والا ہو" ۔ تہذیب نے اس کی ایک ایک ادا کو دلفریب بنا دیا تھا ۔ امن و امان نے ترقی کی راہیں کھول دی تھین ۔ باہمی اتفاق نے سکون قلب بخشا تھا ایک مستحکم مرکزی حکومت (استعماری نظریات اور مذہبی اختلاف کے باوجود) جان و مال کی سلامتی اور عدل و انصاف کی ضامن تھی ۔ نئی تحریکین نئے ولولے پیدا کر رہی تھین ۔ ہر طرف اٹھان اور نشوونما کے آثار نظر آتے تھے جنھین آشوب و تباہی کی پوری ایک صدی کے بعد بجا طور پر احسان الہی سے تعبیر کیا جاتا تھا ۔

---

(۱) دلی کا آخری دیدار از سید وزیر حسن ص ۵

لال قلعہ

۱٦۲۸ ء مین جب یہ خوش منظر و مستحکم قلعہ تیار ہوا تو اس وقت کسے خیال ہوگا کہ سوا سو سال بعد اس پرشکوہ عمارت کی حیثیت ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ کی سی رہ جائے گی اور شاہجہان کا ایک کمزور بے دست و پا خلف یعنی محروم البصارت مسلوب الاختیار شاہ عالم اس مین مجاور کی حیثیت سے بیٹھے گا۔ (۱)

انقلاب زمانہ کے آئین مسلّم سے بچنا غیر ممکن ہے ۔یہی ہوا ۔بکسر کے میدان مین شکست کھاکر شاہ عالم نے بہار اور بنگال کی دیوانی کمپنی بہادر کے ہاتھ بیچ دی اور انگریزون کا وظیفہ خوار ہوگیا ۔ پھر جب ۱۷۷۱ ء مین سیندھیا کی مدد سے اپنے اسلاف کے قلعے مین آکر تخت نشین ہوا تو اس کی حیثیت کٹھ پتلی کی سی تھی جسے سیندھیا حسب مرضی نچاتا تھا (۲) ۔ تاہم برائے نام دہلی سے الہ آباد تک کا علاقہ داخل حکومت تھا ۔ ۱۸۰۳ ء مین جب سیندھیا نے انگریزون سے جنگ کرکے شکست کھائی تو ازروئے معاہدہ یہ علاقہ جس مین آگرہ اور دہلی کے شہر شامل تھے تمام و کمال ہاتھ سے نکل گیا اور اب شاہ عالم کی حکومت لال قلعے (۳) کی چاردیواری مین محدود ہوکر رہ گئی ۔ شاہ عالم کے بعد اکبرشاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر سوا لاکھ روپے ماہوار کے وظیفہ خوار تھے جو انگریزون سے یہ حقیر رقم لیکر جون تون اپنے اخراجات پورے کرتے تھے ۔

---

(۱) آب حیات ص ۴۵٦

(۲) Irvine, Vol.II, p. 161.

(۳) لال قلعے کو کبھی کبھی لال حویلی یا حویلی بھی کہتے تھے چنانچہ یہ لفظ اس باب مین کئی جگہ آئے گا ۔

مسلسل ناکامیان انسان مین احساس کمتری پیدا کردیتی ھین اور حسّاس آدمی اس سے بچنے کے لئے گریز کی راھین تلاش کرنے لگتا ھے - کبھی عیش و عشرت کی طرف راغب ھوتا ھے کبھی شراب ناب کے دامن مین پناہ لیتا ھے اور کبھی بیہودہ مشاغل و تفریحات سے جی بہلاتا ھے - نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ اخلاقی اقدار تباہ ھوجاتے ھین - کردار پست ھوجاتا ھے اور انسان رفتہ رفتہ قعرِ ذلت مین جاگرتا ھے - اکبرِاعظم اور اورنگزیب کے بدنصیب جانشینون کا یہی انجام لال قلعے کی دیوارون نے دیکھا۔

مگر جس طرح مایوس مریض بدپرھیزی پر اتر آتا اور اپنے شوق پورے کرنے پر تل جاتا ھے اسی طرح لال قلعے کے مکینون نے اپنی تباہ شدہ زندگی سے مسرت کا آخری قطرہ تک نچوڑلینے کی کوشش کی - حکومت جا چکی تھی مگر دل کہتا تھا کہ شاھانہ ٹھاٹھ قائم رھے - چنانچہ اکبرو شاھجہان کے زمانے کے عہدے بدستور قائم تھے، دربار لگتا، سردار اور وزیر اپنے اپنے مقام پر کھڑے ھوتے، نقیبون چاؤشون کی دورباش سنائی دیتی سوارون اور پیادون کی صفین سلامی کے لئے کھڑی ھوتین، توقیعات و فرامین جاری ھوتے، عید بقرعید اور بسنت پر خوشیان منائی جاتین تخت نشینی کی سالگرہ کا جشن منعقد ھوتا شعرا قصیدے پڑھتے[1] امیر نذرین گذرانتے، بادشاہ سلامت انھین خطابات خلعت اور انعام سے سرفراز کرتے اور اس طرح اس حکومت کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے جو کبھی کی رخصت[2] ھوچکی تھی -

---

(1) Garratt : Legacy of India, p.303.

(۲) واقعات دارالحکومت از بشیر احمد ص ۳۹۹ - آداب شاھی اس حد تک قائم تھے کہ تہنیت و تعزیت کے مواقع پر ھندوستان کے برائے نام بادشاہ اور شاھان انگلستان مقررہ رسوم باقاعدہ ادا کرتے تھے چنانچہ جب ولیم چہارم کی وفات کے بعد ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ھوئین تو وائسرائے ھند لارڈ آکلینڈ کی معرفت اکبر شاہ ثانی نے تعزیت اور مبارکباد کے پیغام روانہ کئے - اسی طرح اکبر شاہ ثانی کی وفات کے موقع پر شاہ انگلستان کی طرف سے سرچارلس مٹکاف کی معرفت بہادر شاہ ظفر کے نام تعزیت نامہ بھیجا - ایضا ص ۲۰۳

اکبرشاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کو جو وظیفہ ملتا تھا اس کا ایک حصہ مختلف شہزادون اور سلاطین زادون مین تقسیم ہوجاتا ۔ جو بچتا وہ بادشاہ کے ذاتی اخراجات امرا کی تنخواہ' دربار کی آسائش آرائش' مختلف کارخانون (یعنی ڈپارٹمنٹ مثلاً توشہ خانہ فیلخانہ وغیرہ) اور بے شمار حقوق مدون مین کام آتا ۔ محدود آمدنی کے باوجود شاہی اخراجات اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی آبائی جواہرات بیچنے اور شہر کے ساہوکارون سے قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی ۔ باین ہمہ تیموری حوصلہ اس بات کو گوارا نہ کرسکتا تھا کہ پرانے نمک خوارون اور حوسلون کو جواب دے یا ان کے عہدون پر یک لخت تخفیف کا قلم پھیر دے ۔ قدیم عہدے دارون بلکہ ان کے پسماندون کی تنخواہین نسل بعد نسل گھٹ گھٹ کر چند روپون تک رہ گئی تھین ۔ مگر دفتر مین ان کا چہرہ ملازمان شاہی کے زمرے مین درج تھا (۱) اور 'مستوفی الممالک' انھین باقاعدہ ہر ششماہی پر تنخواہ تقسیم کرتا تھا ۔ کچھ ملازم قلعے کے اندر رہتے تھے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو شہر مین رہتے اور ہر روز قلعے مین اپنی خدمات انجام دیکر واپس چلے جاتے ۔ بے دست و پا تہی دست بادشاہ خود چاہے کسی حال مین رہتا مگر تیموری آئین اور آداب حکومت کو نباہتا ۔ خواجگی (۲) جا چکی تھی مگر روش بندہ پروری (۳) اسی طرح موجود تھی ۔ یہی وہ جوہر تھا جو ادبار وزوال کی محیط تاریکی مین آل تیمور کے پاس باقی رہ گیا تھا اور ایک حد تک ان کی اخلاقی پستی کا کفارہ ادا کرتا رہا ۔

---

(۱) مثلاً مفتی صدرالدین آزردہ کے بزرگون کی خدمات کے پیش نظر ڈھائی روپے ماہوار ان کے نام بھی جاری تھے اور یہ رقم انھین بہت عزیز تھی ۔ ابن الوقت ص ۶۸

(۲) ذکاءالله از سی ایف اینڈ ریوز (ترجمہ ضیاءالدین احمد برنی ص ۵۸)

(۳) تان رس خان درباری گویّا تھا ۔ ایک مرتبہ کسی غلطی پر معتوب ہوا مگر بہادر شاہ نے تنخواہ بدستور جاری رکھی ۔ عرش تیموری ص ۵۰

وظیفہ خواری و تہی دستی کے باوجود بادشاہ اور شہزادوں کے مزاج میں تیموری طنطنے کسی
جھوٹی جھلک باقی تھی — شاہزادے، سلاطین زادے، بات بات میں تخت کی قسم کھاتے محدود آمدنی
میں خوش پوشی و خوش خوراکی قائم رکھتے کھانوں، میں لباس میں، سازوسامان میں نئی نئی ایجادیں
کرتے نشست و برخاست سیر و تفریح بات چیت میں شاہانہ ٹھاٹھ دکھاتے — سواری، جلوس، دربار، کھانا،
معاشرت مختلف آداب و رسوم کے معین طریقوں کا جو اہتمام کیا جاتا تھا اور جس کا اثر قلعے سے باہر
دہلی کی زندگی پر پڑتا تھا اس کا نقشہ وزیر حسن، ناصر نذیر فراق، اور منشی فیض الدین نے اپنی
کتابوں میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے —(1)

" قلعے میں گو نام کی بادشاہت رہ گئی تھی مگر بجھتا چراغ تھی — اس گئی گزری حالت میں
بھی بہار دے گئی — اس نہوت میں بھی تحفہ زندگی کا نمونہ بنی رہی — سارے شہر میں اسی
کی چال لی جاتی — اس لئے جسے دلی دیکھنی ہو وہ پہلے ان دنوں کا قلعہ اور بعد میں اور باتیں
دیکھے — شہری زندگی کا یہی سجل نمونہ کبھی عطر زندگی رہا — اسی سے کبھی ہندوستان پڑا
مہکتا تھا —

اس سکھ کی سیم میں کبھی نیا سال شروع ہوتا تو صبح عید کا گلابی نور برستا تھا — بادشاہ
سے لیکر فقیر تک نوروز مناتا تھا — دیوان عام، دیوان خاص، رنگ محل، خاص محل، موتی محل، باغ حیات
بخش، مہتاب باغ، ساون بھادوں، برجوں پر نت نیا سہاؤ ہوتا — محلات کے بیش بہا گل بوٹے پچی کاری
بڑی منہ سے بولتی — سنگ مرمر کی نہر بہشت میں صاف شفاف پانی اس طرح دوڑتا پھرتا جیسے جوش
نور بہتی ہو — جھروکوں کے نیچے انگوری، گلابی باغ تو دلہن بن جاتے — خیمے کھڑے طنابیں میں

---

(1) ناصر نذیر فراق — میخانۂ درد — لال قلعے کی ایک جھلک
منشی فیاض الدین — بزم آخر   وزیر حسن — دلی کا آخری دیدار

شامیانے تنے ہین "۰۰۰ چوبون پر زربفت اطلس لپٹا ہے ریشمی طنابین سونے چاندی کی میخون مین کھینچ دی گی ہین — جھروکون کے باغ سے لگی لگی جمنا بہ رہی ہے — اس مین کشتیان پڑی ہین " (۱) —

محلات کے اندر ترکنین، جشینن قلماقنیان اور باہر مردے پیادے دربان لپالپ جھپاک انتظام کرتے پھرتے ہین — وہ دربار آراستہ ہوا — جہان پناہ ہوادار مین برآمد ہوئے — اس کے چاندی کے چار ڈنڈے ہین — گرد چاندی کا نازک کٹہرہ پشت پر سونے کے کام کا کاؤ دار تکیہ بیچون بیچ زرکوبی مسند تکیہ اطلو پہلو دو اور ملائم تکیے ریشمی ڈوریون سے بندھے ہوئے ہین — دیوان خاص آئے جو بقول فرگسن دنیا کا سب سے شاندار محل تھا — بادشاہت کی سیج تھی — اس کے مرمرین در و دیوار ستون مرغول محراب فرش چھت ہر چیز عقیق مرجان اور بیش بہا پتھرون کی پچی کاری گل بوٹون سے پڑی جھلملا رہی ہے — اجارے سے اوپر چھت کا حصہ توگویا سونے سے لیپ دیا گیا ہے — بیچ مین چاندنی کی سی نہر بہشت بھی روان ہے — صدر مین ہشت پہلو مرمرین چبوترہ ہے جس پر تخت طاؤس دھرا ہے — نذر نذور سے دربار شروع ہوا دعاؤن پر ختم ہوا — شعرا قصیدے پڑھتے ہین خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوتے ہین — شاہزادون کے سہرے جیغے گوشوارے اور معزز امیرون کے سہرے گوشوارے حضور بہادر شاہ خود اپنے ہاتھ سے باندھ رہے ہین —

اس سے بھی کہین زیادہ جشن کے ٹھاٹھ رہتے — یہ بادشاہ سلامت کی تخت نشینی کی سالگرہ ہوتی — پورا ایک چلہ رنگ رلیون مین گذرتا — چارون باقی رہے مہمان داری ہونے لگتی — شاہزادیون امیرزادیون سے محلات بھرجاتے نت نئے شگون ہوتے — طرح طرح کی تیاریان کی جاتین — شادیانے بج رہے ہین — انعامات دئیے جارہے ہین نذر نذور مہمانداری، ناچ رنگ کی بہار ایک چھوڑ چالیس دن رہتی —

---

(۱) دلی کا آخری دیدار ص ۱۱

یون ہی برس کے بارہ مہینے جشن رہتے — دن عید رات شب برات ہوتی — حویلی (قلعہ) کی خوشوقتی سماجی زندگی سے گھٹ گئی تھی — وہاں سے جو مزے کی موج اٹھتی ساری دلّی اس سے شاداب ہوتی — ان دنوں حویلی ایک ایسا دریا تھی جو خود بھی شاداب ہو اور اپنی آبیاری سے اغلو بغلو کو بھی سرسبز کرتا جائے (۱) — "

دسترخوان روزانہ زندگی کا جزو تھا مگر اس کا بھی اتنا اہتمام ہوتا کہ :

اتنے میں دوپہر بج گئی — نعمت خانہ (۲) تیار ہوا — دسترخوان چنا گیا — کھانوں پر سونے چاندی کے ورق جھمک رہے ہیں — گلاب پاشوں سے مشک زعفران عنبر گلاب کیوڑے کا آمیزہ چھڑکا جا رہا ہے — خوشبوؤں کی لپٹوں پہ لپٹیں چلی آتی ہیں — دسترخوان سے لگی بیچوں بیچ صندل کی چوکی بچھی — چوکی کے سامنے تپک پر آلتی پالتی مارے حضور آن بیٹھے — رومال خانے والیوں نے کارچوبی زیر انداز پر پہلے گنگا جمنی چلمچی رکھ ہاتھ دھلائے — گھٹنوں پر زانو پوش ڈالے — دست پاک بینی پاک (۳) آگے رکھ دیے — شاہی خاصے کے خوان بڑی پڑتال سے آرہے ہیں — داروغہ جی بیٹھی حضور کے سامنے مہر توڑ (۴) توڑ کے دیکھ بھال کرتی خاصہ چنتی جاتی ہیں اغلو بغلو بیگمات شاہزادے شاہزادیاں بیٹھی ہیں — مشک زعفران کیوڑے کی بو سے تمام مکان مہک رہا ہے چاندی کے ورقوں سے دسترخوان جگمگا رہا ہے (۵) —

---

(۱) اقتباس از دلی کا آخری دیدار ص ۱۳
(۲) بزم آخر ص ۶۲
(۳) یعنی ناک صاف کرنے کا رومال جو دستمال سے قطعی الگ ہوتا — شاہی نفاست دستمال سے بینی پاک کا کام لینا گوارا نہ کرتی تھی —
(۴) بزم آخر ص ۶۲
(۵) سلطنت کی شمع بھڑک رہی تھی پھر بھی اتنی آب و تاب باقی تھی کہ غیر ملکی مورخ اسے دیکھکر عظمت رفتہ اور موجودہ سطوت کا اعتراف کرتے تھے — پرسیوال اسپیر لکھتا ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی دربار شاہی مختلف علوم و فنون مثلاً شاعری موسیقی مصوری کا گہوارہ تھا اور جس طرح یورپ میں وارسیلز اور پیرس اپنی تہذیب و خوش اطواری کے لئے معروف تھے ہندوستان میں دہلی کا یہی درجہ تھا مختلف فنون کے باکمال اس شہر میں جمع تھے اور مغل دربار حتی الامکان انکی قدرشناسی کرتا تھا — دربار شاہی کا طمطراق ایک حد تک قائم تھا —

بادشاہ خاصہ کھا چکے ۔ دعامانگی، چلمچی، آفتابہ، بیسن دانی، چنبیلی کی کھلی صندل کی ٹکیون کی ڈبیان زیر انداز پر لگی ہین ۔ پہلے بیسن پھر کھلی اور صندل کی ٹکیون سے ہاتھ دھوئے ۔ دسترخوان بڑھایا گیا؂

اس نجی زندگی کی تفصیل سے گذر کر دربار کے آداب پر نظر کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ لٹ جانے کے باوصف دربار شاہی کی ترتیب برہم نہین ہوئی تھی ۔ تورۂ چنگیز خانی (جو مغل بادشاہون کا دستور العمل تھا) کے قواعد بدستور پورے کیے جاتے ۔ دربار کی آرائش کا معقول اہتمام ہوتا ۔ تیوہارون یا جشن کے موقع پر اس مین اور زیادہ آب و رنگ آجاتا ۔ مختلف منصبدار اپنے اپنے عہدون کے لحاظ سے ترتیب وار کھڑے رہتے ۔ معتبرالدولہ اعتبارالملک بہادر (وزیر) عمدۃ الحکما حاذق الزمان حکیم احترام الدولہ بہادر، شمس الدولہ (بخشی) معین الدولہ بہادر (ناظر) سیف الدولہ بہادر راجہ مرزا بہادر، راجہ بہادر، غیاث الدولہ بہادر، سحبان زمان، نجم الدولہ بہادر (غالب) وقارالدولہ بہادر صلح الدولہ بہادر علاءالدولہ بہادر مونس الدولہ بہادر سرفراز الدولہ بہادر میر عدل بہادر میرمنشی دارالانشاء سلطانی میرتوزک میرشکار عرض‌بیگی دیوان خاص کے صحن مین ایک طرف خاصے کے گھوڑے چاندی سونے کے ساز لگے ہوئے، ایک طرف مولابخش خورشید گج چاند مورت (ہاتھی) ہاتھیوں پر فولاد کی ڈھالین سونے کے پھولون کی کانون مین ریشم اور کلابتون کے گپھے اور لوہان کارچوبی جھولین پڑی ہوئی، ایک طرف ماہی مراتب، چتر، نشان، روشن چوکی والے جھنڈیون والے، ڈھلیت جمے کھڑے ہین حبشی، قلار، مردھے، چوبدار، چاندی کے شہردہان سونٹے خاص بردار بندوقین لئے ہوئے کٹہرے کے نیچے کھڑے ہین ۔ دیوان عام کے میدان مین سارٹ پلٹنین جمی کھڑی ہین تہخانے کی توپین لگی ہین ۔ اے لو وہ جسولنی نے اندر سے آواز دی خبردار ہو! نقیب چوبدارون نے جواب دیا اللہ رسول خبردار ہے ۔ بادشاہ برآمد ہوئے ۔ تخت پر جلوس فرمایا جھنڈیان ہلین دنادن

(۱)
توپین چلین فوج نے سلامی اتاری ـ گوہر اکلیل سلطنت مہین پور خلافت ولی عہد بہادر بائین طرف تخت کے اور شاہزادگان والا تبار نامدار قرہ باصرہ خلافت قرۂ ناصیہ سلطنت دائین طرف تخت کے برابر امرا امرا کے آگے کھڑے ہوگئے ـ پہلے ولی عہد بہادر نذر دینے کھڑے ہوئے ـ آداب گاہ پر آئے ـ مجرا کیا نقیب پکارا "جہان پناہ بادشاہ سلامت مہابلی بادشاہ سلامت" مجرا کر کے نذر دی بادشاہ نے نذر لیکر نذرنثار کودے دی ـ الٹے پانو آداب گاہ پر آئے ـ اسی طرح اور شاہزادے امیر امرا اپنے اپنے رتبے سے نذر دے رہے ہین ـ

قلعے سے باہر انگریزون کی حکومت تھی لیکن جب کبھی بادشاہ قدم شریف کی زیارت یا کسی اور تقریب سے قلعے سے باہر نکلتے تو وہی شاہی طمطراق قائم رہتا ـ اب خواہ اسے جھوٹی نمائش سمجھئے یا خود فریبی، مگر حقیقت یہ ہے کہ تیمور و اکبر کے جانشین کو اپنے آبائی جاہ و جلال مین خفیف سی بھی کمی کرتے ہوئے شرم آتی تھی ـ سعدی کے اس شعر مین جو درد ہے اسے اہل دل کے سوا اور کوئی نہین سمجھ سکتا ـ

کہ سفلہ خداوند ہستی مباد   جوانمرد را تنگدستی مباد

حضور بہادر شاہ بادشاہ فاتحہ کو درگاہ شریف آئے ہین(۲) ـ

جلوس شروع ہوگیا ـ پہلے نشان کے دو ہاتھی آئے ـ سر سے پانو تک نقش و نگار بنے ہین ـ کرکری تاش کا پھریرا اڑتا چلا آتا ہے تمامی کی جھولین پڑی ہین ریشمی ڈوریون مین کلابتون کے پھندنے جھول رہے ہین لو وہ چتر کا گرانبار ہاتھی آیا ـ پہاڑ کا پہاڑ جھومتا پھنکارے مارتا سونڈ سے سلام کرتا

---

(۱) اقتباس از بزم آخر ص ۳۰

(۲) ذیل کا اقتباس بزم آخر ص ۸۸ـ۸۶ سے ماخوذ ہے ـ

چلا جاتا ہے - چتر مین سونے کے کلس گنگا جمنی سہارا ہے - نیچے اوپر کلرچوپ کارچوبی کام مین لپا ہوا ہے - کرن کی جھالر جگر جگر کر رہی ہے - وہ ماہی مراتب کے ہاتھی آئے - یہ اگلے بادشاہون کے فتح کے نشان ہین - سونے کے بنے، سنہری چوبون پر لگے، کوئی مچھلی کی شکل ہے کوئی گھوڑے کا سر اور شیر کا کلہ ہے - تاش تمامی قیطونی ڈوریان پھولون کے سہرے بندھے ہین - یہ خاص بادشاہی نشان ہے - ان کے پیچھے نوبت نقارے کے اونٹ، زنبور کے اونٹ آئے نوبت بج رہی ہے - زنبورین چھوٹ رہی ہین - خاصے گھوڑے سونے چاندی کے ساز مین ڈوبے بدلہ بدلہ کر مور بنے جارہے ہین - کالی، اکڑی، بچھیرا، تلنگون کے تمن کمر مین تلوار، کندھون پر دھماکے، بندوق توسدان لگائے دو دو کی قطار مین چلے آتے ہین - احبازی صوبیدار، کمیدان، اور جانے کون کون عینشی توڑے طرے پگڑیون مین لگائے کارچوبی پرتلے حمائل کئے، ایک رنگ سفید گھوڑون پر سوار ہین - مولابخش(۱) خورشید گج چاند مورت نقش و نگار سے سجے، ہاتھون پر فولاد کی ڈھال، کانون مین سونے کے بالے بانات کی کارچوبی جھولین پڑی ہین - ان مین سے جس پر حضور ہین اسے فوجدار(۲) خان مہاوت ایک ہاتھ مین گجباگ (انکس) ایک ہاتھ مین شاہی جھنڈا، ہو لئے چلے آتے ہین - میگ ہبر مین حضور عالم پناہ برای شان و شوکت سے بیٹھے ہین - نیچے قبا اوپر چارقب، دستار و گوشوارہ جیغہ سرپیچ، تاج شاہی جس مین بڑے بڑے موتیون کا طرہ آویزان ہے - گلے مین موتیون کا کنٹھا موتی کی مالا ہیرون کا ہار یاقوت کا ہار بازون پر بھجبند نورتن ہاتھون مین سمرن سر پر خوبصورت چتر کا سایہ، ہاتھی کے سامنے روشن چوکی بج رہی ہے -

---

(۱) یہ ہاتھیون کے نام ہین

(۲) قدیم سے فیلبان کو فوجدار کہتے تھے - اس مین بھی اتنا تکلف تھا کہ یہ عہدہ دار سید ہوتا تھا کیونکہ سید کے سوائے اور کسی شخص کو بادشاہ کی طرف پشت کرنے کی اجازت نہ تھی -

اصلو پہلو خواص، سبز پگڑیاں، کمر میں لال شالی رومال، چنی ہوئی چپکنیں پہنے اپنے اپنے عہدے لئے جاتے ہیں — نقیب چوبدار خبرداری پکار رہے ہیں — خواصی میں مرزا شہو بیٹھے مماکے پر کا رنگین مورچھل کرتے جاتے ہیں — ہاتھی کے پیچھے جو ریشمی ڈوری پڑی ہوتی اسے دربان تاپتا اور جب کوس پورا ہوجاتا تو جھنڈی لے کے سامنے آتا مجرا کرتا — اس سے یہ مراد کہ سواری کوس بھر آئی[1] — گھڑیالسی گھڑی پہر بجاتا ہے — ایک جریب پیچھے ملکہ زمانی شاہزادیوں کی عماریاں ایک جریب پیچھے امیر امرا نواب راجاؤں کی سواریاں سوار رسالے طبل کے ہاتھی پیلے کے ہاتھی پیلہ باشتے چلے آتے ہیں —

پیچھے پیچھے شہزادے سلاطین امیرا امرا رنگ برنگ کپڑے لئے پہنے نئی دھج نرالی وضع سے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ ہیں — ہزارے چھوٹ رہے ہیں خواص گلاب پاشوں سے آمیزہ چھوڑ رہے ہیں کبھی میٹھی پھوار پڑنے لگتی۔ خلقت کے کوٹھوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں چھتے مکان بوجھ کے مارے ٹوٹے پڑتے ہیں — نیچے بھی یہ عالم ہے کہ تومجھ پہ — میں تجھ پہ — کھوے سے کھوا چھلے — بازاروں میں جابجا شماشمر بندی ہے جن میں ابرک کے کنول ان میں شمعیں روشن ہیں — کہیں رنگ برنگ گلاس قمقموں کی بہار ہے — کہیں ہانڈیوں، جھاڑ، فانوس سے آنکھوں میں چکا چوند ہے — دکانوں مکانوں پر ابرک ملاکر جو سفیدی کی گئی ہے اس سے سارے بازار جھم جھم کر رہے ہیں — رات میں دن نکلا ہوا ہے" —

---

(۱) بزم آخر ص ۵۸

وقت کا اور مزاج کا فرق دیکھو — ابھی بہادر شاہ کے اجداد میں اورنگزیب تھا جس نے سارا دکن چھان مارا تھا او کبھی شمار ہی نہ ہوتا تھا کہ آج موکب والا کتنے کوس آیا — ابھی بہادر شاہ کے اسلاف میں اکبر تھا جس نے مرزا عزیز کوکلتاش کو بچانے کے لئے آگرے سے احمد آباد تک کے دھاوے میں نو سو میل کی مسافت سات دن میں ناپ کر رکھ دی تھی —

(۲) سفرنامۂ برنیر ص ۲۸۳ میں امرا کی جو شان و شوکت بیان کی گئی ہے اس کی ایک جھلک اب تک باقی تھی —

برسات میں پھول والوں کا میلہ اب تک اہل دھلی کے لئے بڑی دلچسپی رکھتا ہے – قلعے کی خواتین بھی اس میں شریک ہوتین اور اپنے جہان پناہ کے زیرسایہ خلقت کے ہجوم سے الگ کسی باغ میں اترتین اور جی بہلاتین – شہر سے خلقت پہ خلقت امڈی چلی آتی ہے جن کے مکان ہین وہ اپنے سجے ہوئے مکانون میں آدھمکے غریب غربا کو جہان جائے مل گئی وھین اترجاتے ہین – شاھی محل سے لگا جھرنا' تالاب' ناظر کا باغ' امریون میں بھی زنانہ ہوا – جابجا سبز قناتین[1] لگی ہین – بادشاہ کی سواری پہلے درگاہ شریف آئی – سلام ہوا – فاتحہ پڑھی – پھول چڑھائے – چراغی دی – وھان سے محل ہو جنگلی ڈیوڑھی سے باغ آگئے – بیگماتین' شہزادیان' حرم' ناموس' امیرزادیان سیر کو نکل کھڑی ہوئین – شاھزادیان امیرزادیان رنگ برنگ جوڑے پہنے سونے موتی جواھرات مین ڈوبی چھم چھم کرتی پڑی پھرتی ہین – لو وہ سب جھرنے آگئین – چھیشم چھینٹ ہونے لگی – کوئی شرابور ہوگئی کسی کا پانو پھسلا – ساری لت پت ہوگئی – ایک فرمائشی قہقہہ پڑا – وہ بچاری خفت کی ماری کپکپاتی آنکھ چراتی اپنا سا منہ لئے چلی آتی ہے – ھمجولیان نکو بنارھی ہین – ایک کہتی اجی جی نہ کوھاؤ ایسا ہوتا ہی ہے – دوسری کہتی ہوا تمہاری خفت سرآنکھون پریہ تو بتاو تم نے اس موئی کیچڑ مین ایسی کون سی انوکھی اچرج جان آدم چیز دیکھی جو یون پچھاڑین کھانے لگین – وہ کھسیانی ہو ہو کر بگڑ رہی ہین – الہٰی کرے تم بھی لت پت ہو – تمہاری بھی شیخی کرکری ہو –

جہان نما[2] مین شہر کے سے بانو کی کرسی پر جس مین پشت پر سنہری پھول پتے کے ہین کاشانی مخمل کا نرم نرم گدا بچھا ہے – حضور بہادر شاہ بیٹھے ہین – جھوم جھوم گھٹا آرھی ہے مورجھنکار ....

(۱) یہ بادشاہی رنگ تھا –

(۲) بارہ دری کے انداز کی ایک کھلی ہوئی عمارت

سے امیر الدعری۔ بہادر شاہ ظفر ص ۷۴

رہے ہین ۔ بلبلین چہک رہی ہین ۔ کوہل کوکتی ہے ۔ جی ہین ہوک اٹھتی ہے ۔ پپیہیون کی پی کہان کا جدا شور ہے ۔ کیاریون مین شاہزادیان بھیگی بھول توڑتی پھرتی ہین ۔ ایسا معلوم دیتا جیسے رنگ برنگ کی تیتریان پھول پھول اڑتی پھرتی ہون ۔ کبھی یہان ٹھٹکین کبھی وہان جھول پڑین رنگین جوڑون سے چوطرف لالہ نافرمان کھل گیا ہے ۔ مینہ کی پھوار سے رنگ کٹ کٹ کے رنگین پانی بہ رہا ہے کوئی آمون کے درخت پر پتھر مار رہی ہے ۔ کوئی کیلے کی گہل پکڑے کہ رہی ہے اچھی میری اچپل، دلشاد، دردانہ ذرا اسے تڑوائیو ۔ لونڈیان باندیان گدکڑے لگاتی سگنگے مارتی جھپ جھپ درختون پر چڑھ گئین ۔ توڑ تاڑ وہین بکر بکر کھانے لگین ۔ کسی کے کاٹا چیما کوئی گد سے نیچے آپڑی اے لو وہ شام ہوگئی دونون وقت ملے ۔ جھٹپٹا ہوا ۔ شمسی تالاب کے کنارے کنارے بانسون کے ٹھاٹھون مین لال لال کنول، ان مین دغدغے، روشن ہین، درختون مین قمقمے جگمگ جگمگ کر رہے ہین ۔ محلات مین جھاڑ، فانوس، قنیل، سوز، ایک شاخی، دوشاخی، پنج شاخی دیوارگیریان، چینی لالٹینون سے رات دن بن گئی ہے ۔ تان رس خان سرانچے کے باہر تانین لگا رہے ہین ۔ ناچ ہو رہا ہے ۔ ناچنے والیان اندر سازندے سرانچے کے باہر طبلہ سارنگی تال کی جوڑی بجا رہے ہین[1] ۔

جشن اور دیگر خوشی کی تقریبین جس ٹھاٹھ سے منائی جاتین ان کا کچھ حال گذشتہ اوراق مین بیان ہوا ۔ غمی کی تقریبون کے رسوم بھی اسی طرح معین تھے ۔ بادشاہ مرجاتا تو اس کے مرنے کی خبر مشہور نہ کرتے بلکہ مناسب بندوبست ہونے تک اس خبر کو مخفی رکھتے ۔ اس کے بعد جب عام اعلان ہوتا تو صف ماتم بچھتی ۔ نوبت نقارے الٹے جاتے ۔ چولھے ٹھنڈے کردیتے ۔ سب رسمین خوشی کی موقوف ہوجاتین ۔

---

(۱) دلی کا آخری دیدار ص ۷۲

تابوت کو نالکی میں رکھ کر نکالتے جس پر سراسر تمامی لپٹی ہوتی ـ بیٹے، بھتیجے، عزیز، اقربا، امیر امرا جنازے کے ساتھ روتے آنسو بہاتے سرجھکائے چلتے ـ آگے آگے خاصے کے گھوڑے (١) اور سپاہیوں کے دستے، الٹی بندوقیں کندھوں پر رکھے، میت کے پیچھے ہاتھی، ہاتھیوں پر سے شہر مالین باقرخانیاں روپے اٹھنیاں چونیاں دونیاں اور ٹکے خیرات کرتے چلے آتے ـ شہر کی خلقت دیکھنے کے لئے امنڈ آتی ـ

میر عمارت کو قبر کی تیاری کا حکم ملتا جو لحد کے اندر گلاب کیوڑے کے شیشے اور عطر ڈال کر سنگ مرمر کا تعویذ تیار کردیتا ـ سارا خاندان قبر پر آتا ـ کمخواب کا شامیانہ (٢) استادہ کیاجاتا ـ قبر کے

(١) میت کے آگے مرحوم کے گھوڑوں کو لے چلنے کا دستور ترکوں اور تاتاریوں کا پرانا قاعدہ تھا جسے مغلوں نے بعد اسلام بھی قائم رکھا ـ شاہنامے میں اس رسم کا نقشہ ملتا ہے ؎

پشوتن ہمی رفت پیش سپاہ	بریدہ بش و یال اسپ سیاہ
برو برنہادہ نگوں سار زین	ز زین اندر آویختہ گرز کین

(٢) بزم آخر ص ٩٦ ـ

ان رسموں کا حال اس لئے بیان کرنا ضروری سمجھا گیا کہ قلعے کی رسوم اہل شہر بلکہ سارے ملک کی معاشرت پر اثر ڈالتی تھیں ـ بادشاہوں کی تقلید امیر امراء کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ بھی وہی طریقے اختیار کرتا ـ زہر عشق میں سوداگر زادی کے جنازے کا جو نقشہ نواب مرزا شوق نے کھینچا ہے وہ اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ؎

شامیانہ تیا زری کا تھا	نیچے تابوت اس پری کا تھا
پیچھے پیچھے فنس میں تھی مادر	کہتی جاتی تھی اس طرح روکر
تیری میت کے ہوگئی میں نثار	کم سخن ہائے میری غیرت دار

میت والے گھر میں یوں بھی غم ہوتا ہے اقرّہ روتے ہیں ـ مگر اس دور میں جب کہ مراسم کو پورے اہتمام سے انجام دینا مذہب کا درجہ رکھتا تھا ایک دستور یہ بھی تھا کہ کرائے کے رونے والے اور بلائے جاتے جو اپنے مخصوص انداز نیز بلند آواز سے شور فغان کو آسمان تک پہنچاتے ـ غالب نے

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں جو حسرت ظاہر کی ہے وہ یہی اشارہ کرتی ہے ـ

گرد پھولون کا چھپرکھٹ پھیلاتے ــ بیچ مین کمخواب کا قبرپوش ہوتا جس پر پھولون کی چادر(1) ڈالتے ــ محتاجون کے لئے جوڑے برابر مین رکھتے ــ بالاپوش کی ایک جوڑی بانٹنی رکھی جاتی ــ عود اگر سلگاتے پھر مردون کے ہٹنے کے بعد زنانہ ہوتا یعنی بیگمات آتین فاتحہ خیر کے بعد سب واپس جاتے ــ

وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت جو کچھ تھی اسے وہ خود بھی سمجھتا تھا مگر خواہ اسے نمود و نمائش کہئے یا بزرگون کے نام کی لاج(2) بادشاہ کو یہ منظور نہ تھا کہ ظاہری طمطراق مین کوئی فرق آئے دربار، دسترخوان لباس اور جلوس کی شاہانہ شان قائم رکھنا اس کا ایمان تھا ــ بہادر شاہ کچھ تو افتاد طبع کے ہاتھون اور کچھ حالات کے زیر اثر درویش مزاج اور قنوطی ہو گیا تھا مگر آبائی جاہ و جلال سے ہاتھ اٹھانے کو تیار نہ تھا ــ اس گئی گذری حالت مین بھی سامان معیشت کا اتنا اہتمام ہوتا تھا کہ اگر صرف دسترخوان کی اشیاء اور دیگر لوازم کا بیان کیا جائے تو ایک کتابچہ تیار ہوجائے ــ یہان صرف چند چیزون کے نام لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے یہ دکھلانا مقصود ہے کہ قلعے کی مسرفانہ اور پرافراط طرز معیشت عوام کی معاشرت پر کیا اثر ڈال رہی تھی :

روٹیان | چپاتیان، پھلکے، پراٹھے، روغنی روٹی، بیسنی روٹی، (جو ایک مرتبہ غالب کو بھی بھیجی گئی تھی) دال بھری، خمیری نان، شیرمال، گاؤدیدہ، گاؤزبان، کلچہ، باقرخانی، چاول کی روٹی، بادام کی روٹی، پستے کی روٹی، نان تنک، نان گلزار، نان قماش، نان ختائی، نان پاؤ

---

(1) یعنی پھولون کی مسلسل اور باہم پیوستہ لڑیان جو قبر ڈالتے ــ ان کا ذکر اردو اور فارسی شاعری مین اکثر ملتا ہے ـــ

ڈھونڈھتے مین وہ کہین ملتا نہین میرا مزار
خشک ہوتی جاتی ہے پھولون کی چادر ہاتھ مین

(2) ذکاءاللہ از سی ایف اینڈ ریوز ص ۵۸

چاول | یخنی پلاؤ، موتی پلاؤ، نورمحلی پلاؤ، نکتی پلاؤ، نرگسی پلاؤ، کشمشی پلاؤ، آبی پلاؤ، زمردی پلاؤ، سنہری پلاؤ، مزعفر، مرغ پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، بیضہ پلاؤ، انناس پلاؤ، بونٹ پلاؤ، بریانی سالم بکرے کا پلاؤ، چلاؤ، شولہ، کھچڑی، قبولی، ھنجن، طاھری، زردہ، بادام کی کھیر، کنگنی کی کھیر۔

سالن | مختلف پرندوں کے قورمے پسندے شوربے مختلف اقسام کے کباب مختلف انداز کی مچھلیاں طرح طرح سے پکی ھوئی سبزیاں، راستہ، بورانی، اچار، مربے، چٹنیاں

متفرقات | مختلف اقسام کے حلوے مثلاً سوھن حلوا گری کا پپڑی کا حبشی گوندے کا ۔ مٹھائیاں مثلاً مونگ کے لڈو، نکتی کے لڈو، موتی چور، ملائی کے لڈو، لوزات مونگ کی دودھ کی، پستے کی، بادام کی، امرتی، قلاقند، جلیبی، برفی، موتی پاک، بالوشاھی، پھینی، اندرسے

غور کیجئے کہ اس اهتمام پر جو هر کارخانے میں برابر رکھا جاتا تھا کتنا خرچ ھوتا ھوگا اور اس سے کتنے لوگوں کے پیٹ پلتے ھوں گے ۔تہی دستی و کم معاشی کے باوجود اپنے متوسلوں پر نوازش کرنا، نسل بعد نسل ان کے عہدوں کو قائم رکھ کر ماتحت پروری کرنا، بات کو نباھنا اور خون جگر کھاکر اپنی وضع قائم رکھنا ان آخری بادشاھوں کا اصول تھا جسے وہ مرتے مرتے نہ چھوڑ سکے ۔ھر شخص کی جو حیثیت مقرر تھی اسے ملحوظ رکھتے اور جو قول کرلیتے اسے آخر تک نباھنا لازمۂ شرافت سمجھتے ۔اس میں ھندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی[1] ۔ باپ کے بعد بیٹا اس اصول کو نباھتا ۔ اس کی تشریح کے لئے ایک واقعہ لکھ دینا مناسب ھے :

عزیزالدین عالمگیر ثانی کو نمکحرام وزیر غازی الدین خان عماد الملک ایک خدارسیدہ فقیر کی زیارت کے بہانے فیروزشاہ کے کوٹلے میں لے گیا ۔دو قاتل پہلے سے چھپا دیے تھے ۔جوں ھی بادشاہ داخل

---

(۱) Ibne Hasan Central Construction of Moghal Empire, p.357.

ہوا دونوں نے خنجر سے کام تمام کردیا اور لاش دریا کی طرف پھینک دی ۔ادھر سے ایک ہندو عورت رام کور چلی آتی تھی ۔اس نے پہچان لیا کہ بادشاہ کی لاش ہے ۔ اپنے ان داتا کی لاش کو چھوڑ کر چلے جانا گوارا نہ کرسکی ۔وہیں بیٹھ گئی ۔بہت دیر بعد امیر امرا کوٹلے کے اندر گھسے تو دیکھا کہ جہاں پناہ کی لاش نیچے پڑی ہوئی ہے اور رام کور اس کی نگرانی کر رہی ہے ۔لاش کو شاہانہ اہتمام کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا گیا ۔شاہ عالم نے اس ہندنی کی اس خیرخواہی پر کہ بیکسی کے عالم میں میرے باپ کی لاش کی رکھوالی کرتی رہی اپنی بہن بنالیا ۔بہت کچھ اس کو دیا اور بہنوں کی سی رسمیں اس کے ساتھ برتتے رہے ۔وہ بھی بھائی سمجھ کر اپنی رسم کے مطابق سلونوں کے تیوہار پر تھالوں میں شھائی لیکر آیا کرتی ۔اور بادشاہ کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی راکھی باندھتی ۔بادشاہ اسے شاہانہ عنایات سے نوازتے ۔شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ نے اور اس کے بعد بہادر شاہ نے اس کی اولاد در اولاد سے یہ رسم نباہی ۔(1)

ایک صدی پہلے قلعے کا جو نقشہ تھا اس کے بعض بھدے پہلو بیان ہوچکے ۔مرور ایام نے اس جھوٹی نمایش پر تقدس کا رنگ پھیر کر ہماری نگاہ میں اسے اور محترم بنادیا ہے ۔ سن ستاون میں قلعے کی بربادی اور برگشتہ بخت بہادر شاہ کی جلاوطنی نے اس کے لئے عوام کے سینوں میں ہمدردی کا جذبہ بیدار کردیا ہے ۔تاہم اس دور کی معاشرت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ہمیں ان عیوب سے آنکھیں بند کرلینی مناسب نہیں جو لال قلعے کی چاردیواری میں پھیل رہے تھے اور جنھیں ضعیف و معمر بہادر شاہ کا کمزور ہاتھ روکنے سے قاصر تھا ۔

پہلے بیان ہوچکا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں شمالی ہند کے عوام علمی مذہبی اور سیاسی اعتبار سے بیدار ہورہے تھے ۔مگر قلعے میں معاملہ برعکس تھا ۔تیمور کی اولاد جیسے مشاعروں

(1) بزم آخر از منشی فیض الدین ص ٦٧

مین جانے، بٹیرین لڑوانے، اور پینگ مانگنے کے سوائے اور کوئی کام نہ تھا اکثر شریفانہ اور مردانہ صفات سے عاری ہوچکی تھی — ملک داری یا سپہ سالاری تو بڑی بات ہے، ان شہزادون اور سلاطینون کو چھوٹے چھوٹے امور کے انصرام کا سلیقہ بھی نہ تھا — وہ تمام عیب جو شریفانہ صفات کو زنگ لگا دیتے ہین ان مین پیدا ہوگئے تھے — منشیات کا استعمال، عیش و عشرت مین اشتغال، اسراف، شیخی، نمود و نمائش، بزدلی، تن آسانی، اور گران جانی نے انھین کارزار حیات سے بالکل بیگانہ بنا دیا تھا — یہ لوگ باہم لڑتے جھگڑتے، بے تکان قرض لیتے[1] اور اس شاہانہ وقار کو برباد کرنے مین کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے جسے بچانے کے لئے بدنصیب بہادر شاہ آخر وقت تک سعی کرتا رہا[2] — ایک سن رسیدہ معمر بزرگ کی حیثیت سے ظفر ان سبھون کی غلطیون سے درگذر کیا کرتا تھا مگر ان ناہنجار شہزادون نے دن رات کی ہنگامہ آرائیون سے اس کی زندگی تلخ کردی تھی — انتہا یہ کہ کبھی کبھی یہ شہزادے خود اس کے خلاف ریزیڈنٹ کو عرضیان بھیجا کرتے[3] اور بعض ایسے راز اگل دیتے جن کا افشا رہے سہے وقار کو خاک مین ملا دیتا تھا — بہادر شاہ ضعف پیری سے مغلوب، جسمانی اور دماغی عوارض سے مضمحل سلاطین کے باہمی جھگڑون سے عاجز، انتہائی دل شکستگی کے عالم مین کبھی کسی گوشے مین منھ چھپاکر آہ بھرتا کبھی آدھی رات کے وقت، پاس باغ کی روشون پر ٹہل ٹہل کر آسمان کی طرف بیکسی سے دیکھتا اور کبھی گھنٹون گھنٹون موہوم، ناقابل بیان تفکرات مین کھویا رہتا — کبھی از خود گفتگو کرتا اور بعض اوقات اس سے ایسی حرکتین سرزد ہوجاتین جو اختلال دماغ پر دلالت کرتی تھین — رات کے سناٹے مین

---

(۱) ۱۸۳۶ء یعنی اکبر شاہ ثانی کے آخر عہد مین پنشن یاب سلاطین کی تعداد ۷۹۵ تھی ظاہر ہے کہ یہ بے کار فوج اکبر شاہ اور بہادر شاہ کو کتنا پریشان رکھتی ہوگی —

(۲) دلی کی آخری بہار ص ۲۵ — راشد الخیری

(۳) وداع ظفر ص ۱۲۱

اس کے دل سے آہین نکلتین ۔آنے والی مصیبت کے پانون کی چاپ محسوس ہوتی اور اسی عالم (۱)
اضطراب مین کروٹین بدل بدل کر یہ تاجدار رات گذار دیتا ۔صبح ہوتی تو اس کے ساتھ وہی دربار
کی مصروفیتین اور آئین شاہی کا درد سر آموجود ہوتا جو شام تک اسے مصروف رکھتا ۔اس کے بعد پھر
وہی اپنے ناکارہ بے مصرف خاندان کا غم ۔راشد الخیری کے بیان کو صحیح مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا
پڑے گا کہ " کوئی گناہ نہ تھا جو قلعے کے شہزادے اور شہزادیان نہ کرتے ہون " (۲) اس بیان کی
مزید تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ جب زمانے کے بے رحم ہاتھ نے تیموری حکومت کی نشانی شمع
بھی بجھا دی اور بابر و اورنگ زیب کے یہ اخلاف غدر کے بعد منظر عام پر آگئے تو انھون نے ذلیل ترین
کردار کا مظاہرہ کیا ۔غرناطے کے بنو سراج انتہائی پستی مین بھی شجاعت اور عرب کی حمیت کے جوہر
دکھا دیتے تھے مگر یہ بدبخت ہر شریفانہ خصلت سے عاری ہوچکے تھے ۔ مردون سے مردانہ غیرت
اور عورتون سے نسوانی شرافت رخصت ہوچکی تھی ۔ غدر نہ تھا ایک کسوٹی تھی جس نے صاف دکھلا
دیا کہ تیمور کا گھرانا حمیت سے بالکل عاری ہوگیا ہے ۔نوبت یہان تک پہنچ گئی تھی کہ مرد بھیک
مانگتے خدمت کرتے اور چلتے چلتے چلمین بھرتے تھے ۔عورتون مین سے جو جوان تھین وہ قحبہ بن گئین اور
جو ضعیف تھین نحبہ گری کرنے لگین ۔ (۳)

حالات کا یہ انداز غیر متوقع نہ تھا ۔واقعات کی رفتار کا تقاضا ہی یہ تھا کہ دودمان تیموری اس
دردناک انجام سے دوچار ہو ۔خود سر بے تمیز شاہزادون اور سلاطین زادون کا بچپن انّا اور دایہ
دادا کی گودون مین گذرتا علم و ہنر یا مردانہ ورزشون کے بجائے یہ پتنگ بازی، بٹیربازی، اور

(۱) دہلی کا آخری سانس ص ۳۱
(۲) نوبت پنج روزہ ص ۱۵۱
(۳) اردوئے معلی ص ۲٦٧

شطرنج میں مشغول رہتے ۔ نوخیز جوانیاں جنھیں برطانوی وظیفے کی افیوں نے ہر طرح کی ذمہ داری سے فارغ کردیا تھا بدلگام ہوکر خانہ جنگی یا عیاشی کی طرف رخ کرتی تھیں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا (۱) ۔ ایسے اتالیق نہ تھے جو انھیں اورنگ زیب، شجاع، یا اعظم، کی طرح تربیت کرتے ۔ شجاعت و لیاقت ہوتی تو کہاں سے ہوتی ۔ عورتوں میں نورجہاں، زیب النساء، جہان آرا، اور گلبدن بیگم کا کردار کیسے پیدا ہوتا ۔ یہ صحیح ہے کہ دہلی میں خاندان ولی اللہ اور دیگر اصلاح پسند علماء نے مسلمانوں کو نکوکاری تقویٰ اور جہاد پر مائل کرکے بہت کچھ اصلاح کی تھی جس کا مختصر بیان سید احمد شہید صاحب کی تحریک کے بہ سلسلہ ہوچکا ہے ۔ مگر ان حضرات کی آواز جو عوام میں جوش ایمان پیدا کردیتی تھی قلعے تک نہ پہنچتی تھی ۔ یہاں ان کی بات سننے والا ایک بھی نہ تھا ۔ المختصر انقلاب زمانہ یا مکافات عمل کے ہاتھوں جب یہ گلستان برباد ہوا تو بادخزاں نے اس کے ایک ایک پتے کو ایسا منتشر کیا کہ اس شہ شاہی بہار کا نقشہ پھر نظر ہی نہ آیا (۲) ۔ اکثر غدر کے ہنگامے میں تباہ ہوئے یعنی بغاوت کے جرم میں قتل کیے گئے ۔ بہت سے آوارہ وطن ہوکر عالم غربت میں جاتوں اور ہوپیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ۔ جو بچے انھیں سخت گیر زمانے نے تھوڑے ہی عرصے میں ختم کردیا ۔ بعض سخت جان جو بچتے بچاتے رامپور یا حیدرآباد پہنچے وہاں ملازموں یا وظیفہ خواروں کی جماعت میں داخل ہوگئے ۔ بدنصیب بہادر شاہ رنگوں بھیجے گئے جہاں پانچ سال تک قید وبند کے مصائب اٹھاکر وہ اس طرح دنیا سے رخصت ہوئے (۳) کہ مرتے وقت زینت محل اور مرزا جواں بخت کے سوائے کوئی بالین پر رونے والا بھی نہ تھا ۔ اس طرح دست بُرد روزگار سے لال قلعے کی وہ محفل درہم برہم ہوگئی جس کے شاہی وقار کو بہادر شاہ نے اپنے کمزور، رعشہ دار ہاتھوں سے اب تک سنبھالے رکھا تھا ۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادصبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

---

(۱) قلعہ معلی از عرش تیموری ص ٦
(۲) پرسیوال اسپیر بڑے افسوس سے لکھتا ہے کہ خاندان شاہی کے خاتمے سے دیسی کلچر تباہ ہوگیا
TWILIGHT P. 83
(۳) ۷ نومبر ۱۸٦۲ ء

دوسرا باب

مومن کے ذاتی حالات

آباء واجداد اب تک کسی ذریعے سے اتنی معلومات فراہم نہ ہوسکین جن سے مومن کے اسلاف یا مورث اعلی کا نام معلوم ہوتا ۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کے دادا حکیم نامدار خان اپنے بھائی کامدار خان کے ساتھ شاہ عالم کے عہد مین کشمیر سے جوان کا وطن تھا دہلی آئے[1] اور اطبائے شاہی کے زمرے مین داخل ہوئے ۔ کوچۂ چیلان[2] کی ایک حویلی مین یہ خاندان آباد ہوا[3] ۔ شاہی خدمات کے صلے مین پرگنۂ نارنول (صوبۂ دہلی) کا موضع بلاھہ وغیرہ جاگیر مین ملا ۔

کشمیر مین مومن کے اسلاف اپنی نجابت و شرافت کی بنا پر بہت محترم تھے ۔ اگرچہ اب وہان اس خاندان کے آثار باقی نہین تاھم مومن کے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خان کے کسی مورث کا

---

(۱) آبحیات ص ۲۱۲ ۔ حیات مومن ص ۳۵ مین لکھا ہے کہ نامدار خان آخر عہد شاہ عالم مین دہلی آئے مگر یہ غلط ہے ۔ شاہ عالم کا عہد ۱۷۷۲ء سے ۱۸۰۶ء تک ہے ۔ مومن کی ولادت ۱۸۰۰ء مین ہوئی ۔ ظاہر ہے کہ دو پشتون کا فرق کافی بعد زمانی رکھتا ہے ۔ زیادہ محتاط اندازہ یہ ہے کہ نامدار خان شاہ عالم کے آغاز حکومت مین وارد ہوئے ہون گے ۔

(۲) حیات مومن ص ۳۵ ۔

(۳) دلی کا آخری یادگار مشاعرہ ص ۲۲ ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہین کہ بیس بائیس برس ہوئے مین نے یہ مکان خود دیکھا تھا ۔ تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی ۔ سامنے کا حصہ قائم تھا ۔ نہین معلوم اوپر کی منڈیر اتنی نیچی کیون رکھی گئی تھی ۔ اسی منڈیر سے ٹھوکر کھاکر مومن گرے تھے جس کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا ۔

مزار ٹرل کے کنارے اب تک موجود ہے جس کا حوالہ[1] سرسید احمد خان نے آثارالصنادید مین دیا ہے۔ دھلی مین مومن کے آباء و اجداد شاھی امراءمین شمار ہوتے تھے اور ان کا گھرانا بہت معزز تھا ۔ معاصر تذکرہ نویسون مثلاً شیفتہ قادربخش صابر اور سرسید احمد خان نے ان کی عالی گوھری اور امارت کا ذکر کیا ہے پہلی مثنوی شکایت ستم مین مومن نے بھی اپنی آبائی جاہ و ثروت کا اشارہ کیا ھے نیز نواب وزیرالدولہ والی ٹونک والے مدحیہ قصیدے مین اپنی خاندانی ریاست و امارت کی تفصیل درج کی ہے ۔

دربار شاھی سے خانی کا خطاب جو مومن کے دادا کو ملا تھا اس سے بعض حضرات سمجھتے ہین کہ یہ گھرانا پٹھانون کا ہے ۔ لیکن بعض اشخاص جن مین نیاز فتحپوری اور عرش گیاوی شامل ہین یہ رائے رکھتے ہین کہ یہ خانوادہ علوی سادات کا تھا ۔ ایک داخلی شہادت اس سلسلے مین یہ بھی ہے کہ مومن کی شادی خواجہ محمد نصیر رنج کی بیٹی اشرف النساءبیگم سے ہوئی تھی جو میردرد کے نواسے تھے ۔ خواجہ میردرد علیہ الرحمۃ کا گھرانا شرافت و سیادت کے لحاظ سے مستند تھا اور اکثر نجیب الطرفین سیدون کی طرح یہ خانوادہ بھی اپنی بیٹی غیر سادات خاندان مین دینا عار سمجھتا تھا ۔ اگر مومن سید نہ ہوتے تو میردرد کے گھرانے مین ان کی شادی ہرگز نہ ہوتی[2] ۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر نیز مومن کے اخلاف کے بیان پر اعتماد کرکے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ علوی سید تھے ۔ باین ھمہ دو دلیلین ان کی سیادت کے خلاف بھی ملتی ہین ۔ پہلی یہ ہے کہ خود مومن کے خاندان کی لڑکیان غیر سادات مین بیاہی گئی ہین ۔ مثلاً مومن کی پھوپھی حکیم احسن اللہ خان کے والد شیخ عزیزاللہ سے منسوب ہوئین جو شیخ صدیقی تھے اور جن کے مورث ہرات سے نکل کر کشمیر مین آباد ہوئے تھے[3] ۔ اسی طرح مومن کی

---

(۱) آثارالصنادید باب چہارم ص ۳۲ ۔ یہ مزار زمیندار شاہ کے نام سے مشہور ہے ۔
(۲) صاحب حیات مومن نے ان کی سیادت کی یہی دلیل پیش کی ہے ص ۲۷ ۔
(۳) آثارالصنادید باب چہارم ص ۳۲

بیٹی محمدی بیگم کا عقد عبد الغنی وکیل مرزا پور سے ہوا تھا جو غیر سید تھے ۔ دوسری داخلی دلیل جو اس سے بھی قوی ہے خود مومن کی مثنوی کا ایک شعر ہے جس مین وہ اپنی ہاشمی نسب محبوبہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کی الفت کو اپنا جزو ایمان لکھتے ہین ؎

تو جو ہے ہاشمی نسب اے جان

ہے محبت تری مـــرا ایمـــان (۱)

ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ غیر سید مسلمانون کا ہے جو سیدون کو قابل احترام سمجھتے ہین ۔ اگر مومن خود علوی سید ہوتے تو ہاشمی نسب سیدہ کی الفت کو لازمۂ ایمان سمجھنے کا ~~لقبلد~~ اعتقاد کیون ظاہر کرتے ۔

راقم الحروف نے یہ صورت مومن کے سوتیلے نواسے عبد السمیع ابن عبد الغنی صاحب (حال ساکن لاہور) سے بیان کی تو انھون نے ذرا تامل کیا ۔ پھر بولے کہ اس شعر کی تاویل میرے نزدیک یہی ہے کہ شاعر اپنی ترنگ مین سلسلۂ بیان قائم رکھنے کے لئے کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے ۔ ممکن ہے کہ مومن نے اس ہاشمی نسب خاتون کو پھسلانے کے لئے یہ خوشامدانہ بات کہدی ہو ۔ المختصر گومگو کا عالم ہے ۔ آزاد خاص کوچۂ چیلان کے رہنے والے تھے ۔ انھون نے اس سلسلے مین کچھ نہین لکھا ۔ ہر مقام پر خان صاحب کے لفظ سے ان کا ذکر کیا ہے ۔ شیفتہ اور عبد الرحمن آھی بھی خان موصوف اور خان صاحب لکھ کر ان کی طرف اشارہ کرتے ہین ۔ سیادت کا مطلق ذکر نہین کرتے ۔

باین ہمہ مومن کی عالی خاندانی مسلم ہے ۔ ان کے دادا نامدار خان شاہی منصب دار تھے ۔ پرگنہ نارنول کے چند مواضع ان کی جاگیر تھے (۲) ۔ بعد مین جب نواب فیض طلب خان کو جھجھر کی ریاست سرکار انگلشیہ کی طرف سے عطا ہوئی اور یہ مواضع ان کے تصرف مین آگئے تو نامدار خان کے وارثون کو ایک ہزار روپے سالانہ بطور پنشن ملنے لگے (۳) ۔ اس طرح آبائی امارت کا ٹھاٹھ ایک حد تک قائم رہا ۔

(۱) کلیات مومن اردو مرکز کراچی ص ۳۲۹ (۲) رام بابو سکسینہ ۔ تاریخ ادب اردو مترجم ص ۳۵۶
(۳) آبحیات ص ۴۲۱ ۔

خاندانی جاہ و ثروت کا یہ پندار مومن کو ورثے مین ملا تھا ـ اسی احساس نے مومن کو وہ بلند نگاہی عطا کی تھی جس نے انھین مدت العمر کسی امیر یا رئیس کے آستانے پر جھکنے کی اجازت نہ دی ـ ان کے فارسی رقعات مین خود شناسی و عالی ہمتی کے جواہر پارے جو جابجا چمکتے نظر آتے ہین وہ اسی عالی گوہری کا نتیجہ ہین ـ اسی امارت و نجابت کا اثر تھا کہ جب خاندانی پنشن تقسیم در تقسیم کے عمل سے کم ہوگئی تب بھی مومن نے اپنی رئیسانہ وضع مین کمی کرنا گوارا نہ کی اور خوش پوشی کا انداز آخر تک قائم رکھا ـ

مومن کے چچا حکیم غلام حسن خان اور حکیم غلام حیدر خان بھی دہلی کے باکمال طبیبون اور ارباب ثروت مین شمار ہوتے تھے ـ سرسید احمد خان نے آثارالصنادید کے چوتھے باب مین ان کا ذکر بڑی شیفتگی کے ساتھ کیا ہے(1) اور حکیم غلام حیدر خان سے اپنے تلمذ کی نسبت بطور فخر بیان کی ہے ـ

مختلف ذرائع سے مومن کا شجرہ جہان تک معلوم ہوسکا بہ تفصیل ذیل درج کیاجاتا ہے ـ اس مین مومن کی اولاد شامل نہین ـ ان کا ذکر اس باب کے آخری حصے مین آئے گا ـ

حکیم نامدار خان — حکیم کامدار خان (برادر نامدار خان)(2)

حکیم نامدار خان کی اولاد:
- حکیم غلام حسن خان
  - حکیم عبد الناصر
- حکیم غلام حسین خان
- حکیم غلام حیدر خان
- حکیم غلام نبی خان ١٢٣١ ھ
  - حکیم محمد مومن خان ١٢٦٨ ھ
  - دختر ہمشیرۂ مومن ١٢٦٨
- دختر زوجہ حکیم عزیزاللہ صدیقی ١٢٦٠ ھ
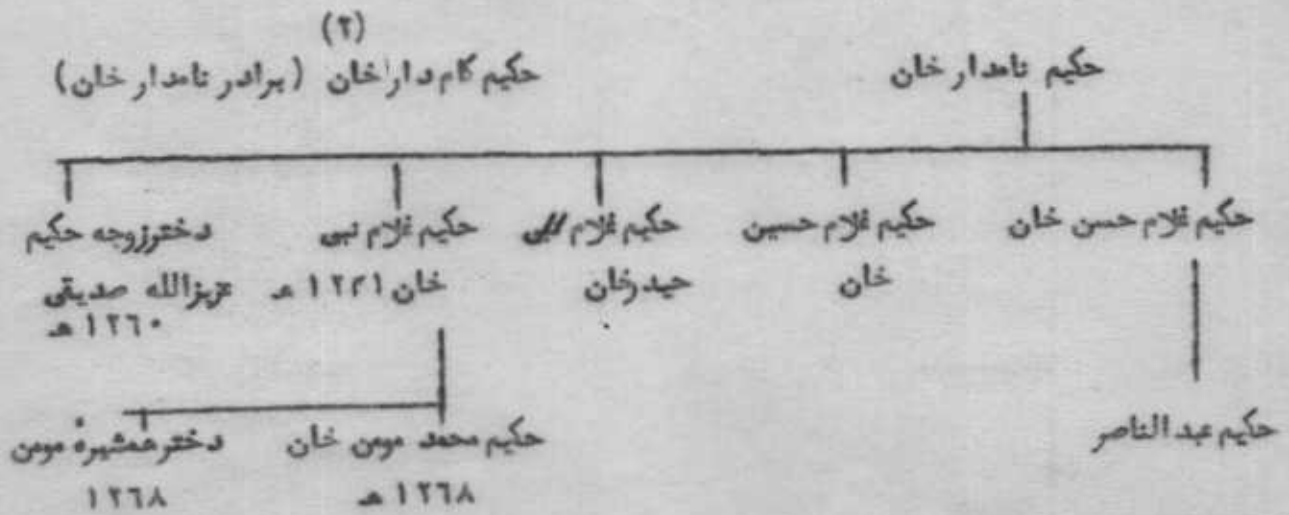
(1) آثارالصنادید ص ٣٣ (باب چہارم ـ ذکر اطبا)

(2) عرش نے حیات مومن مین (صفحہ ١٣١) لکھا ہے کہ حکیم اجمل خان دہلوی حکیم کامدار خان کی نسل سے تھے مگر یہ صریحا غلط ہے ـ

ولادت | مومن کوچۂ چیلان والی حویلی مین ۱۲۱۵ھ کی کسی تاریخ مین جو معین نہین ہوسکی پیدا[1] ہوئے — ان کے والد حکیم غلام نبی خان خاندان ولی اللہی کے ارادت مند تھے — بچے کے کان مین اذان کہنے کے لئے شاہ عبدالعزیز صاحب کو بلاکر لائے — انھون نے اذان کہی اور محمد مومن نام رکھا —[2] عورتون نے اعتراض کیا کہ اصطلاح عام کے اعتبار سے مومن کا لفظ جلاہون کے لئے مخصوص ہوگیا ہے — بہتر ہو کہ حبیب اللہ نام رکھاجائے — مگر یہ اعتراض نہ چلا — شاہ صاحب کا فرمایا ہوا نام ہی رکھا گیا — غالبا شاہ صاحب کے ورود اور ان کے تجویز کردہ نام کی تاثیر تھی کہ مومن نے زندگی بھر رنگین مزاجی اور ہرزہ گردی کے باوصف ایک حد تک کتاب و سنت سے تعلق قائم رکھا — عمر بھر خاندان ولی اللہی کے عقیدت مند رہے اور مرنے کے بعد بھی اسی خاندان کے مقبرے مین زیر دیوار دفن ہوئے —

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کے اٹھے
جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے

تعلیم | شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ کوچۂ چیلان مین تھا — جب مومن نے گھر کی تعلیم سے ابجد شناسی کا مرحلہ طے کرلیا تو ارادت مندی کے تقاضے سے حکیم غلام نبی نے مومن کو تعلیم کے لئے یہین داخل کیا — اس مدرسے مین خاندان ولی اللہی کے افراد درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھتے تھے کہ شریف گھرانون مین یہ شغل ایک متبرک ورثے کی حیثیت رکھتا ہے — چنانچہ شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر شاہ عبدالغنی شاہ محمد اسحق وغیرہ مختلف اوقات مین یہان درس دیتے

---

(۱) ۱۲۱۵ھ ۲۵ مئی ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے — اس طرح مومن کی تاریخ ولادت کا تخمینی تعین جون ۱۸۰۰ء سے مئی ۱۸۰۱ء کے درمیانی عرصے مین ہوسکتا ہے حیرت ہے کہ مومن خود ستارہ شناس زائچہ دان اور تقویم ساز تھے — اگر چاہتے تو بزرگون سے پوچھ کر یا اپنے علم سے تاریخ ولادت معین کرسکتے تھے ۔ ۱۲۱۵ھ کا تعین بھی شیفتہ کے دیباچے گل رعنا ص ۲۰۱ عرش کی حیات مومن ص ۳۷ اور خود مومن کی پہلی مثنوی شکایت ستم سے ہوتا ہے —

(۲) مقدمہ کلیات مومن ص ۲۰ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی مین انھین کامل قدرت تھی اور از راہ فخر اس کا بیان بھی کیا ہے ع لب بہ ہین مہرے بوسہ زن ہندی و تازی ودری

رہے ہین ۔ مومن نے چند کتابین تبرکاً شاہ عبدالعزیز سے پڑھین لیکن زیادہ تر شاہ عبدالقادر سے درس لیا (1) ۔ انھون نے شاہ صاحب سے فارسی عربی (2) فقہ حدیث منطق و معانی کی تکمیل کی ۔ قیاس کہتا ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتون کی بدولت شاہ عبدالقادر وغیرہ کے عزیز شاگردون مین ہون گے ۔ مبداء فیاض سے مومن کو درّاک ذھن بے خطا حافظہ اور بے مثال قوت آخذہ ملی تھی ۔ بارھا ایسا اتفاق ہوا کہ انھون نے ایک روز شاہ صاحب کا وعظ سنا اور دوسرے دن اپنے والد کے مطب مین اسے ادنیٰ تغیر کے ساتھ دوھرادیا (3) ۔ اس نوعمری مین حافظے کی یہ کیفیت تھی کہ شاہ صاحب کے وعظ مین علوم ظاھری کے علاوہ جو باطنی رموز معرفت بیان ہوتے تھے یہ انھین بھی قابل تعریف نظم و ترتیب کے ساتھ سنا دیتے تھے ۔

اس مدرسے مین مومن خاندان ولی اللھی کے مختلف افراد سے تحصیل علم کرتے رھے ۔ لیکن خاص طور پر وہ شاہ عبدالقادر سے استفادہ کرتے تھے ۔ شاہ موصوف کے عربی اور فارسی تبحر کا بیان کرنے کی حاجت نہین ۔ اپنے خاندان کے بیشتر افراد کی طرح وہ ان دونون زبانون پر استادانہ قدرت رکھتے تھے ۔ یہان ان کی فراست اور دوراندیشی کا ذکر کرنا چاھتا ہون انھون نے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اندازہ لگا لیا تھا کہ ھندوستان مین مغل بادشاھون کی حکومت کی طرح درباری زبان یعنی فارسی بھی زوال کی طرف مائل ھے ۔ اسی فراست نے ان کو قرآن مجید کا ترجمہ اردو زبان مین کرنے پر راغب کیا جو سب سے پہلا اردو ترجمہ ہونے کے علاوہ صحت و جامعیت کے لحاظ سے بھی بے نظیر ھے ۔ اس مین ھندی الفاظ کی کافی تعداد ھے مگر ھر لفظ بے نظیر ھے ۔

---

(1) حیات مومن ص ۳۷ ۔ شاہ عبدالقادر صاحب اپنے آبائی مدرسے سے الگ اکبرآبادی مسجد مین جو کچھ فاصلے سے تھی درس دیتے تھے ۔

(2) اردو کے علاوہ فارسی اور عربی مین انھین کامل قدرت تھی اور از راہ فخر اس کا بیان بھی کیا ھے

ع لب پہ ھین میرے بوسہ زن ھندی و تازی و دری ۔

(3) حیات مومن ص ۳۸

مومن کو اپنی خداداد صلاحیتوں کا احساس تھا ۔ شاہ اسمعیل شہید اور اپنے خسر خواجہ محمد نصیر رنج کے سوا اور کسی کو ذہانت میں وہ اپنا ہمسر نہ سمجھتے تھے ۔ انھی لیاقتوں کا پندار گذشتہ و موجودہ شاعروں پر زبان تعریض کھلواتا تھا ۔ ان کا کلیات دیکھ لو ۔ تعلّی شاعر کی فطرت ہے مگر مومن ان جائز حدود سے تجاوز کر کے طنز و تعریض تک پہنچ جاتے ہیں ۔ وہ اخطل جریر، فرزدق اور متنبی جیسے استادوں سے ہم طرحی کو باعث ننگ سمجھتے تھے (۱) ۔ فردوسی و انوری کا ذکر سبکی کے ساتھ کرتے اور سعدی کی گلستان کو ایک معمولی کتاب سے زیادہ وقعت نہ دیتے ۔ یہاں تک کہ گذرتے تھے کہ گلستان میں گفت اور گفتند کی تکرار کے سوا اور کیا رکھا ہے (۲) ۔

اس بارے میں مومن کو ایک حد تک معذور سمجھنا چاہئے ۔ جن اشخاص کو بارگاہ الٰہی سے ذہانت و ایجاد کا جوہر ملتا ہے وہ دوسروں کی تخلیقات سے خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہوں مرعوب نہیں ہوتے ۔ ذہن خدا داد اشتعال دیتا ہے کہ اتنا کام ہم بھی کر سکتے ہیں

ع   دیگران ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

ان کا نعرہ ہوتا ہے ۔ اسی انداز طبیعت کا کرشمہ یہ تھا کہ اپنے ہمعصر شعراء میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے بلکہ انھیں سگان جیفہ خوار مغز سخن سے بے نصیب کا لقب دیتے تھے (۳) ۔ بیچارے ذوق کو تو کبھی ان کے گوشۂ خاطر میں جگہ ملی ہی نہیں (۴) ۔ البتہ مرزا غالب سے دوستانہ تھا ۔ شطرنج

(۱) کلیات اردو ص ۲۳۱ تا متنبی و جریر عار ہے مجھکو ہمسری ۔ قصیدہ در مدح راجہ اجیت سنگھ
(۲) تاریخ ادب اردو ۔ رام بابو سکسینہ ص ۳۵۷ " اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خان کو اس درجہ خیال تھا کہ اس کے مقابلے میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے ۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو ایک معمولی کتاب کہتے تھے ۔ جب سعدی کی نسبت ان کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خاطر میں لاتے ہوں گے "
(۳) کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۳۱
(۴) محمد حسین آزاد نے دیوان ذوق کے مقدمے میں لکھا ہے کہ صرف ایکبار مومن خان ذوق سے ملنے کے لئے ان کے گھر آئے تھے ۔

مین سوائے کرامت علی کے کہ وہ ان کے رشتہ دار بھی تھے اور کسی کو اپنا ھمسر نہ سمجھتے تھے ۔ رمل اور نجوم مین وہ کمال حاصل کیا تھا کہ ان کے احکام بالاکثر درست ھوتے اور لوگون کو حیران کردیتے تھے ۔ غرض ذھن خداداد کی تیزی ھر فن مین انھین آگے بڑھاتی تھی ۔ توائے دماغی کی یھی بے لگام تیزی انھین حسن پرستی اور تماشا دوستی کی طرف بھی لے گئی اور انھین جوانی بھر کاروبار شوق مین مشغول رکھا ۔ جب شباب کی مستی کھولت کے خمار مین تبدیل ھونے لگی تو کوچگرد شاعر کو احساس ھوا کہ ان توتون کو کسی پاکیزہ مشغلے مین صرف کرنا تھا ۔ یہ مقطع دیکھئے ۔ کمال کا پندار اپنی ھرزہ گردی سے پشیمان نظر آتا ھے ۔

موّمن اس ذھن بے خطا پر حیف　　　فکر آمرزش گناہ نہ کی

ظاھر ھے کہ موّمن کے دراّک ذھن نے تعلیم کا مرحلہ بہت جلد طے کرلیا ھوگا ۔ صحیح اندازہ نہین کہ انھون نے شاہ صاحب سے کہان تک تعلیم پائی ۔ مگر اتنا کہہ سکتے ھین کہ اس مدرسے مین انھون نے دیگر علوم کے علاوہ عربی و فارسی کی عمدہ استعداد بہم پہنچائی ھوگی ۔ تذکرہ نگار اس باب مین خاموش ھین ۔ البتہ کریم الدین طبقات الشعرا ذکر موّمن ص ۲۲۳ مین رقم طراز ھین

" حال استعداد کا ان کی یہ ھے کہ عربی مین شرح ملّا تک اور فارسی خوب جانتے ھین"

بہرحال کریم الدین کا قول واضح اور مدلل نہین ۔ وہ عربی کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے ھین جس سے موّمن جیسے جوھر قابل کی لیاقت کا اندازہ لگانا غلط ھوگا ۔ ان کی استعداد اس معیار سے کہین زیادہ تھی ۔ اکبرآبادی مسجد مین جو شاہ عبدالقادر صاحب کا مدرسہ اور مسکن سمجھی جاتی تھی طلبہ کے لئے جو درس رائج تھا اس کی تفصیل درج ذیل ھے ۔ اس سے اندازہ ھوسکتا ھے کہ جب عام طلبہ کے لئے نصاب کا معیار نہ یہ تھا تو موّمن جیسے جوھر قابل نے شاہ عبدالعزیز(عبدالقادر) صاحب سے کستقدر فیض حاصل کیا ھوگا ۔

نحو ـ کافیہ

فقہ ـ شرح وقایہ ـ ھدایہ ـ اصول فقہ حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح

بلاغت ـ مختصر و مطوّل

منطق ـ شرح جامی ـ شرح شمس بازغہ

فلسفہ ـ شرح ھدایۃ الحکمۃ

کلام ـ شرح عقائد نسفی ـ شرح مواقف

حدیث ـ مشکواۃ المصابیح ـ ترمذی ـ کسی قدر صحیح بخاری

تفسیر ـ مدارک ـ بیضاوی ـ

تصوف ـ عوارف المعارف ـ رسال نقشبندیہ ـ مقدمہ شرح لمعات ـ مقدمہ نقد النصوص

طب ـ موجز القانون ـ ھیئت و حساب ـ رسائل مختصرہ ـ

(اقتباس از ھندوستان کی قدیم درسگاھین ص ۹۵ ـ ۹۶ تصنیف ابوالحسنات ندوی)

درسی علوم متداولہ کے علاوہ انھون نے طب نجوم ریاضی اور رمل مین کافی دسترس حاصل کی تھی ـ اس کے دوش بدوش آتشبازی اور سادہ کاری جیسی ادنی حرفتون مین بھی کمال حاصل کیا تھا ـ عرش گیاوی کا بیان ھے کہ انھون نے مومن کے ھاتھ کے بنے ھوئے زیور ان کے گھرانے مین دیکھے تھے (۱) ـ اس معاملے مین مومن کو نظیری سے مشابہت ھے کہ وہ بھی زرگری مین کامل تھا اور کبھی کبھی اس فن سے وجہ معاش پیدا کرلیتا تھا (۲) ـ

---

(۱) حیات مومن ص ۲۰

(۲) شعرالعجم حصہ سوم ص ۱۱۵ ـ

تحصیل علم سے فارغ ہوکر مومنؔ نے اپنی نوجوانی کو بعض اچھے اور بعض برے مشاغل میں لگا دیا ۔ ان مشغلوں میں رمل، جفر، نجوم، شطرنج، حکمت، شاعری، موسیقی، سادہ کاری، عملیات، آتشبازی، عشقبازی سبھی کچھ شامل ہیں ۔ مناسب ہے کہ یہاں ہر ایک کا کچھ حال اختصار کے ساتھ تحریر کیا جائے ۔

رمـــل | محمد حسین آزاد نے اپنے احباب سے مومنؔ کے حالات کی جستجو کی تھی ۔ اس ذیل میں حکیم مومن خان کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم نے انھیں کی چشم دید واقعات لکھے تھے جن سے (۱) فن رمل میں ان کی مہارت واضح ہوتی ہے ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات حساب کتاب کئے بغیر محض سائل کی صورت دیکھ کر حکم لگا دیتے تھے مثلاً :

ایک روز شطرنج کھیل رہے تھے کہ ایک ہندو بہت بیقرار پریشان آیا اور بے اختیار بولا خان صاحب میں لٹ گیا ۔ یہ کچھ پوچھے بغیر بساط سے سر اٹھاکر بولے کہ چپ رہو ۔ اتنا بتاؤ کہ کیا تمہارا کچھ مال چلا گیا ہے ؟ وہ اضطراب میں پھر بولا حضرت کیا کہوں لٹ گیا ۔ یہ اسے پھر بولنے سے روکتے اور کہتے ہیں کہ خاموش رہو ۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو ۔ اگر غلط ہو تو انکار کرتے جاؤ ۔ پھر پوچھا کہ کیا زیور کی قسم سے تھا ۔ اس نے اقرار کیا کہ جی ہاں ساری عمر کی کمائی تھی ۔ کہا گھر میں ہی ہے وہ بولا حضرت ایک ایک کونا چھان مارا ۔ گھر میں نہیں ہے ۔ اب حکیم صاحب شطرنج کو چھوڑ اس کی طرف متوجہ ہوکر ٹوکتے ہیں کہ تم غلط کہتے ہو ۔ اس کے بعد اس کے گھر کا نقشہ اس طرح بیان کرنے لگتے ہیں کہ گویا وہیں کھڑے ہیں ہوں ۔ پھر کہتے ہیں کہ جنوب کے رخ جو کوٹھری ہے اس میں شمال کی جانب لکڑی کا ایک مچان ہے ۔ اس پر تمہارا مال موجود ہے ۔ وہ بولا کہ خان صاحب اسے دیکھ آیا ہوں ۔ یہ کہتے ہیں کہ جاؤ اچھی طرح مچان پر تلاش کرو ۔ وہ ان کی تاکید کا خیال کرکے گھر

(۱) آبحیات ص ۴۱۷

پہنچا اور اب جو غور سے دیکھا تو واقعی زیور کا ڈبا مچان پر ایک کونے مین پڑا ہوا پایا — الٹے پانون واپس آکر خان صاحب کے حکم کی تصدیق کی[1] اور خوش خوش چلا گیا —[2]

اسی طرح ایک روز شطرنج مین محو تھے — حکیم سکھانند راقم رمل مین ان کے شاگرد پاس ہی تھے — کمرے کی دیوار پر ایک چھپکلی بیٹھی تھی — حکیم صاحب سر اٹھاکر اس کی طرف اشارہ کر کے سکھانند راقم سے بولے کہ بھئی دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب ہٹے گی — وہ حساب لگاکر کہتے ہین کہ بس اب جاتی ہے — یہ جواب دیتے ہین کہ واہ — جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے یہ نہین ٹلتی — پھر بدستور شطرنج پر جھک جاتے ہین — کچھ دیر بعد ایک سوداگر ریشمی کپڑا دکھانے کے لئے حکیم صاحب کے پاس آتا ہے — انھین ریشمی پارچات کا شوق نہین عشق تھا — اگر سوداگر اپنا مال ان کے پاس لاتے تھے — یہ بنارسی سوداگر اشارہ پاکر مزدور کے سر پر سے تھانون کی گٹھری اتارتا ہے جون ہی گٹھری زمین پر رکھتا ہے ایک چھپکلی پٹ سے اس مین سے گرتی اور دوڑکر کمرے کی دیوار پر چڑھ پہلی چھپکلی سے مل جاتی ہے — پھر دونون ایک طرف چلی جاتی ہین — حکیم مومن خان سکھانند راقم سے کہتے ہین کہ دیکھا وہ ادب سے جواب دیتے ہین کہ جی حضور حساب کرتے وقت ایک خانے کی غلطی مجھ سے ہوگئی تھی —[3]

نجوم | اس فن مین بھی قابل تعریف کمال حاصل تھا — اگرچہ آزاد یا مرزا فرحت اللہ بیگ نے کوئی واقعہ نقل نہین کیا تاہم اتنا یقینی ہے کہ دلّی مین ان کے احکام کی شہرت

---

(۱) حیات مومن ص ۲۲ نیز آب حیات ص ۴۱۹

(۲) مولانا ابوالخیر کو اپنے خاندانی نوشتون سے معلوم ہوا ہے کہ مومن جفر جامع کے ماہر کامل تھے — اس فن مین سائل کے سوال کی عبارت کے حروف ابجد سے نتائج و احکام اخذ کیے جاتے ہین — مومن کے انھی گوناگون علوم و فنون کی بنا پر سرسید احمد خان نے انھین صاحب کمالات بے اندازہ لکھا ہے —

(۳) حیات مومن ص ۲۳ — دہلی کی آخری شمع ص ۲۳

(۱)
تھی ۔ خود ان کی کلیات سے داخلی شہادتیں ملتی ہیں کہ ستاروں کے اجتماع تثلیث نیز سعدین ونحسین کے مقامات کا حساب لگاکر جو احکام انھوں نے مستخرج کیے وہ اکثر صحیح نکلے ۔جوانی کی شب گردیوں میں مومن ستاروں پر نظر رکھتے تھے اور ان سے وصال و فراق کا شگون لیا کرتے تھے ۔ان میں سے بعض اشعار جو لطف زبان کے علاوہ نجوم کی اصطلاحات کو روشن کرتے ہیں ملاحظہ ہوں :

کرکے استقبال وہ ماہ تمام | لے گئی بارے مجھے بالائے بام
دیکھ کر اوج منجّم بے سخن | جاہ کیواں پر عطارد طعنہ زن
اخترمہ میں کیے ہم نے یہ چین | تھا مبارک اجتماع نیّرین

نور تثلیث چشم کوکب میں | آرزو وصل کی دل شب میں

جوں ہی اس گھر میں ہوا میرا گذر | آئی کچھ تثلیث زہرہ کی نظر

کیا فروغ ان دنوں فراق میں ہے | مشتری زہرہ احتراق میں ہے
ہے عطارد کو ان دنوں میں وبال | خط تقدیر مٹ سکے یہ محال
نجم طالع کو پھر زوال ہوا | اپنا گھر خانۂ وبال ہوا

---

(۱) تذکرہ یورپین شعرائے اردو از سردار علی ص ۳۵

حکیم صاحب کے مختلف فنون کی اتنی شہرت تھی کہ اس دور کے ایک انگریز شاعر جارج پرنس شور نے عائد دھلی کے ذیل میں مومن خان کا حال اپنی مثنوی میں یوں لکھا ہے ؏

یہ مومن بھی شاعر وہ انسان تھے | جنھیں مانتے سب مسلمان تھے
یہ رمّال بھی ایسے تھے انتخاب | حساب رمل جن کا تھا لا جواب
اور حکمت میں وہ تھی انھیں دستگاہ | ارسطو سمجھتا تھا پشت پناہ

اس ضمن مین جب کبھی برے نتائج سامنے آتے تھے تو مومن کی لذت کوش طبیعت سخت الجھتی تھی ۔ وہ کبھی آسمان کے اور کبھی کاتب تقدیر کے شکوے کرتے ۔ کبھی اپنی ستارہ شناسی پر کف افسوس ملتے ؎

ان نصیبون پر کیا اختر شناس آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

تا طالع وکوکبم چہ باشد روزم همه شب شبم چه باشد
ستارہ شناسم و نہ دانم تا طالع وکوکبم چہ باشد[(۱)]

محمد حسین آزاد آب حیات مین لکھتے ہین کہ علم نجوم مین کامل تھے ۔ آغاز سال مین زائچہ اور تقویم تیار کیا کرتے تھے ۔ پھر سارے سال ستارون کے مقامات و مواقع نظر مین رہتے ۔ اس کی تصدیق تقویم کے ان طومارون سے بھی ہوتی ہے جو وہ ہر سال اپنے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خان کو بھیجا کرتے تھے اور جن مین زمانے بھر کے واقعات کی پیش گوئیان ہوتی تھین ۔[(۲)]

کلیات اردو مین ایک آدھ جگہ یہ قرینہ پایاجاتا ہے کہ مومن نے اس فن کو بھی تقریب ملاقات بنالیا تھا ۔ مثنوی پنجم مین مومن کی محبوبہ اپنی ہمراز سہیلیون سے کہتی ہے کہ اگر وہ ادھر سے گذرین تو انھین مجھ سے ملادینا کیونکہ ان سے کسی معاملے مین پیش گوئی مطلوب ہے ؎

کہہ دیا سب سے کہ اک راز نہان آج پوچھون گی کہ ہے بیتاب جان
وہ زبون طالع کہ ہے اختر شناس آئے تو تم بھیج دینا میرے پاس[(۳)]

رام بابوسکسینہ کا بیان ہے کہ انھون نے نجوم مین وہ ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ بڑے بڑے نجومی ان کے احکام کی صحت دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے ۔ دھلی مین ان کے احکام کی دھوم تھی ۔[(۴)]

---

(۱) انشائے مومن ص ۱۱۲
(۲) ایضا ص ۱۳۱ ص ۱۳۸
(۳) کلیات اردو ص ۳۸۱
(۴) تاریخ ادب اردو ص ۳۵۷

طبابت مومن نے آبائی فن کی تحصیل اپنے چچا حکیم غلام حیدر خان اور حکیم غلام حسن خان سے کی تھی ۔ انھی کے مطب میں ایک مدت نسخہ نویسی بھی کرتے رہے ۔ جب استعداد کامل ہوگئی تو خود آزادانہ مطب کرنے لگے ۔ عرشؔ کا بیان ہے کہ حکیم موصوف اپنے گوناگوں اشغال میں حکمت کا حق بھی ادا کرتے تھے ۔ غریبوں کا علاج مفت ہوتا تھا ۔ متمول اشخاص اگر کچھ پیش کرتے تھے تو اسے قبول کرلیتے تھے[۱] ۔ حکمت میں غریب پروری کی روایت قائم رکھی تھی ۔ ان کے کمال کا شہرہ نوجوانی ہی میں ہوچکا تھا ۔ کریم الدین ۔ سرسید احمد خان ۔ نواب علی حسن خان ۔ عبدالغفور نساخؔ یعنی اکثر تذکرہ نویس ان کی مہارت طب کا ذکر کرتے ہیں[۲] ۔ مومنؔ نے بھی جابجا اس فن کا حوالہ کلیات میں دیا ہے ۔ ادبیات کا طالب علم ان واقعات کے دوش بدوش ان اشعار سے بھی قدرتاً دلچسپی کا اظہار کریگا جن سے کسی شاعر کے علوم پر روشنی پڑتی ہو ۔ اس لحاظ سے بعض قصائد جن میں طب کی اصطلاحات آئی ہیں بالخصوص وہ قطعہ جو مومنؔ نے اپنی بیماری کے دوران میں لکھا ہے بہت دل آویز ہے ۔ اس میں اعزہ و اقربا نیز نیم حکیم چارہ گروں کی تجاویز کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا ہے[۳] ؎

موا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بیدرد کو لکھوں
کہ مجھ کو تختۂ مشق اطبا کیوں بنایا ہے
نہ یہ سمجھیں مرض نے کچھ علامت نے سبب پائیں
سری میں آپ مالیخولیا مجھ کو بتایا ہے
کوئی کہتا ہے یہ سکتہ ہے نظروں میں ہماری تو
کئی بار احمقوں نے لا کے آئینہ دکھایا ہے

---

(۱) حیات مومن ص ۳۶ ۔ عرش لکھتے ہیں کہ مومن کے ترتیب دیے ہوئے بعض نسخے قرابادینوں میں ان کے نام سے آج تک چلے آرہے ہیں ۔
(۲) تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۲۳ ۔ بزم سخن ص ۱۰۷ ۔ سخن شعرا ص ۲٦۷
(۳) کلیات اردو ص ۵۵۹

کوئی کہتا ہے دیکھو مستلی ہے نبض مسہل دو
ولیکن پیشتر سے گر کسوئی منضج پلایا ہے
کوئی کہتا ہے روغن دیجئے بادام مقشر کا
یہ نکتہ مرتے دم استاد نے مجھ کو بتایا ہے

ان اصطلاحات وتجاویز کا پورا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جسے طب یونانی سے کافی واقفیت ہو تاہم طنز ومزاح کے نشتر اتنے تیز ہین کہ ناواقف آدمی بھی ان کی کسک محسوس کر سکتے ہین ۔

نجوم کی طرح مومن اس فن کو بھی تقریب ملاقات بنانے سے نہین چوکے ۔ تیسری مثنوی مین حکیم صاحب کی محبوبہ امۃ الفاطمہ المعروف بہ صاحب جی ہے ۔ یہ ماہ طلعت جس شخص کی داشتہ ہے وہ مومن کے پاس آتا اور اس کے علاج کی التماس کرتا ہے ۔ یہ نبض دیکھنے کے لئے جاتے اور اس مہر پیکر کا نور بھرا ہاتھ دیکھتے ہی مرض عشق مین گرفتار ہوجاتے ہین (۱) ۔ اس واقعے کی تفصیل کسی اور مقام پر آئے گی ۔ یہان اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ جس شخص کو مختلف فنون مین دسترس ہوتی ہے وہ ان کی بدولت ہر اچھی بری مجلس مین پہنچ سکتا ہے ۔ مومن کا یہی حال تھا کہ جب تک گھر مین رہتے مختلف فنون کے شیدا انہین گھیرے رہتے ۔ گھر سے باہر نکلتے تو انھی مشاغل کی بدولت جس محفل مین چاہتے پہنچ جاتے ۔

شطرنج | یہ حکیم صاحب کا محبوب ترین کھیل تھا ۔ مولانا فضل حق شیفتہ اور کرامت علی خان ان کے حریف تھے ۔ اس مین انہماک کی یہ کیفیت تھی کہ صبح کو بساط بچھی تو چراغ جل گئے تب اٹھے

(۱) کلیات اردو ص ۳۱۷ ۔

مین نے اس نبض پہ جون ہاتھ دھرا ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا
اس کو جون ہاتھ لگایا مین نے دل سے بس ہاتھ اٹھایا مین نے

اگر شام کو بیٹھے تو صبح ہوگئی — قلعے کے شہزادوں مین مرزا رحیم الدین حیاؔ ان کے شاگرد تھے —[1] ان دنوں قلعہ تو کیا خود بہادر شاہ کی رگ جان ریزیڈنٹ کے ہاتھ مین رہتی تھی — اسے ولایت سے شطرنج کی الجھی ہوئی چالوں کے نقشے آیا کرتے تھے کہ دلی کے شاطروں سے حل کرواکر واپس بھیجو — ریزیڈنٹ مرزا رحیم الدین حیاؔ کو یہ کام سونپ دیتا تھا جو نقشوں کو مومنؔ سے حل کرواکر اسے واپس دے دیتے تھے —[2]

اس فن مین ان کا حریف صحیح کرامت علی خان دھلی کا مشہور شاطر تھا — یہ اس کے ساتھ کھیل کر محظوظ ہوا کرتے تھے — جب قضائے الٰہی سے کرامت علی خان کی بساط زندگی الٹ گئی اور مومن نے قطعۂ تاریخ لکھا تو اس مین بھی شطرنج ہی کی اصطلاحات نظم کین —

مصیبۂ مرگ بین کہ بے مات ۔۔۔ نہ گذاشتہ هیچ آدمی را

زین خانہ بخانۂ عدم برد ۔۔۔ یک کشت کرامت علی را

افسوس کہ طرفہ شہرخے خورد ۔۔۔ نادیدہ عزائے مدعی را

چون فکر خیال سال تاریخ ۔۔۔ زیج کرد رقوم هندسی را

گفتیم کرامت علی خان

تہ کرد بساط زندگی را

غرض تاریخ کہکر حق دوستی ادا کیا — تاریخ وفات کہنا ایک ناگوار فریضہ ہے جو رنگین مزاج خوش باش شاعر کو بطور مشغلہ انجام دینا پڑتا تھا —[3]

---

(۱) حیات مومن ص ۳۸

(۲) ایضاً ص ۳۸

(۳) حتی کہ اپنی تاریخ وفات بھی کہہ رکھنا خان موصوف ہی کی ایجاد ہے —

شاعری | یہ حکیم صاحب کا خاص فن ہے اور اس کی تفصیل اپنے محل پر آئے گی ۔ اتنا اشارہ یہاں مناسب ہے کہ وہ لڑکپن ہی میں شعر کہنے لگے تھے ۔ مدرسۂ رحیمیہ و اکبرآبادی میں ان کی عربی و فارسی کی استعداد نوعمری ہی میں کامل ہوگئی تھی ۔ ہمارے مشاہیر کا بالعموم یہی حال ہے کہ سنّ رشد سے پہلے ہی علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہوجاتے ہیں اور عام طور پر کلام اللہ بچپن ہی میں حفظ کرلیتے ہیں ۔ مومن کے متعلق باقاعدہ یادداشتیں نہیں ملتیں جن سے اندازہ ہوسکے کہ انھوں نے چودہ پندرہ سال کے سن تک اپنے دلپسند علوم کس حد تک حاصل کئے تھے تاہم اس اندازے سے کہ نوعمری ہی میں ان کی طبابت اور شاعری کا شہرہ ہوچکا تھا (۱) ۔ یہ قیاس بعید از صحت نہیں کہ وہ سنّ بلوغ سے پہلے ہی مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ حاصل کرچکے تھے اور شعر کہنے لگے تھے ۔

ان دنوں دہلی کی فضا مشاعروں کے غلغلوں سے گونجی ہوئی تھی ۔ شعرگوئی کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ اس کی صدائے بازگشت سات سمندر پار دی تاسی کے کان تک پہنچ رہی تھی (۲) ۔ ہر ذی استطاعت صاحب ذوق معینہ تاریخ پر اپنے گھر محفل مشاعرہ منعقد کرتا تھا جس میں شہر کے معروف شعراء شوق سے شریک ہوتے تھے (۳) ۔ ظاہر ہے کہ مومن جیسے طبّاع نے جب اس فضا میں آنکھ کھولی ہوگی تو جوہر خداداد کے شوق اظہار نے دل میں گدگدیاں کی ہوں گی ۔ مومن کے بچپن میں شاہ نصیر کی استادی کا غلغلہ بلند تھا کہ قادرالکلامی میں شہرۂ آفاق تھے اور طبیعت کی تیزی میں بجلی کومات کرتے تھے ۔ سنگلاخ زمینوں میں دعوے سے ایسے اشعار نکالتے تھے کہ مسلم الثبوت اساتذہ ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہ جاتے (۴) ۔ مومن اول انھی کے شاگرد ہوئے مگر چونکہ استاد شاگرد کے مزاج میں بعدالمشرقین تھا

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۱۲
(۲) خطبات گارسان دی تاسی مترجم ص ۱۲
(۳) ایضاً صفحہ ۱۲
(۴) آبحیات ۔ ذکر شاہ نصیر ۔

یہ صحبت زیادہ نہ تھی ۔ دو چار غزلین دکھا کر الگ ہوگئے[1] ۔ اس کے بعد اپنی طبیعت ہی سے مشورہ کرتے رہے اور عمر بھر ذوق سلیم کو اپنا رھبر بنائے رکھا ۔ حسب دستور انھون نے اساتذۂ ایران و ھند کے کلام کا مطالعہ کیا ہوگا مگر جس باکمال کا انداز ان کے دل مین کھبا ہوا ہے اور جس کی تقلید وہ شوق سے کرتے ہین عرفی ہے ۔ اس کی زمینون مین کئی قصیدے کہے ہین[2] ۔ اکثر تراکیب مین اسی کا انداز پیش نظر ہے ۔ اردو مین کسی خاص استاد کے پیرو نہین تاہم قصائد مین کہین کہین سودا کا رنگ جھلکتا ہے ۔ بایں ہمہ باقاعدہ شاگردی کا سلسلہ نظر نہین آتا ۔ انھین اپنے کمال کا پندار اس قدر تھا کہ بڑے بڑے استادون کو نظر مین نہ لاتے تھے ۔ شاہ نصیر کی استادی کیسے تسلیم کرتے ۔ ایک جگہ خود لکھتے اور ساری دلی کو گواہ کرتے ہین کہ مبدا فیاض کے سوا مین کسی اور کے فیض کا احسان مند نہین ہون :

" ہمہ کس می داند کہ اوستاد ہرمس و من یکے است
و بجز خالق عقول و نفوس بہ تعلیم دیگرے نیازمند یـم
نیست ۔ آنکہ شمس را نور داد مرا شعـور بخشیـد
و آنکہ کرہ برتری بہ فرق اجرام اثیری نہادہ خیال مـرا
از چرخ اطلس بالاتر رسانیـد "[3]

اس معاملے مین وہ غالب سے مشابہ ہین کہ انھون نے بھی فن شعر مین باقاعدہ کسی کی شاگردی نہین کی ۔ عبدالصمد پارسی سے انھین تحصیل زبان کے سلسلے مین تلمذ ہے جس کا انھون نے خود ذکر کیا ہے

---

(۱) حیات مومن ص ۷۶
(۲) کلیات فارسی ۔ قصائد نمبر ۱ تا نمبر ٦
(۳) انشائے مومن ص ۲۲٦

شاعری مین کسی سے نسبت تلمذ نہ تھی ۔ عبدالصمد نومسلم کے متعلق بھی دلّی کے بے فکرون کا خیال یہی تھا کہ مرزا نے اپنی خفّت مٹانے کے لئے ایک فرضی نام گھڑ لیا ہے (۱) ۔ مرزا غالب خود بھی کہین اپنے ذوق کہین روح القدس اور روش سروش کے فیض اور کہین اساتذۂ سابق کے انداز کو اپنا رھبر قرار دیتے ھین ۔

فی الحال یہ ممکن نہین کہ مومن کی نوجوانی کا کلام معین کیاجاسکے ۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ آغاز شباب ھی مین پختہ مشق ھوچکے تھے ۔ اور ان کی شہرت دھلی سے باھر شمالی ھند کے اکثر شہرون مین پھیل چکی تھی ۔ عبدالقادر رامپوری اپنے روزنامچے مین (۱۲۲۰ ھ مطابق ۱۸۲۵ ء) لکھتے ھین کہ " دھلی کے نوجوان شعرا مین مومن خان مومن ھین جن کا یہ شعر مشہور ہے (۲) ؎

نہ جاؤن گا کبھی جنت مین مین نہ جاؤن گا   اگر نہ ھوئے گا نقشہ تمھارے گھر کا

مومن نے اپنی پہلی مثنوی شکایت ستم ۱۲۳۱ ھ مین مکمل کی جب کہ ان کی عمر سترہ سال تھی ۔ ایک غزل جس کا مطلع ہے ؎

پھر سینہ سوز داغ غم شعلہ فام ھے
پھر گرم جوشی دل و سودائے خام ھے

یقیناً ۱۲۳۶ ھ کی ہے اور اس کے الفاظ و مطالب صاف اشارہ کرتے ھین کہ مومن نے یہ غزل ان دنون کہی تھی جب وہ اکیس سال کے تھے اور امۃ الفاطمہ صاحب جی کے عشق مین نئے نئے مبتلا ھوئے تھے اور جب اس شعلہ عذار کی گرم جوشیون نے انھین روزافزون امیدون کے جال مین پھانس رکھا تھا (۳) ۔

---

(۱) دلی کا آخری دیدار ص ۳۶ ۔ کیونکہ بے استادا یا بے پیرا ھونا مشرقی آداب کے بموجب عیب مین داخل ھے ۔

(۲) روزنامچۂ عبدالقادر ۱۲۲۰ ھ بہ حوالہ کلب علی خان فائق رامپوری

(۳) کلیات اردو ص ۱۶۵ ۔ پھر کس نے مسکرا کے مجھے بیوفا کہا
کیون کہہ رھا ھون بندہ تو صاحب غلام ھے

اسی طرح وہ غزل جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

باہے تھے چین کب غم دوری سے گھر میں ہم

راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

صاف صراحت کرتی ہے کہ ۱۲۳۶ھ کا کلام ہے جب وہ اسی حور طلعت کے غم فراق میں بیخود ہوکر خواہ اس کی تلاش میں خواہ دشت نوردی کے شوق میں دلی سے نکل کر سہسوان پہنچے تھے (۱) –

ان اشعار کی زبان، ادائے مطالب کا انداز اور مومن کا مخصوص رنگ مذکورہ بالا غزلوں میں ایسا رچا ہوا ہے کہ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت دیتا ہے – دستور کے مطابق مومن شہر کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور نوجوانی کے جوش تیز نشۂ کمال کی مستی میں جھوم کر غزلیں پڑھتے تھے – جرأت اور شاہ نصیر کی تقلید میں دو غزلہ یا سہ غزلہ پڑھنے کا رواج ہوچکا تھا – مومن بھی ایک غزل پر بس کرنے کے بجائے بعض اوقات دو دو تین تین غزلیں لکھ کر لاتے تھے اور جرأت کے انداز میں ہر مقطع میں دوسری یا تیسری غزل کا اشارہ کرکے آگے بڑھتے تھے – مندرجہ ذیل مقطع اس رجحان کو واضح کرتے ہیں (۲) ؎

شوق اس بت کو ترے اشعار سے	کہ غزل اک اور بھی مومن کہ ہے
کھل جائے کہ ترک در بت خانہ کریں گے	مومن وہ غزل کہتے ہیں اب جس سے یہ مضمون
آخر اس بزم میں کوئی تو سخندان ہوگا	اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن
مومن اے اهل فن اظہار هنر کرتا ہے	سن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں
جس کو مفلس بھی نہ بدلے نسخۂ اکسیر سے	رشک و امان جواہر اور لکھی ہے غزل
شوخیوں کو جس کی دعوی ہو رم نخچیر سے	مومن اب پڑھتا ہوں وہ مضمون بسمل کی غزل
مومن یہ اسے سنائیں گے ہم	کہہ اور غزل بہ طرز واسوخت

(۱) کلیات اردو ص ۸۷ (۲) کلیات اردو ص ۱۶۰

اس جوش و خروش کے باوجود شوریدہ مزاج شاعر کو اپنا کلام جمع کرنے کا شوق نہ تھا — جو کچھ کہتے تھے بے توجہی سے مشاعروں اور محفلوں میں چھوڑ آتے تھے (۱) — میر حسین تسکین اور نواب مصطفی خان شیفتہ ان کے دوست محرم راز اور غمخوار تھے — انھوں نے بالخصوص موخرالذکر نے بڑی کوشش و کاوش سے ۱۲۴۳ ھ میں چھ ہزار بیت کا ایک دیوان غزلیات مرتب کیا تھا — شیفتہ اس کے متعلق دیباچے میں یوں رقم طراز ہیں :

" پس فراوان جستجو و ہزاران تکاپو اند کے از بسیارے بدست آورد — حیف کہ بسیارے تلف گردیدہ — شکر کہ اندک ہم بہم رسید — انچہ این وقت از خیالاتش یکجا شدہ قیاس شش ہزار بیت می داند (۲) ۔ "

شیفتہ بہت سنجیدہ آدمی تھے اور دیگر امور کی طرح تحریر میں بھی احتیاط و اعتدال کا خیال رکھتے تھے — اگر اند کے از بسیارے کا حساب لگایا جائے تو مومن نے ۱۲۴۳ ھ تک (جبکہ شیفتہ نے ان کا دیوان جمع کیا اور جب ان کی عمر ۲۹ سال تھی) (۳) چھ ہزار اشعار سے کئی گنے شعر کہے ہونگے — اگر ان اشعار کی تعداد چوبیس ہزار بھی مقرر کی جائے تو ۲۹ سال کی عمر تک کا محض (معین) اردو کلام جس میں صرف غزلیں شامل ہیں (مثنویاں قصائد وغیرہ الگ ہیں) غالب کے فارسی و اردو کے مجموعی کلام سے (غزلیات و مثنویات و قصائد) سے دوگنا ہوتا ہے — کلیات فارسی اس کے علاوہ ہے جسے شامل کرلیا جائے تو یہ مجموعہ غالب کے اردو و فارسی اشعار سے چارگنا ہوجائے گا —

---

(۱) حیات مومن ص ٦٧ دیباچہ کلیات اردو از شیفتہ ص ٦٣

(۲) دیباچۂ کلیات از شیفتہ ص ٦٣

(۳) دیباچۂ کلیات اردو از شیفتہ ص ٦٣ — چند سال بعد مومن نے فارسی کی طرف زیادہ توجہ کی تھی — شیفتہ گلشن بیخار (ص ١٩٦) میں لکھتے ہیں کہ آجکل (١٢٥٠ ھ مطابق ١٨٣٢ء) اردو شعر کہنے کی طرف توجہ کم ہے —

افسوس ہے کہ مومن کا اردو دیوان جس مین حسب تصریح شیفتہ چھ ہزار اشعار غزلون کے تھے اب نایاب ہے ۔ آجکل جو دواوین موجود ہین اور جو مختلف مطابع سے وقتا فوقتا طبع ہوئے سب اس نسخے سے منقول ہین جو مومن کے پسر خواندہ میر عبدالرحمن آہی نے ترتیب دیا تھا ۔ مومن شیفتہ کے ترتیب دادہ دیوان کے بعد ۲۳ سال اور زندہ رہے ۔ اس مدت مین انھون نے بہت کچھ کہا ہوگا جو کم از کم اس سے پہلے کے کلام سے دوگنا ضرور ہوگا ۔ افسوس کہ اس سرمائے کا بیشتر حصہ مومن کسی وارستہ مزاجی کے ہاتھون تلف ہوگیا ۔ ۱۲۴۳ ھ مین شیفتہ نہ جانے کیون اپنے استاد کے اس دیوان کو نہ چھپوا سکے جس کی تاریخ انھون نے دیوان بے نظیر کہی تھی (۱) ۔ اب اس تمام و کمال سرمائے کا ایک حقیر جزو یعنی میر عبدالرحمن آہی کے ترتیب دادہ دیوان کا کچھ حصہ ہمارے ہاتھ مین ہے جس کے اشعار غزل کی تعداد ۲۵۷۰ ہے ۔ شیفتہ کی طرح ہم بھی یہ افسوس کرنے پر مجبور ہین کہ تغزل کے یہ بے بہا موتی بری طرح ضائع ہوئے (۲) ۔ اگر آج یہ جواہر موجود ہوتے یا مستقبل مین کسی طرح ہاتھ آجائین تو اردو کا تغزل ایک عظیم سرمائے کا مالک ہوجائے ۔

گلشن بیخار مین مومن کے جو اشعار انتخاب کیے گیے ہین ان سے یہ یقین کرنے مین آسانی پیدا ہوگئی ہے کہ حکیم مومن خان نے ۱۲۵۰ ھ یعنی ۳۵ سال کی عمر تک کون کون سی غزلین کہی تھین ۔ تاہم اس مفید دستاویز سے بھی ان کے بچپن یا نوجوانی کے کلام کا تعین نہین ہوتا ۔ صرف چند غزلین ہین جو مخصوص واقعات کی بنا پر اپنا سنّ تصنیف ظاہر کرتی ہین ۔ دیوان غزلیات سے اندازہ نہین ہوتا کہ ابتدائی غزلین کون کون سی ہین ۔ کلیات اردو کی پہلی غزل جو حسب دستور حمد باری تعالی پر مشتمل ہے بہت بعد کی ہے کیونکہ اس کا یہ شعر صاف اشارہ کرتا ہے کہ ۱۲۴۲ ھ کے آس پاس کہی گئی ہے

(۱) خطبات گارسان مترجم ص ۱۲ ۔ نیز دیباچہ کلیات از شیفتہ ص ۶۲

(۲) ایضـــا ص ۶۳

جب کہ سید احمد شہید کا لشکر سکھوں سے جہاد میں مصروف تھا ــــ

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کے آپہنچا
لبوں پر دم بلا ہے جوش خوں شوق شہادت کا [1]

اس یقین کے باوجود کہ مومن نے نوجوانی میں بہت سی اچھی غزلیں کہی ہوں گی کسی ایک کے متعلق بھی تعین نہیں ہوسکتا (لہذا پہلی مثنوی شکایت ستم کو جس کا تاریخی نام ۱۲۳۱ھ ظاہر کرتا ہے [2] مومن کی شاعری کا نقش اولیں کہنا چاہئیے ــ اس کی تصنیف کے وقت ان کی عمر سترہ سال تھی ــ اس مثنوی میں نوجوان شاعر نے اس محبت کے واقعات نظم کیے ہیں جو اسے بچپن میں کسی حسین لڑکی سے ہوگئی تھی اور جس کی ناگہانی موت کے صدمے سے وہ دو سال تک بدحواس [3] رہا ــ اسی میں اس معاشقے کی تفصیلات بھی قلمبند کی ہیں جو اس نے نوجوانی میں ایک اور ماہ پیکر کے ساتھ (جو غالبا اس کی ہمسایہ تھی) کیا تھا ــ اس ماہ طلعت کے ساتھ عیش و عشرت کے رنگین لمحات چھپ چھپ کر ملنا اندھیری شبوں میں ہوشیاری سے اور چاندنی راتوں میں انتہائی احتیاط سے اس کی خلوت گاہ میں پہنچنا بادۂ عیش سے سرشار رہنا پھر چرخ تفرقہ پرواز کی گردش سے معشوقہ کا ان سے بدگمان ہوکر قطع تعلق کرلینا المختصر دونوں معاشقوں کے حالات اس تفصیل اور اتنی کامیابی سے لکھے ہیں [4] کہ بعض مقامات پر اس نوعمری ہی میں ان کی استادانہ قادرالکلامی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے یہ مثنوی چھ سو چھ اشعار پر مشتمل ہے ــ نوعمر شاعر نے اس میں اپنے مزاج اور ذاتی رجحان مثلاً نو سال کی عمر میں کسی عزیزہ یا ہمسائی پر فریفتہ ہونے کے حالات اس سہولت اور روانی سے بیان کیے [5]

---

(۱) کلیات ــ غزلیات ص ۷
(۲) ایضـــا ص ۲۳۹
(۳) ایضـــا ص ۲۵۱
(۴) کلیات اردو ص ۲۲۰ تا ص ۲۷۰
(۵) ایضـــا ص ۲۲۱

ہین کہ بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے ۔ اشعار کا باہم مربوط ہونا ایک مطلب سے دوسرے مضمون کی طرف گریز، قدرت بیان، اسلوب کی دلفریبی، دلنشین تراکیب کا استعمال، عمدہ تشبیہات و استعارات کا صرف، قافیون کی نشست، علمی اصطلاحات، تسلسل مطالب غرض وہ تمام اوصاف موجود ہین جو عمدہ مثنوی کی بنیادی شرائط شمار کیے جاتے ہین ۔ اپنے پہلے معاشقے کا ذکر کرنے سے پہلے جس جسگہ حال پریشان لکھ کر بڑی خوبی سے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہین وہ مقام خصوصیت سے قابل داد ہے ؎

ساقیا دے چک آب آتش رنگ	گرم و سرد زمانہ سے ہون تنگ
جوش الفت ہو اس قدر مے دے	نہ صراحی سبو بھیا بھے دے
حل قلقل خروش مین آون	صورت بادہ جوش مین آون
جوش دل کو جو یک بیک آوے	راز پنہان زبان تک آوے
یعنی طفلی سے ہون مین پیر مغان	بلبد راہ گمرہان جہان
تھے برس ہم شمارۂ افلاک (۱)	کہ ہوا پائمال صورت خاک
کھودیا چین ایک مہ رو نے	شب سیہ کی ہلال ابرونے
خنجر غمزہ نے ہلاک کیا	نرگس سرمہ سا نے خاک کیا
اور اس کا بھی مجھ پہ دل آیا	کھوکے دل مین نے جان کو پایا
دشنے تھے زخم بار دونون کے	ہوئے سینے فگار دونون کے
ہوئے آرام و صبر ہر دو روان	بے اجازت گشتے سکون و توان

(۱) حکمائے یونان کے خیال مین آسمانون کی تعداد نو ہے

گھر سے عیش و طرب کے جوش گئے
میری نیند اڑنا کے ھوش گئے

ھوئے سرگرم چارہ وتد بیر
کیے کیا کیا علاج بے تاثیر

دستہ ھائے گل و ھجوم سمن
بستر خواب رشک صحن چمن

اڑ گیا اور بھی مرا آرام
حال تغیّر مقتضائے مقام

شہرۂ عاشقانہ ھونے کا
حال میرا فسانہ ھونے کا

کچھ کہ کبھے جو وصال ھوتا تھا
وہ بھی جی کا وبال ھوتا تھا

دیکھ وہ غمزۂ ھراس آلود
نگہ آرزو تھی یاس آلود

شبنم و نرگس اس کی تر آنکھین
جی بھرا آئے دیکھ کر آنکھین

آفت جان ودل فراق و وصال
الغرض یون ھی کٹ گئے دو سال

اس مثنوی مین داخلی شاعری کے بہترین نمونون کے علاوہ منظر کشی تفصیل نگاری اور محاکات نگاری کے اتنے اچھے مرقعے ھین اور ھر جگہ ربط وتسلسل کا یہ عالم ھے کہ مومن کی یہ پہلی کوشش اردو کی بہترین مثنویون کے برابر بے تکلف رکھی جاسکتی ھے -یہان دو چار مقامات سے جستہ جستہ اشعار نقل کیے جاتے ھین :-

۱ - فراق مین اپنے دل کو خود سمجھانا :

یون کہا دل نے اے زبون تقدیر
نہین اس کے سوائے کچھ تدبیر

کہ ذرا جان کو سنبھالو تم
بات جب ھے کہ بات ٹالو تم

چارہ سازون کو ھو نہ حیرانی
نہ کرین اس قدر نگہبانی

جان کا ھو علاج فرصت مین
کھا سکو زھر کھم خلوت مین

بات دل کی مجھسے بسند آئی — ضبط بے طاقتی کی ٹھہرائی

نفس تیز تیز کو روکا — نالۂ شعلہ ریز کو روکا

ظاہر آزار کچھ غرض نہ رہا — لاغری کے سوا مرض نہ رہا (۱)

۲ — راز عشق کھل جانے پر گھر والون کی برہمی :

بذلہ سنجون کو اک بہانہ ہوا — بڑھتے بڑھتے سخن فسانہ ہوا

کوئی کہتا تھا کیا کہے کوئی — کس سے یہ ماجرا کہے کوئی

کوئی کہتا تھا آپ کی کیا بات — اتنی سی عمر اور یہ حرکات

اتنے مین ایک نے کہا آکر — گھر مین ہو آئیے ذرا جاکر

وان سے ناچار آئے ہم گھر مین — پانون رکھتے وہان اژدر مین

آستانے پہ جون قدم رکھا — سر تہ بار سنگ غم رکھا

دیکھتا کیا ہون سارا گھر ہے غین — جو نظر آئے ہے سو چین بہ جبین

اقربا کی نگاہین قہر آلود — دست دشمن مین تیغ زہر آلود

گھر سے اٹھی صدا ملامت کی — اک اک نے جدا قیامت کی (۲)

۳ — محبوبہ کی تجویز کے مطابق مومن کمال احتیاط سے آدھی رات کو اس سے ملنے جاتے ہین — یہان ایک شعر سے اتنا واضح ہوتا ہے کہ مومن چودہ پندرہ سال ہی کی عمر مین علم نجوم سے کافی واقف تھے اور رات کو خانۂ محبوب تک پہنچنے سے پہلے ستارون کے مقامات دیکھ لیتے تھے : (۳)

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۴۸

(۲) ایضا ص ۲۵۵

(۳) ایضا ص ۲٦٦

نور تثلیث چشم کوکب میں | آرزو وصل کی دل شب میں
نیم شب جب ہوئی عنان کش دل | جانب منزل مہ کامل
ہوئے آنکھوں سے ڈرتے ڈرتے رواں | لغزش پا تھی جنبش مژگاں
تیرہ بختی نے کیا ڈرایا تھا | سایہ اپنا پری کا سایہ تھا
ہر کسی کو زرا خبر نہ ہوئی | انجم نحس کی نظر نہ ہوئی
نہ ہوئی چشم عیب بیناں باز | نہ زرا سر اٹھا سکے غماز
رہی پوشیدہ گرم جوشی شب | کھل گئی ہم پہ پردہ پوشی شب
دوسری رات بھی وصال ہوا | روز فرقت کا انتقال ہوا
جب ہوئی خاطر پریشان جمع | پھر تو ہر شب بسان شعلہ و شمع
کیں عجب گرم جوشیاں دل نے | لگے ہم اس برق جلوہ سے ملنے

ان اقتباسات سے جو مومن کے اوائل عمر کا کلام ہیں ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوسکتاہے۔ اصناف سخن میں مثنوی (قصیدے کی طرح) مشکل ترین اور عظیم ترین صنف ہے ۔فارسی میں فردوسی اور نظامی کی عظمت کا سرمایہ یہی صنف ہے ۔مضامین کا تنوع، واقعات کی کثرت، مختلف جذبات و کیفیات کا بیان پھر ان سب میں اس طرح ربط قائم رکھنا کہ ہر شعر کا جوڑ پچھلی یا اگلی بیت سے ملتا چلا جائے بہت مشکل کام ہے ۔مومن کی یہ پہلی کوشش ان تمام معیاروں پر پوری اترتی ہے ۔اور خوبیوں کے علاوہ نشست الفاظ، تراکیب کی ندرت، ادائے مطلب میں سہولت، مناسب لفظوں اور چست ترکیبوں سے طویل مضمون ادا کرکے ایجاز و بلاغت کے جلوے دکھانا یہ سب اوصاف ایسے ہیں کہ آغاز عمر ہی میں ان کی استادی کو تسلیم کراتے ہیں ۔

موسیقی | فنون لطیفہ مین رقص و موسیقی دو ایسے فن ہین کہ اسلام ان کی ہمت افزائی نہین کرتا — بلکہ یہ کہئیے کہ ممانعت کرتا ہے — مومن خاندان ولی اللہی کے مرید تھے جو کتاب و سنت کا علمبردار تھا — ظاہر ہے کہ ان کا موسیقی سے علانیہ تعلق نہین ہوسکتا تھا — مگر مومن جیسے رنگین طبع ان پابندیون کو نباہنے والے نہ تھے(۱) — صحیح معلوم نہین کہ انھون نے موسیقی و مزامیر نوازی کس سے کس حد تک اور کب سیکھی تھی — ان کی ایک غزل کے مقطعے سے اس شوق کا حال کھلتا ہے —

مومن آکیش محبت مین کہ سب جائز ہے

حسرت حرمت صہبا و مزامیر نہ کھینچ

غرض اس میدان مین بھی بند نہ تھے(۲) — اس کے علاوہ ان کی سسرال مین جہان خواجہ میر درد کا روحانی ورثہ آخر تک باقی رہا(۳) اس فن لطیف کی سرپرستی ہوتی تھی — مومن کی مثنویون مین بھی ایسے اشارے ملتے ہین جن سے مومن کا شغف اس فن کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے چوتھی مثنوی آتشین ۱۲۲۱ ھ مین لکھی ہے جب ان کا سن چھبیس سال تھا اور مشاغل یہ تھے(۴) کہ —

طبع کشیدہ رنج کشون سے | گرمی صحبت شعلہ وشون سے
زمزمہ سازی سے دم سازی | چنگ نوازی گوش نوازی

(۱) کلیات فارسی مین امامن طوائف کی تاریخ وفات ان کی حسن پرستی اور موسیقی سے تعلق کی گواہ ہے — اگرچہ تاریخ کہہ دینا ان کے لئے ایک شغل تھا تاہم جس دلسوزی سے امامن کی تاریخ کہی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھین اس ناظورۂ نازنین کے حسن اور مہارت فن سے قلبی تعلق تھا —

(۲) حیات مومن ص ۳۹ — ان کے مرنے پر دہلی کے مشہور بین نواز ناصر احمد نے بین ہاتھ سے رکھ کر کہا تھا کہ اب دلی مین اس کا قدردان نہین رہا —

(۳) میخانۂ درد ص ۱۲۸

(۴) کلیات اردو ص ۳۳۸

ان دنون محفل مشاعرہ مین غزلین تحت اللفظ پڑھی جاتی تھین — مومن نے ترنم سے غزل پڑھنا ایجاد کیا تھا — آزاد نے مرزا خدا بخش قیصر اور نواب اصغر علی خان نسیم کے مشاعرون مین انھین دردناک آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے سنا تھا — (۱) پڑھتے وقت شعر کی کیفیت اور ترنم کی لذت مین ڈوب جاتے تھے — انگلیون کی کنگھی زلفون مین پھرتی رہتی تھی — ترنم مین وہ سوز ہوتا تھا کہ نرم دل اشخاص رونے لگتے تھے — (۲)

سادہ کاری | کچھ معلوم نہین کہ مومن نے یہ فن کس غرض سے سیکھا تھا — سوائے اس کے کہ ان کی ہزار شیوہ طبیعت کا ایک کرشمہ کہاجائے اور کیا کہہ سکتے ہین — عرش گیاوی کا بیان ہے کہ وہ اس فن مین بھی ایجاد کے کرشمے دکھا گئے ہین نیزیہ کہ ان کے بنائے ہوئے زیور عرش نے ان کے خاندان مین خود دیکھے تھے —

آتشبازی | بظاہر مومن کی تفریح کا ایک مشغلہ ہوگا جسے کسی آغا آتشباز سے سیکھا ہوگا — اس مین بھی ایجاد کی پھلجھڑیان چھوڑ گئے ہین — (۳)

علمیات | خواجہ محمد نصیر رنج کے مرنے پر مومن نے چاہا تھا کہ مرحوم خسر کی جگہ میر درد کی درگاہ کے سجادہ نشین بن جائین مگر ان کی کثرت اشغال اور رنگین مزاجی اس بکھیڑے کو برداشت نہ کرسکتی تھی — تاہم جن دنون انھون نے خسر کی جائداد کا وارث بننے کے لئے عدالت مین دعوی دائر کیا تھا تو غالبا تقدس و مشیخت کا لباس اختیار کیا ہوگا — (۴) کلیات اردو (۵) کی دو رباعیان اس مطلب کو روشن کرتی ہین ـــ

---

(۱) آبحیات ص ۲۱۸
(۲) حیات مومن ص ۶۱
(۳) ایضا ص ۲۰
(۴) میخانۂ درد ص ۲۰۵
(۵) کلیات اردو ص ۲۷۲ —

مومن خلقت لباس پر مرتی ہے | سرپانوں پہ دامن کی طرح دھرتی ہے
عمامہ ہے نے عصا نہ جبّہ حضرت | پیروں کی بھی وضع ہوا کرتی ہے؟

مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے | جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ ہے اللہ اللہ | جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

دوسری رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن نے تقدس کا یہ لباس ادھیڑ عمر میں اختیار کیا ہوگا جب انسان کے چہرے سے جوانی کی رعنائی رخصت ہونے لگتی ہے۔ لیکن چوتھی مثنوی تف آتشین (تالیف ۱۲۲۱ھ) سے ظاہر ہوتا ہے کہ کرامات و عملیات کا لتکا انہیں نوجوانی ہی سے لگا ہوا تھا اور اپنے دوسرے فنون کی طرح وہ حسب ضرورت اسے بھی تقریب ملاقات بنالیتے تھے۔ چنانچہ خانۂ محبوب تک رسائی کے لئے انہوں نے اس معاشقے میں یہی حیلہ اختیار کیا تھا۔ (۱) ایک قصیدے میں اپنے کمالات بیان کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں کہ مجھے طلسم و عملیات میں مہارت کامل ہے ؎

طلسم ماہ لکھوں گر ہے زبان بستن | بتائے مہر دہن چرخ نکتۂ جاسوس
یقین کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو | پڑھوں جو میں پئے دوری دعائے بد رہطوس

ان اشارات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ جوانی کے زمانے سے آخر عمر تک عملیات و تعویذات کا شغل بھی کرتے رہے کہ یہ دلچسپ مشغلہ تقدس و احترام کے علاوہ اقتدار و منفعت کا ذریعہ بھی ہے ۱۹۲۹ء میں عرش گیاوی مومن کی پوتی عزیز بیگم سے ملے تھے جنہوں نے انہیں بتایا کہ دادا مرحوم گنڈے تعویذ بھی کرتے تھے اور شہر میں ان کے تعویذوں کی دھوم تھی۔ (۲)

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۲۸
(۲) میخانۂ درد ص ۲۰۵

مومن کی شخصیت

حلیہ | حلیہ اور وضع قطع کے اعتبار سے مومن میں وہ بیشتر خصوصیات موجود تھیں جو کشمیری نژاد امراء میں پائی جاتی ہیں ـ کشیدہ قامت خوشرو خوش اندام خندہ جبین آدمی تھے(۱) ـ رنگ سرخ و سفید تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی ـ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لانبی پلکیں، لانبی ستوان ناک، کھنچی ہوئی ابرو، خوشنما دانت جو مسّی کی سیاہی میں اور بھی اچھے معلوم ہوتے تھے ـ چہرے پر ایک تل تھا جس کی سیاہی گوری رنگت پر کھلتی تھی(۲) ـ باریک ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما رہتا تھا ـ داڑھی خشخشی اور مونچھیں باریک رکھتے تھے ـ بھرے بھرے بازو چوڑا سینہ پتلی کمر باریک لانبی انگلیاں جو نازک فنکاری کا نشان ہیں سر پر گھونگھردار بال لمبی زلفوں کی شکل میں کچھ گردن پر اور کچھ شانوں پر بکھرے رہتے ـ کانوں کے قریب بالوں کی کچھ لٹیں کو بل دے کر کاکلوں کی صورت دیے رہتے(۳) ـ

لباس کے معاملے میں مومن کی رنگین مزاجی کافی تکلف اور اہتمام کرتی تھی ـ لباس کی اکثر چیزیں تیحی خوش وضع عمدہ تراش کی ہوتی تھیں ـ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا ہوتا ـ اس کے نیچے کرتا نہیں پہنتے تھے ـ اس لئے اچکن کے پردے سے سینے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا ـ یہ وضع

---

(۱) کلیات مومن ص ۲۸۳ ـ جوں غنچہ سدا کھلے ہی جانا ـ ہر وقت ہر آن مسکرانا

(۲) یہ دو ایک تفاصیل دیگر ذرائع کے علاوہ مومن کے کلام سے ماخوذ ہیں جہاں انھوں نے نظیر اکبرآبادی کی طرح اپنا حلیہ خود لکھا ہے ـ ملاحظہ ہو کلیات اردو ص ۲۹۱

بینی کہ تھی شمع بزم ماتم ـــ لب یا مہ عشرۂ محرّم

سبزہ سر پشت لب نمایاں ـــ جوں سبزۂ تربت شہیداں

اک خال سیاہ داغ سا تھا ـــ یہ لطف فغاں شعلہ زا تھا

(۳) حلیہ کی اکثر تفاصیل مرزا فرحت اللہ بیگ کی تالیف دہلی کی آخری شمع سے ماخوذ ہیں ـ صاحب حیات مومن نے بھی اکثر تفاصیل حرف بحرف اسی کتاب سے لی ہیں ـ ص ۲۱ تا ۲۳

ان دنون عام تھی ۔ واجد علی شاہ تاجدار اودھ کی جو تصویر آج موجود ہے اس مین وہ رنگین مزاج بادشاہ ایسا ہی انگرکھا پہنے نظر آتا ہے ۔ گلے مین سیاہ رنگ کا فیتہ جس مین چھوٹا سا سنہری تعویذ پانون مین کبھی ایک برکا پاجامہ کبھی تنگ مہریون والا جو اوپر سے کچھ ڈھیلا ہوتا جیساکہ آج کل بھی کشمیری عورتین پہنتی ہین ۔ (۱) یہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا جس مین سوت ریشم اور سونے کے تار ملے ہوتے تاکہ خالص ریشم پہننے کی جو شرعی ممانعت ہے اس کا بچاؤ ہوسکے ۔ ازار کا نیفہ ہمیشہ سرخ ہوتا جس کی رنگت انگرکھے یا کرتے مین سے جھلکا کرتی ۔ طبیعت کی رنگینی اکثر سرخ گلبدن کے پاجامے کو اختیار کرتی تھی ۔ انگرکھے کی آستینین لمبی ہوتین جنھین کبھی لٹکا چھوڑ دیتے کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے ۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی پنج گوشیہ ٹوپی جو بڑے سر پر خوب منڈھ کر آتی تھی پہنتے نچلے حصے مین باریک لیس ٹکی ہوتی ۔ اس مین سے ماتھے کا کچھ حصہ اور مانگ شیشے کی طرح صاف جھلکتے تھے ۔ مختصر یہ کہ بہت خوش پوش اور جامہ زیب شخص تھے دھلی مین اس حسن و جمال کے آدمی کم تھے ۔ (۲)

صاحب حیات مومن بھی قریب قریب یہی حلیہ لکھ کر بیان کرتے ہین کہ مومن بڑے صاحب جمال آدمی تھے ۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے سید حیدر علی دھلوی کی زبانی ان سے روایت کی تھی کہ سید موصوف نے " مومن خان کو اکثر دیکھا تھا ۔ ایسا شوقین آدمی دلّی بھر مین نہ تھا ۔ جدھر سے وہ گذر جاتے لوگ تصویر کی طرح انھین دیکھنے لگتے ۔ (۳) مزاج مین وارستگی تھی ۔ اکثر چلتے وقت اپنے خیال مین ڈوبے رہتے تھے ۔ حکیم اشتیاق حسین شوق دھلوی نے اپنے نانا راقم الدولہ ظہیر دھلوی کے حوالے سے راقم الحروف سے بیان کیا کہ راہ چلتے وقت بھی مومن پر ازخود رفتگی کا عالم طاری رہتا تھا ۔

---

(۱) حیات مومن ص ۲۲
(۲) ایضاً ص ۲۸
(۳) ایضاً ص ۲۵

اکثر ایسا ہوا کہ وہ چلے جارہے ہیں پیچھے سے کسی رئیس ذیجاہ امیر کی پالکی آرہی ہے - کہار ہٹو بچو کی آواز دے رہے ہیں مگر وہ اس تمام ہنگامے سے بے پروا اپنی دھن میں محو بالوں میں کہ انگلیوں کی کنگھی کرتے چلے جاتے ہیں - غرض خوبصورتی و خوش پوشی کا پیکر جمیل تھے - جس طرح ان سے سوسال پہلے دلّی والے میر عبدالحی تاباںؔ کے حسن و جمال اور جامہ زیبی پر فریفتہ ہوتے تھے اسی طرح یہ بھی اہل دہلی کی نظر میں کھپے رہتے تھے - تاباںؔ کی طرح ان کی خوبصورتی و جامہ زیبی بھی شہر میں مشہور تھی[(۱)] - تاباںؔ ہی کی طرح ان کی بے وقت موت نے بھی دلّی والوں کے دل ہلا دیے تھے - ایسے حسین خوش پوش گل اندام آدمی تھے کہ ان کے مرنے کے بعد جب مرزا غالبؔ ان کی قبر پر گئے تو زبان حسرت سے یہ شعر پڑھا اور دیر تک رویا کیے -

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں[(۲)]

مومنؔ کو پھولوں اور عطر سے بہت رغبت تھی - جس گلی سے گزرتے معطّر ہوجاتی[(۳)] - اس شوق کا ذکر انھوں نے اپنی دوسری مثنوی میں بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ محبوبہ کے لئے عطر اور پھول کا تحفہ

---

(۱) حیات مومن ص ۲۵ - مومن کی مثنویوں سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ خوبصورت جامہ زیب اور دلفریب آدمی تھے - اس خصوصیت میں وہ لارڈ بائرن سے مشابہ ہیں جو ان کا معاصر شاعر تھا - اور جس کے مردانہ حسن اور خوش اطواری پر لندن کی خواتین جان دیتی تھیں - مومن کے حسن و جمال اور جامہ زیبی نے انھیں محبوب دلہا بنا رکھا تھا - انھوں نے مثنویوں میں اپنی دل باختگی اور دلستانی دونوں کا حال لکھا ہے - غزل کے بھی بعض اشعار اس مطلب کو واضح کرتے ہیں -

آئے غزال چشم سدا میرے دام میں — صیاد ہی رہا میں گرفتار کم ہوا
میں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

(۲) حیات مومن ص ۲۷

(۳) بقول حالیؔ ع وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں

پہنچایا کرتے تھے ۔ اگرچہ یہ رنگینی ہمارے زمانے میں معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن اس دور کی معاشرت میں جائز تھی رنگین لباس اور تیز خوشبو جسے ہماری حانت گوارا نہیں کرتی ان دنوں خوش باش آدمیوں کے لوازم میں داخل تھی ۔ فرانس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں مردوں کی پوشاک کا یہی انداز ہوتا تھا ۔ راقم نے اپنے بچپن میں بعض روسا کو رنگین پاجامے اور اچکن نیز بڑے پائینچے کے بیل دار پاجامے پہنے دیکھا ہے ۔ یہ لوگ اس جاگیردار طبقے کے باقیات الصالحات تھے جس کا تعلق چار پشت پہلے دہلی اور اودھ کے شاہی خاندان سے قائم تھا ۔(۱)

مجلسی زندگی | لباس کی یہ وضع گھر اور باہر دونوں جگہ رہتی ۔ گھر پر نشست کی یہ صورت ہوتی کہ دیوان خانے میں جو سفید چاندنی کے فرش سے آراستہ ہوتا شہ نشین کے نزدیک قالین پر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے ۔ بعض اوقات بالخصوص شام کو دالان کے اوپر والے بالاخانے میں نشست ہوتی مختلف فنون کے شائق دوست احباب شاگرد طالبعلم سب اپنے اپنے وقت پر آتے اور اس طرح صبح شام محفل جمی رہتی ۔ گرمیوں میں دوپہر کا وقت آرام کے لئے وقف ہوتا ۔ یہ تخلیے کا وقفہ تھا جس میں آرام کے ساتھ فکر شعر بھی ہوتی رہتی تھی ۔(۲)

خاص صحبتوں میں ان کے چہیتے شاگرد ہمراز دوست اور شہر کے عمائد شریک ہوتے تھے ۔ مرزا رحیم الدین حیا حکیم سکھانند راقم میر حسین تسکین غلام علی خان وحشت میر عبدالرحمن آہی

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۰۰

(۲) کلیات مومن ص ۲۷۳ ۔ پہلی مثنوی میں یہ حال ضمناً بیان ہوگیا ہے ۔ محبوبہ کی پیغامبر جب انہیں ڈھونڈھتی ڈھونڈھتی دیوان خانے تک آتی ہے تو اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں ؎

ڈھونڈھ کر ہر ٹھکانے میں ظالم ۔۔۔ پہنچی دیوان خانے میں ظالم
بند دروازہ واں کا تھا ناگاہ ۔۔۔ در کشائے سخن دل آگاہ
شوق کو فکر نالۂ موزوں ۔۔۔ باندھتا تھا میں دلکشا مضموں

نواب مصطفی خان شیفتہ اور کبھی کبھی مولینا امام بخش صہبائی مفتی صدرالدین آزردہ آیا کرتے تھے ۔
بے تکلفی کی صحبت ہوتی مگر آئین اور ضابطے کی پابندی ان دنون اتنی شدید تھی کہ متانت کے سبب وہ
مجلس انس کسی امیر کا دربار معلوم ہوتی تھی ۔ چاندی کا حقہ طشت مین رکھا رہتا اور گاہ گاہ بول
اٹھتا ۔ مومن بہت خوش بیان، لطیفہ گو، بذلہ سنج آدمی تھے ۔ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑ تے
اپنی خوش بیانی کا انھون نے خود بھی ذکر کیا ھے ۔ (۱)

عائدین شہر کے علاوہ متوسط طبقے کے اشخاص مثلاً کم رتبہ شاگرد صنعت و حرفت کے ماھر
مختلف فنون کے افراد سوداگر (بالخصوص ریشمی پارچات کے) بہ کثرت آتے تھے ۔ اس گھما گھمی
کو دیکھ کر بعض قریبی عزیز اور بے تکلف دوست یہ شعر پڑھ دیتے جسے سن کر مومن بہت خوش
ہوتے ۔ (۲)

رہتا ھے عاشقون کا از بس ہجوم در پر ہوجائے گا گھر اس کا بازار رفتہ رفتہ

مومن نے ایک رقعے مین جو اپنے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خان کو لکھا ھے اپنے مشاغل
کی تصویر بڑی شگفتہ انداز مین کھینچی ھے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ھے کہ وہ شعر گوئی، شطرنج اور
یارباشی کے دوش بدوش اپنے وقت کا کچھ حصہ طلبہ کو درس دینے مین صرف کرتے تھے ۔ طلوع آفتاب
سے لے کر ایک پہر دن چڑھے تک ان خشک مزاج طالب علمون کو پڑھانے کے بعد اصطرلاب کو سنبھالے
ہوئے دن بھر نجوم و ہیئت کے شوق مین ڈوبے رہتے تھے ۔ چونکہ مومن نے ۱۲۴۸ھ ۱۲۵۰ھ اور
۱۲۵۱ھ مین نوروز کے دن (۲۱ مارچ) تقویم اور زائچے تیار کرکے حکیم احسن اللہ خان کو بھیجے ہین ۔ (۳)
لہذا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ یہ خط ۲۱ مارچ ۱۸۳۳ء اور مارچ ۱۸۳۶ء کے درمیانی عرصے مین لکھا
گیا تھا ۔

(۱) ہے بذلہ سنی نہ بات گوئی ختم اس پہ ہوئی لطیفہ گوئی (دوسری مثنوی)
(۲) حیات مومن ص ۲٦ (۳) کلیات مومن ص ۳۱۱

" کوئی صبح ایسی نہین آتی کہ میرے نالے سوتے ہوؤن کو نہ جگادین اور کوئی شام ایسی نہین آتی کہ میری آہین مرغ سدرہ کے پرون کو نہ جلادین - برادر گرامی مین اپنے اوقات و مشاغل کا نقشہ آپ کو پیش کرتا ہون جس سے آپ کو میرے مصائب کا اندازہ ہوگا - ہر صبح جب مرغ بانگ دیتاہے اور حیّ علی الفلاح کی صدا بلند ہوتی ہے مین بستر سے اٹھتا ہون .... شیاطین کے شر سے محفوظ ہونے کے لئے نماز پڑھتا ہون - ابھی دعا لب پر اور تسبیح ہاتھ مین ہوتی ہے کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی صدا بلند ہوتی ہے - کیا دیکھتاہون کہ ایک شاگرد ماتھے پر بل ڈالے شکایات کا طومار زبان پر لئے کھڑے ہین ابھی ان سے معذرت نہین کرپایا کہ ایک اور شاگرد بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوکر چند اور ساتھیون کے آنے کی خبر سناتا ہے ... (اپنے علم و فضل پر تفریں کرتے ہین) اس اعتقاد کے باوجود کہ کوئی ذرّہ خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہین کرتا مین ستارہ پرست ہون اور صبح سے شام تک اصطرلاب سنبھالے رہتا ہون - جب آفتاب غروب ہوجاتا ہے تو اس مشغلے سے ہاتھ اٹھاتا ہون .... یہ حسینون کی ملاقات کا وقت ہوتا ہے - ان کی جدائی کا صدمہ میرے لئے جانکاہ ہے "(1)

مومن کی رنگین مزاجی اس دور کے اکثر امیرزادون کی طرح مومنؔ کے وقت کا بیشتر حصہ آنجمن آرائی دید بازدید اور سیر و تفریح مین بسر ہوتا تھا - محل سرا سے زیادہ لگاؤ نہ ممکن تھا نہ مستحسن - امراء کا قاعدہ یہی تھا کہ دن مین کھانے کے وقت یا رات کو تمام کامون سے فارغ ہوکر محلسرا مین قدم رکھتے - رنگین مزاج کثیرالمشاغل مومنؔ کو شاید اتنا لگاؤ بھی نہ تھا - محفل آرائی سے فارغ ہوتے تو کوچہ گردی سیر یا ملنے ملانے کے لئے باہر نکل جاتے - تخلیہ ہوتا تو فکر شعر مین محو رہتے -

---

(1) انشائے مومن ص ۱۰۹ اقتباس و ترجمہ از رقعہ بنام احسن اللہ خان

مثنوی "قول غمین" مین جوانی کے محبوب مشاغل کا ذکر تفصیل سے کیا ھے (۱) جس کا اقتباس یہان بیجا نہ هوگا ؎

یارون مین ھنسنے کا غل آٹھ پہر — وقف لب خندۂ گل آٹھ پہر

زمزمہ ساز برنگ بلبل — نغمہ پرواز برنگ بلبل

نغمہ سنجی و خوش الحانی و بس — شعر گوئی و غزلخوانی و بس

رات دن ھنسنے ھنسانے کی بات — یارون سے ملنے مین صرف اوقات

آشناؤن مین سدا گھر مین کہان

گہ وہان گاہ یہان گاہ وہان

دوسری مثنوی "قصۂ غم" (۲) مین اپنے مزاج اور مشاغل کی اس سے بہتر تصویر کھینچی ھے بلکہ بے تکلف صاف الفاظ مین اپنی اس خوشباشی سرخوشی اور تماشا دوستی کا ذکر کیا ھے جو کبھی کبھی تماش بینی کی حد تک پہنچ جاتی تھی اور جو مومن کے اس مقام سے کہین پست تھی جو کمال فن اور آبائی امارت نے انھین عطا کیا تھا ؎

تھا نام تو مومن اور دین کفر — جان محو بتان و دلنشین کفر

رسوائے زمان و تیرہ ایام — آوارہ و ھرزہ گرد و بدنام

ربط اس کو بتان نازنین سے — دنیا سے نہ کام کچھ نہ دین سے

گہ آشفتۂ کاکل پریشان — انداز پرست کفر کیشان

مدھوش شراب نوجوانی — سرشار نشاط و شادمانی

---

(۱) کلیات مومن ص ۳۱۱

(۲) ایضاً ص ۲۸۳

آرام و طرب مین صرف اوقات — مشغول سرور عیش دن رات

جون غنچہ سدا کھلے ہی جانا — ہر وقت ہر آن مسکرانا

دیوانون سے شوق ہے نہایت — اشعار کا شوق ہے نہایت

مل چلنے کی ہر کسو سے تھی خو — تھا یار غرض جہان مین تھا جو (۱)

چوتھی مثنوی قصہ غم مین بھی جو مومن نے چھبیس سال کی عمر مین کہی ہے اپنے مزاج کی اکثر خصوصیات بیان کی ہین۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علم نیز خاندانی نجابت و شرافت بھی انھین نظربازی ذوق تماشا اور کوچہ گردی سے روکنے مین ناکام رہین۔ اس زمانے تک مومن کے سر پر بزرگون کا سایہ قائم تھا۔ دو سال پہلے تک شاہ عبدالعزیز صاحب بھی زندہ تھے۔ سید احمد صاحب بریلوی کی تحریک جہاد بھی دیندار اشخاص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مومن کو اس تحریک سے کچھ تعلق تھا۔ وہ سید احمد شہید کے مرید تھے اور اس تحریک کی قلمی اعانت کرتے رہتے تھے۔ وہ ان دنون کنوارے نہ تھے شادی ہوچکی تھی۔ غرض اتنے سامان تھے کہ ایک اوسط درجے کے آدمی کو ہرزہ گردی و نظربازی سے روک سکتے تھے۔ مگر یہ تمام وسائل مومن کی رنگین الہیلی حسن پرست طبیعت پر اعتنائی اثر نہ ڈال سکے۔ چوتھی مثنوی تف آتشین مین رنگین مزاج شاعر نے اپنا حال بے کم و کاست لکھ دیا ہے (۲) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ذی علم امیرزادہ

در جوانی چنانکہ افتد و دانی

دل کے ہاتھون کتنا مجبور تھا نیز یہ کہ جن حسینون کا وہ عاشق تھا وہ بھی اس پر جان دیتے تھے ؎

---

(۱) کلیات مومن ص ۲۸۲ — (۲) کلیات مومن ص ۳۲۱

طبع کشیدہ رنج کشون سے گرمی صحبت شعلہ وشون سے

بسکہ طبیعت مشغلہ جو تھی اپنی سدا سے چاہ کی خو تھی

اهل جفا مین دھوم تھی اپنی جورکشی معلوم تھی اپنی

شوق نہان مشہور ھمارا دیکھو جہان مذکور ھمارا

سب کو تمنا چاہ کی اپنی کان کو لذت آہ کی اپنی

اور ھمین بھی چاہ کا لپکا عشق دل وجان کاہ کا لپکا

مہروشون سے لاگ سی دل کو گرم رکھے رکھے اک آگ سی دل کو

مثنویون کے علاوہ غزلون مین بھی بعض جگہ ایسے اشارے بلکہ صراحتین موجود ھین جو اس حسن پرست شاعر کے کاروبار شوق کی تفصیل بیان کرتی ھین ۔ کلام کا انداز خود کہتا ھے کہ شاعر نے یہ اشعار یون ھی فرضی یا سرسری نہین کہے بلکہ اپنی دلی کیفیت بیان کی ھے (۱)

شام سے گھر مین سو رھے وہ تو اور ھم ان کے کوچے مین

ولولہ ھائے شوق سے کیا کیا پھرتے ھین گھبراتے ھین

کرتے ھین آواز زنجیری دیتے ھین دستک سو سو بار

گھر مین پتھر پھینکے ھین زنجیر در کھڑکاتے ھین

نوجوانی مین مومن بہت گرم اختلاط گرم جوش اور زود آمیز تھے ۔ طبیعت کے رجحان سے ھر طبقے کے لوگون مین مل کر بات چیت کرنے یا بذلہ سنجی سے انھین عار نہ تھا ۔ اس معاملے مین ان کا علم اور امارت آڑے نہ آتے تھے ۔ دوستون کے ساتھ ان کی تقریبون مین

(۱) کلیات مومن ص ۹۵

شریک ہونا شادی بیاہ میں چھوٹے بڑے کاموں کا سنبھالنا اور ایک عام آدمی کی طرح مختلف امور
کا سرانجام انھیں منظور و مرغوب تھا ۔ چوتھی مثنوی تک آتشین کے حسب ذیل اشعار اس
مزاجی کیفیت کو واضح کرتے ہیں ۔

تھی جو وہ بزم جان و دل آرا   میں بھی وہاں تھا محفل آرا
کارکن و مختار وہاں میں   مہتمم ہر کار وہاں میں
اندر باہر سو ر فزائی   تھی متعدد بزم آرائی (۱)
سوئے ہر اک اپنا کدھر ہو   مجھ کو پکارین کام جدھر ہو

یہ کرم اختلاطی اور طبیعت انداز حیات قابل اعتراض نہ سہی مگر ایک ذی علم رئیس
زادے کے لیے غیر مستحسن ضرور ہے ۔ مومن جس طبقے اور جس مرتبے کے آدمی تھے نیز علم و فضل
(۲)
میں جس لوچے پر فائز تھے اس کے پیش نظر ان کی یہ بیباکی بے لگام ہرزہ گردی اور وہ
بے روک ٹوک نظر بازی جس کی تفصیل ان کی مثنویوں میں موجود ہے بہر حال نازیبا ہے ۔

حسن پرست شاعر بعض اوقات تلاش یار میں ایسے ادنیٰ درجے کے لوگوں سے بھی
ربط و ضبط رکھتا تھا جو دریدہ دہن ہونے کے علاوہ دشنام طرازی میں بھی ماہر تھے ۔
ایسی ایک نا معقول صحبت کا ذکر مثنوی قول غمین میں اس طرح ملتا ہے ۔

بس یہ کہتے ہی لو سب جان گئے   بات جو دل کی تھی پہچان گئے
پھر تو نکو نکی ہونے لگی   بے دھڑک طعنہ زنی ہونے لگی
اک نے تعریف دلبری کی کی   دل میں چٹکی سی کسی نے لے لی
ایک اک اور پہ رکھ کر بولا   ایک نے صاف زبان کو کھولا

---

۱ ۔ کلیات اردو ص ۳۲۳

۲ ۔ ایضاً ص ۲۱۲

ایک نے اپنے پہ رکھ کر ڈھالی   ایک نے پردے میں جھٹ دی گالی

مومن کا یہ انداز کیون تھا اس کا تجزیہ آسان نہین — ان کے ذاتی حالات اس درجہ مخفی هین کہ مختلف واقعات ترتیب دینا اور پھر ایک یقینی نتیجہ ان سے اخذ کرنا ممکن ہی نہین — یہ تو نہین کہہ سکتے کہ بچپن یا نوجوانی مین ان کی صحیح تربیت نہین ہوئی — یہ سب کچھ یقیناً ہوا ہوگا مگر طبعی رجحان بلا جبلت اور افتاد مزاج ایسے عوامل ہین کہ کوہستانی ندی نالون کی طرح کسی مزاحمت کی پروا نہین کرتے — عشقبازی مومن کی جبلت تھی جس کا مظاہرہ وہ بچپن سے کہولت کے آغاز تک کرتے رہے — ان کی مثنویون اور دیگر خارجی شہادتون سے جو حالات معلوم ہوئے ہین ان سے اس مست الیلی عشقبازی کا واضح خاکہ تیار کرنا آسان ہے جس مین وہ جوانی بھر رنگ رلیان مناتے رہے — چونکہ یہ واقعات ان کی داستان حیات مین ضروری کڑیون کی حیثیت رکھتے ہین اس لئے ان کا ترتیب دینا سوانحی نقطۂ نظر سے اہم ہے —

مومن کی حیات معاشقہ

عاشق و رند و منتظر بازم و بگویم فاش
تا بدانی کہ بہ چندین هنر آراستہ ام

جنسی کشش کا احساس بالعموم بلوغت یا نوجوانی کے ساتھ ہوتا ہے مگر بعض مثالین ایسی بھی دیکھی گئی ہین کہ کچھ آدمی بچپن ہی سے اس کا احساس رکھتے ہین — ہرچند اس عمر مین کوئی فعلی یا انفعالی صلاحیت نہین ہوتی تاہم جنس مخالف کے ساتھ رہنے کی تمنا اور اس کے حسن کا احساس نمودار ہوجاتا ہے — اس کے وجوہ و اسباب سے بحث کرنا ایک ماہر نفسیات یا ماہر علم الاعضا کا کام ہے — ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ایسی جو مثالین تاریخ و واقعات سے حاصل ہون انھین پیش کردین — یہ مثالین شاذ ہین مگر

ہین ضرور — ان کے افراد بیشتر وہ ہوتے ہین جن کا احساس ذکی اور جذبۂ جمال پسندی[(۱)]
کافی قوی ہوتا ہے — ایسے افراد بچپن مین بھی جبکہ جنسی قوتین خفتہ ہوتی ہین
احساس جمال رکھتے تھے اور جنس مخالف کی طرف مائل ہوتے ہین — جوش ملیح آبادی نے
ایک نظم " ناسزا جوانی " مین اس کیفیت کا بہت کامیاب نقشہ کھینچا ہے —

خوشا وہ دن کہ شادابی تھی جب دل مین لڑکپن کی

کیا کرتا تھا میرے ساتھ وہ بھی سیر گلشن کی

مین بھرون نیم کے نیچے اسے جھولا جھلاتا تھا

وہ گاتی تھی مگر اس کو نہ کچھ آتا نہ جاتا تھا

ہوائے سرد کے جھونکے ہمین بے خود بناتے تھے

فرشتون کی طرح شفاف چشمون مین نہاتے تھے

نہایت لطف آتا تھا خنک جاڑون کی راتون مین

انگیٹھی کے کنارے صبح ہوجاتی تھی باتون مین

نہ دن کو دل دھڑکتا تھا نہ شب کو آنکھ روتی تھی

محبت تھی مگر دونون کو اس کی حس نہ ہوتی تھی

مومن ابھی افراد مین سے ایک تھے — وہ نو سال کی عمر مین ایک حسین لڑکی پر جو غالباً
ان کی ہمسائی تھی[(۲)] اور جس کا نام انھون نے ظاہر نہین کیا مائل ہوئے — یہ لڑکی بھی

---

(۱) اطالوی شاعر دانتے ایسی ہی مثال ہے —

(۲) اس معاشقے مین مومن اطالوی شاعر ڈانٹے سے مشابہ ہین جو نو سال کی عمر مین اپنی ہمسایہ لڑکی بیٹرس پر عاشق ہوا تھا اس نے La Vita Nuova مین اپنی داستان الفت لکھی ہے اور ظاہر کیا ہے کہ مین اپنی محبوبہ سے پاکیزگی اور نگاہ لطف کا طالب رہتا تھا — ڈانٹے کا بیان ہے کہ بیٹرس کی محبت نے ہی میری شاعری کو طرز لطیف بخشا ہے — ڈیکھئے طربیہ خداوندی ترجمہ عزیز احمد ص ۲۷ —

انھیں چاہتی تھی ـ دونوں چوری چھپے باہم ملتے رہے ـ مگر یہ معاملہ زیادہ عرصہ نہیں چھپتے ـ رفتہ رفتہ بات کھل گئی اور عزیزوں کی سخت گیری کے باعث ان کا باہم ملنا موقوف ہوگیا ـ دو سال بعد اتفاقاً یہ لڑکی مرگئی اور مومن کے نوخیز دل پر اس کی موت کا داغ رہ گیا ـ الفت طفلی کی اس کیفیت کو مومن نے کافی عرصہ بعد اپنی پہلی مثنوی میں جو سترہ سال کی عمر لکھی تھی تفصیل سے بیان کیا ہے ـ یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

یعنی طفلی سے ہوں میں پیرمغان بلد راہ گمرہان جہان

تھے برس ہم شمارۂ افلاک کہ ہوا پائمال صورت خاک

کھودیا چین ایک مہ رو نے شب سیہ کی ہلال ابرو نے

خنجر غمزہ نے ہلاک کیا نگہ سرمہ سا نے خاک کیا

اور اس کا بھی مجھ پہ دل آیا کھوکے دل میں نے جان کو پایا

دشنے تھے زخم بار دونوں کے ہوئے سینے فگار دونوں کے

مومن نے اس کمسن حسینہ کی وفات کا صدمہ شدّت سے محسوس کیا ـ طبیعت میں وحشت پیدا ہوئی ـ صحت اور خور و خواب میں فرق آگیا[1] ـ ایک مدت تک یہی کیفیت رہی ـ

اب مومن عمر کی بارہ بہاریں دیکھ چکے تھے ـ ابدی فراق کا غم ان کے دل کو کھا رہا تھا کہ ایک اور ماہ طلعت لڑکی از خود ان پر مائل ہوئی ـ اسی مثنوی میں مومن نے اس کے بار بار سامنے ہونے ہروقت آنے جانے اور بے تکلف ملنے کا حال جس طرح لکھا ہے اس سے یہ ترشح نکلتا ہے کہ وہ ان کی رشتہ دار یا ہمسایہ ہوگی اور ان کی حویلی یا کسی قریب کے گھر

(۱) کلیات مومن ص ۲۲۷

مین رہتی ہوگی ۔ اس نے ایک پختہ سال رفیق کی طرح مومن کو جی سنبھالنے اور غم و الم کے پھندے سے نکلنے کی صلاح دی ۔ غرض مختلف طریقوں سے دلجوئی کر کے مومن کو اپنی طرف مائل کرلیا ۔ اس ماہ طلعت سے مومن کا تعلق بارھوین سال سے سترہ سال کی عمر تک یعنی پانسچ سال رہا ۔ اس عرصے مین انھون نے کامیابی٬ ناکامی٬ بدنامی٬ ناگہانی ملاقات٬ غیر متوقع وصال٬ سب کا مزہ چکھا ۔ اقربا کی ملامت٬ خانہ براندازون کی غمازی٬ بےدرد عزیزون کی رخنہ اندازی٬ اس کے بعد دولت دیدار اور نعمت وصال کا حصول غرض تمام معاملات کا مرقع اس پہلی مثنوی مین موجود ہے ۔ یہان اس مقام کے چند اشعار نقل کرنا مناسب ہین ۔ جب افشائے راز پر مومن کے مختلف بزرگ فرداً فرداً انھین ملامت کرتے اور ننگ و ناموس مین داغ لگ جانے سے برہم ہو ہوکر سمجھاتے ہین کہ یہ بری روش ترک کرنا لازم ہے [1] :-

گھر سے اٹھی صدا ملامت کی	ایک اک نے جدا قیامت کی
بد زبانون نے آکے منہ پہ کہا	جا کہ تو اپنے کام کا نہ رہا
نام کو خاک مین ملایا حیف	تونے جون کاف سر اٹھایا حیف
طعنہ حرف نصیحت آلودہ	طرز تفہیم وحشت آلودہ
کہ سنا اب بھی چھوڑ دے یہ خیال	خواب ہوجائے تا پریشان حال
عزت و شان خاندان کو دیکھ	جاہ ہم اوج آسمان کو دیکھ
جون فلک کجروی سے باز آ تو	پھر نہ ہمراہ ماہ سیما تو
کیون روش تیری بے محابا ہے	یہ چلن سب خلاف آبا ہے
کس نے یون سعی عشقبازی کی	کس نے اس طرح ہرزہ تازی کی

(۱) کلیات مومن ص ۲۵۵

نش ہوا کون عنبرین مو پر | دم دیا کس نے تیغ ابرو پر
کس کو تھا اشتیاق چشم سیہ | کون تھا تختہ مشق گلہ مژہ
کس کو تھا شوق صرع گیسو | منتخب کس کے تھی بیماں گلو
باعث عبرت جہان تو ہوا | ہائے کیا ننگ خاندان تو ہوا (۱)

اس مثنوی کا انجام حزنیہ ہے ۔ یہ ماہ پیکر جو خود بھی مومن پر مائل تھی بالآخر ان کی طرف سے بدگمان ہوجاتی اور ان کے ہرجائی پن کی غلط خبر سن کر قطع تعلق کرلیتی ہے ۔ مومن اس مفت کے الزام سے بد دل ہوکر خود بھی اس سے برگشتہ ہوجاتے اور ہمیشہ کے لیے طبقۂ اناث سے اجتناب کا عہد کرتے ہیں (۲) (اگرچہ اس عہد کو ثبات حاصل نہ ہوسکا) :

مومن اب تو بھی اپنے نام پہ جا | نام کو ان بتوں کے آگ لگا
چھوڑ بس الفت مجازی کو | کر سلام ایسی عشقبازی کو
کب تلک حسرت وصال اناث | کیا نہیں جانتا تو حال اناث

کسی نے کی ہے یا نہیں تعلیم
آیۃ انّ کیدکنّ عظیم

---

(۱) کلیات مومن ص ۲۵۱

(۲) کلیات مومن ص ۲۷۵

یہاں مومن کی یہ مثنوی ختم ہوجاتی ہے ۔ یہ ان کی عاشقی کی پہلی داستان ہے جس کا آغاز نو سال کی عمر سے ہوتا ہے ۔ اس معاملے مین وہ اطالیہ کے نامور شاعر دانتے سے مشابہ ہین کہ وہ بھی نو سال کی عمر مین ایک ہمسایہ لڑکی بیٹرس پر فریفتہ ہوا تھا ۔[1] البتہ اتنا فرق ہے کہ دانتے تمام عمر اپنی محبوبہ سے پاکیزہ ملکوتی محبت کا طالب رہا ۔ اس کے برعکس مومن کی محبت افلاطونی عشق کے بجائے خالص بشری اور ارضی جذبات کے تابع تھی ۔ ایک صحیح القویٰ جو ان کی طرح وہ تمام عمر جذبات کے خوشنما جال مین پھنسے رہے اور کبھی اس کا اعتراف کرنے سے نہین شرمائے ؎

مومن بہشت و عشق حقیقی تمھین نصیب

ہم کو تو رسم ہو جو غم جاودان نہ ہو

مومن کی دوسری مثنوی قصۂ غم جو ١٢٣٥ ھ مین لکھی گئی ۔ اسی قسم کے واقعات پر مشتمل ہے ۔ یہ بھی حزنیہ ہے اور واقعات کی رفتار محبت گرم جوشی اور وصال کی منزلون سے گذر کر بالآخر محبوبہ کی بے توجہی و بیوفائی تک پہنچتی ہے ۔ اس مثنوی کی زبان پہلی سے بہتر اور انداز بیان زیادہ دلفریب ہے ۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارہ انیس سال کی عمر مین انھون نے پھر کسی شوخ ، بذلہ سنج ، طرار خود کام و خود آرا محبوبہ سے دل لگایا ۔ ایک مدت تک دولت دیدار اور نعمت وصال سے کامیاب رہنے کے بعد فراق کی مصیبت سے دو چار ہوئے ۔ محبوبہ کا التفات بے توجہی سے بدل گیا ۔ مومن اس صدمے سے بدحال رہنے لگے ۔

---

(١) طربیۂ خداوندی ترجمہ عزیز احمد ص ٢٧

دوستون سے ملنا ملانا ترک کردیا ـ احباب کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے گریزان بلکہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہوکر چنچل جذباتی بیوفا معشوقہ کے غم مین دشت نورد[1] ہوگئے ـ تصور محبوب مین ایسے محو رہنے لگے کہ خود اس کی تصویر بن گئے اور مجنون کی طرح انا الصنم کے نعرے لگانے لگے ـ

اس نظم مین واقعات وہی ہین جو اکثر عاشقون کو پیش آتے ہین ـ تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ محبوبہ بہت شوخ اور حاضر جواب تھی اور مومن کو اپنی الفت کے جال مین پھنسائے رکھنے نیز ذو معنی کنایات و محاورات بولنے کی شائق تھی[2] ـ دیکھئے کس جوش و خروش سے اپنی الفت جتاتی ہے ؎

ہے تجھ سے مجھے دلی محبت   گو تجھ کو نہ ہو مری محبت

اور جیسا کہ تجھ کو چاہتی ہون   تو دیکھیو کیا نباہتی ہون

مجھ کو تری جان کی قسم ہے   جس وقت تلک کہ دم مین دم ہے

ایسی ہی رہے گی آشنائی   آتی نہین مجھ کو بیوفائی

جھوٹی نہین تم مین کہ راست گو ہون   گر اس مین مین کچھ بھی جھوٹ بولون

سب قہر خدا کسی پہ ٹوٹین   آنکھین مرے سامنے کی پھوٹین[3]

مومن نے اس بت طناز کی گرم جوشی اور لگاوٹ کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرتبہ انھون نے حسن کی ادائین جی بھر کر دیکھین ـ ضمنا" یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۹۱
(۲) کلیات اردو ص ۳۰۲
(۳) ایضـــا"

مومن کو پھولوں اور عطر سے بہت رغبت تھی (جیسا کہ بیان ہوچکا ہے) اور وہ اس کے لیے یہ تحفے لایا کرتے تھے ؎

ہے یاد وہ دوستی کا عالم | کہ وہ شوخی و دلبری کا عالم
کس لطف سے چھیڑتی ستاتی | گد گدیوں سے خوب سا ہنساتی
ہوجانا میں ہنستے ہنستے بیدم | آپس میں مجھے ہچکیاں پیہم
لاتا گل و عطر میں کبھی گر | فرماتی یہ مجھ سے مسکرا کر
یہ گل تو عمل کیا ہوا ہے | یہ عطر فسون پڑھا ہوا ہے[1]

یہ محبوبہ حسین تو تھی ہی مگر خود آرائی و خود پسندی حسن سے کہیں زیادہ تھی — اکثر مومن سے اپنے حسن و جمال کی داد مانگا کرتی ؎

پھر اپنے غرور میں جو آتی | خاطر میں کسی کو بھی نہ لاتی
خود بینی سے ہوش میں نہ رہتی | آئینے کو پھینک مجھ سے کہتی
دیکھو تو یہ نور چشم بد دور | یوسف کہ وہ ہے جہان میں مشہور
کیا اس کی بھی صورت ایسی ہی تھی | کیا اس کی بھی طلعت ایسی ہی تھی
کیا ایسا ہی حسن تھا نہ ہوگا | یہ حسن کبھی ہوا نہ ہوگا
مانا بھی کہ یہ ہی رنگ رو تھا | ایسا ہی وہ چہرۂ نکو تھا
پر اس میں یہ بات تو نہ ہوگی | کیوں میری سی گات تو نہ ہوگی
یہ خوش سخنی کبھو نہ ہوگی | یہ گرمی گفتگو نہ ہوگی
ایسی تو نہ ہوگی جامہ زیبی | ایسی تو نہ ہوگی دلفریبی

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۰۰

مثنوی کے خاتمے پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرتبہ مومن نے زیادہ گہرا زخم کھایا تھا۔ پہلی داستان کے برعکس جس کے آخیر میں حسن پرست شاعر حسرت وصال اناث کو سے توبہ کرتا ہے اور جس میں اس کے لہجے سے خودداری کا رنگ ٹپکتا ہے اس مثنوی کا آخری حصہ غم و افسوس کی شدت سے بھرا ہوا ہے۔[1] آخری اشعار پڑھ کر قاری کو بھی شاعر کے غم میں شریک ہونا پڑتا ہے ؎

بس مومن دلگداز خاموش	اب طاق ہوئی ہے طاقت ہوش
جاری ہے ہر ایک چشم سے خون	تھے شعر کہ نالہ ہائے موزون
کر ڈالا کباب سامعین کو	آگے نہیں تاب سامعین کو
ہر حرف ترا شرر فشان ہے	ہے آگ کا شعلہ یا زبان ہے

زین بیش ز سوز سینہ مخروش
چون شمع خموش باش خاموش

مومن کی یہ مثنویاں اکثر تذکرہ نگاروں کے بقول ان کے معاشقوں کی داستانیں ہیں۔[2] ان سب کا بالترتیب مطالعہ کر کے ہم مومن کی حسن پرست طبیعت کا کم و بیش صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ چوتھی مثنوی انھوں نے چھتیس سال کی سن یعنی ۱۲۴۱ ھ میں لکھی ہے۔ تف آتشین کرا تاریخی نام ہے۔ اس سے مومن کے ایک دلچسپ معاشقے کا حال کھلتا ہے

(۱) کلیات اردو ص ۳۰۶
(۲) ~~کلیات اردو ص ۴۴۳~~
رام بابو سکسینہ ص ۳۵۷

جس سے مومن کچھ مدت بعد خود دست بردار ہوگئے تھے ۔تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کے ہان شادی مین گئے تھے جس نے یار صادق کی حیثیت سے مختلف امور کا انصرام ان کے ذمے لگا دیا تھا ۔[۱] یہ ابھی کامون کے اہتمام مین اندر باہر پھر رہے تھے کہ گھر کے ایک گوشے سے کسی نسوانی آواز نے دلدار شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ۔انھون نے ادھر دیکھا تو وہ شعلہ رخسار چلمن گراکر ہٹ گئی ۔شاعر از خود رفتہ ہوگیا مگر کافی کوشش کے بعد شادی کے ہنگامے مین اس شعلہ رو سے دو باتین کرلینے کی سبیل نکالی ۔ اس سے زیادہ کوئی حسرت پوری نہ ہوسکی ۔ اگلے روز محبوبہ اپنے گھر چلی گئی جہان بزرگون کی سخت نگرانی ایسی تھی کہ نسیم صبح کا گزر مشکل اور مرغ سلیمان کا پر مارنا محال تھا ۔[۲] عورتین چوکنّی تھین اور مردون کی آنکھ سے خون ٹپکتا تھا ۔اس کیفیت کی تفصیل وہ حسینہ خود اپنی زبان سے/اکو مومنؔ کو یون سناتی ہے ؎

قید کہون کیا اپنے مین گھر کی	کانپتی جاوے باد سحر کی
باد صبا پیغام نہ لاوے	مرغ سلیمان اڑنے نہ پاوے
تا دم مرگ ارمان نہ نکلے	نزع بھی ہو تو جان نہ نکلے
رفتہ زمان کا چرچا ہووے	عمر روان کا چھپ چرچا ہووے
سب کی نیند اس فکر مین جاوے	خواب مین بھی تا کوئی نہ آوے
جی کی تباہی کہئیے کہان تک	صبر نہ آوے قید یہان تک
خیر پھر اب اے جان ملین گے	جیتے رہے تو آن ملین گے[۳]

(۱) کلیات اردو ص ۳۲۳ (۲) کلیات اردو ص ۳۲۶

(۳) کلیات اردو ص ۳۲۷

ان سخت قیود کے باوجود ہزار شیوہ عاشق نے محبوبہ سے ملنے کی سبیل نکال ہی لی ـ عملیات و کرامات کے لباس میں[1] اس کے گھر تک گئے اور بہت سوچ سمجھ کر ایک بوڑھی خادمہ کے ذریعے پیام محبت اسے بھیجا ـ وہ پیر زال جو مکروہ صورت ہونے کے علاوہ تند خو بھی تھی تھوڑی دیر بعد انکاری جواب لائی ـ شاعر مایوس ہوکر واپس آیا اور چار مہینے سخت یاس و اضطراب کے عالم میں گزارے ـ پھر ایک روز جب کہ وہ شعلۂ جوالہ مومؔن کے کسی دوست کے گھر شادی کی تقریب سے آئی تھی یہ بھی وہاں پہنچے ـ کسی خادمہ کے ذریعے غم فراق کی شدت اس کو کہلا بھیجی اور آرزوئے ملاقات کا اظہار کیا ـ اس نے اس مرتبہ سخت مایوس کن جواب بھیجا[2] جس سے عاشق کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں ـ

یہ مثنوی تو یہاں ختم ہوجاتی ہے مگر پانچویں مثنوی حنین مشوم میں جو مومؔن نے ۱۲۲۲ھ میں نظم کی اسی حسینہ کا ذکر پھر آتا ہے کہ مسلسل تحریک کی بدولت مومؔن اسے رام کرنے میں کامیاب ہوگئے ـ اب جو اس سے بے حجابانہ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جس پردہ نشین کی جھلک دیکھ کر وہ حماقت کا شکار ہوئے تھے اس کی رنگت تو ضرور سرخ و سفید تھی مگر ناک نقشہ بھدّا تھا ـ[3] ہوس پیشہ شاعر کی محبت جوش و خروش سے شروع ہوئی تھی مگر بے نمکی کے ساتھ ختم ہوگئی ـ مومؔن نے اس مضحکہ واقعے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے ـ یہاں صرف چند اشعار کا اقتباس کافی ہے جن میں انھوں نے اس

---

(۱) مولوی عبدالحی صاحب کا بیان ہے کہ مومن بعض اوقات پتنگ کے ذریعے بھی نامہ و پیام کی سبیل نکال لیتے تھے ـ

(۲) کلیات اردو ص ۳۵۲

(۳) کلیات اردو ص ۳٦۹

اس کے بدنما چہرے بے آب آنکھوں کرخت آواز بدوضع گردن سوکھے ہاتھ پاؤں کا مضحکہ اڑایا ہے نیز خود اپنی احمقانہ محبت پر بھی افسوس کیا ہے ؎

وجہ نفرت یہ کہ وہ آتش عذار — دور ہی سے خوشنما تھی جوں شرار

پاس سے دیکھو تو بس دیکھا نہ جائے — ہر نگاہ منفعل آنکھیں ہائے چرائے

شعلۂ دوزخ رخ انور کی تاب — جس سے ہر مومن کو لازم اجتناب

شوخی مژگان خرام ناشکیب — نرگس بیمار مر بیٹے کسے قریب

کان گل تھے لیک مرجھائے ہوئے — فصل بہمن کی ہوا کھائے ہوئے

کیا کریہ الصوت جیسے شور رعد — شہر پر بجلی گرے ہنسنے کے بعد

سوکھے سوکھے ساعد و بازو ستم — جیسے دو خار مغیلاں ہوں بہم

چھاتیاں وہ کتنی نامعلوم بس — بے گمان دو نقطۂ موہوم بس

لطف تو یہ ہے کہ اس صورت پہ ناز — گرمی خو آتش عالم گداز (۱)

غرض اس خوش رنگ لیکن بدشکل لڑکی کے پیچھے وقت ضائع کرنے اور جی کھوتے رہنے پر بہت پچھتائے اور اس حماقت کی تلافی کرنے کے لیے ایک اور قمر طلعت سے دل لگائے ہیں جو نسوانی حسن کا مثالی نمونہ ہے ۔ اس کے ساتھ ایک مدت تک شراب وصل پیتے ہیں (۲) اتفاقاً اس بدصورت بدوضع لڑکی کو اس عشقبازی کا پتہ لگ جاتا ہے ۔ حسد کی آگ اس کے دل

(۱) کلیات اردو ص ۳۷۱ ۔ ۳۷۲

(۲) مومن نے ایک مدت تک اس معاشقے پر پردہ ڈالے رکھا بلکہ ڈانٹے کی طرح جس نے اپنی محبوبہ بیٹرس کا نام چھپانے کے لیے ایک اور فرضی معشوقہ کا نام گھڑ لیا تھا مومن نے بھی محبوبہ کا نام چھپا کر ایک اور حسینہ کا ذکر کرکے اس راز کو پردہ میں رکھا ۔

مین بھٹک رہی ہے اور مومن سے اپنا انتقام اس طرح لیتی ہے کہ اس معشوقۂ ماہ طلعت کو مومن کے ہرجائی پن کی داستانین سنا سنا کر ان سے بالکل منحرف کردیتی ہے ۔ حسرت نصیب عاشق نامرادی کے عالم مین حسینون کی محبت سے ہاتھ اٹھاکر خدا سے لو لگاتا ہے جو ہر محروم و مایوس کا آخری سہارا ہے ۔

چھٹی مثنوی آہ و زاری مظلوم مومن نے ۱۲۲٦ھ مین لکھی جب ان کی عمر اکیس سال تھی ۔ اس مین بھی ایک بے مروّت بیوفا معشوقہ کا ذکر کیا ہے ۔ مجموعی طور پر ان مثنویون سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مومن تازہ عشق نظرباز اور ہوس پیشہ تھے ۔

مگر بوالہوسی کے ان دفترون مین جو کلیات کے ۱۸۵ صفحات پر مشتمل ہین سچی محبت کی ایک داستان بھی نظر آتی ہے ۔ یہ مومن کی تیسری مثنوی قول غمین ہے جس کے ایک ایک لفظ سے دل کے جلنے کی بو آتی ہے اور جس کے پرسوز اشعار برابر عشق صادق کی گواہی دے رہے ہین ۔

مومن نے اس مثنوی مین بھی حسب معمول محبوبہ کا نام نشان ظاہر نہین کیا مگر اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پری تمثال جس پر مومن دل و جان سے عاشق ہوئے اور جو خود بھی ان پر مائل ہوگئی کسی شخص کی داشتہ تھی ۔ لکھنؤ سے یا پورب کے کسی اور شہر سے وہ اپنے آشنا کے پاس دہلی آئی تھی[1] ۔ سفر کی زحمت سے بے حال ہو رہی تھی[2] اس لیے وہ شخص علاج کے لیے مومن کو بلائے آیا جو اس نوعمری یعنی اکیس سال کی عمر مین بحیثیت طبیب کافی مشہور تھے ۔ مومن نے نبض دیکھنے کے لیے اس مہر پیکر کا ہاتھ اپنے ہاتھ مین جو لیا تو کلائی کی تابانی اور پرنور پنجے کی آب و تاب دیکھ کر ہی جان و دل قربان کر بیٹھے ۔

(۱) گلشن بیخار ص ۱۲۹　　(۲) کلیات اردو ص ۳۱٦

علاج کرنے کے لیے بلائے گئے تھے لیکن خود عشق کے مرض میں گرفتار ہوگئے ۔ خود فراموشی چھا گئی اور کچھ ایسے کلمات از خود منہ سے نکلے کہ وہ نازورہٴ پردہ نشین ان کی دلی کیفیت صاف سمجھ گئی جھٹ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دو ایک جملے خوش طبعی کے کہہ کر بظاہر بات ختم کردی ۔ دل از دست دادہ شاعر نے یہ حالات پوری تفصیل سے لکھے ہیں ۔

ہاتھ سے پھرے مرا دل ہی چلا	مین نے اس نبض پہ جون ہاتھ دھرا
نرم مخمل سے زیادہ وہ ہاتھ	صاف صندل سے زیادہ وہ ہاتھ
دستہ گلدستہ رہے جس کے حضور	پنجہٴ مہر کا سا شعشعہٴ نور
لیے لیتا تھا مگر ہاتھ مین دل	دھر دیا تمام جگر ہاتھ مین دل
یہ غزل اپنی زبان پر آگئی	آفت تازہ جو جان پر آگئی

تھوڑی سی گفتگو کے بعد جس مین جانبین نے بذلہ سنجی کی داد دی مومن وہان سے اٹھ کر اپنے گھر پہنچے مگر اس مہر تابان کا پنجہ دیکھ کر اس طرح مائل ہوئے تھے کہ دل وہین رہ گیا ۔ رات بھر نہ سو سکے ۔ اگلی صبح پھر وہین پہنچے اور کچھ دیر نبض بول کر بلکہ درپردہ اپنا درد دل اس خورشید لقا کو سنا کر واپس آگئے ۔ پھر تو ہر روز وہان جانا ان کا معمول ہوگیا ۔ وہ بھی ان کی خوش پوشی و خوبروئی پر مائل ہوتی گئی ۔ رفتہ رفتہ نامہ و پیغام کا سلسلہ قائم ہوگیا ۔[1] آخر ایک روز موقع پاکر اس نے انھین تنہائی مین بلا بھیجا ۔ عاشق و معشوق بے حجابانہ ایک دوسرے سے ملے مگر دونون تحیّر کے عالم مین ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش حیران

.....٩

(١) کلیات اردو ص ٣٦٦

رہ گئے۔ محبت کی آگ جس نے مومن کا دل جلا کر خاک کر دیا تھا اس شعلہ پیکر[1] کے دل تک پھیل چکی تھی۔دونوں پر ستائے کا سا عالم طاری تھا۔

پانو رکھا جو میں گھر کے اندر | لگی اک آگ جگر کے اندر
بھی وہ شعلہ رخ و شعلہ عذار | بے حجابانہ ہوئی مجھ سے دوچار
بڑھ گئی تاب جگر سوز مری | خرمن صبر پہ بجلی سی گری
چاہا کچھ بات کہوں کہہ نہ سکا | چاہا خاموش رہوں رہ نہ ہو سکا
چشم و دل دونوں پریشانی میں | جنگ بیتابی و حیرانی میں
سو دم چند تو خاموش رہا | نشہ حیرت کا تھا بیہوش رہا
جوش جب دھوم مچانے آیا | رفتہ ہوش اپنے ٹھکانے آیا
پھر تو ہم غم کے بیان پر آئے | دلنشین نالے زبان پر آئے
اپنا احوال سنایا اس کو | درد دل خوب جتایا اس کو

اس حسینہ نے بھی اپنے دل کے زخم انہیں دکھلائے۔ محبت بھرے پیماوں کا یہ سلسلہ کئی ماہ قائم رہا۔[2] وہ عورت مومن پر مائل ہونے کے باوجود اس شخص کی محکوم تھی یکایک اسے واپس لکھنؤ جانا پڑا۔اس ناگہانی فراق کی خبر نہ تھی۔فوراً مومن کو اطلاع بھیجی کہ جدائی کا وقت آپہنچا۔دو گھڑی کو ہوجاؤ اور تنہائی میں آخری بار مجھ سے مل لو۔[3] مومن حسب طلب افتان خیزان وہاں پہنچے۔یوں تو یہ ساری مثنوی پرسوز اور دردناک ہے مگر اس

---

(١) کلیات اردو ص ٣٢٧
(٢) کلیات اردو ص ٣٢٦
(٣) کلیات اردو ص ٣٢٩

آخری ملاقات اور الوداعی مختصر گفتگو کا بیان زخم خوردہ شاعر نے ایسے درد بھرے الفاظ میں کیا ہے کہ پڑھ کر دل ٹکڑے ہوتا ہے :

کیا شبِ تعب سے ملاقات ہوئی — کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی

مل کے حسرت زدگان بیکس — دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس

خونفشاں لب پہ وہ آہیں باہم — حسرت آلودہ نگاہیں باہم

گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تابِ کلام — پر یہ بولی وہ ذرا جی کو تھام

کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو — مفت کس واسطے جی کھوتے ہو

اب تم اوروں سے لگا لیجیو جی — نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی

ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو — رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو

کہ بری آہ ہماری خو ہے — ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

خیر رخصت ہوا اب تک اپنا — اب وطن تم کو مبارک اپنا

کام دل رنج و بلا کو سونپا — تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا

کہہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی — ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی

ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے — با دل مضطرب و مضطر آئے

اس جانکاہ فراق کے صدمے سے مومنؔ پر بیخودی و ازخودرفتگی کا ایک طویل دور گزرا جس میں انھوں نے دشت نوردی سے کام رکھا بلکہ معشوقۂ مہر تمثال کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر بھی کیا ۔ شدتِ یاس نے بالآخر دل کی بیتابی کو بھی ختم کردیا اور ان پر یاس آمیز سکوت طاری ہوگیا جس کا دردناک بیان اس داستان کے آخری اشعار میں یوں ہوا

ہے ـــ

مومن زار کہ تھا گرمِ بیان | سوزشِ سینہ سے تھا شعلہ فشان
دل کی آتش سے جلا خاک ہوا | بجھ گیا شعلہ بھڑک کر دل کا
آتشین نالہ زد و رفت زھوش | ہمچو شمعِ سحری گشت خموش

ختم المومن نوحا حزنا
(۱)
ختم اللہ لہ بالحسنی

مثنوی کی زبان مین یہ داستان یہان ختم ہوجاتی ہے مگر قاری کے دل پر یاس و حسرت کا ایسا نقش چھوڑ جاتی ہے کہ اسے اس خورشید لقا معشوقہ کے متعلق جس نے مومن جیسے آزاد مزاج عشقباز کے دل پر غم کا ابدی داغ لگایا تجسّس باقی رہ جاتا ہے کہ یہ مہرجلوہ کون تھی کہان سے آئی کہان چلی گئی کلیات مین جس معشوقۂ حور طلعت کا مرثیہ ہے کیا وہ اسی سراپا ناز سے متعلق ہے یا دیگر وغیرہ وغیرہ

اس بارے مین اور تو تمام تذکرے خاموش ہین مگر مومن خان کے شاگرد اور ہمراز دوست نواب مصطفی خان شیفتہ نے اس المناک سانحے کے پورے بارہ سال بعد جبکہ مومن بہ قیدحیات تھے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے یعنی وہ مہرجمال لکھنؤ سے دہلی آئی ۔یہان کچھ عرصہ اپنے آشنا کے پاس رہی اور اسی عرصے مین مومن کے دل پر غم فراق کا داغ دے کر واپس چلی گئی انھی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیام دہلی کے زمانے مین ہی مومن کے فیض صحبت سے یہ مہرجمال شعر کہتی تھی اور حکیم صاحب سے اصلاح لیتی تھی ۔ امۃ الفاطمہ نام تھا ۔ (۲)

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۳۸

(۲) گلشن بیخار ص ۱۲۳

صاحب جی کی عرفیت سے معروف تھی اور صاحب تخلص کرتی تھی ۔ شیفتہ اس کے حسن و جمال خوش قامتی اور موزونی طبع کی تعریف کرنے کے بعد اس کے کلام کا انتخاب پیش کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ یہ ہیں :

" صاحب ۔ امۃ الفاطمہ صاحب جی ۔ ماہ آسمان نکوئی است ۔ آفتاب صفت از جانب مشرق بہ مغرب آمدہ ۔ بہ تقریب مداوا کارش با مومن خان افتادہ ۔ ماہے چند کار با درد و دوا بود سالہاست کہ باز بہ لکھنئو رفت ۔ بہ فیض صحبت شان دلش بہ شعر و شاعری میل کرد ۔ از موزونی قامت بہ موزونی طبع گرائیدہ ۔ مثنوی قول غمین کہ از خان معزی الیہ است شرح نسخۂ حسن و جمال ہمان موزون قد است " (۱)

حیات مومن کے مولف نے شاگردان مومن کے ذیل میں صاحب جی کا حال لکھتے ہوئے یہی حالات تحریر کیے ہیں ۔(۲) منشی صفدر علی صفدر مرزاپوری نے بھی اپنی تالیف حسن خیال میں اس معشوقۂ عاشق نواز کے متعلق یہی تفاصیل پیش کی ہیں ۔(۳) ظاہر ہے کہ دونوں صاحبان کا ماخذ گلشن بیخار ہے ۔

---

(۱) مولانا ابوالخیر صاحب اپنی خاندانی روایات اور نوشتوں کی بنا پر بیان کرتے ہیں کہ یہ حسینہ ایک ذی جاہ شخص کی داشتہ تھی جو کمپنی کی ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے ۔ ان کا بڑھاپا تھا اور یہ نوجوان تھی ۔ پہلے کسی شخص کی منکوحہ تھی جو جوانمرگ ہوا ۔ بیوہ ہونے کے بعد ان ڈپٹی صاحب سے متعلق ہوگئی ۔

(۲) حیات مومن ص ۸۱ ۔

(۳) حسن خیال ص ۸۹ ۔

عرش گیاوی نے مومن کے مختلف سفروں کے متعلق جوکچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سہسوان وغیرہ کا سفر اسی دلربا کی جستجو میں کیا تھا ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

" جوانی میں جب جذبات زوروں پر تھے اور محبت کی ناکامیوں سے جی گھبرا گیا تھا تو دلّی سے نکلے سہسوان رامپور بدایوں وغیرہ کا سفر کیا تھا ۔ مگر کہیں جی نہ لگا تو بےمرنگ واپس آئے " (۱)

خود مومن کا ایک قطعہ بھی رمز و معمّا کی صورت میں اس راز کی پردہ دری کرتا ہے کہ سہسوان کا سفر اسی مہر جلوہ معشوقہ کی تلاش میں کیا تھا[۲] جہاں وہ غالباً اپنے کسی عزیز کے گھر ٹھہری ہوگی ۔ سہسوان میں مومن نے اپنے ایک ہمراز دوست حکیم مظہر علی کے ہاں قیام کیا[۳] معلوم نہیں کہ جس گوہر نایاب کی جستجو میں وہ یہاں آئے تھے ملا یا نہیں ۔ غالباً نہیں ملا کیونکہ مختلف اشعار سے ناکامی کا رنگ ٹپکتا ہے ۔ وہی درد جو مثنوی قول غمین میں ابلا پڑتا ہے ایک حد تک اس قطعے میں بھی موجود ہے ؎

صاحبو میرا حال مت پوچھو	بندۂ سخت بےوفا ہوں میں
چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا	ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
اے خداوند شوخ کے غم میں	قابل رحم ہوگیا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک	کہ غلام گریزپا ہوں میں

(۱) حیات مومن ص ۵۸

(۲) کلیات اردو ص ۵۵۵

(۳) حیات مومن ص ۵۸

ایک اور قطعہ جس مین شاعر نے اپنی طویل علالت کا ذکر کیا ہے ظاہر کرتا ہے کہ مرض کی شدت درد فراق ہی کی بدولت تھی جس کا اندازہ ان کے چچا غلام حیدر خان صاحب کو بخوبی تھا ۔ اس کے آخری اشعار مین جو الفاظ آئے ہین وہ صاف اشارت کرتے ہین کہ ساری خرابی اسی معشوقۂ دلنواز کی جدائی کے باعث ہے ۔ نیزیہ کہ ہجران نصیب عاشق اس تک پہنچنے کے لیے بیتاب ہے ؎

باقی رہی ہے بچنے کی تدبیر کون سی　　اے ناصح شفیق و جگر سوز و چارہ ساز

اڑ یہی کہ پہنچون وہان جسکی خاک در　　کرتی ہے آج خاک شفا پر ہزار ناز

وہ مایۂ حیات وہ سرچشمۂ بقا　　جس کا کہ ہے لعاب دہن آب جان نواز

صد سالہ مردہ زندہ ہو گر اپنی بات پر　　آجائے اس صنم کا لب معجزہ طراز

رحم آئے تو عجب نہین آخر غلام ہون　　اور وہ غلام خاص کہ یوسف[1] تھا یا ایاز

پہنچا دے کاش کوچے مین اس سبزہ رنگ کے
مرتا ہون اپنی جان سے تا عمر خضر دراز

اس مثنوی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مومن اس ماہ پیکر کے غم مین مدتون تباہ حال رہے۔[2] بیقراری نے بیتابی کی اور بیتابی نے وحشت کی شکل اختیار کرلی اور وہ مہینون برسون دشت نوردی کرتے رہے تا اینکہ شدت یاس سے دل بجھ گیا اور آتش فراق کا شعلہ بھڑک کر خاموش ہوگیا ۔

---

(۱) یہان اور مناسبات کے علاوہ اس محبوبۂ دلنواز امۃ الفاطمہ المتخلص بہ صاحب کے اس شعر کو نظر مین رکھئے ؎

صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا　　یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی

(۲) ایضاً ص ۳۲۱ مولانا ابوالخیر اور عرش گیاوی دونون کا بیان ہے کہ صاحب جی دوبارہ دلّی آئی تھین اور مومن سے ان کا ربط و ضبط دوبارہ ہوا تھا ۔

اس سخت صدمے کے باوجود مومن کی عیش کوش طبیعت نئے مشغلے اختیار کرنے سے عاری نہ تھی — وہ شہد کی مکھی بننے کے بجائے نئے پھولون کا رس چوسنے کے قائل تھے — صاحب جی کے صدمۂ فراق نے انھین مدتون بیخود رکھا مگر آخر ان کی البیلی طبیعت اپنے اصلی رنگ پر آ ہی گئی — چند سال بعد مثنوی تف آتشین مین جو ۱۲۴۱ ھ کی تصنیف ہے وہ اس غم سے سنبھلنے اور دوبارہ خوشی و خرمی کی جانب مائل ہونے کا حال لکھتے ہین —(۱)

دل بہلایا شعر و سخن سے	جی کو سنبھالا حیلہ و فن سے
ربط قند بھی یاد دلایا	عیش کو پھر مہمان بلایا
ربط ہوا گلخندہ و لب مین	تازہ کھلا گل باغ طرب مین
ٹھہری تبسم سے بھی ہنسی کی	ہوگئی یاری دل سے خوشی کی
ہمنفس دم باد بہاری (۲)	سیر چمن مین روز گزاری

تمام مثنویون مین محبت نامہ وپیام ملاقات و وصال اور بالآخر فراق کا باقاعدہ سلسلہ موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن اپنے ہر معاشقے مین ان مراحل سے گزرتے رہے — جوانی کاروبار شوق مین بسر ہوتی گئی — ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ ہر مرتبہ فراق کی ناکامی سے گزر کر محبت کے نئے کھیل کھیلتے رہے — کوئی ناکامی انھین ہمیشہ کے لیے پست نہین کرسکی — الفت کی ایک بازی بگڑی تو انھون نے نئی بساط بچھا کر دوسری بازی شروع کردی — غالب کی

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۲۲

(۲) کلیات اردو ص ۳۲۳ الی آخرہ

مشہور غزل جس میں ان کی ہوس لب بام[1] پر کسی نوبہار ناز کو تاکتی ہے غالب سے کہیں زیادہ مومن کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ بلکہ مرزا صاحب جس دولت دیدار کی تمنا کرتے رہے مومن ہزار بار اس سے محظوظ ہوئے ۔ ان کی مثنویوں میں ایسے مواقع متعدد میں جہاں وہ "شہر لب و رخسار" کی سیر کرتے نظر آتے ہیں ۔ وہ کبھی چلمن کی آڑ سے کبھی کوٹھے پر کبھی کسی محفل عروسی میں کبھی کسی دوست کے گھر ایک نہ ایک ماہ طلعت سے دوچار ہو ہی جاتے ہیں[2] ۔ یہ سب محبوب پردہ نشین ہیں جن تک مومن کی رسائی بڑے جتن کیے بعد ہوتی ہے ۔ وہ کسی نہ کسی ترکیب سے ان تک پہنچتے اور درد دل سناتے ہیں ۔ مثنویوں میں یہ مقام جہاں جہاں آئے ہیں وہاں اب بھی کاغذ کی سطح سے حسینوں کے نورانی مکھڑوں کی ضیا پھوٹتی نظر آتی ہے ؎

اپنے کوٹھے پہ ایک دن تنہا	پھر رہی تھی وہ آفتاب لقا
میں بھی اس وقت ناگہاں پہنچا	داد کو میری آسمان پہنچا

ہوئی شادی ہمارے ہاں اک بار	آئی مہماں وہ دولت بیدار
شرکت محفل سراپا زیب	اس کے آنے کی ہوگئی تقریب
ایک خالی مکان میں آکر	مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر[3]

---

(۱) دیوان غالب اردو ۔ نولکشور ص ۱۲۱ ۔

(۲) غرض مومن کی جوانی اکبر کے اس مصرعے کا مصداق تھی ع

جوانی کیا تھی سیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا

(۳) کلیات اردو ص ۲۵۸

محو نظارۂ رنگ بازار — ناگہاں ہوگئی وہ مجھ سے دوچار

کہ وہ چلمن کا ذرا تھا پردہ — گرچہ تھا پردہ پہ کیا تھا پردہ

ہوئیے آپس میں نظارے کیا کیا — کئے ابرو سے اشارے کیا کیا

ترجمان چشم و نظر مطلب سے — کچھ تبسم بھی نمایاں لب سے (۱)

ناگہاں تھی وہ کہیں کوٹھے پر — میرے آنے کی نہ تھی اس کو خبر

بے خبر سامنے آئی یکبار — بے دھڑک ہوگئی وہ مجھ سے دوچار

دیکھتے ہی مجھے غش آنے لگا — ہوش بھی صبر غلط جانے لگا (۲)

پانو رکھا جوں ہی گھر کے اندر — لگی اک آگ جگر کے اندر

یعنی وہ شعلہ رخ و شعلہ عذار — بے حجابانہ ہوئی مجھ سے دوچار

بڑھ گئی تاب جگر سوز مری — خرمن صبر پہ بجلی سی گری (۳)

آفریں ہے طالع مسعود کو — پہنچے ہم یوں منزل مقصود کو

کرکے استقبال وہ ماہ تمام — لے گئی بارے مجھے بالائے بام

ان مثنویوں میں مومن نے اپنا حال اپنی سرگزشت شباب پر چنانکہ الحمد و دانی صاف صاف لکھ دی ہے ۔ اعزہ و اقربا کی مزاحمت، محبوبہ کے تیوروں کا چوکنا پن، ہزار تدبیروں سے محبوبہ تک رسائی، دولت وصل کا حصول، باہمی گلے شکوے، شدید رنجشیں، بدگمانی، افتراق،

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۱۲ (۲) ایضاً ص ۳۲۰ (۳) ایضاً ص ۳۲۶

جدائی غرض تمام واقعات تفصیل سے لکھے ہیں ۔ ان مثنویوں کے انداز بیان میں کچھ ایسا خلوص ہے کہ قاری آغاز داستان ہی سے عاشق شوریدہ حال کا رفیق بن جاتا ہے اور ایک مخلص دوست کی طرح رنج و راحت میں اس کا ساتھ دینے لگتا ہے ۔ اردو میں عمدہ مثنویوں کی تعداد کافی ہے مگر خلوص و یگانگت کا وہ رشتہ جو داستان گو عاشق اور قاری کے درمیان پنہان نظر آتا ہے بجز زہر عشق کے اور کہیں نہیں ملتا ۔ انداز بیان کا خلوص پڑھنے والے کو ہر قدم پر ساتھ لئے پھرتا ہے اور ہم ہر جگہ مصنف کے شادی و غم میں اپنے آپ کو شرکت کرتا ہوا پاتے ہیں ۔ سوز و گداز کا یہ عالم ہے کہ بعض جگہ بالخصوص مثنوی قول تعین میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں پڑھنے والا بے اختیار آب دیدہ ہوجاتا ہے ۔ اس کا خلوص میں کچھ ایسی کشش ہے کہ عشق برد کشاں کشاں کے بقول ہم بیخودانہ اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہیں ۔ مثلاً ایک مقام پر محبوبہ اپنی بدنامی کے بعد عاشق سے بیزار ہوجاتی ہے ۔ اس کا بیان ملاحظہ کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ یگانگت کا یہ رشتہ آپ کو کتنا متاثر کرتا ہے ؎

تھا میں اس گھات میں کہ اگر اک آن	ملے تنہا وہ راحت دل و جان
طور تحریک اضطراب کروں	شکوۂ جوش ہیجر و عتاب کروں
سو سر شام ادھر ہوا جو گذار	ملی تنہا وہ شمع شعلہ عذار
چشم نم سے پڑی نظر مجھ کو	ہوگئی آگ دیکھ کر مجھ کو
لگی کہنے کہ چل ہوا کیا بس	جی بھرا آئے ہے چلا جا بس
چاہئے دل کے بدلے آگ لگے	جل گئی جان تجھ کو آگ لگے
کیوں نہ دل میں مرے کدورت آئے	کیا کیا یہ تو خاک میں مل جائیے

مجھ سے اب دل لگائیے وہ ناکام   جس کو ہونا ہو خلق میں بد نام

مین نے کی جتنی معذرت نہ سنی   شوق دل کی مبادرت نہ سنی (۱)

ایک جگہ عاشق آدمی رات کے وقت محبوبہ سے جاکر ملنے کا حال بیان کرتا ہے :-

نیم شب جب ہوئی عنان کش دل   جانب منزل مہ کامل

ہوئے آنکھون سے ڈرتے ڈرتے روان   لغزش پا تھی جنبش مژگان

فکر رفت و نشست و گشت ستم   گئے پہنچے ملے پھر آئے ہم

اور کسی کو ذرا خبر نہ ہوئی   انجم نحس کی نظر نہ ہوئی

نہ ہوئی چشم عیب بینان کہ باز   نہ ذرا سر اٹھا سکے غمّاز

رہی پوشیدہ گرم جوشی شب   کھل گئی ہم پہ پردہ پوشی شب

دوسری رات بھی وصال ہوا   روز فرقت کا انتقال ہوا

جب ہوئی خاطر پریشان جمع   پھر تو ہر شب بسان شعلہ و شمع

کین عجب گرم جوشیان دل سے   لگے اس برق جلوہ سے ملنے (۲)

غم فراق مین مومن کئی بار مبتلا ہوئے - ہر مرتبہ ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ :-

ایک کچھ دن یہ دن احوال تباہ   آج تک کل سے کہین حال تباہ

منہ پہ پہلی سی بحالی نہ رہی   رنگ مین نام کو لالی نہ رہی

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۷۰

(۲) ایضاً " ص ۲٦٧

رہیے ہوشوں پہ فغان خونبار | دمبدم دیدۂ تر جیحون باز
آنکھوں مین اشک بھی آہی جائیے | خون دل رنگ دکھا ہی جائیے
ہر سے کچھ چشم سے حیرانی سی | ٹپکے نظروں سے پریشانی سی

مگر مومن صدمۂ فراق سے مضمحل ہونے کے بعد جلد بحال ہوجاتے اور طبیعت کو بہلا کر سنبھال لیتے تھے۔ ایسے ایک موقعے کا بیان بڑی لطافت سے تیسری مثنوی کے آغاز مین ہوا ہے

پر زرا جینے کا کچھ طور بھی تھا | ان چنالون مین چنال اور بھی تھا
صبر بھی شکل دکھا جاتا تھا | دل نہ ملنے پہ بھی آجاتا تھا
دشنہ گردن سے خفا ہوتا تھا | سنگ بھی سر سے جدا ہوتا تھا
شاد و خرم بھی زرا ہوتے تھے | ہنسنے بھی لگتے تھے گر روتے تھے
گئی دن مین ہوا غم اور بھی کم | پھر زرا اور بھی کم اور بھی کم
پھر تو وہ خبط وہ سودا ہی گیا | دل بیمار بحال آہی گیا
رنگ رفتہ نے جھلک دکھلائی | منہ پہ اک سرخی کی تہ سی آئی
زخم کاری ہوئیے آخر نا کام | آگیا جوش طپش کو آرام (۱)

مہر و محبت کی ان داستانوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مومن دہلی مین اپنی نظر بازی اور ہرجائی پن کی بدولت کافی بدنام تھے۔ قریب قریب ہر مثنوی مین معشوقہ کی برگشتگی کا سبب کسی بد آموز کی فتنہ سازی ہے جو بھلے ہرجائی شاعر کی ہرزہ گردی کے قصے سناکر محبوبہ کو

---

(۱) کلیات اردو ص ۳۱۱

اس سے منحرف کردیتی ہے ۔ ایک آدھ جگہ مومن نے اپنی ہوسناکی آوارگی اور بے راہ روی کا خود بھی اظہار کیا ہے اور معشوقہ کی طرف سے جو ملامت آمیز خطاب انھین ملے ہین صاف صاف لکھ دیے ہین :-

بے مروت بیوفا نا مہربان ۔۔۔ بے تمیز و بے خرد نا قدردان

دور گرد بارگاہ عاشقی ۔۔۔ کم خرام شاہراہ عاشقی

اے خراب اے بیحیا اے نابکار ۔۔۔ اے ذلیل اے مضطرب اے بیقرار

اے ہوس آمیز رنگ عاشقی ۔۔۔ دشمن ناموس و ننگ عاشقی (۱)

ان بدنامیون کے باوجود مومن کا کاروبار شوق چلتا ہی رہتا تھا ۔ " عشقبازی کے لئے دلی جیسا وسیع شہر پایا تھا جہان ان کی محبت کے افسانے لوگون کے زبان زد تھے " (۲) ۔ یہی افسانے مثنویون کی شکل مین آج بھی موجود ہین ۔ آخری مثنوی " آہ و زاری مظلوم " ۱۲۲۶ ھ کی تصنیف ہے جبکہ مومن کی عمر اکیس سال تھی ۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اور داستان محبت نہین ملتی لہذا خیال آتا ہے کہ مومن نے اور کوئی معاشقہ نہ کیا ہوگا ۔ بعض اشخاص مثلاً " مولانا ابوالخیر مودودی کا خیال ہے کہ مومن اپنے پیر یعنی سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد ہوس پرستی سے تائب ہوگئے تھے اور اس کے بعد کسی نے انھین مشاعرون مین غزل پڑھتے نہین سنا یہ صریحاً " غلط ہے ۔ شمس العلماء آزاد نے جو ۱۸۳۲ ء مین پیدا ہوئے انھین مرزا خدابخش

---

(۱) کلیات اردو ص ۳٦۷ ۔

(۲) تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ ص ۳۵۷

قیصر اور اصغر علی خان نسیم کے مشاعرون مین دلپذیر ترنم سے پڑھتے ہوئے سنا ہے ۔ المختصر مستند شہادتون سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۴۶ ھ کے مدتون بعد تک اپنے محبوب مشغلے مین مصروف رہے ۔ شیفتہ ان کے عزیز شاگرد بلکہ محرم راز رفیق ہین ۔ گلشن بیخار مین کہ چارسال بعد یعنی ۱۲۵۰ ھ کی تالیف ہے مومن کے حالات رکھتے ہوئے تحریر کرتے ہین کہ :

" بہ وصال یاران رنگین و شاہدان شہرین عمرے خوش بگذرانند "(۱)

ایک مقطع بھی اشارہ کرتا ہے کہ وہ کہولت کی عمر تک خاک بازی کرتے رہے اور ایک مدت تک جوانی کی غفلت ان پر مسلط رہی ؎

سو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت بھ مومن
نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخر شب

مثنویون کے علاوہ غزلون کے بعض اشعار بھی ان کی رنگین ہوس پرست طبیعت کا حال اور عشقبازیون کی داستان سناتے ہین ۔ " کیسے بگڑے مجھ سے تم الله اکبر رات کو " پھر سینہ سوز داغ غم شعلہ فام ہے تمھین یاد ہوکہ نہ یاد ہو نیز صفحۂ جبھون پر جو کبھو ہم سوزش دل لکھواتے ہین محض مفروضے یا سرسری رسمی غزلین نہین ہین بلکہ ان کی سرگزشت سمجھے جانے کی مستحق ہین ۔ مندرجہ ذیل اشعار بھی تکرار شوق کے اس رجحان کو نمایان کرتے ہین جس کی بدولت وہ دلی مین کافی بدنام تھے ؎

پھر دل اک بت کو دیا مومن نے کب وہ ان باتون سے باز آتا ہے

کیا کسی بت نے دل مین جگہ کی کوئی کھٹکا اور ہے حضرت مومن اب تمھین ہم مسجد مین بہت کم پاتے ہین

ہوگئے نام بتان سنتے ہی مومن بیقرار ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہین

---

(۱) گلشن بیخار ص ۱۹۶ ۔

ہوگئی دو روز کی الفت مین کیا حالت ابھی   مومن وحشی کو دیکھا اس طرف جاتے ہوئے تھا

بعض رباعیان بھی ان کی محبت کے افسانے بیان کرتی ہین مثلاً "

پھر کوئی صنم پسند آئے مجھ کو   کوئی بت مہر جلوہ بھائے مجھ کو

جس دن نے دکھائین یہ اندھیری راتین   وہ دن اللہ پھر دکھائے مجھ کو

جون ماہ مین عمر بھر پھرا ہون اے چرخ

ہر شہر مین دربدر پھرا ہون اے چرخ

ان سا کوئی مہروش تو دیکھا ہی نہین

مین تجھ سے زیادہ تر پھرا ہون اے چرخ (۱)

ابھی مین سے بعض رباعیان ان چھلون چھیڑون کا اشارہ کرتی ہین جن سے ہمارا کوچہ گرد شاعر وقتاً " فوقتاً " محظوظ ہوا اور جن کے نقوش غیر شعوری طور پر اس کے کلام مین باقی رہ گئے

مومن ہے امید وصل بیجا تجھ کو

کم فہمی شوق نے ڈبویا تجھ کو

پانی پھینکا تو گرم جوشی نہ سمجھ

نادان یہ دیا ہے اس نے چھینٹا تجھ کو

پانی اس بت نے تجھ پہ پھینکا مومن   احسان مین سر بسر ڈبویا مومن

ہے کشت امید سبز و خرم بارے   ابر رحمت کچھ آج برسا مومن

(۱) کلیات اردو ص ۲۵۷

عشق بازی مومن کی طبیعت ثانی بن چکی تھی ـ جب تک اس معاملے مین کامیاب و کامران رہتے دولت وصال کے مزے لوٹتے ـ جب چرخ کج رفتار کی گردش سے بات بگڑتی اور محبوبہ بیوفائی اختیار کرتی تو کبھی گردون دون کا کبھی بخت واژگون کا گلہ کر کے کبھی اپنی اخترشناسی کو کوس کر دل خالی کیا کرتے ـ غالبا" یہی ملال واسوخت اور واسوخت نما غزلون کی شکل مین ظاہر ہوتا ـ کبھی اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتے اور جیساکہ پہلی مثنوی کے آخر مین آن کید کن کی تلاوت کر کے حسینون کی الفت سے اجتناب کا عہد کرتے ہین (۱) اپنے دل کو سمجھایا کرتے کہ خاک بازی کا شغل اچھا نہین ـ مومن ان فیصلون پر کاربند نہ ہوسکے تاہم وقتا" فوقتا" ٹھوکر کھانے کے بعد جب کبھی ہوش آیا تو احتراز و اجتناب کا ارادہ ظاہر ضرور کیا ـ ذیل کی رباعیان اسی رجحان کا نتیجہ ہین :

رباعی

مومن شوق گناہ گاری کب تک ۔۔۔ اے تیرہ درون سیاہ کاری کب تک

مان اپنے خدا کو باز آ بہر خدا ۔۔۔ اے دشمن دین بتون سے یاری کب تک (۲)

رباعی

مومن رہ عشق آہ کچھ خوب نہین ۔۔۔ واللہ بتون کی چاہ کچھ خوب نہین

آ مان کہا نہ جا سوئے بتخانہ ۔۔۔ کچھ خوب نہین یہ راہ کچھ خوب نہین

رباعی

محروم حصول مدعا ہے چاہا ۔۔۔ حسرت زدہ بخت نارسا ہے چاہا

مومن اس بت نے گرنہ چاہا نہ سہی ۔۔۔ ہم خوش ہین اسی مین جو خدا نے چاہا

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۷۵ (۲) کلیات اردو ص ۲۰۵

غرض جوانی انہی مشغلوں میں گزر گئی - جب شباب کی مستی کم ہوئی اور کہولت کی صبح کاذب نمودار ہونے لگی تو فطرتاً " کاروبار شوق کی رفتار مدھم پڑ گئی - انہیں ایک عالی خاندان شریف انسان کی طرح اپنی غلطیوں کا احساس ہوا - آوارگی و عیش کوشی سے کنارہ کش ہوگئے - رام بابو سکسینہ نے اسی دور کے متعلق اشارہ کیا ہے کہ :

" جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو انہوں نے تمام بری باتوں سے توبہ کرلی "[1] -

کریم الدین صاحب تذکرۂ شعرائے اردو کی بھی یہی رائے ہے[2] - مومن کے حالات میں لکھتے ہیں :

" ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو و لعب دنیا میں صرف کر کے تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر کہنا بھی چھوڑ دیا ہے - اب پابند نماز روزے کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں " -

کریم الدین نے اپنا تذکرہ ۱۸۴۷ میں مرتب کیا ہے - ان کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ مومن نے سن مذکور سے کچھ پہلے جوانی کے بیہودہ مشاغل سے ہاتھ اٹھا لیا تھا اور اس بدمستی سے توبہ کرلی تھی جس میں ان کی ساری جوانی ضائع ہوئی -

اسی دور کے پیش نظر نواب صدیق حسن اور ان کے بیٹے علی حسن نے اپنے تذکروں میں مومن کا ذکر عقیدت آمیز الفاظ سے کیا ہے[3] - کیونکہ ان دنوں مومن اس ہوسناکی و ہرزہ گردی سے تائب ہوچکے تھے جس میں ان کی جوانی بسر ہوئی تھی اور جس کی ندامت کا احساس ان کے بعض قصائد میں پایا جاتا ہے -

---

(۱) تاریخ ادب اردو - رام بابو سکسینہ ص ۳۵۶

(۲) کریم الدین - تذکرۂ شعرائے اردو ص ۴۲۳

(۳) شمع انجمن ص ۴۲۸

مومن نے حمد باری تعالی میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں اپنی بے راہ روی اور ہوس پرستی کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے ۔ سنّ تصنیف کا تعین مشکل ہے لیکن لہجے کی ندامت اور اندازبیان کی متانت اشارہ کرتی ہے کہ پختہ عمری کا کلام ہے ۔ شباب کی لغزشوں کے اشارے بڑے لطیف پیرائے میں عمدہ مناسبات کے ساتھ کئے ہیں ؎

اللہ غم بتان میں یک چند ۔۔۔ بے فائدہ جان کو کھپایا

سمجھا نہ کہ ہے رہ خطرناک ۔۔۔ دین و دل و عقل کو لٹایا

حاصل نہ ہوا سوا ندامت ۔۔۔ کس تخم کو خاک میں ملایا

ہر حلقۂ دام آرزو نے ۔۔۔ طوق لعنت مجھے پنہایا

تھا شور نداک جائیے لبیک ۔۔۔ اس دشمن دین نے گر بلایا

کرتے رہے شکر بخت بیداد ۔۔۔ ساتھ اپنے صنم نے جو سلایا

روٹھا کوئی نازنین صنم گر ۔۔۔ سوگند دروغ کھا منایا

کتنی ہی قضا ہوئیں نمازیں ۔۔۔ پر سر کو نہ پانو سے اٹھایا

گل پیرہنوں کی آرزو نے ۔۔۔ اکثر خزو پرنیان پنہایا (١)

ایک اور قصیدے میں جو نواب وزیرالدولہ والی ٹونک کی مدح میں ہے عہد شباب کی لذت کوشی و کامرانی کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوانی کے رنگین دور میں وہ ارباب نشاط کے شبستانوں اور رقص و سرود کی محفلوں میں بھی شریک رہے ہیں اور ان تمام لذتوں سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں جو جنت نگاہ اور فردوس گوش کہلاتی ہیں ؎

ہائے وہ رقص خوشنما جس کی ۔۔۔ شکل انداز سرو بستانی

(١) کلیات اردو ص ١٨١

(۱)
ہائے وہ زمزمہ سرا جن کی سحر ہاروت زمزمہ الحانی

امامن دھلی کی مشہور طوائف تھی ۔ ۱۸۲۳ء مین جوانی کی بھری بہار مین بازار امکان سے شبستان عدم کو روانہ ہوئی ۔ مومن نے اس کی وفات پر جس دلسوزی و اہتمام سے قطعۂ تاریخ کہا ہے اس سے ان کے قلبی تعلق کا اندازہ لگا سکتے ہین ۔ یہان صرف چند اشعار لکھے جاتے ہین ؎

خزان دیدہ شد نوگلے در جوانی جوانے چنین باغ امکان ندارد

امامن کہ مانند او لعبتے خوش پس پردہ گردون گردان ندارد

دریغا کہ جان جہان دلربائے بخاک از جہان رفتہ و جان ندارد

دمید ارچہ سنبل ز خاک مزارش خم و پیچ آن زلف پیچان ندارد

چو امید وصلش بہ مردن فتادہ خوشا دردمندے کہ درمان ندارد

چہ گویم ز سال وفاتش چہ گویم غم و رنج و آزار پایان ندارد

مگر عمر کے ساتھ ذمہ داریون مین اضافہ ہوتا گیا ۔ فرائض کا بار بڑھتا گیا اور رنگین مزاجی کم ہوتی گئی ۔ مختصر یہ کہ ان تمام عوامل نے اور اس دینی تعلیم نے جو مدرسۂ رحیمیہ مین حاصل کی تھی نیز اس احساس " ننگ و نام " نے جو شریف گھرانون مین کم و بیش برقرار رہتا
(۲)
ہے انھین شباب کے بیہودہ مشاغل سے کنارہ کش کر دیا ۔ بے راہ روی نے پرہیزگاری کی اور رنگین مزاجی نے شگفتہ حالت کی جگہ لے لی ۔ وہ تمام منہیات سے تائب ہوکر احکام دین کے

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۱۹

(۲) نواب صدیق حسن جو ان کے معاصر ہین اپنے تذکرہ شمع انجمن (ص ۲۲۸) مین انھین مومن کامل لکھتے ہین ۔

سختی سے پابند ہوگئے — نجوم رمل شطرنج اور شاعری کے مشغلے البتہ جاری رہے — یہی وہ دور ہے جس کا عمومی تصور ہمارے ذہن پر طاری ہے — اس زمانے میں وہ ایک پختہ عمر سلیم الطبع خوش باش محفل آرا رئیس کی شکل میں نظر آتے ہیں جو اپنی وسیع حویلی کے دالان میں صبح کے وقت مریضوں کو فیض پہنچا رہا ہے — دو گھنٹے بعد عزیزوں دوستوں اور شاگردوں کے جمگھٹے میں شعر گوئی اور غزلخوانی کی داد دے رہا ہے —(۱) دوپہر کو بالا خانے پر کرامت علی خان کے ساتھ شطرنج کی چال میں الجھا ہوا ہے کبھی حکیم سکھانند راقم کو رمل کے نکتے سکھاتا ہے — کبھی نواب اصغر علی خان نسیم اور شہزادہ خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں ترنم سے اپنی غزل پڑھ کر حاضرین جلسہ کو اپنے کلام کے سوز سے رلاتا ہے —(۲) ان مشاغل کے دوش بدوش دنیا کے دھندے اور فکر معاش پر بھی متوجہ ہے — جہاں جہاں سے زر سالانہ اور جاگیر کا مالیہ وصول ہوتا ہے وہاں تقاضائی خطوط لکھے جارہے ہیں —(۳) کسی رئیس نے بلایا ہے تو فطری خود داری کے باوجود وہاں بھی پہنچے اور شعر گوئی و بذلہ سنجی کی داد دے کر اسے اپنا معتقد بناتے ہیں — دیوان خانے کی خلوت میں شکر ئے کا قصیدہ بھی لکھ رہے ہیں — آئندہ مشاعرے کے لئے غزل یا دو غزلہ بھی تیار کرتے جاتے ہیں — المختصر ایک خوش وضع کثیر الشوق شگفتہ و عظیم شخصیت ہے جو دہلی کی وضعداری و امارت کا دلکش نمونہ پیش کرتی اور ہمارے ذہن پر پائدار نقش چھوڑ جاتی ہے —

---

(۱) دیوان مومن فارسی ص ۱۰۹

(۲) حیات مومن ص ٦١

(۳) انشائے مومن (فارسی) ص ۵۹ و ص ۱۳۸

دیگر مزاجی خصوصیات | رنگینی و لذت کوشی کے بعد جو خصوصیت مومن کی طبیعت

مین نمایان نظر آتی ہے ان کی نازک مزاجی ہے - قاعدہ ہے کہ جو اشخاص ذہین ہوتے ہین

انھین خلاق عالم کی بارگاہ سے ذکاوت احساس بھی عطا ہوتی ہے - یہ چیز مومن کو بھی

ملی تھی اور بعض اوقات ان کے لئے آشفتگی و آزردگی کا سبب بنی - ہم بالعموم مومن کے متعلق

یہی تصور کرتے ہین کہ ایک رنگین مزاج عیش کوش امیر زادہ ہے جو جوانی بھر رنگ رلیون مین مشغول

رہا - یہ سچ ہے کہ انھون نے عہد شباب مین عشقبازی کی دل کھول کر داد دی مگر دنیا کی

ذمہ داریان کم و بیش ہر شخص کے ساتھ لگی ہوتی ہین - غم جانان کی گرفت سخت سہی مگر

غم دوران کی تلخی بھی اپنی جگہ مسلّم ہے - مومن کے ساتھ یہی سانحہ گزرا کہ وہ بہ یک وقت

ان دونون کا شکار رہے -

ہم مرزا غالب کے متعلق اچھی طرح جانتے ہین کہ وہ عمر بھر تنگ دست رہے[1] - اردوئے

معلّی اور عود ہندی کے بہت سے خطوط نیز مثنوی ابر گہربار کے اشعار گواہی دیتے ہین کہ

ان کے ارمان بہت کچھ نکلا نکلنے کے باوجود کم نکلے - یہ صحیح ہے کہ مختلف اوقات مین ان

کی وجہ معاش برابر قائم رہی - ایک دروازہ بند ہوا تو دوسرا کھل گیا - نوجوانی سے آخر عمر

تک ان کو مختلف ذرائع سے معاش حاصل ہوتی رہی - آبائی جاگیر کی آمدنی بند ہونے پر سرکار

انگلشیہ کی طرف سے ان کی پنشن مقرر ہوگئی - نواب یوسف علی خان ناظم کی طرف سے سو روپیہ

ماہوار آتا تھا[2] - ہندو اور مسلمان شاگرد بھی تھوڑی بہت خدمت کرتے رہتے تھے - بعض تقاریب

---

(۱) یادگار غالب ص ۱۰۳

(۲) غالب از مہر ص ۲۰۵

پر سرکار انگلشیہ سے خلعت و انعام بھی ملتے تھے ۔ یہاں ھمہ چونکہ امیرزادے تھے اس لئیے یہ محدود آمدنی ان اخراجات کی کفالت نہ کرتی تھی جو امارت و ریاست کا ٹھاٹھ قائم رکھنے کے لیے ضروری تھے ۔ مومن کی بھی یہی حالت تھی ۔ غالب پر تنگ دستی کے ہاتھ سے جو کچھ گزرتی تھی ہم اس سے اس لئیے واقف ھیں کہ ان کے خطوط ہمارے سامنے ھیں ۔ مومن کی حالت اس لئیے معلوم نہیں کہ ان کے فارسی خطوط جن میں انھوں نے اپنا حال لکھا ہے (۱) بہت کم پڑھے جاتے ھیں ۔ انشائے مومن کے مطالعے سے اندازہ ھوتا ہے کہ غالب کی طرح حکیم صاحب بھی احتیاج کے مزمن مرض میں مبتلا رہے ۔ دیگر عوامل کے دوش بہ دوش یہ سبب بھی اس آزردگی کا موجب ہے جس نے نازک مزاج شاعر کو عمر بھر رنجیدہ رکھا اور جس کے ہاتھوں وہ نظم و نثر میں جا بجا فریاد کرتا نظر آتا ہے ۔ (۲)

مومن بالطبع نفاست و نزاکت کے دلدادہ تھے ۔ ھمیں ان کے لباس اور رہن سہن کے انداز سے معلوم ھوجاتا ہے کہ وہ ذوق جمال جو ان کی زندگی میں رچا ھوا تھا اسی نفاست و نزاکت کا پیدا کردہ تھا ۔ احساس کی نزاکت اگر ایک طرف انھیں خوش پوشی و جامہ زیبی پر مائل کیا تھا تو دوسری جانب ان کو اتنا نازک مزاج بھی بنا دیا تھا کہ وہ کسی نا مطبوع بات کو برداشت نہ کرسکتے تھے ۔ ہر وہ واقعہ جو ان کی مرضی کے خلاف واقع ھوتا انھیں سخت رنجیدہ کردیتا تھا ۔ (۳) اس گرم جوشی و گرم اختلاطی کے باوجود جس کا نقشہ ان کی رنگین نوجوانی کے اذکار میں ضمناً کھنچا ہے مومن بہت حساس اور غیور آدمی تھے ۔ یہ ذکاوت احساس اگر

---

(۱) انشائے مومن ص ۵۹ و ۱۱۷ و ۱۱۸ و ۱۳۸

(۲) انشائے مومن ص ۱۱۷ ص ۱۱۸ ص ۱۳۸

(۳) مثلاً اپنے خسر عظیم اللہ بیگ کیدان کے ساتھ رنجش کا واقعہ جو انھوں نے ایک خط میں (بہ نام غلام ضامن کرم) لکھا ہے اور نہ صرف خسر کو بلکہ پوری سسرال کو خوب صلواتیں سنائی ھیں انشائے مومن ص ۵۶

اعتدال کی حدود میں رہے تو قابل تعریف ہے اور غیرت مندی کی علامت ہے۔ مگر جب حد سے بڑھ جائے اور میر کی بددماغی سے جا ملے تو غیر مستحسن ہے۔ غالب تو اپنی مرزا منشی کے باوجود باید سوخت و باید ساخت پر عمل کرلیتے تھے مگر یہ آخر عمر تک اس نازک مزاجی سے مغلوب رہے جو کبھی کبھی تنک مزاجی تک پہنچ جاتی تھی۔ ذیل کے واقعات سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہ خلاف مزاج باتوں سے کس قدر برہم ہوجاتے تھے اور ہر ناگوار واقعہ انھیں کتنا مشتعل کردیتا تھا۔

ایک مرتبہ مولوی فضل حق خیرآبادی کے ساتھ جو مومن و غالب دونوں کے دوست تھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ باتوں باتوں میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا ذکر نکل آیا۔ مولوی فضل حق صاحب اپنی خوش عقیدگی کے پیش نظر ان خیالات کے بزرگ تھے جنھیں ہم آج کل بریلوی عقائد کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جنھیں بدعتی ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے[1]۔ اس کے برعکس شاہ عبدالعزیز صاحب بلکہ ان کا سارا کنبہ اس اجتہادی ذہنیت کا تھا جس کسی تجدد پسندی انھیں وہابی کا لقب دینے کے لئے کافی تھی۔ غرض عقائد میں اختلاف تھا۔ مولوی فضل حق صاحب نے بے پروائی سے کہا کہ وہ (شاہ عبدالعزیز) اتنے تو نہیں ہیں جتنا آپ سمجھے بیٹھے ہیں۔ مومن نے فضل حق صاحب کی بزرگی کا لحاظ کئے بغیر سختی سے جواب دیا کہ آپ جیسے ان کا مرتبہ کیا سمجھ سکتے ہیں۔ اتنا کہہ کر کھیل سے ہاتھ اٹھا لیا اور کشیدگی و کبیدگی کے انداز میں یہ شعر پڑھا جس میں لفظ آرزو سے مولوی فضل حق

---

(۱) ان دنوں امتناع نظیر خاتم المرسلین کا عقیدہ گرما گرم مباحثے کا موضوع بن گیا تھا۔ مولوی فضل حق امتناع کے قائل تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے غالب کو بھی اپنا ہمنوا کرلیا تھا۔ دیکھئے کلیات غالب فارسی ص ۸۹

صاحب پر طعن ہے کیونکہ مولوی صاحب کا تخلص آرزو تھا ؎

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دو

مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم (۱)

اسی طرح ایک مرتبہ گو سکندر خان سکندر کی غزل دیکھ رہے تھے جو ان کا شاگرد تھا۔ جب اس شعر پر پہنچے تو تامل کیا اور کہا کہ مفہوم صاف نہیں ہے ؎

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینے کا لحاظ

اور یار یہ سمجھتے ہیں مجھ میں ہی دم نہیں

اس نے خواہ بے پروائی سے خواہ خود رائی سے کہا کہ مفہوم میں کوئی اغلاق نہیں۔ خان صاحب کو اتنی تاب کہاں کہ شاگرد کی گستاخی سے درگزر کریں۔ اسی روز استادی شاگردی کی بساط الٹ گئی۔ (۲)

اگرچہ ان دونوں واقعات میں مومن کی آزردگی حق بجانب ہے مگر اتنا اشارہ مناسب ہے کہ دنیا کو دام علائق کہتے ہیں اور ہر شخص کو اس کے ناگزیر و ناگوار واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حوصلہ مند اشخاص تحمل اور درگزر کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ اور باید سوخت و باید ساخت پر کاربند رہتے ہیں کہ صبر و تحمل انبیائے اولوالعزم تک کا نشان افتخار ہے۔ ابوطالب کلیم نے اس خارزار علائق سے گزرنے کا کیا اچھا اصول بیان کیا ہے ؎

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے

یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گزشت

---

(۱) امیر الروایات ص ۲۶۲۔ کلب علی خان فائق اورلح فلسفہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مومن اور مولانا فضل حق کے درمیان کسی موضوع پر مناظرہ ہوا تھا جس میں مومن غالب رہے اور آخر میں کبیدہ خاطر ہوکر یہ شعر پڑھتے ہوئے اٹھ گئے۔ (۲) گلستان سخن ص ۲۷۵

مومن میں یہ حوصلہ نہ تھا - نزاکت مزاج کسی نامرغوب بات کی تاب نہ لا سکتی تھی غالب کے خطوط پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاگردوں کی فروگزاشتوں سے درگزر کرتے اور ان کے مراسلوں کا جواب دیتے وقت ان کی غلطیوں کا بڑے لطیف انداز میں اشارہ کرتے تھے - بعض شاگرد اصلاح کے لئے اپنی غزلیں پیہم بھیجتے تھے اور یہ خیال نہ کرتے تھے کہ مرزا صاحب کو اتنا وقت میسر بھی آتا ہے یا نہیں کہ وہ ان کی فرمائشیں پوری کرسکیں - مرزا ان سب کو بڑی نرمی سے جواب لکھتے تھے - جہاں بہت ہی گھبرا جاتے وہاں بھی ایسے انداز سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے کہ مکتوب الیہ آزردہ ہونے کے بجائے مسکرا پڑے - ایسے ہی ایک شاگرد (احمد حسن) کو جو سادات سے ہے لکھتے ہیں :-

> " حضرت - آپ کے جد کا غلام تو مرلیا - تواتر ورود اشعار - پھر اس پر یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو - آپ کی غزلیں آتی نہیں برستی ہیں - کہاں تک دیکھوں - اوروں کی غزلیں بھی ان میں گم ہوجاتی ہیں " - (١)

منشی بال مکند کو ایک اور شاگرد کے خط میں یہ پیغام دیتے ہیں :

> " بے صبر (بال مکند) کو اس مرتبہ صبر کرنا پڑے گا " (٢)

غرض ہر شخص کے ساتھ مدارات سے گزر کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں (٣) کی کثیر تعداد ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی - ذوق بھی مرنجان مرنج

---

(١) اردوئے معلّٰی ص ١٨٢ خط مورخہ ١٨ اکتوبر ١٨٦٦ء

(٢) ایضاً ص ٦٧

(٣) دیکھئے مختلف خطوط - عود ہندی ص ٧١ ص ١٨٣ اردوئے معلّٰی ص ١٨٥ ٣٦٧

بلکہ متحمل و صلح کن بزرگ تھے جن کے عجز و انکسار نے قلعے کے اکثر شہزادوں اور سلاطینوں کے دل مسخر کر رکھے تھے ۔ اس کے برعکس مومن کی نزاکت احساس کسی ناگوار معاملے کو تھیس برداشت کرنے سے قاصر تھی ۔ ان کے شاگردوں کی تعداد مختصر تھی جو شام کے وقت ان کے دیوان خانے میں آتے مگر آداب حاضری کی اتنی پابندی کی جاتی کہ وہ مجلس انس کسی امیر کا دربار معلوم ہوتی ۔ (۱) مزاج کچھ ایسا نازک پایا تھا کہ نازبرداری ممکن ہی نہ تھی ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری نیازمندی حسینوں کے لئے وقف تھی مگر غور کیجئے تو وہ عاشق مزاجی کے باوجود ان کی نازبرداری کے لئے بھی تیار نہ تھے ۔ مثنویوں سے جو ان کی حیات معاشقہ کی تصویریں ہیں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آئینہ پیکر نازنینوں کی سخت مزاجی کا متحمل کرنے کے بجائے بہت جلد ان سے ترک تعلق کرکے دوسرے دلنواز معشوقوں سے ربط قائم کرلیتے تھے ۔ تیسری مثنوی میں ایک جگہ یہ صورت یوں بیان ہوئی ہے ؎

پھر تو یک بارگی صحبت بگڑی   ہم میں اور ان میں قیامت بگڑی

ایسی بگڑی کہ صفائی نہ ہوئی   نہ ہوئی ترک لڑائی نہ ہوئی

خفگی پھر کسی صورت نہ گئی   نہ گئی دل سے کدورت نہ گئی

---

(۱) حیات مومن ص ۲۷

(۲) مومن کے واسوخت ان کے مزاج کے آئینہ دار ہیں ۔ غزلوں میں بھی کہیں کہیں یہی انداز نمایاں ہے ؎

رکھ لیویں گے پتھر مگر ان سنگدلوں کو   چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کریں گے

گر آرزوئے وصل نے بیمار کیا تو   پرہیز کریں گے یہ مداوا نہ کریں گے

(۳) کلیات اردو ص ۳۰۹

پہلی شنوی کے خاتمے پر بھی بیوفا حسینوں سے اجتناب کا عہد کرتے ہیں ؎

مومن اب تو بھی اپنے نامہ پہ جا　　　دام کو ان بتوں کے آگ لگا

کب تلک حسرت وصال اناث　　　کیا نہیں جانتا تو حال اناث

کسی نے کی ہے یا نہیں تعلیم　　　آیہ انّ کیدکنّ عظیم (۱)

بعض غزلوں میں بھی یہ رجحان نمایاں ہے مگر مومن نے اپنے جلے ہوئے دل کے پھپھولے سب سے زیادہ واسوختوں میں پھوڑے ہیں جہاں وہ محبوب کی بیوفائی اور اگلی پچھلی خطائیں گن کر اسے چھوڑ دینے اور دوسرے معشوقوں سے دل لگا لینے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ (۲)
ان تمام رجحانات کو ذہن میں رکھئے تو صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ مومن کی نازک مزاجی کسی حالت میں ناپسندیدہ و نامرغوب امور کی متحمل نہ ہوتی تھی ۔وہ طبعاً "نازبرداری و نیازمندی سے متنفر تھے اور غالباً" اسی وجہ سے امراء کے درباروں تک پہنچنا گوارا نہ کر سکے۔

استغنا | یہ بھی نازک مزاج مومن کی طبیعت کا ایک جلالی پہلو ہے۔ آبائی امارت کا نتیجہ سمجھئے یا خاندان ولی اللہ سے عقیدت کا اثر وہ اپنی فطری نازک مزاجی کے باعث ان ذلتوں کو گوارا نہ کر سکتے تھے جو سلاطین و امرا کے درباروں میں بعض اوقات پیش آتی ہیں اور جن سے ہمارے درباردار شاعروں کو دو چار ہونا پڑا ہے ۔سید انشا' مصحفی' جرات' غالب اور ذوق کی درباری زندگی پر نظر ڈالئے تو سخت قلق ہوتا ہے ۔انشا جیسا جوہر قابل سعادت علی خاں بلکہ جان بیلی صاحب (ریزیڈنٹ) کو خوش کرنے کے لئے کیا کیا بھروپ بھرتا تھا۔(۳)

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۷۵
(۲) کلیات اردو ص ۵۰۶ تا ص ۵۳۰　(۳) آب حیات ص ۲۹۱

مصحفی کو نواب سلیمان شکوہ کے دربار مین کیا کیا خجالتین اٹھانا پڑین (۱) ذوق کی
اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کی بارگاہ مین کیا وقعت تھی ۔ غالب بہادر شاہ ظفر کی
خوشنودی حاصل کرنے اور حکام فرنگ کی پیشگاہ مین اپنا خطاب خلعت اور لمبر بحال کرانے
کے لئے کتنی تگ و دو کرتے تھے ۔ (۲) یہ بڑی دردناک داستان ہے جو ہمارے ملک یا زبان
تک محدود نہین ۔ قریب قریب ہر ملک کے ادیب اس تکلیف دہ ضرورت کے ہاتھون نالان نظر
آتے ہین مگر اس مظلوم گروہ مین بعض باکمال ایسے بھی ہین جن کے چہرون پر قناعت و استغنا
کا نور برس رہا ہے ۔ ولی دکنی ایسے ہی باخدا بزرگ ہین ۔ میر اور سودا دونون کو دربار
شاہی سے تعلق رہا مگر اس مین عجز و الحاح کے بجائے خودداری و بلند ہمتی کا رنگ غالب ہے ۔
لکھنؤ کے اساتذہ مین آتش و ناسخ دونون بزرگ اس ذلت سے محفوظ ہین ۔ اول الذکر کو
فقیری نے اور دوسرے کو خودشناسی و غیرت نے دربارداری کی ذلت سے دور رکھا ۔ میر انیس
کا میدان ہی مختلف تھا ۔ انھون نے خاندان رسول کا دامن تھاما تھا ۔ امجد علی شاہ اور واجد
علی شاہ یا ان کے امراء کو کیا نگاہ مین لاتے ۔ دہلی کے دور آخر مین مومن وہ باکمال ہین
جنھون نے فن کا احترام قائم رکھا ۔ وہ نہ بہادر شاہ کے دربار مین گئے نہ حاکمان فرنگ
کے آستانون پر سر جھکایا ۔ قصائد انھون نے ضرور لکھے مگر قریب قریب سب اکابر دین کی
مدح و منقبت مین یا حمد و نعت مین ہین ۔ صرف دو قصیدے ایسے ہین جن مین ان کا روئے سخن
ارباب دولت کی طرف ہے ۔ پہلا نواب وزیرالدولہ والی ٹونک سے متعلق ہے جو مومن کے پیر
بھائی تھے اور جنھون نے مومن کو اپنے دربار مین بلانا چاہا تھا اور یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ وہ

(۱) آب حیات ص ۳۱۷ ۔
(۲) غالب از مہر ص ۳۰۲ تا ص ۳۱۳

فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کرلیں ۔ مومن نے جس انداز میں نواب مذکور کا
شکریہ ادا کیا ہے اور اس کے ساتھ جس طرح اپنے کمالات کا اظہار کیا ہے اسے دیکھ کر کون
کہہ سکتا ہے کہ یہ مدحیہ قصیدہ ہے(۱)۔ صاف عرفی کا سا انداز ہے جو اکبر شاہزادہ سلیم
خانخانان اور ابوالفتح گیلانی کی مدح کرنے کے دوش بہ دوش اپنے آباء و اجداد نیز اپنے
کمالات کا دفتر کھول دیتا ہے ۔ دوسرا قصیدہ راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں ہے جو مہاراجہ
پٹیالہ کے بھائی تھے اور جنھوں نے ایک مرتبہ مومن کو بلا کر اعتراف کمال کے بطور انھیں ایک
ہتھنی انعام میں دی تھی(۳)۔ یہ قصیدہ مومن نے اس واقعے کے بعد بطور شکریہ کہا تھا۔

کچھ شک نہیں کہ مومن نے اپنی عادت کے برخلاف اس قصیدے میں وہی شاعرانہ
مبالغے کئے ہیں جو بخشی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں ۔ لیکن انداز کلام سے اتنی بات ثابت
ہوتی ہے کہ راجہ اجیت سنگھ میں بعض ایسے اوصاف موجود تھے جو اس میں اور مومن میں مشترک
تھے ۔ وہ حسن و جمال کے علاوہ جامہ زیب و خوش پوش بھی تھا اور اس کی بارگاہ میں زہرہ جمال
حسینوں کا ہجوم رہتا تھا ۔ غرض جس طرح عرفی نے شاہزادہ سلیم کے حسن و جمال کی
تعریف کی ہے مومن نے بھی والہانہ انداز میں اجیت سنگھ کے اوصاف لکھے ہیں ۔ انھوں نے
اس کی سخاوت و شجاعت کے علاوہ اس کی وجاہت و خوبروئی کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام
لیا ہے ۔ راجہ اولاد سے محروم تھا ۔ مومن نے اس معاملے پر بھی حسن تعلیل کا پردہ ڈال کر

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۱۸

(۲) کلیات اردو ص ۲۲۶

(۳) حیات مومن ص ۱۰۲ ۔ معلوم نہیں کہ اجیت سنگھ کو مومن کی شاعری سے زیادہ لگاؤ تھا
یا نجوم سے ۔ اس دور کے ایک دریدہ دہن بزرگ میر عبد اللہ خاں اوج کا طعنہ اشارہ کرتا ہے کہ راجہ
نے مومن کو یہ انعام ان کی نجوم دانی کے سلسلے میں دیا تھا ۔

جھنوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے   نجوم بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

یہ وجہ بیان کی ہے کہ عالی گوہری راجہ کی ذات پر ختم ہوگئی ہے اس لئے اولاد کا سلسلہ آگے چلنا خلاف مصلحت الٰہی ہے۔ [1] غرض اس قصیدے میں مومن کا انداز عام مدح گو شاعروں کا سا ہے جسے رسم و رواج کے طور سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ مومن نے یہ قصیدہ عطائے انعام کے بعد کہا ہے اور جذبۂ شکر کا تقاضا ہے کہ محسن کے احسان کا اعتراف بیش از بیش کیا جائے۔ تمام باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وارستہ مزاج مومن درباداری سے متنفر تھے اور کسی رئیس کی بارگاہ سے توسل رکھنا ان کی خودداری و استغنا کے منافی تھا۔

چند اور واقعات بھی شہادت دیتے ہیں کہ ان کا طبعی استغنا انہیں آستانۂ امرا پر جھکنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ مہاراجہ کپورتھلہ نے ان کے کمالات سے واقف ہوکر ساڑھے تین سو روپے ماہوار پر بلایا تھا۔ یہ بھی اس تعلق کو منظور کرنا چاہتے تھے مگر جب معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویّے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو خود داری نے صاف انکار کردیا۔ [2] دہلی کالج میں فارسی کی صدر معلمی پر طلب کئے گئے مگر کچھ تو کثرت مشاغل کے سبب اور کچھ استغنا کے باعث کنارہ کشی اختیار کی۔ [3] ظفر کے دربار میں کبھی بھول کر بھی نہ گئے۔ ایک خط میں لکھنؤ اور حیدرآباد جانے کا خیال ظاہر کیا ہے [4] مگر معلوم ہے کہ یہ خیال کبھی عملی لباس نہ پہن سکا۔ یوسف علی خان نواب رامپور ان سے شاگردانہ عقیدت رکھتے تھے۔

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۳۱

(۲) تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ ص ۳۵۷

(۳) دہلی کی آخری شمع ص ۵۷۔ غالباً اس انکار میں مذہبی تعصب کو بھی دخل تھا۔ انہوں نے کبھی کسی انگریز گورنر یا گورنر جنرل کی مدح نہیں کی حالانکہ غالب نے اکثر حکام کی شان میں قصیدے لکھے۔ (۴) انشائے مومن ص ۱۲۵

۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں دہلی آئے۔ (۱) مومن نے تہنیتی قطعہ ضرور کہا مگر دربار رام پور سے تعلق پیدا نہ کیا۔ قناعت و استغنا نے کبھی رخصت ہی نہ دی کہ ارباب دولت کے دروازوں پر قدم رکھنے کا ارادہ کرتے۔ عمر عزیز اپنی حویلی کے دیوان خانے میں کاٹ دی۔ حیات مستعار کو ملازمت یا درباداری کے جنجال میں پھنسانے کے بجائے آزادی و استغنا سے کام رکھا۔ (۲) اور خون جگر پینے کے بجائے ہنستے بولتے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ قناعت و استغنا کے باوجود مومن کبھی کبھی مکروہات زمانہ سے تنگ آجاتے تھے اور توکل کا قدم ڈگمگا جاتا تھا۔ غالب کی طرح انہیں بھی تنگ دستی سے اکثر سابقہ پڑتا رہا۔ خاندانی پنشن جاگیر کی محدود آمدنی اور طبابت وغیرہ کی فتوحات ان امیرانہ اخراجات کی کفیل نہ ہوسکتی تھیں جو نفاست پسند رنگین مزاج شاعر کی لا ابالی طبیعت نے اس کی ذات سے وابستہ کردیے تھے۔ خاندانی امارت کا نباہنا بڑے کیسے کے رئیسانہ اخراجات برداشت کرنا خوش پوشی و وضعداری کا دستور قائم رکھنا آسان نہیں۔ حکیم صاحب کے ساتھ یہ سارے خرچ لگے ہوئے تھے مگر آمدنی کم تھی۔ تنگ دستی سے گھبرا کر کبھی چرخ کج رفتار کی شکایت کرنے لگتے اور کبھی اپنی اخترشناسی کو کوستے۔ اسی حالت میں دنیا کی ہوس اپنے مکروہ چہرے پر دولت کا غازہ لگا کر سامنے آجاتی تو آزاد مزاج شاعر کے دل میں کسی ایسے امیر کے دربار سے فیض یاب ہونے کا عارضی خیال پیدا ہوجاتا جو ان

---

(۱) کلیات فارسی ص ۲۱۵

(۲) انشائے مومن ص ۱۸ خط بہ نام حکیم احسن اللہ خان۔ امّا ازقدر ناشناسی و سخن نافہمی ہیچ کسم خریدار نیست ... با این ہمہ ہیچ میرزی آبروئے ہنر نہ فروختہ ام و چشم بر آستین گوہرین دامان ندوختہ۔ بہ نان جوین ساختہ ام و نظر بہ سفلۂ آسمان نہ انداختہ۔

کے کمال کا قدردان ہو۔ ایک قصیدے کے چند اشعار اسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں ـــ

وائے قسمت کہ نہ دے خوردۂ گل بھی گلچین ۔۔ زخم مرغ گلستان کے سے کھینچوں میں ہزار

نہ ہنر کی مرے پرسش نہ سخن کی مرے قدر ۔۔ نہ گہر کی مرے ارزش نہ طلا کی معیار

در منشور مرے زینت صد صدر ہوئے ۔۔ لیک ہزء امراء میں نہ ملا مجد کو بار (۱)

آخری شعر صاف غمازی کرتا ہے کہ ان دنوں مومن کسی مرتبہ دان و ذی علم رئیس سے وابستہ ہونے کے آرزومند تھے ۔

پندار کمال مومن کی سیرت کا یہ پہلو ایسا ہے جس پر ان کے مخالف جتنا جی چاہے شور مچا سکتے ہیں ۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مومن اس معاملے میں جائز حدود سے تجاوز کر جاتے تھے ۔ وہ مختلف علوم و فنون کے جامع تھے ۔ رمل سادہ کاری عملیات شطرنج اور دیگر متداول علوم کو چھوڑیے نجوم طب اور شاعری ایسے فن ہیں کہ جن میں سے ہر ایک انسان کے لئے باعث فخر ہے اور ایک ایک کی تحصیل میں عمر صرف ہوجاتی ہے ۔ مومن نے ان سب فنون میں دستگاہ بہم پہنچائی تھی ۔ (۲) ان کی ذہانت نے جوانی ہی میں ان سب پر دسترس حاصل کرلی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس زمانے میں دہلی کے باکمالوں میں شمار ہوتے تھے اور مختلف فنون کا جامع ہونے کے سبب بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔ سرسید احمد خان ان کا نام لینے سے پہلے پانچ سطروں میں ان کے مناقب لکھتے ہیں :

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۰۹ رقعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۳۹ھ میں حیدر آباد دکن جانا چاہتے تھے جہاں ان کے چچا حکیم غلام حسین خان ٹھہرے ہوئے تھے اور جہاں مومن کو راجہ چندو لال وزیر اعظم سے بہت امید بندھی تھی ۔ (انشائے مومن ص ۱۲۵)

(۲) حیات مومن ص ۳۶ ص ۳۷ ص ۳۸ وغیرہ

" زنگ زدائے آئینۂ سخندانی صیقل مرآۃ نکتہ رانی
محی مراسم کمال جلوہ دہ عرائس مضامین تازہ
زیب وسادۂ کمالات بے اندازہ سرمست نشۂ سخنوری
نظر باز شاہد معنی پروری پیرایہ پیرائے معاصد تازہ
حلیہ طراز اطوار گزیدہ یگانۂ جہان محمد مومن خان مومن "(۱)

سرسید جیسے محتاط و اندازہ دان شخص کا ان کے متعلق یگانۂ جہان اور صاحب کمالات بے اندازہ لکھنا اس امر کی دلیل ہے کہ مومن فی الواقع جامع الفنون تھے اور دلی جیسے شہر کے لئے ان کی ذات باعث فخر تھی - آزردہ وصہبائی جیسے فاضل غالب جیسے باکمال مصطفی خان شیفتہ جیسے نقاد نسیم قلق سالک اور وحشت جیسے سخنور ان کے دوستون اور شاگردون مین شامل تھے - ان سب باتون کے علاوہ مومن حسن صورت رکھتے تھے - آبائی امارت کا سرور بھی اپنا رنگ دکھاتا تھا - دوستون اور شاگردون کی تحسین بھی دل بڑھاتی تھی - غرض یہ سب عوامل آزاد طبع شاعر مین احساس کمال پیدا کردینے کے لئے کافی تھے - یہی ہوا ان کی طبیعت مین اپنے کمالات کا پندار پیدا ہوا - وہ رمل اور نجوم مین پورے اعتماد کے ساتھ حکم لگاتے - (۲) طب مین نئے نئے نسخے ایجاد کرتے - شاعری کے فن لطیف کو ان سب سے زیادہ باعث فخر سمجھتے تھے - لہذا اس فضا مین ان کے فخر کا شہباز اور بھی بلند پروازی دکھاتا تھا - جو شخص بچپن مین شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ زبانی دوہرادے(۳) جو سترہ سال

---

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۰٦

(۲) و (۳) حیات مومن ص ۳۸

کی عمر مین شکایت ستم جیسی بلند پایہ مثنوی لکھ دے جو انتیس سال کی عمر تک پچاس
ساٹھ ہزار اشعار اردو اور فارسی کے کہہ سکے[1] اور جس کے شاگرد اس پر جان چھڑکتے
ہون اسے اپنے کمالات کا احساس ہونا قطعی فطری ہے ۔ اسی بنا پر سرسید انھین سرمست نشۂ
سخنوری لکھتے ہین ۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ ان فنون کی بدولت جوانی ہی مین ممتاز و محسود
ہوگئے تھے ۔ کمالات کا احساس جوان خون مین ترنگ کی لہرین دوڑاتا تھا اور وہ اپنے
آپ کو یگانۂ زمانہ سمجھتے تھے ۔[2]

اس حد تک کسی کو اعتراض کا حق نہین ۔ مگر جب شاعرانہ تعلی اپنی تعریف سے
گزر کر اساتذۂ سلف کی ہجو تک پہنچ جاتی ہے تو فی الواقع غلط ہے اور قابل اعتراض ۔ مومن
نشۂ کمال مین کبھی کبھی اتنے بہک جاتے تھے کہ دوسرون کے کمالات انھین نظر ہی نہ
آتے تھے ۔ گلستان سعدی کو ایک معمولی کتاب سمجھتے[3] ۔ انوری خاقانی اور ابوالفرج
رونی پر زبان طعن کھولتے اور متنبی جریر اور اخطل جیسے استادون کی تقلید اپنے لئے
باعث عار خیال کرتے تھے ۔[4]

شریعت شعر مین تعلی شاعرانہ جائز ہے ۔ اکثر اساتذہ نے ولولۂ طبیعت کے اقتضا
سے فخر و مباہات کا ترانہ گایا ہے مگر اتنا خیال رکھا ہے کہ یہ نغمہ فخر کی حدود تک رہے
ہجو اور طنز و طعن کی سرحد مین داخل نہ ہو سکا " ـــــ

---

(۱) اس تعداد کا تخمینہ ان کی شاعری کے بیان مین بالاختصار پیش کیا گیا ہے ۔ افسوس
کہ کلام کا بیشتر حصہ مومن کی لا ابالی طبیعت کے ہاتھون ضائع ہوگیا ۔

(۲) منم کہ نیست قرانم بہ ہیچ قرن و زمان
منم کہ نیست نظیرم بہ ہیچ شہر و دیار   کلیات فارسی ص ۲۵۱

(۳) تاریخ ادب اردو سکسینہ ص ۲۵۷

(۴) کلیات فارسی ص ۲۵۱ ۔ نیز کلیات اردو ص ۲۳۰

میر :

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا

پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ سینہ چاک

ہے میرے ریختوں کا دوانہ دکن تمام

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر

جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

سودا :

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال

یہ سنگریزہ ہوا ہے در عدن مجھ سے

قائم :

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

مصحفی :

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں

دلی میں بھی چھوری مرا دیوان گیا تھا

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا بو آتی ہے جس مین فارسی کی

غالب :

پاتا ہون داد اس سے کچھ اپنے کمال کی

روح القدس اگرچہ مرا ہمزبان نہین

انیس :

کسی نے تری طرح سے اے انیس عروس سخن کو سنوارا نہین

کسطرح قدر تجھے اپنے سخن کی ہو انیس مرتبہ مشک کا آہوئے ختن کیا جانے

جذبۂ فخر جب اس حد سے بڑھ جاتا ہے تو خود ستائی کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کی ٹہنیون مین پھولون کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہین ۔ اس منزل مین شاعر اپنے کمال کا دعوی کرنے کے ساتھ دوسرون پر اچٹتے وار بھی کرجاتا ہے ۔کہین معاصرانہ چشمک ہوجاتی ہے جسے سننے والے ہم عصری کی رعایت سے زیادہ قابل الزام نہین قرار دیتے ۔ اس نوع کی مفاخرت معاندانہ حملون کے بجائے محض خوش طبعی پر محمول کی جاسکتی ہے ۔

سودا :

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے

وہ ان طرزون سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

میر :

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن مین

یون ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیاجانے

مصحفی :

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری

نادان ہے جس کو مجھ سے ہو دعوائے شاعری

غالب :

ہیں یوں تو زمانے میں سخنور بہت اچھے

پر کہتے ہیں غالب کا ہے انداز بیان او ر

انیس :

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نواسنجیوں نے تری اے انیس ہر اک داغ کو خوش بیان کر دیا

مومن کے کلام میں فخر و مباہات کے یہ دونوں مدارج موجود ہیں ۔ چونکہ ان میں کھلم کھلا

کسی پر چوٹ نہیں ہے اس لئے معرض اعتراض میں نہیں آتے ۔

(۱) سن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں

مومن اے اہل فن اظہار ہنر کرتا ہے

(۲) اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے

کہاں ہے لیک معنی بند مضمون یاب اپنا سا

(۳) مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لئے یہ زور شور

کیا کیا مضامین لائیے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

(۴) مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ان اشعار کو تعلی شاعرانہ کے تحت کہ سنت شعراء ہے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص دوسرا اور تیسرا مقطع کہ تعلی میں ان سے بہتر انداز بیان بہت کم نظر آتا ہے عناد و اعتراض کی چنگاریاں اس وقت اڑتی ہیں جب مومن اپنے معاصروں کے علاوہ گزشتہ استادوں پر علانیہ چوٹ کرتے اور انہیں اپنے مقابلے میں بہ مدارج حقیر بتلاتے ہیں۔ ایسے اشعار ہر اعتبار سے قابل گرفت ہیں۔ چونکہ مومن اس معاملے میں بے پروا تھے اس لئے ان کے معاصر اس قسم کے حملوں سے بگڑ کر ان پر خودستائی و تکبّر کا الزام لگاتے تھے۔ (1) مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر اندازہ لگائیے کہ انہیں سن کر مومن کے مخالفوں پر کیا گزرتی ہوگی۔

سچ تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی   آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہوگیا

مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے   جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ

ہیں یہ سگان جیفہ خوار مغز سخن سے بے نصیب

کافر استخوان پرست طرفہ سگی و کافری

کفر حکایت غرور اس کے بغیر یہ محال

تا متنبی و جریر عار ہے مجھ کو ہمسری

میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں   جس کے در کا گدا ہے خاقانی

انوری کے بیان میں ہے کہاں   میری تقریر کی سی تابانی

(1) گلستان سخن ص ۲۴۴

ملک معنی کا شہریار کہیے　　　دیکھ خسرو مری قلم رانی

میرے گوہر تمام ناسفتہ　　　میرے یاقوت سب بدخشانی (۱)

ظاہر ہے کہ یہ اشعار فخرومباہات سے گزر کر ہجو اور دریدہ دہنی کی حد تک پہنچ گیے ہیں ۔ مومن کے ہواخواہوں نے ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود ستائی و خود بینی پر تاویل و توجیہ کے پردے ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرے میں جو مومن کی وفات سے تین سال بعد تالیف ہوا (۱۲۷۱ ھ) شاعر کی خود پسندی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ :

" چونکہ یہ والا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا ہر سربلند اس کو پست اور ہر بزرگ اس کو خرد نظر آتا تھا ۔ جو کوتاہ بینان اس والا ہانگی اور علو ہمت سے آگاہ نہ تھے اس کی نگاہ کو عیب بین اور اس کی زبان کو خردہ گیر بتا کر زبان سرزنش دراز اور طومار شکوہ باز کرتے " (۲)

مگر حقیقت یہ ہے کہ نشہ کمال کی مستی مومن کو بیخود رکھتی تھی اور اس بیخودی میں وہ اپنے معاصروں نیز اساتذۂ سلف کے حق میں ایسی باتیں کہہ گزرتے تھے جو ان کے لئیے زیبا نہ تھیں ۔ (۳) شاید اسی خود ستائی و نخوت نے انھیں قبول عام سے محروم رکھا ۔ ان کا علم و فضل مسلم ان کی جامع الفنون ہستی کا احترام بھی لازم مگر ان تمام باتوں کے باوجود حد سے بڑھا ہوا پندار ایک ایسا دھبا ہے جو ان کے فضل و کمال کے دامن پر بدنما معلوم ہوتا ہے ۔

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۲۵

(۲) گلستان سخن ص ۴۴

(۳) کلیات اردو ص ۲۲۲　ص ۲۳۱　نیز کلیات فارسی ص ۳۲ ۔ انشائے مومن رقعہ بنام تفضل حسین خان ص ۹۲

مومن کی خانگی زندگی

مومن کی نجی زندگی کے حالات اس درجہ مخفی ہین کہ ان کے تاہل خانہ داری اور معاش کے متعلق قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے ـ معاصر اور مابعد کے تذکرہ نویس اس معاملے مین خاموش ہین ـ مرزا قادر بخش صاحب گلستان سخن کریم الدین مولف طبقات الشعرا قطب الدین باطن مولف گلستان بیخزان شیفتہ صاحب گلشن بیخار سر سید احمد مصنف آثار الصنادید سب کے سب مومن کے معاصر ہین مگر کسی نے ان کے خانگی حالات پر روشنی نہین ڈالی ـ مختلف مآخذ سے جو تفصیلات حاصل ہوسکین یہان درج کی جاتی ہین

خانہ آبادی | بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ مومن کی ایک شادی ہوئی تھی ـ یہ مفروضہ غلط ہے ـ مختلف ذرائع سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھون نے یکے بعد دیگرے تین شادیان کی تھین ـ پہلی نوجوانی مین جبکہ ان کا سن اٹھارہ انیس سال کا تھا دوسری ۱۲۳۹ ھ مین جب ان کی عمر چوبیس سال تھی اور تیسری چند برس بعد ـ ان کی تفصیل یہ ہے :

دستور کے مطابق مومن کے والدین لڑکپن ہی مین ان کی خانہ آبادی کا سرانجام کرنا چاہتے تھے ـ ان دنون چھوٹے اور بڑے گھرانون مین یہ دستور عام تھا ـ (1) مومن نے مثنوی شکایت ستم مین جو ۱۲۳۱ ھ کی تصنیف ہے یہ اشارہ کیا ہے کہ جب لڑکپن مین ان کا راز عشق فاش ہوگیا تو بزرگون نے سخت ملامت کی ـ کسی نے ننگ و ناموس کی تباہی پہلو پر انھین برا بھلا کہا کسی نے تعلیم سے بے توجہی پر سرزنش کی کسی نے بیباکی و بے حیائی

---

(1) مثلاً غالب کی شادی ۱۲۲۵ ھ مین ہوئی تھی جب وہ تیرہ سال کے تھے ـ اردوئے معلی ص ۱۹۸ ـ

پر ٹوکا ۔ اس سلسلے میں گھر والوں کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ؎

آرزو تھی کہ نکلیں گے ارمان — کہ خدا ہی کے کرتے تھے سامان

سبھوں کے کلام تھے کیا کیا — جا بجا سے پیام تھے کیا کیا

اس توقع سے اب ہوئے مایوس — آگیا فرق بات میں افسوس

سن کر ایسی صفات نامعقول — نہ کرے گا کوئی جہان میں قبول (۱)

اس حوالے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کی ہرزہ گردی کے پیش نظر ان کے والدین نے جلد ہی انھیں تاہّل کی قید میں ڈال دیا ہوگا ۔ مومنؔ کی نواسی احمد النساء بیگم کا انتقال دسمبر ۱۹۲۷ء میں ہوا ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ نانا ابّا کی پہلی شادی خاندان میں ہوئی تھی جو کامیاب نہ رہی ۔ (۲) اس رشتے کی تفاصیل اب تک نامعلوم ہیں ۔ کچھ اطلاع نہیں کہ اہلیہ یا خسر کا کیا نام تھا ۔

دوسری شادی ۱۲۳۹ھ میں جب شاعر کی عمر ۲۲ سال تھی (۲۴/۱۸۲۳ء) عظیم اللہ بیگ ساکن سردھنہ کی دختر سے ہوئی ۔ یہ صاحب ریاست سردھنہ میں بہ عہدۂ کیدانی ملازم تھے جو ایک معمولی فوجی عہدہ ہے ۔ مومن کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم شمرو کی سرکار کے متوسّل تھے اور اپنے وارستہ مزاج رنگین طبع داماد سے ناخوش رہتے تھے ۔ مومن بھی اس رشتے سے دل برداشتہ تھے ۔ انھوں نے نوجوانی میں دلّی جیسے شہر کی کوچہ گردی کی تھی اور حسینان زہرہ جبین کے حسن سے آنکھیں سینکی تھیں انھیں یہ سسرال اور اپنی

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۵۵

(۲) بہ حوالۂ مکتوب جناب شفیق بریلوی (مدیر خاتون پاکستان) مورخہ ۵ مئی ۱۹۵۹ء

دیہاتی بیوی (جو غالباً* خوش رو نہ تھی) پسند نہ آئی ۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ ان کے خسر عظیم اللہ بیگ نے غلام ضامن کرم سے جو اس رشتے کے محرک ہوئے تھے[1] مومن کی والدہ کا گلہ کیا بلکہ ان کے متعلق کچھ نازیبا کلمات بھی کہے ۔ مومن نے ان دنوں دو ڈھائی ماہ سردھنہ میں قیام کیا تھا دیہاتی فضا اور سسرال کی نکتہ چینی سے تنگ رہتے تھے ۔ انھی دنوں اپنی شادی کی تاریخ کہی ہے جس سے کدورت و نفرت کا غبار ابھرتا نظر آتا ہے ؎

حیف صد حیف کہ در فصل بہاران بلبل	ناگہان گشت گرفتار بہ دام صیّاد
آہ صد آہ کہ آزادگی نکہت گل	باہمہ رنگ تجرّد ہمگی شد برباد
یعنی آن مومن آوارہ کہ در آزادی	بہ جہان ضرب مثل بود چو سرو آزاد
این زمان پائے بہ زنجیر تعلق گشتہ	یوسفے بود سروکار بہ زندان افتاد
چہ خوش این واقعہ را گفت اسیرے تاریخ	مرغ بر بال و پر اندر قفس آمد فریاد[2]

(۱۲۳۹ ھ)

یہ ناموزوں رشتہ اور خسر کی بدمزاجی مومن کی قوت برداشت سے زیادہ تھی ۔ پھر جب عظیم اللہ بیگ (خسر) نے ان کی والدہ کے متعلق کچھ نازیبا باتیں کہیں تو شعلہ خو شاعر کو تاب نہ رہی ۔ درمیانی شخص یعنی شیخ غلام ضامن کرم کو ایک خط میں اپنے پست خاندان خسر کے طعنوں کا جواب دیا ہے اور جتلایا ہے کہ اس رشتے پر میرے خسر کو فخر کرنا چاہئے تھا کیونکہ وہ ہمارے خاندان کے غلاموں کا غلام ہے ۔ یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اب کسی

---

(۱) انشائے مومن ص ۵۷

(۲) دیوان فارسی ص ۱۳۵

اونچے گھرانے میں شادی کروں گا :-

" ضمن نسبت به جناب والده مکرمه معظمه نمودن زبان به مذمّت مریم علیہا السلام

کشودن است عظیم الله بیگ که پایهٔ افتخارش جز به منصب کدخدائی عیسی نیست ...

دو سه ماه که به نادرانی و ساده دلی مرتکب جریمه به نا اعلان ساختن گردیدم از هیچکس

جز ملامت و نفرین نه شنیدم - اکنون که فارغ البال و خوش حالم خدا نه کرده خود را به

حیثیت گرفتار نمایم و به مجلس از عقل هزار فرسخ دور افتادگان در آیم - آیهٔ مثنی وثلث و

ربع خوانده ام و معنی آن از اساتذه به تحقیق رسانده - چون از جهلائے نابکار رنج ها

کشیده ام سرآن دارم که با همچو عالی خاندانے فلك شکو هے وصلت نمایم و چشم تماشا طلب

به دیدار خوش نسبے زهره گو هرے کشایم " (۱)

تحقیق نہین که اس رشتے کا انجام کیا ہوا اور مومن نے اس بھولی بھالی دیہاتی

دلہن سے کیا سلوك کیا - ہوسکتا ہے که تیسری شادی کرنے کے بعد بھی اس بیوی کو

رکھا ہو اور اس سے اولاد ہوئی ہو - بعض خطون مین اپنے بیٹے احمد نصیر کو اس کی بھی

بڑی بہن کی طرف سے دعا لکھی ہے (انشائے مومن ص ٦٨) - ممکن ہے که یه لڑکی

اسی دوسری بیوی سے ہو مگر یه امر پایهٔ تحقیق کو نہین پہنچ سکا - تاہم اتنا معلوم ہے که

۱۲۵۸ ھ مطابق ۱۸۴۲ ء مین مومن کے دو یا تین بیویان تھین - دیوان فارسی مین منجمله

اور تاریخون کے دو لڑکون کی ولادت کی تاریخین بھی موجود ہین دونون سے ۱۲۵۸ ھ نکلتا ہے

پسرم داده اند سال وجود " نو گل باغ جاه و اقبال " (جست (۱۲۵۸ھ)

دوسرے کا مادّہ تاریخ " گل گلزار دولت و رشد " ہے (۱۲۵۸ ھ) ضعیف احتمالات نظرانداز

(۱) انشائے مومن ص ٥٦

کر دیے جائیں تو یقینی ہے کہ یہ لڑکے دو مختلف بیویوں سے یکے بعد دیگرے ایک ہی سال کے اندر پیدا ہوئے تھے ۔ دیکھئے دیوان فارسی ص ۱۳۲ ۔ اگلے سال یعنی ۱۲۵۹ ھ مطابق ۱۸۴۳ ء میں ایک لڑکی (محمدی بیگم) ہوئی ۔ ظاہر ہے کہ اتنے مختصر وقفوں سے پیدا ہونے والی اولاد ین مختلف بیویوں کے بطن سے تھیں ۔

مومن کی تیسری شادی خواجہ محمد نصیر رنج (1) (نبیرہ خواجہ میر درد) کی صاحبزادی اشرف النساء بیگم سے ہوئی اور اسی رشتے سے مومن کی نسل چلی ۔ حکیم ناصر نذیر فراق کا بیان ہے کہ مومن کی شادی انجمن النساء بیگم سے ہوئی تھی جو خواجہ محمد نصیر رنج کی بڑی صاحبزادی تھیں ۔ (2) فراق کے حوالے سے عرش گیاوی نے اور ان کی سند پر ضیا احمد صاحب بدایونی نیز کلب علی خان فائق رامپوری نے بھی یہی لکھا ہے ۔ لیکن مومن کی نواسی احمد النساء بیگم کامل وثوق سے بیان کرتی تھیں کہ مومن کے عقد میں اشرف النساء بیگم تھیں اور انجمن النساء بیگم کا عقد ان کے چچا زاد بھائی مولوی عبد القیوم سے ہوا تھا ۔ (3)
اس شہادت کی موجودگی میں حکیم ناصر نذیر فراق کا بیان چنداں وقعت نہیں رکھتا ۔ پرانے خاندانوں کی خواتین عمدہ نسّاب ہوتی تھیں اور نہ صرف اہل خاندان کے ناموں ہی کو یاد رکھتی تھیں بلکہ واقعات کی کہانیاں مسلسل ان کے حافظے میں محفوظ رہتی تھیں ۔ یہ جوہر

---

(1) خواجہ محمد نصیر رنج خلف میر کلّو اکبر آبادی ۔ خواجہ میر درد کی صاحبزادی زینت النساء بیگم کے بطن سے تھے ۔ ریاضی و موسیقی میں کامل تھے اور اپنے نانا کے سجادہ نشین ہونے کی حیثیت سے ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کی بارہ دری میں حسب دستور خاندان مجلس برپا ہوتی تھی ۔ شاعری سے لگاؤ تھا ۔ ریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے ذہین ترین اشخاص میں سے تھے ۔ شوال ۱۲۶۱ ھ میں انتقال کیا (گل رعنا ص ۱۷ ان کا یہ شعر تذکروں میں درج ہے ۔ دل یہ جس کے لئے پہلو میں تپاں رہتا ہے
یوں سنا ہے کہ اسے بھی خفقان رہتا ہے

(2) میخانۂ درد ص ۲۰۲ (3) مکتوب شفیق بریلوی مدیر خاتون پاکستان بنام راقم مورخہ ۱۹ فروری ۱۰

ان خواتین میں آج بھی موجود ہے ۔ اس تفصیل کے پیش نظر میں حکیم ناصر نذیر فراق کے بیان پر احمد النساء بیگم کی روایت کو ترجیح دوں گا کہ اهل البیت ادرٰی بما فی البیت ۔ ظاہر ہے کہ بیچارے فراق کی بہ نسبت ان محترمہ کو اپنی نانی کا نام زیادہ صحت بلکہ قطعیت کے ساتھ یاد ہوگا ۔

اولاد: اشرف النساء بیگم کے بطن سے نیز دوسری بیوی سے مومن کے چھ اولادیں یعنی تین لڑکے تین لڑکیاں ہوئیں ۔ ان میں سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں مومن کے ہی حیات فوت ہوگئیں ۔ ایک لڑکے کی تاریخ وفات کا اندازہ نہیں ۔ دوسرا ۱۲۶۳ ھ مطابق ۱۸۴۷ ء میں بہ عمر ۲ سال فوت ہوا جیساکہ مندرجہ ذیل قطعے سے ظاہر ہے ؎

جگر گوشۂ ما بہ کنج لحد ‏ ‏ ‏ امان از جہان پر آفات یافت

دو سال اندر آغوش مام و پدر ‏ ‏ ‏ ستم دید و پاس مکافات یافت

چہ ماتم کہ پسر خرد سال فوت ‏ ‏ ‏ ز ہیہات ہیہات ہیہات یافت (۱)

اسی سال ایک لڑکی کا بھی انتقال ہوا اور غمزدہ باپ کو تاریخ گوئی کا فرض انجام دینا پڑا ؎

خاک بر فرق دولت دنیا ‏ ‏ ‏ من فشاندم خزانہ بر سر خاک

۶۶۳ ‏ ‏ ۶۰۰

---

(۱) دیوان فارسی ص ۱۵۱ ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس لڑکے کا سال ولادت ۱۲۶۱ ھ ہے ۔ اس سے پہلے جو لڑکا پیدا ہوا تھا اس کی تاریخ ولادت ذیل کے شعر سے ۱۲۵۸ ھ ثابت ہوتی ہے ؎

پسرم دادہ اند سال وجود ‏ ‏ ‏ نوگل باغ جاہ و اقبال است

دوسری لڑکی فاطمہ سلطان بیگم ۱۲۶۵ ھ (۱۸۴۹ ء) مین دنیا سے رخصت ہوئی ۔
جس کا قطعۂ تاریخ شاعر نے بہت دردناک کہا ہے ؎

رفت لخت جگرم زیر زمین | چرخ بر خاک نشاندم امروز
در غم فاطمہ سلطان بیگم | صبح الفاطمہ خواندم امروز
تا بہ جانش نہ روان شد (دی) شب | جان بہ تاریخ فشاندم امروز

۵۴   ۱۲۱۱

جینے والے بچون مین ایک لڑکا احمد نصیر اور ایک لڑکی محمدی بیگم تھے جن سے شاعر کی نسل چلی ۔ عرش نے لکھا ہے کہ مومن کے انتقال پر احمد نصیر کی عمر چھ سات سال (۱) تھی ۔ ننھیالی عزیزون نے تعلیم و تربیت کا فرض ادا کیا ۔ مومن کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مخلص دوست تفضل حسین خان کو احمد نصیر سے بہت محبت تھی اور وہ اس کے حال پر اکثر توجہ کیا کرتے تھے ۔ مومن بھی انھین احمد نصیر کا سچا بہی خواہ سمجھتے تھے ۔ ایک رقعے مین جو بہ حالت مرض الموت خان موصوف کو بھیجا ہے لکھتے ہین :

" در معاملۂ احمد نصیر و جناب مرا چہ جائے دم زدن است ۔ خان والا شان چہ انصاف است کہ اولاد مومن از خوان احسان شما بہرہ یابند و من محروم مانم " (۲) ذہن اور حافظے کی تیزی مین اپنے باپ کے خلف الرشید تھے ۔ بارہ سال کی عمر مین قرآن مجید حفظ کیا ۔ ہزارون شعر عربی و فارسی کے نوک زبان تھے مگر طبیعت روان نہ تھی ۔ شعر گوئی کا جوہر نہ ملا ۔ رنگ گورا ۔ گھونگھردار بال ۔ ململ کا انگرکھا پہنتے تھے ۔ لالٹینون کا شوق تھا ۔ اپنا

(۱) یہ بیان عرش کا ہے (حیات مومن ص ۸۷) ۔ کلب علی خان فائق رامپوری نے احمد نصیر خان کی تاریخ ولادت ۱۲۴۷ ھ متعین کی ہے مگر کوئی صحیح حوالہ نہین دیا ۔ دیکھئے موصوف کا مقالہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۹ ء ص ۷۸ (۲) ایضاً ص ۷۹

جی خوش کرنے کے لئے انھیں رنگین شیشوں سے آراستہ کرکے روشن کرتے تھے ۔ وحید الدین بیخود کے ماموں ننھے خان صاحب کے ہاں حالی کی اور ان کی نشست رہتی تھی ۔ پچاس برس کی عمر میں ایک لڑکی اور دو لڑکے چھوڑ کر بہ امراض دماغی انتقال کیا ۔[۱] ان میں سے ایک لڑکے کا نام عبدالوہاب تھا جو عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد فقیری کی طرف راغب ہوئے اور عالم جذب میں دنیا سے رخصت ہوگئے ۔ حیات مومن کے مولف جناب ضمیرالدین عرش گیاوی کا بیان ہے کہ میں نے انھیں مقبرۂ ہمایوں کے پاس جنگلوں میں پھرتے دیکھا تھا ۔[۲] دوسرے لڑکے کا نام محمد نصیر تھا ۔ ۱۹۲۹ ء میں جب عرش دہلی گئے تو ان سے نہ مل سکے مگر لکھتے ہیں کہ انٹرینس کا امتحان امتیاز سے پاس کیا تھا ۔ شعر بھی کہتے تھے ۔ مزاج میں وارستگی تھی جسے جدّی تبرک سمجھئے ۔ احمد نصیر خان کی لڑکی کا نام عزیز بیگم تھا ۔ ۱۹۲۹ ء میں عرش نے ان سے مل کر مومن کے بہت سے حالات فراہم کیے ۔ کوچۂ چیلان یعنی آبائی محلے میں رہتی تھیں ۔ عرش نے نگار کے مومن نمبر والی تصویر انھیں دکھائی تو بہ کمال جد امجد کی یاد میں دل بھر آیا اور رونے لگیں ۔[۳]

مومن کی بیٹی محمدی بیگم ۱۲۵۹ ھ (۱۸۴۳ ء) میں پیدا ہوئیں ۔ قطعہ تاریخ تخرجہ کی ندرت کے لحاظ سے بہت معروف ہے ۔

دخت روشن رواں ہوئی پیدا ۔۔۔ کیا ہی چمکا ہے اختر مومن

سال گفتے کے ساتھ ہاتف نے ۔۔۔ کہی تاریخ دختر مومن

۸۱ ۔۔۔ ۱۳۴۰

---

(۱) حیات مومن ص ۸۶

(۲) حیات مومن ص ۸۷

(۳) حیات مومن ص ۸۷

ان کی شادی مولوی عبدالغنی وکیل مرزاپوری سے ہوئی تھی جو مولوی محمد فصیح صاحب بانی سلسلۂ فصیحی کے صاحبزادے تھے۔ بعد میں بہ سلسلۂ وکالت سیتا پور منتقل ہوگئے۔ وکالت کے علاوہ پیری مریدی کا شغل بھی تھا۔ فن شعر سے بھی دلچسپی تھی۔

حکیم ناصر نذیر فراق ۱۹۳۰ء میں لکھتے ہیں کہ احمد نصیر خان کی اولاد دہلی میں اور محمدی بیگم کی اولاد سیتاپور میں حیّ وقائم ہے۔(۱) ان محترمہ کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا۔ محمدی بیگم کی بیٹی احمد النساء بیگم تھیں جن کی بیان کردہ بعض روائتیں اس مقالے میں داخل ہیں اور جن کا انتقال دسمبر ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ ان کی بیٹی یعنی مومن کی پرنواسی اختر النساء بیگم ہیں جو حضرۃ شفیق بریلوی مدیر خاتون پاکستان کی خوشدامن ہیں اختر النسا بیگم کی صاحبزادی مسرت جہان بیگم شفیق ہیں جو مومن کی نواسی کی نواسی ہیں اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔(۳)

محمدی بیگم کے بیٹے یعنی مومن کے نواسے سید ناصر حبیب صاحب ابن مولوی عبدالغنی تھے۔ ناصر حبیب صاحب کی ولادت دہلی میں اور نشو ونما سیتا پور میں ہوئی جب جیتے تھے عربی و فارسی کے ماہر اور انگریزی سے باخبر تھے۔ اول گوالیار میں پھر ریاست دتیا میں بہ سلسلۂ معاش رہے مگر ناخوش رہے چنانچہ لکھتے ہیں ؎

کون ہے آگاہ میری قدر و قیمت سے یہاں ایک گنج مایہ ہوں لیکن میں ویرانے میں ہوں

عہد شباب میں تندرست کشیدہ قامت جوان تھے۔ ناصر وزیر سجادہ نشین خواجہ میر درد کی

---

(۱) میخانۂ درد ص ۲۰۳

(۲) حیات مومن ص ۸۹ (۳) مکتوب حضرۃ شفیق بریلوی مورخہ ۵ مئی ۱۹۵۹ء

بہن سے شادی ہوئی تھی ۔ مضطر خیرآبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے ان کی اولاد میں کنیز فاطمہ تھیں جنھوں نے عرش کو خاندانی حالات سے آگاہ کرکے حیات مومن مرتب کرنے میں مدد دی تھی ۔ [1] ناصر حبیب کا انتقال گوالیار میں ۱۹۲۲ء میں ہوا ۔ دوسری بیوی سے مولوی عبدالغنی کے بیٹے مولوی عبدالحی ہیں ۔ یہ بھی کراچی رہتے ہیں ۔ نوے سال کے قریب عمر ہے ۔ ضعف پیری نے چلنے پھرنے بلکہ بات کرنے سے بھی معذور کر رکھا ہے ۔ محمدی بیگم صاحبہ کے ایک اور سوتیلے بیٹے مولوی احمد سعید ابن مولوی عبدالغنی ہیں ۔ ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں دہلی سے چلے آئے تھے ۔ اب لاہور میں میکلوڈ روڈ پر رہتے ہیں ۔ انارکلی میں آہنی سازو سامان کی دکان ہے ۔ ان کی عمر باسٹھ سال کے قریب ہے ۔ تنومند خوش مزاج شائستہ اطوار شگفتہ رو بزرگ ہیں ۔ [2] بیان کرتے تھے کہ ان کے برادر گرامی ناصر حبیب صاحب جوانی کے زمانے میں بہت تنومند اور قوی ہیکل تھے ۔ چاولوں کی بھری ہوئی دیگ اٹھا کر بہ سہولت ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دیتے تھے ۔ ناصر حبیب کو حسن پرستی اور شعر کا بھی شوق تھا دیوان مرتب ہوا تھا مگر چھپنے کی نوبت نہ آئی ۔ عرش نے ان کے مندرجہ ذیل اشعار نمونۂ کلام کے بطور درج کیئے ہیں [3] ۔

زمین ہے مدعی اپنی عدو ہے آسمان اپنا ۔۔۔ بسر ہوگی کہاں اپنی گزر ہوگا کہاں اپنا

العدد جوش جنون موسم گل آپہنچا ۔۔۔ آج زنجیر گرانبار کے ٹکڑے کر دے

ادا کے ناز کے انداز کے کرشمے کے ۔۔۔ جدا جدا مرے سینے میں ہیں نشان باقی

جو تیر آتا ہے ان کا وہ ڈھونڈھتا ہے یہی ۔۔۔ کہ درد عشق ہے دل میں کہاں کہاں باقی

---

(۱) حیات مومن ص ۸۹ (۲) راقم نے حالات مومن کے بہ سلسلہ اکثر ان سے رجوع کیا ہے ۔ باخبر آدمی ہیں ۔ مومن کے متعلق جو کچھ معلوم ہے اعتماد و یقین کے ساتھ بتایا ہے ۔

(۳) حیات مومن ص ۸۸

اولاد مومن کی تفصیل جو اوپر بیان کی گئی ہے ذیل کے شجرے سے واضح ہوتی ہے ـ راقم نے سلسلہ قائم رکھنے کی غرض سے مومن کے اسلاف اور ان کی اولاد کے نام بھی شامل کرلئے ہیں تاکہ مومن کے تمام اعزہ و اقربا کا احاطہ ہوسکے :ـ
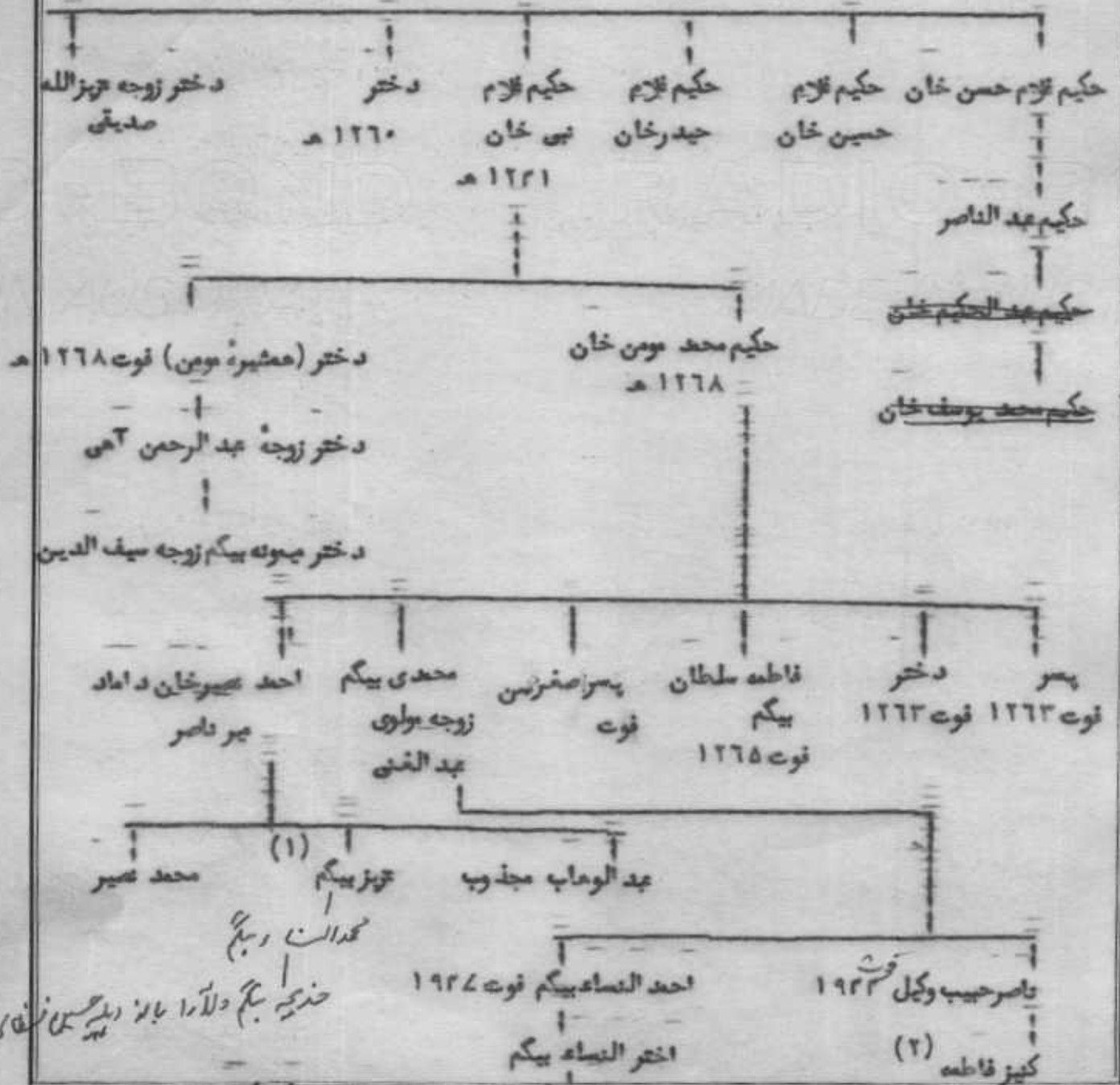
(۱) عرش ۱۹۲۹ء میں ان سے ملے تھے اور ان سے بہت سے خاندانی حالات معلوم کئے تھے ملاحظہ ہو حیات مومن ص ۸۷

چند اعزّہ جن کی تفصیل اس شجرے مین نہین ہے حسب ذیل ہین :

(۱) مومن کی دادی یعنی حکیم نامدار خان کی اہلیہ ۔ ان کا انتقال ۱۲۳۷ ھ مین ہوا ۔ نامور پوتے نے تاریخ وفات کہی ؎

جبکہ اس غم سرا سے رحلت کی ‏ ‏ ‏ جدّۂ مومن پریشان نے

سال تاریخ حسب حال کہا ‏ ‏ ‏ دخلت بالنعیم رضوان نے (۱)

۱۲۳۷ ھ

(۲) غلام نبی خان ۔ مومن کے والد ماجد تھے طب اور علوم رسمیہ مین خاصی دسترس رکھتے تھے ۔ مذہب کی طرف میلان زیادہ تھا ۔ شاہ عبدالعزیز کے معتقد تھے ۔ جب مومن پیدا ہوئے تو شاہ صاحب کو بلا کر لائے اور مولود کے کان مین اذان دلوائی ۔ عبادت پر زیادہ مائل تھے اور شیوۂ تسلیم و رضا مین کامل ۔ ۱۲۳۱ ھ مین واصل بحق ہوئے ۔ مومن نے ان کی موت پر جو دردناک نوحہ لکھا ہے اس مین ان تمام اوصاف کا اشارہ کیا ہے ۔ ان کی اہلیہ یعنی مومن کی والدہ کا نام اور حال معلوم نہ ہوسکا ۔ بجز اس کے یہ حکیم غلام نبی کے بعد فوت ہوئین ۔

(۳) غلام حیدر خان ۔ نامدار خان کے بیٹے اور مومن کے حقیقی چچا تھے ۔ مومن نے ان کے مطب مین نسخہ نویسی کی تھی اور ان سے طب پڑھی تھی ۔ دلی کے نامور اطبا مین سے تھے اور طب کی تعلیم دینے مین بھی شامل تھے ۔ سرسید احمد خان طب مین ان کے شاگرد تھے ۔ چنانچہ ان کے متعلق لکھتے ہین :

" حکیم غلام حیدر خان ارشد تلامذۂ حکیم شریف خان سے ہین ۔ مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت مین حل ہوتے ہین غالب تو یہ ہے کہ اس جزو زمان مین اور کہین نہ ہوتے ہون " (۲) ان کا انتقال ۱۸۲۷ ء کے بعد ہوا ۔

(۱) کلیات اردو ص ۲۲ (۲) آثارالصنادید باب چہارم ص ۶۵

(۴) حکیم غلام حسین خان ۔ نامدار خان کے بیٹے اور مومن کے چچا تھے ۔ انشائے مومن کے ایک خط سے جو ۱۲۳۹ھ میں لکھا گیا اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت کی نیت سے حیدرآباد دکن چلے گئے تھے[1] ۔ سال وفات معلوم نہیں ۔ ۱۸۲۲ء تک زندہ تھے ۔

(۵) حکیم غلام حسن خان ۔ مومن کے چچا یا تائے دہلی کے نامور طبیبوں میں شمار تھا اپنے بڑے بھائی کی طرح حکیم شریف خان کے شاگرد تھے ۔ سرسید احمد خان نے ان کا ذکر اطبائے دہلی کی ذیل میں کیا ہے ۔

(٦) مومن کی پھوپھی ۔ نام نا معلوم ۔ نامدار خان کی بیٹی تھیں اور حکیم عزیزاللہ صدیقی سے بیاہی تھیں ۔ مومن سے بہت محبت کرتی تھیں اور وہ بھی ان سے بہت الفت رکھتے تھے ۔ ایک خط میں جو اپنی والدہ کے انتقال کے بعد لکھا ہے ان کی شفقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب تک آپ کا سایہ میرے سرپر ہے ماں کے مرنے کا غم نہیں ؎

تا سایۂ تست بر سر من　　　غم نیست ز مرگ مادر من

ان کا انتقال ۱۸۵۲ کے بعد ہوا ۔

(۷) دوسری پھوپھی ۔ نام نا معلوم ۔ تفصیلات بھی معلوم نہیں ۔ دیوان فارسی میں ایک قطعۂ وفات ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۲٦۰ھ (۱۸۴۴ء) میں ہوا :

عمہ مومن چو باکرداریک　　　زین جہان شد سوئے جنات النعیم

سال فوتش از خرد پرسیدمے　　　ہاتفے گفتا لہا اجر عظیم

---

(۱) حکیم انشائے مومن ص ۱۲۵ ۔

(٨) حکیم احسن اللہ خان ـ شیخ عزیز اللہ صدیقی کے بیٹے یعنی مومن کے پھوپھی زاد بھائی تھے ـ قرابت کے علاوہ ہمرازی ہم سنی ہم فنی اور ہم مذاقی کے رشتے بھی تھے ـ انشائے مومن مین ان کے نام بہت سے رقعے ہین جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کے بہی خواہ تھے ـ اسی لئے مومن اپنی سالانہ رقم (زر سالانہ) کے لئے نیز اپنی ضرورتون مین اکثر ان کو تقاضائی خطوط لکھا کرتے تھے ـ(١) ایک مرتبہ سونے کے کشتے مشک اور حبّ مسکین نواز (عام تقویت جسمانی کی دوا) کی فرمائش کی تھی ـ ان چیزون کے آنے مین دیر لگ گئی ـ نازک مزاج شاعر کو جو اتفاق سے بیمار بھی تھا انتظار کی تاب کہان تھی ـ فوراً خط لکھا ـ بچپن کی دوستی بھی عجب چیز ہے دیکھنا تقاضے کے ساتھ ناز و انداز کی کیا کیا پھلجھڑیان چھوڑی ہین :

" حبّ مسکین نواز چرا اسم بے مسمّٰی ہست وکشتۂ سیم وطلا ہم اثر کیمیا؟ انتظار جان بلب آوردہ و شور اشتیاق دل را بے تاب کردہ ـ ہرچند زر و سیم با خاک برابر می کنم صحت را دل بر حالم نمی سوزد ـ بارے اگر طلا ئے کشتہ نمی فرستید مرا بہ درد انتظار چہ می کشید ـ حبوب شما اگر مسکین نواز است مسکین تر از من نیست کہ تا نقد دل و جان بہ سیمبران دادہ ام ..." (٢)

حکیم احسن اللہ خان اپنی شیرین کلامی اور خوش تدبیری کی بدولت اتنے بڑھے کہ بہادر شاہ ظفر کے وزیر ہوئے ـ مگر افسوس کہ ہنگامۂ ١٨٥٧ء مین اپنے آقا سے بیوفائی کر کے

---

(١) انشائے مومن ص ٥٩ ص ٦٢

(٢) انشائے مومن ص ٦٢

انگریزوں کے ہوا خواہ بن گئے [۱] ۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے انہیں بھی جاگیر و انعام سے نوازا مگر دلی والے ان کی حرکات سے اتنے برہم تھے کہ انہیں دہلی چھوڑ کر جے پور رہنا پڑا ۔ بالآخر جب ۱۸۷۳ء میں دنیا سے رخصت ہوئے تو داغ بدنامی کے سوا اور کچھ ساتھ نہ گیا ۔ منجملہ اور امور کے ایک کار خیر یہ کر گئے کہ انشائے مومن اور دیوان فارسی کو ۱۲۷۱ھ میں مناسب اہتمام کے ساتھ مطبع سلطانی سے شائع کرا کر حق اخوت و الفت ادا کیا ورنہ مومن گمنام رہ جاتے ۔ ان کی تاریخ وفات ضیاء الدین احمد خان نیر نے "حکیم تہیب" سے نکالی ہے (۱۲۹۰ھ)

(۹) دختر غلام نبی خان ۔ مومن کی حقیقی چھوٹی بہن تھیں ۔ مومن انہیں بیٹی کی طرح چاہتے تھے ۔ مومن کے مرنے سے دو چار ماہ پہلے چند بیٹے بیٹیاں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئیں (۱۲۶۸ھ) ۔ مومن نے ان کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے جس سے دلسوزی و غمگینی کا دھواں اٹھتا نظر آتا ہے [۲] :

اے خواہر عزیز چہ دیدی کہ محو شد	مہر کسان تو ز دل مہر پرورت
طفلی بہ یاد ت آمد و رفتی بہ خواب ناز	اندر کنار خالہ و آغوش مادرت
یک عمر من بجائے پدر بودہ ام ترا	یک لحظہ دخترانہ بنہ در برم سرت
گر از درونہ نالۂ موزون بر آمدہ	بہر حساب نامہ نوشتم بہ شوہرت
داغ جگر گداز نہادہ فراق تو	بر فرق دختر و پسران و برادرت [۳]

---

(۱) غالب از مہر ص ۲۹۱

(۲) دیوان فارسی ص ۱۳۸

(۳) دیوان فارسی ص ۱۵۱

احباب : مختلف دستاویزات سے مومن کے جن احباب کا حال معلوم ہوسکا ان کے نام حسب ذیل ہیں :

۱۔ نواب مصطفی خان شیفتہ ابن نواب مرتضی خان

۲۔ غلام ضامن کرم

۳۔ میر غلام علی خان وحشت

۴۔ میر حسین تسکین

۵۔ عبدالرحمن آہی خلف میر حسین تسکین

۶۔ نواب اصغر علی خان نسیم

۷۔ عظمت اللہ عظمت بریلوی

۸۔ مرزا سنگین مضطر

۹۔ مرزا غالب

۱۰۔ مولانا فضل حق

۱۱۔ حکیم احسن اللہ خان

۱۲۔ صدرالدین آزردہ ۔ ۱۳ تفضل حسین خان

۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳

یہ سب اشخاص مومن سے تعلق کی نسبت رکھتے ہیں بجز (۱۱) کے ۔ اس لئے ان کا بیان مقالہ ھذا کے چوتھے باب میں شاگردوں کے عنوان سے ہوا ہے ۔ ان میں شیفتہ کرم اور وحشت کو خصوصیت خاص حاصل تھی ۔ یہ مومن کے ہمراز ندیم تھے اور مومن کے معاشقوں میں رازدار دوستوں کسی حیثیت سے حق امانت ادا کرتے تھے ۔ حکیم احسن اللہ خان کا حال عزیز قریب کی حیثیت سے پچھلے صفحے میں بیان ہوچکا ہے ۔ اس لحاظ سے وہ اشخاص جن پر احباب کا صحیح اطلاق ہوسکتا ہے

تفضل حسین خان مولانا فضل حق مفتی صدرالدین آزردہ اور مرزا غالب ہیں ۔ مرزا رحیم الدین حیا حکیم سکھانند اور خواجہ امان کو صاحبوں کی فہرست میں داخل سمجھئے ۔

تفضل حسین خان مومن کے مخلص دوست تھے ۔ کمپنی کی ملازمت میں کسی اہم عہدے پر سرفراز اور صاحب جاہ و ثروت ہونے کے علاوہ عمارتوں اور باغوں کے شوقین تھے ۔ مومن نے ان کے بناکردہ باغ اور عمارات کی تاریخیں کہی ہیں (۱) جن کا ذکر فن تاریخ گوئی کے تحت آئے گا ۔ مومن سے ان کا صدق و خلوص اس درجے کا تھا کہ انھوں نے اپنے بیٹے احمد نصیر خان کو پرورش و تربیت کے لئے ان کے حوالے کردیا تھا ۔ (۲) مومن اشعار یا رقعات میں جہاں کہیں ان کا ذکر کرتے ہیں یگانگت و الفت کی پھوار پڑتی محسوس ہوتی ہے ۔ ایک خط میں جو موصوف کے نام ہے القاب لکھنے کے ساتھ ہی محامد و مناقب کے دریا بہائے اور اپنے یار عزیز کے جاہ و اقبال کا ترانہ گائے ہیں ۔۔

شاعرے ہمچو من نبودہ و نیست	بہ فصیحان اصفہان گویم
لیک در فکرت مسدائح او	ہمچو اندیشہ و بیان گویم
پرسم از عقل اولین تا او	ہرچہ گوید بہ من ہمان گویم
گر ز جاهش بہ لب زنم سخنے	حرف در گوش آسمان گویم
نام ممدوح می برد اکنون	بایدم مدحت زبان گویم
جان بہ گرد زبان من گردد	چون تفضل حسین خان گویم (۳)

---

(۱) دیوان مومن ص ۱۳۲ تا ۱۳۶

(۲) کلب علی خان فائق نے اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۹ ء ص ۸۶ میں وثوق سے یہ لکھا ہے لیکن مجھے اس کی تحقیق نہ ہوسکی ۔ (۳) انشائے مومن ص ۹۲ رقعہ بہ نام خان موصوف ۔

تفضل حسین خان کا اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا ۔ وہ ۵۷ء کے ہنگامے میں زندہ تھے ۔ چنانچہ جب دہلی کی جامع مسجد کو ایک مدت کے قبضے کے بعد انگریزوں نے واگزاشت کیا تو اس کے منتظمین میں ایک تفضل حسین خان بھی تھے ۔ مفتی صدرالدین آزردہ بھی منتظم تھے (غالب از غلام رسول مہر ص ۳۰۱) / مفتی صدرالدین آزردہ ۔ علم وفضل نجابت و شرافت پاک طینتی اور علمی تبحر کے لحاظ سے ایسی ہستی تھے جسے بجائے خود ایک عالم کہا جائے تو بجا ہے ۔ غالب شیفتہ اور مومن کو ان کی دوستی پر ناز تھا ۔(۱) سرسید احمد خان آثار الصنادید میں ان کا ذکر کرنے سے پہلے آدھا صفحہ مناقب و محامد میں سیاہ کردیتے ہیں اور ہنوز ع ہزار بار بشویم دہن ز مشک وگلاب کی حسرت رکھتے ہیں ۔(۲)

مفتی صاحب کے بزرگ کشمیر سے بہ سلسلۂ تجارت دہلی آکر آباد ہوئے ۔ ان کی ولادت اور تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ آزردہ کمال علم و فضل کے دوش بدوش بہت شگفتہ مزاج شخص تھے ۔ ان کے اور شیفتہ کے گھر باری باری چودھویں دن مشاعرہ ہوتا تھا جس میں دہلی کے اکثر باکمال جمع ہوتے تھے ۔ بے تکلفی کی ان محفلوں میں کبھی کبھی چہلیں اور چھیڑیں بھی ہوجاتی تھیں ۔ ۱۸۲۷ء میں شیفتہ کے ہاں مشاعرہ ہوا ۔ کمر ایسی ۔ نظر ایسی ۔ یہ زمین تھی مفتی صاحب نے منجملہ اور اشعار کے یہ شعر پڑھ کر تمام حاضرین محفل سے داد لی ۔

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھادے دہن ایسا کمر ایسی

---

(۱) ہندرا خوش نفسانند سخنور کہ بود ۔ باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و علوی و صہبائی و نیر وانگاہ ۔ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان (غالب)

(۲) آثار الصنادید باب چہارم ص ۷۹

شیفتہ نے مفتی صاحب کو چھیڑنے کے لئے ایک اچھی غزل کہہ کر کسی غیر معروف شخص کو دی ۔ جب اسنے یہ اشعار پڑھے تو ایک مرتبہ تو مفتی صاحب پر بھی سراسیمگی سی طاری ہوگئی ۔

ہم بزمِ دشمن کو چھپانا ہی تھا قاصد کہتا ہے کسی سے کوئی نادان خبر ایسی
کہیئے ہو علاج آپ کہیں کچھ خفقان کا دل کا ہے کو رہوے گا سنائی اگر ایسی (١)

مرزا غالب کی ان سے برابر کی ملاقات تھی ۔ جب یہ ان کے ہاں جاتے تو ایک دو دن بعد غالب بھی بازدید کے لئے ان کے گھر پہنچتے ۔ چنانچہ غالب کا وہ ابہام کہ " مجھے ان کا ایک آنا دینا تھا مفتی صاحب ہی سے متعلق ہے ۔

آزردہ کا گھر ضرورت مند شرفاء کا مرجع اور اہل ذوق کا مرکز تھا ۔ عشاء کے بعد دہلی کے تمام نامور باکمال ان کے دیوان خانے میں پہنچتے تھے اور کوئی موسم ہو اہل ذوق اس صحبت کو ناغہ نہ کرتے تھے ۔ اگر کسی کو یہ خواہش ہوتی کہ دہلی کے اہل علم کو کسی ایک محفل میں مجتمع دیکھے تو مفتی صاحب کے دیوان خانے میں دیکھ سکتا تھا ۔ (٢) ان دنوں کمپنی کی حکومت نے اہل ملک کی تالیف قلوب کے لئے انگریزوں کے دوش بدوش ملک کے معزز اشخاص کو منصفی کی خدمات سپرد کردی تھیں ۔ مفتی صاحب کو صدرالصدور کا عہدہ ملا تھا جسے آج کل ججی کے ہم رتبہ سمجھئے ۔ ایک مرتبہ جب غالب قرض کی علت میں ماخوذ ہوئے تو اتفاق سے مقدمہ مفتی صاحب ہی کی عدالت میں پہنچا ۔ برائے نام بازپرس ہوئی اور غالب یہ شعر پڑھ کر بخیریت اپنے گھر واپس آگئے ۔

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(١) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ۔ انتظام اللہ شہابی ص ٦٣
(٢) غالب از مہر ص ٢٠٥

ان تمام مشاغل کے باوجود صبح کا وقت مفتی صاحب نے طلبہ کو درس دینے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا ۔ ان میں امیر غریب ادنیٰ اعلیٰ ہر طبقے کے شاگرد تھے ۔ وہ خوش قسمت جو بعد میں اوج کمال کو پہنچے نواب صدیق حسن خان اور سرسید احمد خان تھے ۔ ابوالکلام آزاد کے والد مغفور بھی اسی اسی زمرے میں تھے ۔(۱)

اس جاہ و جلال کے باوجود ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مفتی صاحب بھی ماخوذ ہوئے ۔ جون ۱۸۵۷ء میں جب باغیوں کا زور انتہا پر تھا اور بخت خان اپنی فوج سمیت دھلی میں موجود تھا ۔ باغیوں نے علماء سے فتوے حاصل کرلئے تھے کہ کافر انگریزوں سے جنگ کرنا جہاد ہے ۔ جہّال کا یہ گروہ مفتی صاحب کے پاس بھی آیا اور ان سے فتوے پر دستخط کرنے کو کہا ۔ آزردہ انگریزوں کے قتل کو خون ناحق سمجھتے تھے ۔ دستخط کرنا نہ چاہتے تھے ۔ مجبور ہوکر " کتبہ بالحسر " لکھ کر دستخط کردئے مگر آخری لفظ پر نقطے نہ دیے ۔ سب نے سمجھا کہ بالخیر لکھا ہے ۔(۲) ستمبر ۱۸۵۷ء میں فتح دھلی کے بعد جہاں اور علما ماخوذ ہوئے مفتی صاحب بھی گرفتار کیے گیے ۔ بہت کچھ ردّ و کد کے بعد جس میں وہ کئی ماہ حیران و سرگردان رہے یہ کہہ کر چھوٹے کہ میں نے لفظ آخر پر قصداً نقطے نہیں دیے تھے اور یہ لفظ بالجبر لکھا تھا جس سے میری مراد یہ تھی کہ زبردستی دستخط کرائے گئے ہیں ۔(۳) غرض رہائی ہوگئی ۔ لیکن ابتلاء و آزمائش کے چند ہی ماہ میں مفتی صاحب پر عسرت و نکبت کا ناقابل بیان دور گزرگیا ۔ یادگار

---

(۱) غالب از مہر ص ۲۰۶

(۲) فتح دھلی کے بعد مفتی صاحب نے اپنے شاگرد سید رجب علی (بعد ازاں نواب ارسطو جاہ رجب علی خان) کے گھر جگروں ضلع لدھیانہ میں پناہ لی ۔ یہیں محمد حسین آزاد بھی اپنی پریشانی و ابتلا کا زمانہ گزار رہے تھے ۔ سعادت مند شاگرد نے دونوں کی خدمت اور حفاظت کا حق ادا کیا (۳) غالب از مہر ص ۲۰۶

غالب میں حالی نے جولکھا ہے کہ ایک روز ایک صاحب جو پہلے بہت ذی عزت تھے مگر اب تباہ حال ہوگئے تھے چھینٹ کا فرغل پہنے آئے ـ غالب کو ان کی حالت زار دیکھ کر بہت ترس آیا ـ مناسب طریقے سے اپنا بانات کا فرغل ان کے حوالے کیا ـ (۱) اگرچہ حالی نے آزردہ کی عظمت کے لحاظ سے ان کا نام چھپایا ہے مگر باخبر اشخاص جانتے ہیں کہ یہ واقعہ آزردہ ہی کے ساتھ پیش آیا تھا ـ فضل وکمال میں جو مقام انھیں حاصل تھا اس کے باوجود بختستر (؟) تقشف اور زہد خشک سے برکنار تھے ـ مشاعروں میں چھوٹے بڑے شاعروں کے ساتھ اپنی غزل پڑھتے اور سخن گوئی و سخن فہمی کی داد دیتے ـ گلشن بیخار اور آثار الصنادید میں ان کے اشعار منقول ہیں ـ چند اشعار بہ طریق اختصار یہاں لکھے جاتے ہیں ـــ

دامن اس کا توبھلا دور ہے اے دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مـــرا دور نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عـشق میں
اك جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نـــہیں

کامل اس فـــرقۂ زہّاد سے اٹھـــا نہ کـوئی
کچھ ہوئے تو یہی رنــدان قــدح خــوار ہوئے

آزرده مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گــیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنّت میں گھــر ملے

آزردہ پر ۱۸۶۱ء میں فالج گرا ـ آٹھ سال بعد ۱۸۶۹ء (۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۵ ھ) کو انتقال ہوا ـ ظہور علی نے چراغ دوجہان بود سے تاریخ نکالی ـ

(۱) یادگار غالب ص ۹۳

مرزا غالب سے مومن کے تعلقات دوستانہ و معصرانہ تھے ـ مومن اپنی بے نیازی و بددماغی کے باوصف مرزا غالب کی لیاقت کے معترف تھے ـ مرزا بھی مومن کی ذہانت اور دلفریب انداز تغزل کے مدّاح تھے ـ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا والا شعر انھیں اتنا پسند تھا کہ اسے اپنے دیوان کے بدلے حاصل کرنے کے آرزو مند تھے ـ[(۱)] احوال غالب مولفہ مختارالدین احمد آرزو میں مالک رام نے غالب کی زبان سے ان کے متعلق جوکچھ بیان کیاھے قابل غور ھے :

" دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی ـ کچھ شعر و شاعری کچھ صرف کچھ قلعے کے لطیفے ـ حکیم مومن خان کا انتقال ہوئے ابھی تھوڑے ھی دن ہوئے تھے ـ معلوم نہیں کیسے ان کا ذکر چل پڑا ـ اس پر مرزا صاحب فرمانے لگے صاحب بڑی آن بان کا آدمی تھا ـ ایسا رنگین مزاج زندہ دل اور خوددار شخص کم دیکھنے میں آیا ھے اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا ـ بلکہ غزل میں ایک نئی روش کا مخترع تھا ـ اس کا شعر جب تک ایک خاص لب ولہجہ سے نہ پڑھا جائے اس کا پورا لطف نہیں اٹھایا جاسکتا ـ مجھے تو اس کا یہ شعر نہیں بھولتا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نفس مضمون لطف زبان اسلوب بیان غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے ـ جب تک کسی شخص نے واقعی عشقبازی نہ کی ہو اور کسی کے فراق کا مزہ نہ چکھا ہو اسے یہ مضمون سوجھ ھی نہیں سکتا ـ سب پر طرّہ یہ کہ سہل ممتنع ـ یہ وراثے شاعری کچھ اور چیز ھے اور محض خدا کی دین ـ پختے

(۱) یادگار غالب ص ۸۱

مین اس پایے کے شعر کم ہین " (۱)

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہنے لگے " صاحب — مومن کے مرنے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا — قافلہ خالی ہوتا جاتا ہے — مرحوم میرا ہم عمر تھا — اس چالیس بیالیس برس کے عرصے مین کبھی کوئی رنج وملال ہمارے درمیان نہین آیا — حضرت اتنی لمبی مدت کا تو دشمن بھی میسر نہین آتا — دوست کہاں ہاتھ آتا ہے — مین نے اس کے مرنے پر ایک رباعی لکھی کہی تھی —

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر خونتابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر

کافرباشم اگر بہ مرگ مومن جون کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر (۲)

مرزا غالب کو اپنے قابل فخر دوست سے قلبی تعلق تھا — عرش نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مومن کی قبر پر گئے تو اپنا یہ شعر پڑھ کر بہت روئے —

سب کہاں کچھ لالہ و گل مین نمایاں ہوگئین

خاک مین کیا صورتین ہون گی کہ پنہان ہوگئین (۳)

مولوی فضل حق ابن مولوی فضل امام خیرآبادی سے بھی مومن کی ملاقات تھی — شطرنج اور شعر کے سبب دونون کی طبیعتون مین جتنی مناسبت تھی اتنا ہی بعد اختلاف عقائد کا تھا — مومن اصلاح پسند معقولی تھے مولوی فضل حق خوش اعتقاد روایت پرست — اس بنیاد پر بحث

---

(۱) مالک رام کا یہ خاکہ ان تفصیلات پر مبنی ہے جو آفاق حسین کے مرتبہ خطوط غالب مین ملتا ہے — دیکھئے نادرات غالب ص ۲۲ مکتوب بنام نبی بخش

(۲) اقتباس از احوال غالب ص ۲۸ وص ۲۹ (۳) حیات مومن ص ۴۷

اوقات شکر رنجی ہوجاتی تھی جس کی ایک مثال گزشتہ صفحات میں بیان ہوچکی ہے ۔ مولوی فضل حق کا علم وفضل اور منطق وفلسفہ میں جو پایہ ہے محتاج بیان نہیں ۔ اس کے باوجود مومن کی جامع الحیثیات شخصیت کا احساس ان کے ذہن پر طاری رہتا تھا ۔ ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ مرزا غالب نے ان سے کہا کہ آپ شطرنج کے ماہر کامل ہیں ۔ پھر بھی مومن آپ کو مات دے دیتے ہیں ۔ مولانا نے اپنے حریف کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے جواب دیا کہ مومن بھیڑیا ہے ۔ اپنی طاقت کی خبر نہیں ۔ اگر عشق و عاشقی کے جھگڑوں میں نہ پھنستا اور علوم وفنون کی طرف توجہ کرتا تو اس کے ذہن کی کیفیت معلوم ہوتی ۔[۱] فلسفہ و منطق میں بے مثال دستگاہ رکھنے کے علاوہ مولانا فضل حق شعر فہمی میں بھی فرد تھے ۔ جب مشکل گوئی کے باعث ہر طرف سے غالب پر اعتراضوں کی بوچھار ہونے لگی تو اس وقت انھوں نے مولانا کی ہدایت پر عمل کرکے سلیس گوئی اختیار کی اور ان کی مدد سے اپنے کلام کا انتخاب کیا ۔[۲] مولانا شعر بھی کہتے تھے ۔ اردو میں آرزو اور فارسی میں فرقتی تخلص تھا ۔ وہ عقائد کے اعتبار سے ایک خوش عقیدہ حنفی تھے اور امتناع نظیر خاتم النبیین اور معراج جسمانی کے قائل ۔ دلی کو ان کی ذات سے بہت علمی فیض پہنچا ۔ شمس العلماء آزاد کے والد محمد باقر ان کے شاگردوں میں تھے ۔[۳]

غدر کے ہنگامے میں فتوائے جہاد دینے والے علماء کے زمرے میں یہ بھی تھے ۔ جب دوبارہ انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تو یہ سب حضرات ماخوذ ہوئے ۔ اگرچہ ملکہ وکٹوریہ

---

(۱) ارواح ثلاثہ ص ۲٦۲ مرتبہ ظہور الحسن
(۲) غالب از مہر ص ۱۸۸
(۳) ایضاً

نے عفو عام کا اعلان کردیا تھا مگر اس کے باوجود یہ گرفتار ہوئے ـ ۱۸۵۹ء میں سزائے موت
کا حکم ملا جو بڑی کوشش کے بعد حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں تبدیل ہوا ـ نواب
یوسف علی خان ناظم والی رامپور نے ان کے علم وفضل اور خدمات کی بنا پر حکام بالا دست
سے سفارش کی ـ بڑی سعی و جانفشانی کے بعد ۱۸۶۱ء میں بریت کے احکام صادر ہوئے ـ
مگر قبل اس کے کہ یہ احکام انڈمان کے گورنر تک پہنچیں مولانا قید وبند کے شدائد اور مسموم
آب و ہوا کے اثر سے چند روز پہلے وفات پا چکے تھے ـ(۱) (۱۹/ اگست ۱۸۶۱ء) ـ غرض
دریائے علم وفضل کا یہ گوہر شہوار کالے پانی کی خاک میں مل گیا ـ اب کوئی اتنا بتانے والا
بھی نہیں کہ جزیرۂ انڈمان کے کون سے حصے اور کون سے کونے میں اس گنج ہنر کو گاڑا تھا ـ

وما تدری نفس بائی ارض تموت وما تدری نفس ماذا تکسب غداً وما تدری نفسٌ باَیّ ارضٍ تموت ٥

مولانا فضل حق سے ابوالکلام آزاد کے والد ماجد نے استفادۂ علمی کیا تھا ـ فضل حق صاحب نے
غدر کے حالات اور اسیری انڈمان کی تفصیل میں ایک رسالہ لکھا تھا جو مولانا غلام رسول مہر
کے کتب خانے میں ہے ـ(۲)

مرزا رحیم الدین حیا اور حکیم سکھانند راقم ہر روز کے حاضرباشوں میں تھے ـ ان کا
ذکر اس باب کے آغاز میں شطرنج اور رمل کے بہ سلسلہ آچکا ہے ـ یہ دونوں بڑے مؤدب
مودب قاعدہ دان شاگرد تھے ـ بالخصوص آخرالذکر کہ مومن کا ایسا ادب کرتے تھے جیسا ایک
سعید بیٹا اپنے باپ کا کرتا ہے ـ(۳) موزوں قامت شکیل جامہ زیب آدمی تھے ـ شاعری میں
شاہ نصیر سے تلمذ تھا ـ رمل میں مومن کے شاگرد تھے ـ اس فن کو خوب حاصل کیا تھا ـ(۴)

(۱) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ـ انتظام اللہ شہابی ص ۱۰۳ ـ بہادر شاہ ظفر ۸۶۹
(۲) غالب از مہر ص ۲۷۷ (۳) حیات مومن ص ۲۳ (۴) دلی کی آخری شمع ص ۲۳

خواجہ امان ۔ مومن سے قرابت بعیدہ رکھتے تھے مگر یگانگت اور اتحاد مزاج نے اس بعد کی تلافی کردی تھی ۔ بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے خوش پوشی جامہ زیبی اور عشقبازی کے آئین مومن خان سے سیکھے تھے ۔ انشاء میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۔ بوستان خیال کا ترجمہ ان سے یادگار ہے ۔ مصوری میں کافی دخل رکھتے تھے ۔ آج کل مومن کی جو شبیہ عام طور پر دیکھی جاتی ہے وہ انھی کی ساختہ تصویر کا چربہ ہے یہ تصویر مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے قبضے میں تھی اور ۱۹۲۸ء میں انکی توجہ سے اردو پرست طبقے کے سامنے آئی ۔

معاش ! حکیم نامدار خان کے حال میں بیان ہوچکا ہے کہ جب سرکار انگلیشیہ نے جھجھر کی ریاست نواب فیض طلب خان کودے دی تو پرگنۂ نارنول کے وہ دیہات جو حکیم موصوف کی جائداد میں تھے نواب کے تصرف میں آگئے اور کمپنی کی طرف سے حکیم مرحوم کے وارثوں کو ایک ہزار روپیہ سالانہ پنشن ملنے لگی ۔ اس میں سے حکیم مومن خان کو بھی اپنا حصہ ملتا تھا ۔ پرگنۂ نارنول کے مواضع ضبط ہوجانے کے باوجود مومن کے قبضے میں کچھ آبائی جائداد باقی تھی جس کا مالیہ انھیں سال بہ سال ۱۸۳۵ء تک ملتا رہا ۔ یہ جائداد جو ان کے مصارف کی کفالت کرتی تھی غالباً ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کے حکم سے مارچ ۱۸۳۵ء میں راجہ اندرجیت کو منتقل ہوگئی ۔ ایک خط میں مومن اس ناانصافی کا ذکر بڑے دردناک لہجے میں کرتے ہیں :

خون گرفتۂ کہ ہنوز از تلش فتنہ ہا برپاست و روح تلپاکش مانند بخی جان ہنگامۂ آشوب آرا (کذا) روزے بیشتر از کشتہ شدن زمین موروثیم را کہ نان جوین مرا

کفایت می کرد بہ ضبط سرکار اندرپت آورده، خاک مذلّت بہ فرق روزگار خود ریخت "۔(۱)

ولیم فریزر کا قتل نواب شمس الدین خان والی فیروزپور جھرکہ کے ایما سے بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء ہوا ۔(۲) اس سے ظاہر ہے کہ ۲۱ مارچ ۱۸۳۵ء تک یہ جائداد مومن کے تصرف میں رہی ۔ اس کے علاوہ بہادر شاہ کی معرفت مومن کو نو سو روپیے سالانہ کے قریب ملتے تھے ۔(۳) نواب فیض اللہ خان والی جھجّھر کی سرکار سے ایک معقول رقم مقرر تھی جس کا حوالہ ان کے رقعات میں موجود ہے ۔(۴) ثروت بیگم شمرو کی سرکار یعنی ریاست سردھنہ سے بھی تعلق تھا ۔ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک بھی مومن کے قدردان تھے ۔ طبابت وغیرہ سے بھی کچھ یافت ہوتی تھی ۔ ان تمام ذرائع سے مومن کو معقول آمدنی تھی ۔ لیکن آبائی امارت کا ٹھاٹھ قائم رکھنا عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور خوش پوشی کے تقاضے پورے کرنا بڑے اخراجات کا موجب تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ غالب کی طرح مومن بھی تنگ دستی کے ہاتھ سے نالان رہتے تھے ۔ مفلسی کا مرض بھی عجب درد بے دوا ہے کہ انسان کی دلجمعی کو غارت کر کے رکھ دیتا ہے ۔ حکیم مومن خان اس درد بے درمان کے ہاتھ سے اکثر نالان رہتے تھے ۔ ایک خط میں اپنے پھوپھی زاد بھائی احسن اللہ خان کو لکھتے ہیں :۔

---

(۱) انشائے مومن ص ۱۶۰

(۲) غالب از مہر ص ۱۶۵ نیز نادرات غالب ص ۷۷

(۳) مومن کے رقعات میں زر سالانہ از خزینہ دار شاہی کا ذکر کئی جگہ آیا ہے ۔ صحیح اندازہ نہیں کہ یہ رقم انہیں بہادر شاہ کی طرف سے ملتی تھی یا کسی اور ریاست مثلاً جھجھر کی طرف سے شاہی خزانچی کی معرفت ادا کی جاتی تھی ۔ یہ رقم ۱۲۰ تومان تھی جس کے ۹۳۸ روپیے بنتے تھے ۔ ایک سال ۹۳۸ کے بجائے صرف ۸۸۰ روپیے ملے تھے ۔ ملاحظہ ہو انشائے مومن ص۹۰

(۴) ایضاً ص ۶۳

" سراسیمگی تیرہ باطن روا نمی دارد کہ سطرے بہ جمعیت خاطر بنگارم و پریشانی سیاہ نامہ نمی گزارد کہ معانی دل بستہ فراہم آرم " (۱)

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ مومن نے زر سالانہ کی امید پر قرض لیا اور بروقت ادا نہ کر سکے - ایک خط میں جو کسی بے تکلف دوست کے نام ہے اور دانش پژوہا کے القاب سے شروع ہوتا ہے صاف لکھا ہے کہ بقال اپنی رقم وصول کرنے کے لئے آیا اور نازیبا گفتگو سے گزر کر میرے ساتھ ہاتھا پائی پر اتر آیا :

گندم فروشے کہ سامان نان و نمک بہ وعدۂ این زر مرسوم سالانہ پیش رساندہ بود بہ تمنائے حصول تمغا در رسید و بہائے متاع کو بہ تاراج دادہ بازطلبید - بہ دشنام شرح مدعا کردم - او ہم بہ دامنم آویخت و آبروئے پایہ شناسی ریخت ..... جان از چنین بہ خواری زیستن نفور گردید " (۲)

رقعات میں جا بجا اس تہی دستی کے ہاتھ سے فریاد کرتے ہیں -(۳) ایک خط میں اپنے کمالات اور ناقدری زمانہ کا اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : از قدر ناشناسی و سخن نافہمی ہیچ کسم خریدار نیست و جواہر زواہرم را بہ شبرنگی نیز روز بازار نے - گرد کساد آنقدر بہ نشستہ کہ طوفان نوح از متاع تختہ بند من تواند بردن و زنگار ناروائی آنچنان نہ بستہ کہ غبار صرصر عاد آئینہ ام را بہ جلا خواہد آوردن - با اعجاز بیضا تہی دستم و باد م عیسوی آزار بوستم " - جب کچھ بس نہیں چلتا تو اپنی نجوم دانی اور علوم و فنون پر تعریض کر کے دل کا غبار نکالتے ہیں -

---

(۱) انشائے مومن ص ۲۳ (۲) انشائے مومن ص ۱۲۹

(۳) انشائے مومن ص ۱۰۵ و ص ۱۰۹ و ص ۱۳۱ و ص ۶۳

تا طالع و کوکبم چه باشد   روزم همه شب شبم چه باشد
سیارہ شناسم و نه دانم   تا طالع و کوکبم چه باشد

از علم به تنگم تنگم از دلم بیرون باد   محزون شدم از هنر هنر محزون باد
از کاوش دانشم دلم پرخون است   یارب که درون دانشم پرخون باد (۱)

قصائد میں بھی جا بجا اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں ؎

کچھ انتہا بھی کواکب کے دور بیجا کی   ہمیشہ ہے مرے طالع میں اجتماع نحوس
ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے علوم و فنون   خدا کسی کو نہ دے ایسے طالع منکوس (۲)

وا اے چرخ تیری نافہمی   مہ اوج کمال قال اختر
روتے ہیں تیری جان کو ظالم   ایک میں کیا کہ سارے اہل ہنر

ایک قصیدے میں اپنے کمالات کا بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ان سے سوائے رنج و غم کے اور کچھ حاصل نہ ہوا :

(نجوم و شعر)   نہ ہنر کی مرے پرسش نہ سخن کی مرے قدر
نہ گہر کی مرے ارزش نہ طلا کی معیار

---

(۱) کلیات انشائے مومن ص ۱۰۹ ــ ایک اور جگہ فریاد کی لے اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگئی ہے ؎

مومن به چنین حال اناالدهر چه گوئی
کافر شوم از شکوهٔ گردون رود از دل

(۲) کلیات اردو ص ۱۸۹

(ریاضی) کیا حساب اس لئے سیکھا تھا کہ گھر میں بیٹھے

گنجئے درہم و دینار کو دافسون کے شمار

(طب) نہ ہوا بسکہ مریضوں سے حصول اجر رنج

کردیا مجھ کو مری چارہ گری نے بیمار

(شاعری) مدح خوانی پہ مری جائزہ شاہی بھی نہیں

وائے حرمان کہ ہیں بے جائزہ ایسے اشعار

در نایاب تو کیا خاک سے بھی منھ نہ بھرے

جس کے در پر میں کروں لولوئے شاداب نثار

در منثور مرے زینت صد صدر ہوئے

لیک بزم امرا میں نہ ملا مجھ کو بار (۱)

ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا سراسر غلط ہے کہ مومن کم حیثیت یا مفلس تھے ۔ وہ مختلف ذرائع سے معقول آمدنی رکھتے تھے لیکن امیرانہ شان و شوکت قائم رکھنے نیز آبائی امارت کے تقاضے پورے کرنے کے باعث کبھی فارغ البال نہ رہ سکے ۔ ان کے بعض مخلص دوست مثلاً تفضل حسین خان اور نواب مصطفی خان شیفتہ زندگی بھر ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے اور دوستی کے پردے میں ان کی دستگیری کرتے رہے ۔ مومن کے مرنے کے بعد بھی ان دونوں صاحبوں نے اپنے مرحوم دوست کی اولاد کے ساتھ قابل تعریف سلوک کیا ۔ (۲)

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۰۹ ۔ (۲) ایک مرتبہ شیفتہ نے خواب میں مومن مرحوم کو دیکھا کہ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ میرے اہل و عیال تکلیف میں ہیں ۔ بے تامل ان کے مکان پر گئے ۔ احمد نصیر نے بتایا کہ برسات کے سبب مکان ٹپک رہا ہے اور ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں ۔ شیفتہ نے گھر جاکر دو سو روپے بھجوادیے ۔ حیات مومن ص ۱۱۸

مذہب اور عقائد | مومن کا خاندان خانوادۂ ولی اللہی کا مرید تھا جس کے تمام افراد اصلاح و احیائے دین کے علمبردار تھے ۔شاہ عبدالقادر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز نے دین مبین کی اصلاح و تجدید کے لئے جو کچھ کیا اہل نظر اس سے خوب واقف ہیں ۔ اس خانوادۂ عالی سے مومن کو جو لگاؤ تھا اسی سے ان کے عقائد کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ وہ زرا سخت قسم کے حنفی مذہب اجتہاد پسند سنی تھے ۔ علم وفضل نے ان کو تحقیق پسند بنادیا تھا ۔ وہ مذہب کے معاملے میں قیاس یا تقلید کے قائل نہ تھے ۔ اس عقیدے کے اشخاص اہل حدیث کے لقب سے آج تک معروف ہیں ۔یہ لوگ فقہ میں کسی ایک امام کی تقلید کرنے کے بجائے قرآن و حدیث سے براہ راست مسائل کا استنباط کرتے ہیں ۔ مومن کا مسلک یہی تھا ۔وہ مشرکانہ عقائد اور اندھی تقلید کے منکر تھے ۔تصوف اور فلسفے کے وہ نکات اور وہ بے فائدہ موشگافیاں جو اسلامی تصورات کے خلاف ہیں ان کے نزدیک ناقابل قبول تھیں ۔یہی وجہ ہے کہ وہ قیاس و تقلید کے منکر اور تصوف و کلام کے لا یعنی مسائل سے روگرداں تھے ۔رباعیوں میں انھوں نے اپنے عقائد صاف صاف بیان کئے ہیں :

ارباب حدیث کا میں فرماں بر ہوں — تقلید کے منکروں کا سردفتر ہوں
مقبول روایت آئمہ نہ قیاس — یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں (1)

ہے بسکہ محبت رسول مختار — مذہب کو میں سوچتا ہوں مومن ہر بار
کتا ہے قیاس میں حق اہل حدیث — ہر چند قیاس سے نہیں کچھ سروکار

---

(1) کلیات اردو ص ۲۶۶

مومن ہے اگرچہ سب اسی کا یہ ظہور — توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے — بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

عقائد کی اس شدت کے باوجود مومن عملی اعتبار سے سست تھے — جوانی کی رنگینی میں نماز روزے سے بھی غافل ہوجاتے تھے — سید احمد شہید صاحب کی ترغیب اور وعظ وپند سے کئی سو آدمی ان کے ساتھ حج کے لئے گئے (۱۸۲۱ء) — مومن ان کے مرید تھے مگر چونکہ صاحب جی سے دل لگا رکھا تھا دلّی سے نہ نکل سکے — ایک مدت بعد نواب وزیر محمد خان والی ٹونک نے انھیں حج کی ترغیب دی تو کچھ بیر زوری کا اور کچھ آرزوئے وصل صنم کا بہانہ کر کے جان چھڑائی —[1]

وہابیت کا الزام تحقیق پسندی کی بدولت ان پر وہابیت کا الزام بھی لگایا جاتا ہے جو صحیح نہیں — اس الزام کی متعدد وجوہ ہیں — وہ خاندان ولی اللہی کے شاگرد اور سید احمد شہید کے مرید تھے جو کچھ تو اپنی اصلاحی سرگرمیوں کی بدولت لیکن زیادہ تر انگریزوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں کے باعث وہابی وبدعتی کہلانے لگے تھے — چونکہ مومن نے شاہ ولی اللہ کے خاندان سے تعلیم پائی تھی اور سید احمد شہید سے بیعت تھے —[2] اس لئے ان میں اصلاح و

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۶۶ —

ہے مجھے بھی خیال طوف حرم — خضر رہ گر ہو لطف رحمانی
واکہ صحن منا میں کرڈالوں — نفس امارہ کی بھی قربانی
ہے ابھی آرزوئے وصل صنم — ہے ابھی حسرت ہوس رانی

(۲) سیرۃ سید احمد شہید ص ۱۱۸ — مومن نے سید صاحب کی بیعت رجب ۱۲۳۳ھ مطابق جون ۱۸۱۸ء میں کی تھی جب سید صاحب امیر خان سے جدا ہوکر دلی آئے تھے اور جب مولانا عبد الحی اور شاہ اسمعیل ان سے بیعت ہوئے تھے — اگلے سال یعنی ۲ شعبان ۱۲۳۴ھ کو سید صاحب رائے بریلی چلے گئے اور پھر دلی نہیں آئے —

وتجدید کی روح کارفرما تھی ۔ وہ لوگ جو اس خاندان کے مخالف یا جو سید احمد صاحب کی تحریک جہاد کے خلاف تھے مومن کو وہابیت سے نسبت دیتے تھے جو اس زمانے میں بلکہ آج بھی بدترین عقیدہ سمجھا جاتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن اس خیال کے نہ تھے ۔ عرش نے ان کے حالات میں اس عقیدے سے بھی بحث کی ہے اور اس بے بنیاد الزام کی وجہ یہ لکھی ہے کہ مومن موحد تھے اور دین میں بیہودہ رسوم اور بدعتوں کو گوارا نہ کرتے تھے ۔ ان کی چھتی رباعیاں سن سن کر وہ پیر اور مشائخ جو مریدوں سے سجدہ تک حلال ٹھہراتے ہوئے تھے گھبرائے کہ یہ شخص ڈھولک ستار اور قوالی بند کرادے گا اور ہمیں "مرید آباد سے ایک ٹکا بھی نہ ملے گا" ان خرقہ پوشان بے جوہر نے مومن پر وہابیت کا الزام لگاکر انتقام لیا ۔(۱)

عرش نے اس دلیل کے علاوہ اپنے دوست ڈاکٹر عظمت اللہ بسمل عظیم آبادی کا بھی حوالہ دیا ہے جن کے والد سید احمد شہید کے مرید یعنی مومن کے پیر بھائی تھے ۔ بسمل صاحب نے بچپن میں مومن کو دیکھا تھا اور ان کا یہ مقطع خود انھی کی زبان سے سنا تھا ۔

زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

ڈاکٹر بسمل صاحب کے استناد سے عرش لکھتے ہیں کہ وہابیت کا الزام مومن پر غلط ہے ۔(۲) ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا غلط نہیں کہ وہ صحیح سوجھ بوجھ کے اہل تحقیق حنفی مسلک بزرگ تھے ۔ وہ ان لایعنی رسوم اور بیہودہ موشگافیوں سے ضرور متنفر تھے جنھیں اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ دراصل ان کی اس بدنامی کا حقیقی سبب ان کی اصلاح پسندی ہے اور اس سے بڑھ کر وہ شدت عقیدہ ہے جو انھیں دوسرے مسلک والوں پر طعن

(۱) حیات مومن ص ۵۹ بہ تغیر الفاظ
(۲) ایضاً ص ۶۰

و طنز کرنے کی طرف راغب رکھتی تھی ـ چنانچہ مومن نے اپنے اشعار مین مقلّدون شیعون اور اھل بدعت پر جابجا سخت حملے کئے ھین ـ(۱) باین ھمہ وہ متشرّع ومتقشّف زاھد نہ تھے ـ ان کی جوانی بڑی رنگینی مین بسر ھوئی جس مین نماز روزے کی پابندی تو تھی یا نہ تھی فسق وفجور کا گاڑھا رنگ ضرور تھا ـ بیرونی شہادتون سے قطع نظر انھون نے حمدیہ قصیدے مین اپنی دیوانی جوانی کا حال بے کم وکاست لکھا ھے جب وصل بتان کی لذت مین نماز ان کے لئے وبال بن جاتی تھی ـ(۲) اور حسینون کے ساتھ ھم نوالہ و ھم پیالہ ھونے کی خوشی مین وہ روزہ توڑنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے ــــہ

آیا نہ کبھی خیال صبح کا ۔۔۔ تلوا سوبار گر کھجایا

کتنی ھی قضا ھوئین نماز ین ۔۔۔ پر سر کو نہ پانو سے اٹھایا

افسوس شکست صوم یکسو ۔۔۔ یہ شکر کہ اس نے ساتھ کھایا(۳)

البتہ عمر کی آخری منزل مین وہ مذھبی اصول کے پابند ھوگئے تھے ـ(۴) غالباً" اسی منزل مین ان کا مذھبی تعصب بھی کچھ کم ھوگیا تھا اور وہ دوسرے فرقون کے خیالات سے معقول مفاھمت کرنے لگے تھے چنانچہ سیدنا حضرت امام حسن علیہ السلام کی منقبت مین جو قصیدہ لکھا ھے اس کے ایک شعر سے واضح ھوتا ھے کہ وہ شیعون کی طرح عصمت ائمہ کے قائل تھے ــــہ

شبہ کیا عصمت لخت جگر احمد مین ۔۔۔ جب مسلّم ھے کہ معصوم ھے جزو معصوم

---

(۱) گل رعنا ص ۳۰۳
(۲) وصل بتان کے دن تو نہین یہ کہ ھو وبال ۔۔۔ مومن نماز قصر کرین کیون سفر مین ھم
(۳) کلیات اردو ص ۱۸۲
(۴) تاریخ ادب رام بابو سکسینہ ص ۳۵۷

اس کے علاوہ انھون نے وقتاً " فوقتاً " جو رباعیان کہی ہین اور جن سے اعتراف گناہ کے ساتھ احساس ندامت اور خوش عقیدگی کی خوشبو آتی ہے وہ بھی زیادہ تر اسی دور کی ہین مثلاً " :

من بندۂ آن کہ رحمتش جرم زداست　　　من امت آن کہ شافع روز جزاست

گر جرم ز اندازہ فزون است بہ بخش　　　یا رب بہ محمدؐ کہ کرم عمت او راست

عہد شباب کی رباعیون مین جوانی کی بے باکی عقیدے کا اعلان کرنے مین کوئی تکلف نہین کرتی ۔ وہ اپنے خیالات صاف صاف بیان کرجاتے ہین : ۔

گوینْد برون ز کفر و عصیان نہ شدم　　　تا تابع یک تن از فقیہان نہ شدم

مومن شدم و محمدی و سنّی　　　آخرچہ شدم اگر مسلمان نہ شدم

یہی بیباکی ان سے شیخون اور مقلدون کو برا بھلا کہلواتی تھی اور

ع " حیوان ہین حقیقت مین یہ اہل تقلید " جیسے تشنیع و دشنام روا رکھتی تھی ۔

سیاسی رجحانات ! انیسوین صدی کا نصف اول اصلاح و عمل کا وہ دور ہے جس مین متعدد مذہبی سماجی اور سیاسی تحریکین بروان چڑھین ۔ ان تحریکون کا تفصیلی بیان اس مقالے کے پہلے باب مین ہے ۔ یہان صرف سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی کی تحریک جہاد کا اشارہ کرنا ضروری ہے جن کے ایمان افروز خطبات نے شمالی ہند کے مسلمانون کو جوش عمل سے بھر دیا تھا ۔ وہ ۱۸۲۶ء مین صرف پانچ سو جانبازون کا لشکر لے کر سکھون سے جہاد کرنے کے لئے نکلے ۔ بندیل کھنڈ گوالیار اجمیر سے گزرتے سندھ کے صحرا اور بلوچستان کے بے آب و گیاہ

جنگلوں کو عبور کرتے، ناقابل بیان مشکلات و موانع کے باوجود کابل پہنچے اور وہاں سے پشاور گئے اور چند معاربات کے بعد جن میں ان کے جانباز رفیقوں نے شجاعت کے بے مثال کارنامے دکھائے صوبہ سرحد کو سکھوں کے ہاتھ سے چھین کر اسلامی حکومت قائم کرلی ۔[1] اگرچہ یہ تحریک اہل سرحد کی غداری کے باعث ناکام ہوگئی اور سید احمد صاحب اپنے جان نثاروں کے ساتھ شہید ہوگئے (٦ مئی ۱۸۳۱ ء) مگر اس قدوسی جماعت نے سواسو سال پہلے ایمان ویقین کی جو شمع روشن کی تھی اس کی تابانی آج بھی ہر صاحب دل مسلمان کو پیغام عمل دیتی ہے ۔ راقم الحروف نے ضلع ہزارہ کے جنگلوں میں ان شہیدان راہ وفا کے مزاروں سے

ع حیات جاودان اندر ستیز است

کا ترانہ سنا ہے ۔ مٹی کے ان ڈھیروں پر اب تک جلال برستا ہے اور ہر اگتی دگی متفرق قبر سے ان شہیدوں کے پاک خون کی خوشبو آتی ہے جو کلمۂ حق کو بلند کرنے کی خاطر ایک دور افتادہ اجنبی علاقے میں جان پر کھیل گئے ۔

بوئے خون دیتا ہے کچھ مجھ کو یہ گلشن اے صبا
ہے شہیدوں کا یہاں کس گل کے مدفن اے صبا

مومن سید احمد صاحب کے مرید تھے اور انہیں اس تحریک سے کافی تعلق ہونا چاہئے تھا ۔ مرید مومن کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ معرکۂ جہاد میں شریک ہوکر ارادت وعقیدت کا حق ادا کرتے مگر ع فکر معاش عشق بتان یاد رفتگان، کی موانع ان کے لئے زنجیر پا بنے ہوئے تھے ۔ ۱۲۴۱ ھ میں یعنی جس سال سید صاحب جہاد کے لئے روانہ ہوئے ۔[2]

(۱) تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت ص ۳۱۰ (۲) سیرۃ سید احمد از مہر ص ۱۸۱ ۔ تاریخ خروج دراصل ۷ جمادی الثانی ۱۲۴۱ ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ ء ہے مگر مومن نے تاریخ کئی ماہ بعد کہی جبکہ ۱۲۴۲ ھ شروع ہوچکا تھا ۔

مومن نے ان کی تاریخ خروج کہی اور اس کے بعد ایک شادی کی محفل میں کسی دلربا کو دل دے کر ہوسناکی و مزہ بازی کے کھیل میں مصروف ہوگئے تھے۔(۱) تین سال بعد جب کہ سید صاحب سرحد میں اسلامی حکومت قائم کرچکے تھے اور انھیں اس کی بقا کے لئے مخلص کارکنوں کی سخت ضرورت تھی وہ رندی و عاشقی کی چھٹی بازی کھیل رہے تھے۔(۲) ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں بھی یعنی جس سال سید صاحب اور ان کا لشکر سرحد میں تباہ ہوئے وہ ایک او معشوقۂ دلنواز کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے نظر آتے ہیں۔(۳) غرض مومن اپنی بوالہوس مزہ گرد طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وہ اس تحریک میں عملی حصہ نہ لے سکے۔ ضمیر کی آواز انھیں بار بار ترغیب دیتی تھی اور وہ اپنے بچ چلانے ہوس پرست دل کو اس طرف مائل کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔

مومن جو تمھیں ہے کچھ بھی پاس ایماں　　ہے معرکۂ جہاد چل دیجئے وہاں

انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز　　وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے　　جلد مومن لے پہنچ اس مہدی دوراں تلک

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا　　لبوں پر دم بلا ہے جوش خوں شوق شہادت کا

---

(۱) اس کی تفصیل مثنوی تف آتشیں میں دیکھئے کلیات اردو ص ۳۳۸

(۲) مثنوی حنین مسموم میں یہ واقعہ دیکھئے۔ کلیات اردو ص ۳۵۸

(۳) کلیات اردو ص ۳۸۸

مگر ان تمام ترغیبوں کے باوجود ان کی طبیعت ادھر نہ آسکی ۔ وجہ ظاہر ہے ۔ سرحد کے پہاڑوں میں ٹکریں مارنا اور لق ودق صحراؤں کے مصائب سہنا اس شاعر کے بس کا کام نہ تھا جس کی رنگین جوانی دلی کی گلیوں میں حسینان پری پیکر کے ساتھ گزر رہی تھی ۔ تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھنے کے بجائے انھوں نے قلم اٹھانا بہتر سمجھا اور مثنوی جہادیہ لکھ کر فریضۂ جہاد سے فارغ ہوگئے ۔ اگرچہ مومن کی بے عملی حد درجہ قابل اعتراض ہے مگر ان جیسے رنگین مزاج نازک طبع عشقباز شاعر سے جانباز مجاہدوں کی سی جفا کشی کی توقع رکھنا امید محال ہے ۔ ان دنوں تمام شمالی ہند سے غیور و جسور مجاہدوں کے قافلے سرحد پہنچ کر سید احمد صاحب کے لشکر میں شامل ہو رہے تھے ۔[1] روپیے اور اسلحے کی ترسیل کا باقاعدہ انتظام مولانا محمد اسحاق نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب کی وساطت سے قائم تھا ۔[2] تاہم جہاں تک معلوم ہے مومن نے جان یا مال سے اس تحریک کی اعانت نہیں کی ۔ جہاد کی تمام مدت یعنی ۱۲۴۱ھ سے ۱۲۴۶ھ تک وہ عشقبازی کا کھیل کھیلتے رہے ۔ غرض دلی کا یہ رنگین طبع شاعر جو بہت سی خصوصیات میں اپنے انگریز معاصر بائرن سے مشابہ تھا اس کی طرح جنگ آزادی میں حصہ نہ لے سکا ۔ اس کے علم نجوم نے بھی اس کار خیر میں ترغیب و تحریک کرنے کے بجائے نحوست و نامساعدت کے شگون دکھلائے ۔ چنانچہ ایک قصیدے میں جو دلی سے سید احمد صاحب کی شان میں کہہ کر سرحد بھیجا تھا ان کے جوش عمل کی تعریف کرتے اور یہ لکھتے ہیں کہ میں بھی شریک جہاد ہونا چاہتا ہوں مگر کیا کروں ۔ زحل کی نحوست کا اثر مانع ہے ۔[3] سنیچر کی تاثیر زائل ہوجائے تو حاضر ہوں ۔

---

(۱) سوانح احمدی ص ۱۳۹ (۲) تاریخ مسلمان ہند و پاکستان از سید ہاشمی ص ۲۹۰ ۔

(۳) خواہ اسے حیلہ پردازی کہیے یا حقیقت ۔ نجومی کی بات پوری ہوئی ۔ حکیم مومن خان کے احکام بالاکثر درست ہوتے تھے چنانچہ اس قدوسی تحریک کا انجام بھی دردناک ہوا ۔

چسان بہ دشت زنسم خیمۂ سفر کہ ہنوز　　نمی رود گر نحس اکبر از اوتاد

پیام دعلی ویران بہ حضرت لین است　　کہ اے ز مقدم تو ہر خرابہ نور سواد

بہ یاد لوکرہ الکفرون چسو ماہ تمام　　تمام ساختہ کارے کہ کردۂ بنیاد (١)

مختصر یہ کہ عملی طور سے شریک جہاد ہونے کے بجائے انھون نے صرف ایک پرجوش مثنوی لکھنے پر اکتفا کی یعنی اپنے جذبۂ ایمان کا ثبوت زبان تیغ سے دینے کے بجائے زبان قلم سے دیا ـ یہ مثنوی کافی ولولہ انگیز ہے ـ مومن نے اس مین نفسیاتی ژرف نگاہی سے کام لے کر معقول دلائل سے مسلمانون کے جوش ایمان کو ابھارا ہے (٢) ـ چند اشعار ملاحظہ ہون ـ

زہے سید احمد قبول خدا　　سر اصحاب رسول ہدی

خدا نے مجاہد بنایا اسے　　سر قتل کفار آیا اسے

دم اس دست و بازو پہ دیوے اجل　　لب تیغ کے بو سے لیوے اجل

جلو مین ہمیشہ دوان ہو ظفر　　رکاب اس کی پکڑے روان ہو ظفر

خ　خبردار ہو جاؤ اے اہل دل　　کہ رحمت برستی ہے اب متصل

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا　　اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

امام زمانہ کی یاری کرو　　خدا کے لئے جان نثاری کرو

سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز　　نہ جان آفرین سے کرو جان عزیز

کسی کو نہین ہے اجل کی خبر　　کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر

تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے　　تن خستہ سے جان کر جانے نہ دے

---

(١) دیوان مومن فارسی ص ٥١

(٢) کلیات اردو ص ٢١٧

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو — حیات ابد ہے جو اس دم مرو
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے — ملا دے امام زمان سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جان فدا ہو تری راہ میں (۱)

اس پر جوش انداز بیان اور پرخلوص دعا کے باوجود جو ان اشعار میں نمایاں ہے سب جانتے ہیں کہ مومن نے سرحد کی طرف دو قدم چلنے کی بھی تکلیف نہیں اٹھائی — وہ ایک آزاد مزاج رنگین طبع عیش دوست شاعر تھے — ایسے آدمی سے یہ توقع رکھنا سراسر غلط ہے کہ وہ دہلی جیسا شہر چھوڑ کر اور اپنے عاشقانہ مشغلے ترک کر کے صوبہ سرحد کے پہاڑوں میں سر بھوڑتا پھرتا پھرے — انھیں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کا کچھ شعور تھا لیکن وہ ان کی سربلندی کے لئے کوئی عملی تدبیر کرنے یا اپنے شخصی کردار سے جوش عمل اور جذبۂ ایمان کا نمونہ دکھانے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے —

مومن نے مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی — وہ ایک منصب دار خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لئے ملکی سیاسیات سے ان کی دلچسپی فطری تھی — ان کے زمانے میں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت ظاہری ٹیپ ٹاپ کے باوجود محض ایک سایہ تھی — اصلی طاقت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی جو دکن بنگال اور بہار پر قبضہ کرنے کے بعد ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے بھی مالک بن گئے تھے — مومن کچھ تو اختلاف مذہب کے باعث کچھ اس غیر ملکی طاقت سے تعصب رکھنے کی وجہ سے

---

(۱) کلیات اردو ص ۲۱۸

لیکن زیادہ تر اس لئے کہ تیموری خاندان کے زوال کے ساتھ تمام بادشاہی حوصلے بھی آہستہ آہستہ ریاست و امارت سے محروم ہو رہے تھے وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے ۔ انھیں اس قوم سے اتنا عناد تھا کہ جہاں کہیں انگریزوں پر مصیبت پڑتی وہ خوش ہوتے تھے ۔ ۱۲٦۷ ھ مطابق ۱۸۵۱ ء میں برطانوی فوج کابل میں تباہ ہوئی تو انھوں نے نصر من اللہ فتح قریب کے الفاظ سے افغانوں کی فتح کی تاریخ نکالی(۱) ۔ ولیم فریزر فریزر کے قتل کے بعد ایک خط میں اس کا ذکر بڑی نفرت سے کیا ہے(۲) ایک فارسی قصیدے میں بھی انگریزوں کسی روز افزوں شوکت و سطوت پر دانت پیستے ہیں(۳) حد ہے کہ ایک غزل کے مقطعے میں بھی انتقامی جذبے کی جھلک دکھائی ہے ؎

پرس تا چہ کنم در قصاص دین مومن خدا بہ دست من اندازد این بتان فرنگ

ایک خط میں جو ۱۲۳۹ ھ (۱۸۲۳ ء) میں اپنے نانیے حکیم غلام حسین خان کو ان کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں بھیجا ہے کفار فرنگ سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" چون درین دیار خراب کہ بہ دست کفرۂ جاہل بے قدر افتادہ ..... " (۴)

اور اس کے بعد دہلی سے ہجرت کا مقصد ظاہر کرتے ہیں ۔ ان تمام شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے برعکس جو انگریزی حکومت کے مداح تھے مومن انگریزوں کے مخالف اور سابقہ جاگیرداری نظام کے حامی تھے ۔ انگریزوں سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خانوادۂ ولی اللّٰہی اس قوم سے بیزار تھا ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہاں تک فتویٰ دے دیا تھا کہ فرنگی کی

---

(۱) دیوان فارسی ص ۱۳۵

(۲) انشائے مومن ص ۱٦

(۳) این بھویان بہ لب رساندند جان من و جان آفرینش (۴) انشائے مومن ص ۱۲۵

ملازمت حرام ہے۔ (۱) مومن انہی وجوہ سے برطانوی سیاست کے خلاف تھے ۔باین ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اپنی خداداد ذہانت کے باوجود سیاسی بصیرت سے محروم تھے ۔ واقعات کی رفتار پر ان کی نگاہ نہ تھی اور خاندان ولی اللہی سے تعلق رکھنے کے باوصف ان کے دماغ میں ایک منظم اسلامی حکومت یا کسی عالمگیر اسلامی تحریک کا تصور نہ تھا ۔ وہ ایک رنگین مزاج عیش کوش رئیس زادے تھے اور سیاست کے خارزار میں الجھنا نہ انہیں پسند تھا نہ ان کے بس کا کام تھا ۔(۲) یہی سبب ہے کہ زبانی جوش و خروش دکھانے کے باوجود انہوں نے تحریک جہاد یا اس کی عملی تنظیم میں کوئی حصہ نہیں لیا ۔

سفر :۔ نازپروردہ رنگین مزاج شاعر نے اپنی زندگی میں بہت کم سفر کیا البتہ جوانی میں جب جنون عشق کی وحشت زنجیر در کھڑکاتی تھی اور محرومی سے جی گھبرانے لگتا تھا تو چند روز کے لئے دلی سے نکلتے تھے ۔کلیات اردو نیز رقعات فارسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۱۱ھ انہوں نے رامپور بدایون سہارنپور سہسوان جہانگیر آباد وغیرہ کے سفر کئے تھے اس مسافرت کا دائرہ کبھی ڈیڑھ سو میل سے زیادہ نہیں بڑھا ۔دلی کے ایسے عاشق تھے کہ ہر بار چند ہفتے بعد واپس آ جاتے تھے ۔ان سفروں کی مختصر روداد یہ ہے :۔

(۱) سہسوان ۔ یہ سفر ۱۲۳٦ھ میں امۃ الفاطمہ کی تلاش میں کیا تھا جہاں وہ دلہا لکھنؤ کے راستے میں سہسوان کے آس پاس کسی عزیز یا آشنا کے گھر ٹھہری ہوگی ۔ یہاں مومن نے

---

(۱) سیرۃ سید احمد از مہر ص ۱۱۸

(۲) یعنی بقول اقبال ۔ یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
که فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

اپنے ایک دوست حکیم مظہرعلی کے گھر جو رئیس قصبہ تھے قیام کیا اور شغل بے کاری کے بطور سدیدی
ؔ نفیسی کی شرح بھی لکھی ۔(۱) معلوم نہیں کہ وہ متاع نایاب جس کی تلاش میں وہ صحرانورد
ہوئے ملی یا نہیں ملی ۔ تاہم ایک قطعے سے جو قیام سہسوان کے زمانے میں لکھا ہے یاس
و محرومی کا رنگ ٹپکتا ہے ؎

صاحبو میرا حال مت پوچھو	بندۂ سخت بیوفا ہوں میں
اے خداوند شوخ کے غم میں	قابل رحم ہوگیا ہوں میں
چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا	ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک	کہ غلام گریزپا ہوں میں (۲)

۲) رامپور ۔ عرش کا بیان ہے کہ نواب محمد سعید خان نے مسند نشینی کے موقع پر انہیں
رامپور بلایا تھا ۔(۳) نواب موصوف کی تاریخ مسند نشینی ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء (مطابق ۱۹/
جمادی الآخر ۱۲۵۶ ھ) ہے ۔ اگر عرش کا بیان مستند سمجھا جائے تو مومن کے اس سفر
کا زمانہ متعین ہوجاتا ہے ۔ اسی سے یہ بھی طے پاتا ہے کہ یہ غزل ؎

ہائے تعیین چین کب غم دوری سے گھر میں ہم
راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

۱۸۴۰ء (۱۲۵٦ ھ) میں یعنی سفر یا قیام رامپور کے زمانے میں کہی گئی ہے ۔(۴)

---

(۱) حیات مومن ص ۵۸ (۲) کلیات اردو ص ۵۵۵
(۳) حیات مومن ص ۵۸ (۴) کلب علی خان فائق رامپوری نے رضا لائبریری کے قلمی
نسخۂ دیوان مومن میں جو ۱۲۵۱ ھ سے پہلے کا ہے یہ غزل نہیں دیکھی ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا
درست ہوگا کہ غزل مذکور ۱۲۵۲ ھ یا بعد کی ہے ۔

(۳) بدایون - اس سفر کی تفصیلات معلوم نہین - صرف ایک شعر کلیات مین ہے
جو ان کے ورود بدایون کا اشارہ کرتا ہے ؎

بدایون مین مجھے جوش جنون لایا ہے دلّی سے
یہ کیونکر چارہ پند خردمندان کا ہوش آیا

ان کے علاوہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر بھی جایا کرتے تھے کہ یہ قبضہ ان کے دوست
صادق شیفتہ کی جاگیر تھا - سردھنہ بھی گئے ہین کہ وہ ان کی دوسری سسرال تھی اور
وہان دو تین ماہ قیام بھی کیا ہے -(۱)

ان مسافرتون مین نازپرورد آرام طلب مومن نے کافی زحمتین اٹھائین - سفر کا زیادہ حصہ
گھوڑے پر طے ہوتا تھا - ایک مرتبہ ایسا گھوڑا ملا جو عرفی والے اسپِ شاہی کا جواب تھا -
نہایت سست بد رفتار - ایسا کہ ؎

بہ ہر کہ آمدہ ازپیش اول این سخن است
بہ این فرس نتوان رفت یا توان رفتن

بہ ہزار خرابی منزل پر پہنچے ہین مگر آرام و سکون وہان بھی مفقود - جس مکان مین فروکش
ہوئے ہین اس کی کیفیت یہ ہے :

مکانے تنگ تر از گور منافق و باوجود تازہ تعمیر شکستہ تر از دل عاشق -
ابوابش چون ابواب تحفۂ اثنا عشریہ عبرت ریز و ارکانش مانند ارکان لیاقم
ہمہ جنون خیز " -(۲)

---

(۱) انشائے مومن ص ۵۸

(۲) انشائے مومن ص ۵۲

اسی طرح انداز میں مزاح کی دریا کی کشتی کی خارزاروں کی قصبائی و کان داروں کی المختصر پورے دیہاتی ماحول کی ہجو کی ہے ۔ دکانداروں کی تہی مائگی اور بد سلیقگی کا خاکہ بڑے مزے لے لے کر اڑایا ہے ۔ ایک بزاز کا حال لکھتے ہیں کہ میں نے اس سے اطلس خریدنا چاہی ۔ وہ دیر تک میرا منہ دیکھ دیکھ مسکراتا رہا پھر بولا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور اطلس کا نام کہاں سنا ہے ؟ میرے پاس اس قسم کی چیزیں نہیں ۔ البتہ ایک کمبل موجود ہے آپ کے لباس کے لئے نہایت موزوں رہے گا ۔

بزاز و عجب ماجرائے — گفتم بدہ اطلسی قبائے

تا دیر بہ ہستئے نسامد — وانگاہ بہ گفتگو در آمد

پرسد کہ تو از کجا رسیدی — این نام بگو کجا شنیدی

چون سرو قد بلند داری — اطلس ز چہ دلپسند داری

اطلس نہ سزائے چون تو باشد — پشمینہ برائے چون تو باشد

دارم بہ دکان خود گلیمے — گیرم ز تو تا بہائے نیمے

این گونہ لباس دل فریبد — زیبد بہ تو این لباس زیبد (۱)

غالباً انہی سفروں میں وہ رقعات لکھے گئے جو مومن نے خبریہ ناموں کے بطور دلی بھیجے اور جن میں بچوں کو دعا پیار لکھا ۔ بیٹی کو جو خط تحریر کیا ہے اس کے الفاظ سے محبت کا رس ٹپکتا ہے ۔ :

---

(۱) انشائے مومن ص ۵۲

لخت جگر سلمہا ۔ عریضۂ ایشان حرز جان کردم ۔ از درد تنہائی بجانم
که از دختران خود اکثر ایام مہجورم ۔ دل بہ صحبت شما تسلی مے شد "(۱)

ایک اور خط میں احمد نصیر کو جو مومن کی غیر حاضری میں گھر پر بہ عارضۂ درد گردہ علیل تھا تسلی
وتشفی کے کلمات لکھے ہیں ۔(۲) ایک رباعی سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرزند عزیز کی
علالت سے بے حد پریشان ہیں ۔ شافی حقیقی کی بارگاہ میں اس کی صحت کی دعا اس طرح کی
ہے کہ الفت پدری کا دریا ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے ؎

اے مہر پسر نہادہ در جان پدر　　الطاف رسولت زپسدر افزون تر
فرزندم را شفا عطاکن که بہ حشر　　کافی است مرا شفاعت پیغمبر(۳)

وفات : مومن سفر حیات کی ۵۲ منزلیں طے کرچکے تھے (شمسی حساب سے ۵۲ سال) که
سفر آخرت پیش آیا ۔ ان کی زندگی شعر شطرنج اور نجوم ورمل کے مشاغل میں باطمینان
بسر ہو رہی تھی ۔ ڈھلتی عمر نے ابھی قوی میں اضمحلال پیدا نہ کیا تھا که وقت ناگزیر
آپہنچا ۔ ہوا یہ که وہ دالان جس میں ان کی نشست تھی شکستہ ہوگیا تھا ۔ اس کی(۴)
چھت جو مرمت طلب تھی مزدوروں نے کھولی تھی اور یہ کام کی نگرانی کر رہے تھے ۔ چند مزدور
نیچے سے کڑیاں اٹھاکر اوپر کو دے رہے تھے ۔ یہ منڈیر سے لگے کھڑے تھے ۔ معلوم

---

(۱) انشائے مومن ص ۱۶۱ ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے که یہ لڑکی اس وقت کافی بڑی
ہوگی اور باپ کی خدمت گزاری کرتی ہوگی ۔

(۲) انشائے مومن ۔ رقعہ بنام احمد نصیر ص ۱۸۰ (۳) دیوان فارسی ص ۱۷۸
(۴) حیات مومن ص ۸۰

نہیں کس خیال میں محو ہوئے کہ یکایک جھجھکے اور لڑکھڑا کے ٹھوکر کھا کر چھت سے نیچے گر پڑے ۔ گرے تو بیہوش ۔ نصیر ظہیر فراق کے والد جو ان کے عزیز اور شاگرد تھے دوڑ کر گئے اور انھیں اٹھا کر نیچے کے کمرے میں لٹا یا ۔ گھر میں کہرام بپا ہو گیا ۔ عزیزوں اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی جن میں عبد الرحمن آہی بھی تھے ۔ ہوش آیا تو ان کی طرف دیکھ کر بولے کہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا ۔ مگر میرا علم کہتا ہے کہ صرف پانچ دن یا پانچ مہینے زندہ رہوں گا ۔ میرے مرنے کی تاریخ لکھ رکھو " دست و بازو بشکست " آخر یہی ہوا ۔ بدھ کا دن صبح کا وقت تھا کہ اس جامع کمالات نے بزم عالم کو خیرباد کہا ۔ بہ ہوش و حواس ہنستے بولتے دنیا سے رخصت ہو گئے ۔[۱]

کوٹھے سے گرنے کی افتاد مومن پر قالبا " جمادی الاول ۱۲۶۸ ھ (مارچ ۱۸۵۲ ء) میں پڑی ۔ بازو ٹوٹ گئے اور معقول معالجے کے باوجود زخم بگڑ گئے ۔ یہ تکلیف سخت جانکاہ تھی مگر مومن بڑے تحمل سے اسے برداشت کرتے رہے ۔[۲] مرزا قادر بخش صابر نے یہ کیفیت ذرا تفصیل سے لکھی ہے :-

" انواع شدائد نے وہ رنج دیا کہ ان کا تحمل حد بشر سے خارج تھا ۔ آخر الامر اسی سال کہ بارہ سو اڑسٹھ ہجری تھے سفر آخرت اختیار کیا ۔ وابستگان جگر فگار کے دل کو رنج اور داغ میں مبتلا کر کے حوران فردوس کو سعادت اقبال سے مستعد کیا " (۳)

مومن زخموں کی جانکاہ تکلیف کے باوجود با ہوش و حواس رہے ۔[۴] آہی نے اپنے استاد اور شفیق

---

(۱) یہ تفاصیل عرش گیاوی کے بیان ص ۸۰ و ص ۸۱ سے ماخوذ ہیں ۔ لیکن پانچ دن یا پانچ مہینے والی پیشین گوئی غلط ہے ۔ (۲) گلستان سخن ص ۲۲۳
(۳) گلستان سخن ص ۲۲۳ (۴) دیوان فارسی ص ۱۷۵

بزرگ کو دو ماہ مرگ وحیات کی کشاکش میں دیکھا ۔ حالت کا اندازہ ہو ہی چکا تھا ۔
شاعر کی عزیز ترین متاع اس کا کلام ہے ۔ آسی نے سارے کام چھوڑ کر کلیات اردو ترتیب
دینے کی طرف توجہ کی ۔ شیفتہ کے جمع کردہ دیوان کے بعد کا سارا کلام اضافہ کر کے مومن کے
مرنے سے تین دن پہلے ان کے سامنے پیش کیا ۔ قریب المرگ شاعر نے مناسب ترمیم کرانے کے بعد
دیوان کو آسی کے حوالے کیا اور زبان یاس سے یہ مصرع پڑھا ع

حوالت با خدا کردیم و رفتیم (۱)

فارسی دیوان کی بھی یہی کیفیت ہوئی ۔ اسے حکیم احسن اللہ خان نے ترتیب دیا اور انھی
دنوں جب کہ شاعر کی شمع حیات گل ہونے میں دو ہفتے باقی تھے (۲) پیش کیا ۔ چونکہ دیوان میں
چند ردیفیں سرے سے نہ تھیں اس لئے اسی کرب کے عالم میں برادر عزیز کے حسب خواہش
خالی ~~ردیفیں سرے سے~~ ردیفوں کی غزلیں پوری کیں ۔ حکیم احسن اللہ خان کا بیان ہے کہ :۔

"ہاتھ گلے میں لٹکا ہوا تھا اور زبان سخن سنجی میں مصروف تھی" (۳)

اس حالت میں احسن اللہ خان کو جو خط لکھا ہے اس میں شکایت لکھ کر کہ تم دو روز سے
میری عیادت کے لئے نہیں آئے اپنی حالت لکھی ہے اور زندگی سے یاس ظاہر کی ہے ۔ اسی
خط میں یہ وصیت بھی ہے کہ میری پھوپھی اور دیگر اعزا و اقربا کو صبر کی تلقین کرنا اور
میری پھوپھی زاد بہنوں کو تسلی دینا :۔

---

(۱) دیباچۂ کلیات اردو از میر عبدالرحمن آسی مطبع نولکشور
(۲) دیباچۂ دیوان فارسی از حکیم احسن اللہ خان
(۳) ایضاً ۔ دیوان دیکھ لو ۔ بعض ردیفوں میں صرف ایک ایک غزل ہے ممکن ہے کہ
کہ یہ اسی فرصت پروانہ در آخر شب کا تبرک ہو ۔

" در چنین وقت که ملک الموت نشتر بر رگ جان سپرده غسّال کافور به کرٓب آلود تجار تحفهٔ تابوت درود ـ خیّاط گریبان کفن دریده چاره فرما نالید ـ گور آغوش صفا بازکرد و نوحه گر زلب سوء زبان واویلا دراز " ـ

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرض الموت میں مومن کی قوت برداشت قابل ستائش رہی اور وہ اس مصیبت کو منجانب اللہ سمجھ کر صبر سے برداشت کرتے رہے ـ دیوان فارسی کی ایک رباعی بھی جو اس عالم میں کہی گئی ہے شاعر کے صبر و ثبات کی تصدیق کرتی ہے ـــ

یارب جانم به درد جانکاه رود ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ برجادهٔ مستقیم و دلخواه رود

وانگاه که در رسد اجل با همه شوق ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ گوئیے تو به شور حسبی اللّٰه رود (۱)

غرض اسی حالت میں به تاریخ ۱۲ مئی ۱۸۵۲ء مطابق ۲۱ رجب ۱۲۶۸ ھ) بدھ کی صبح کو باغ عالم سے ریاض خلد کی جانب سدھارے ـ(۲) نماز جنازہ جامع مسجد میں ہوئی ـ مہندیوں میں جہاں شاہ ولی اللہ صاحب کا مدرسہ تھا اور مسجد اب تک باقی ہے (اور وہیں اس خانوادے کا گورستان بھی ہے) مسجد کی غربی(۳) دیوار کے باہر محراب مسجد کے قریب دفن ہوئے ـ آہی نے " ماتم مومن خان " سے تاریخ نکالی ـ

ان کے مرنے سے دہلی کی بزم سخن سونی ہوگئی ـ ذوق کو ان سے زیادہ واسطہ نہ تھا مگر اس سانحے سے آب دیدہ ہوگئے ـ غالب مدتوں افسردہ رہے ـ کہا کرتے تھے کہ مومن

(۱) دیباچهٔ دیوان فارسی از حکیم احسن اللہ خان ص ۱۷۸ ـ

(۲) یہ تاریخ نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین ص ۲۲ کے اس خط سے اخذ کی گئی ہے جو غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو بہ تاریخ ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء لکھا ہے اور اطلاع دی ہے کہ آج مومن کو مرے ہوئے دسواں دن ہے ـ تقویم سے بدھ کا دن اور ۱۲ مئی ۱۸۵۲ء مستنبط ہوتے ہیں ـ

(۳) عرش نے اور ان کی سند پر فائق نے جانب شرق لکھا ہے جو غلط ہے ـ راقم خود مزار پر گیا ہے ـ

کے مرنے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا ۔(۱) غرض یہ کہ اندام پیرہن شاعر جسے انیسوین صدی کی بزم سخن ڈھونڈھتی رہ گئی مہندیون کی خاک کا پیوند ہوا ۔ چرخ کینہ پرداز کے دل کا غبار پھر بھی نہ نکلا تا اینکہ ایک مدت بعد اس بد نصیب شاعر کی قبر کا نشان تک مٹ گیا ۔ سید رشید احمد بخاری کہ نجابت و شرافت کے علاوہ شعر فہمی کا جوہر بھی رکھتے ہین اور خاندانی تعلقات کی بدولت مومن سے وابستہ ہین ۔(۲) کہتے تھے کہ ایک زمانے مین قبر اس طرح ہموار ہوگئی تھی کہ باخبر حضرات کے سوا اور کوئی اس کا نشان نہ بتا سکتا تھا ۔ عرش گیاوی دہلی کے پہلے سفر مین ہزار کوشش کے باوجود مزار کی زیارت سے محروم رہے ۔ دوسری مرتبہ یعنی ۱۹۲۹ ء مین حکیم ناصر ظہیر فراق کی رہنمائی سے قبر تک پہنچے ۔ خاک کا ڈھیر تھا جس سے لپٹ کر وہ بہت روئے ۔(۳) ۱۹۲۲ ء مین پروفیسر احمدی نے نواب سراج الدین احمد خان سائل وغیرہ کی مدد سے قبر کا مقام دیکھا اور مٹے ہوئے نشان کو دوبارہ قائم کیا ۔ گم کی قبر بنوا کر سنگ مرمر کی لوح لگوادی ہے ۔ خدا جزائے خیر دے ۔ اگر وہ اتنی توجہ نہ کرتے تو مین اور مومن کے تمام معتقد تربت کی زیارت سے محروم رہتے ۔

یہان اتنا لکھنا مناسب ہے کہ قرب معنوی ہزارون رنگ مین اپنا جلوہ دکھاتا ہے ۔ مومن کے خاندان کو خانوادۂ ولی اللہی سے جو عقیدت تھی اس کا اثر دیکھو کہ مومن مرنے کے بعد بھی انہی بزرگون کے ساتھ مین آرام کر رہے ہین ۔ ذیل کے نقشے سے ان کی قبر کا محل وقوع واضح ہوتا ہے ۔

نقشہ

---

(۱) احوال غالب از آرزو ص ۲۹ ۔ (۲) موصوف دہلی کے اس خانوادۂ گرامی سے ہین جو شاہان مغلیہ کے زمانے سے جامع مسجد کی امامت پر سرفراز ہے ۔ پچاس سال کا سن ہے خوش مزاج شگفتہ و خوش اطوار آدمی ہین ۔ اسٹیٹ بینک کے ٹریژرر ہین اور اخلاق عالیہ کے خزینہ دار ۔ حاجت روائی احباب ان کا شغل ہے ۔ (۳) ان صاحب کا حال باوجود جستجو معلوم نہ ہوسکا ۔ دہلی کے سب بزرگون نے لاعلمی ظاہر کی ۔

تیسرا باب

مومن کی شاعری

"اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء کا کلام رکھ کر
(بہ استثناء میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے
کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے
کلیات مومن دے دو۔ باقی سب اٹھا لے جاؤ"۔ (۱)

آج سے بتیس سال پہلے جب نیاز فتحپوری نے مذکورہ بالا الفاظ میں مومن کی ستائش کی تھی تو بعض اشخاص کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس مدت میں مومن پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف نقادوں نے مومن کی شاعری کے محاسن جس طرح واضح کئے ہیں ان کے پیش نظر نیاز کے اس مقولے میں چنداں مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔ نیاز سے پہلے انیسویں صدی کے سخن فہموں اور سخن سنجوں نے بھی قریب قریب یہی رائے کا اظہار ظاہر کی تھی لیکن چند وجوہ سے جن کا بیان کسی اور موقعے پر کیا جائے گا مومن کی ذاتی حیثیت اور فنی عظمت پر طرح طرح کے پردے ڈالے گئے۔ اس کے باوجود انیسویں صدی کے نصف آخر میں مومن کا دیوان مختلف مطبعوں سے دس بار شائع ہوا۔ (۲) مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اب یہ مطبوعہ نسخے بہ مشکل دستیاب ہوتے ہیں۔ مومن کی یہ مقبولیت کوئی نئی چیز نہیں آج سے ایک صدی پہلے بھی مومن کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے

---

(۱) نگار ۔ مومن نمبر ۱۹۲۸ء

(۲) اس کی تفصیل تصانیف مومن کے ذیل میں آئے گی ۔

معاصر نقاد انھیں تمام ہمعصر شعراء پر ترجیح دیتے تھے ۔ شیفتہ نے ان کے متعلق گلشن بے خار میں جو رائے دی ہے[1] ممکن ہے کہ اسے اتحاد پرمحمول سمجھا جائے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باقی سخن شناس بھی اس معاملے میں کم و بیش یہی رائے رکھتے ہیں تو مومن کی شاعرانہ عظمت میں شبہ نہیں رہتا ۔ یہ تمام حضرات جن میں سے بعض ان کے معاصر ہیں پچھلی صدی کے مروجہ انداز تنقید میں ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں ۔ نقد و نظر کا یہ انداز اگرچہ کسی شاعر کے فن کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہے تاہم تعریفی الفاظ کا سیلاب جو ان کے قلم سے ابلتا ہے صاف ظاہر کرتا ہے کہ مومن کو اپنے دور میں کتنی مقبولیت حاصل تھی اور صاحب ذوق اشخاص ان کے کلام کو کس نظر سے دیکھتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ غالب نے ان کے ایک شعر پر اپنا دیوان قربان کر دینے کی پیش کش کی تھی ۔ اس روایت میں خواہ کتنا ہی مبالغہ ہو مگر اتنا مسلّم ہے کہ غالب کے ذہن پر مومن کے فن اور ان کی شخصیت کا اثر بہت شدید تھا ۔[2] اس خیال کو مزید تقویت اس لحاظ سے بھی ملتی ہے کہ وہی مرزا نوشہ غالب جو اپنے سوبرآوردہ حریف ذوق کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے ہمیشہ مومن کی عظمت کے قائل رہے اور انھیں ہر موقع پر اچھے الفاظ سے یاد کیا ۔

ظاہر ہے کہ جب غالب اپنے باکمال معاصر کا اتنا احترام کرتے تھے تو دوسرے اشخاص کی ان کے متعلق کیا رائے ہوگی ۔ ان میں سے بعض کی آراء کا اقتباس پیش کرنا مناسب ہے تاکہ ان کی روشنی میں مومن کے فن کا تجزیہ کیا جا سکے ۔ مرزا قادر بخش صاحب گلستان سخن نے مومن کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ ان کی رائے ہیں :

---

(۱) گلشن بے خار ص ۱۹۵ (۲) مختار الدین احمد آرزو ۔ احوال غالب ص ۲۸

" چونکه یه والا نگاه اپنی همت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا ہر سہل اس کو پست اور ہر بزرگ اس کو خرد نظر آتا اور وہ بے تکلف اس کا نام اسی پندار کے موافق زبان پر لاتا ۔ کوتاہ بینان روزگار اس کی والا نگاہی اور علوّ همت سے آگاہ نہ تھے اس کی نگاہ کو عیب بین اور زبان کو خردہ گیر تصور کرکے طومار شکوہ دراز کرتے ۔ ہرچند زبان اردو میں تو طرہ یکتائی بلند ہی تھا لیکن کمال مہارت فارسی سے .... بلبل شیراز کو دم بخود کردیا "(١)

مرزا قادر بخش کی تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مومن کے کمالات کے پیش نظر ان کی خود بینی کو چنداں قابل اعتراض نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے کمال کا مقتضا تصور کرتے تھے کریم الدین بھی اپنے تذکرے میں انھیں تمام معاصروں پر ترجیح دیتے اور جملہ اصناف سخن میں انھیں ممتاز سمجھتے ہیں :

" فنون نظمیہ کے باب میں خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے استاد شاہ نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے ۔ شعر ان کا بہت اچھا ہوتا ہے ۔ "(٢)

نواب مصطفے خان شیفتہ ان کے عزیز شاگرد بلکہ ہمدم و ہمراز دوست ہیں ۔ ان کی تعریف سند نہیں تاہم اس لحاظ سے کہ ان کے الفاظ جوش عقیدت کے باوجود دوسرے تذکرہ نویسوں کے بیان سے ہم آہنگ ہیں یہاں بجنسہ درج کئے جاتے ہیں :

" بے بہا لعل کان سخندانی یکدانہ گہر دریائے معانی فرمان فرمائے اقلیم سخن پایہ بلند ساز این فن بہ دور آور ساغر بادۂ بے غش نواگر نغمہ ہای دلپسند پرو

(١) گلستان سخن ص ٢٢٣   (٢) کریم الدین ۔ تذکرۃ الشعراء ص ٢٢٣

دلکش، مہر سپہر نکتہ دانی، واقف سیر آسمانی، شاعر حکمت پرور، حکیم سخن گستر فرید عصر، یکتائے دوران، جامع فنون شتّیٰ، حکیم محمد مومن خان مومن "(1)

لیکن اتنی تعریف و توصیف سے شیفتہ کا دل نہیں بھرتا ۔ اس کے بعد عربی کے دو تین جملوں میں ان کی استعداد اور بے نظیر ملکۂ شاعری کا بیان کرکے لکھتے ہیں کہ " جو لوگ علامہ دھر اور امام فن سمجھے جاتے تھے آج کل وہ بھی مومن کے سامنے اپنی کم مائگی کا اعتراف کرتے ہیں ۔ میری رائے میں ان جیسا شاعر قادرالکلام پیدا نہیں ہوا ۔ کسی کو ایک صنف سخن میں وہ مہارت حاصل نہیں ہوتی جو انہیں تمام اصناف سخن میں میسر ہے ۔"

سرسید احمد خان آثار الصنادید میں جہاں دھلی کے باکمال شعرا کا حال لکھتے ہیں مومن کا تذکرہ اس ولولے سے کرتے ہیں کہ شیفتہ کے بیان کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے ۔ سرسید جذباتی آدمی نہ تھے ۔ ان کا بیان ایک مورخ کی طرح احتیاط و اعتدال کا پہلو لئے ہوئے ہے ۔ اس کے باوجود وہ مختلف اصناف سخن میں انہیں بے عدیل قرار دیتے ہیں اور ان کے بے اندازہ کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" زنگ زدائے آئینۂ سخندانی، صقیل مرآۃ نکتہ دانی، جلوہ دہ عرائس مضامین تازہ، زیب و سادۂ کمالات بے اندازہ، سرمست نشۂ سخنوری، نظر باز شاھد معنی پروری ...، یگانۂ جہان مومن خان مومن ۔ ان کے کمالات کا اندازہ ظرف شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیروں ہے .... سخن گوئی کہ بحد اعجاز پہنچایا اور شعر نے ان سے مرتبہ حکمت کا پایا ۔ نکات سخن اور دقائق فن ان کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے باران .. لطافت ان کی

(1) گلشن بیخار ص ١٩٥

طبیعت اور فروغ ان کے ضمیر میں ایسی ہے جیسے آئینے میں صفا ۔ ابیات ان کی خل بیت ابرو سراپا انتخاب اور اشعار ان کے مانند مصرع زلف مجموعۂ آب وتاب ۰۰۰۰ اگر یہ کہا جائے کہ شیرینی زبان حافظ، نمک سخن سعدی، متانت تراکیب اور نشست الفاظ خاقانی، ربط عبارت ابوالفضل ہندی، تازگی مضامین کمال اصفہانی اور سوا اس کے جو خوبی صنف شعرا میں کسی کے ساتھ مخصوص ہے ان کے کلام بلاغت نظام میں صرف ہے تو حق شناسی اور مرتبہ دانی سے نہایت دور از کار ہے ۔" (۱)

کلیات مومن (اردو) کے دیباچے میں بھی شیفتہ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مومن کی بعض خصوصیات کے اشارے موجود ہیں :۔

" طرز گزین، روش متین، الفاظ شگفتہ و دلپسند، تنومندی معانی تازہ و بلند، چستی تراکیب، شوکت کلمات، تنومندی اندیشہ، نزاکت خیال، رشاقت مضمون، حسن ادا وقف فکرت اوست ۔ ناظورۂ اندیشہ اش از لباس عاریتی ہمہ تن عور است و بہ تقاضائے یکسانی از متاع دست فرسودۂ روزگار نفور ۰۰۰ دو شیزہ ہائے فکرتش زہر گونا گون صنائع آراستہ چنان بے تکلف کہ گوش گوشندہ را بہ لفظ پیرائی سرے نبودہ تنہا آرائش صورت معنی در نظر داشتہ ۔" (۲)

عبدالغفور خان نسّاخ بھی ان کے معاصر ہیں ۔ غالب نے نسّاخ کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سخن فہمی میں اچھا مقام رکھتے تھے ۔ یہ مومن کے دیکھنے والے ہیں دلّی کی محفلوں میں انہوں نے مومن کے متعلق جو کچھ سنا اور مختلف وجوہ سے ان کی برتری کے متعلق

---

(۱) آثار الصنادید ص ۱۰٦

(۲) دیباچۂ کلیات اردو نولکشور پریس ص ۲

جو رائے قائم کی اس کا خلاصہ یہ ہے :-

"اشعار ان کے پر مضمون شیرین و عاشقانہ و نگین ہوتے ہیں ، راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں نہیں گزرا" ۔(۱)

نواب صدیق حسن نے مومن کو نہیں دیکھا ۔ جن دنوں وہ دہلی میں طلب علم کے لئے آئے مومن کا انتقال ہوچکا تھا ۔ تاہم انہوں نے اپنے تذکرے میں جو الفاظ تحریر کئے ہیں ان سے مومن کے فن پر روشنی پڑتی ہے :

"شاعر قابل بود ... ہمیشہ پریزادان معانی بہ دام بیانی صید می کرد و سخن در فارسی و ریختہ ہردو می سرائید ۔ از شعراء نامور شاہجہان آباد و صاحبان استعداد خداداد است" ۔(۲)

اس سے ملتی جلتی رائے ان کے بیٹے علی حسن کی ہے جو اپنی تالیف میں مومن کے اشعار کو سحر سامری سے مثال دیتے اور ان کے فارسی خطوط کو سرمایۂ بلاغت کہتے ہیں ۔(۳) اسی خاندان کے ایک اور فرد یعنی صاحب طور کلیم مومن کی قادرالکلامی اور بے مثال سخن سرائی کے یوں معترف ہیں :

"بر جمیع اصناف سخن قادر و از لطائف شعر و شاعری کما حقہ ماہر ۔ بہ قوت سخنوری او کمتر کسے برخاستہ" ۔(۴)

---

(۱) سخن شعراء ص ۲٦۷

(۲) شمع انجمن ص ۴۴۸

(۳) بزم سخن ص ۱۰٦

(۴) نورالحسن ۔ طور کلیم ص ۲۲٦

بعد کی
ان تمام اقتباسات سے نیز ان تنقیدوں سے (عبدالسلام عبدالحی رام بابو صغیر اثر نیاز) بہ آسانی
یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مومن کی مقبولیت انیسویں صدی کے آغاز سے آج تک برابر قائم
رہی ہے ۔ غالب کے برعکس جنھیں تقریباً ساری عمر اکثر ناقدوں کے اعتراضات کا ہدف بننا
پڑا اور جنھیں مرزا یگانہ چنگیزی نے اس صدی کے ربع دوم میں بھی مخالفانہ تنقید کا نشانہ بنایا
مومن آج تک عوام و خواص میں مقبول ہیں ۔ ذوق کو اپنے زمانے میں بے شک قبول عام حاصل ہوا
لیکن ان کا کلام جو اس عہد میں محض لطف بیان اور خوبی محاورہ کی بدولت پسند کیا جاتا تھا
شعلۂ مستعجل کی طرح اپنی دلآویزی کھو بیٹھا ۔ اب ذوق کے اشعار پڑھ کر سر دھننے والے بہت
کم ہیں ۔ مومن اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کا کلام تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برابر
یکساں مقبول چلا آتا ہے ۔ شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن' کی حسرت آمیز شکایت
غالب کو عمر بھر رہی مگر مومن کو اس معاملے میں زحمت کش انتظار نہیں ہونا پڑا ۔ وہ اپنے زمانے
میں محفل شعر کے صدر نشین تھے اور آج تک بزم تغزل میں ان کا مقام امتیازی ہے ۔ انھیں
شیفتہ وحشت قلق اور اصغر علی خان نسیم جیسے شاگرد ملے جنھوں نے استاد کے مخصوص انداز
شعر کو قائم رکھا ۔ مومن کے تغزل کی روایت انھی اشخاص کے ذریعے قائم ہوئی اور آج تک تسلیم
وحسرت موہانی مرحوم کے واسطے سے زندہ ہے ۔ اسی روایت کا کچھ ورثہ اصغر گونڈوی کو ملا
اور ان سے جگر مرحوم تک پہنچا ۔ مناسب ہے کہ ان خصوصیات کا جائزہ لیا جائے جو مومن کا
امتیازی وصف سمجھی جاتی ہیں جن پر ان کی شہرت کا دارومدار ہے اور جن سے ان کے فن کو
حیات جاوداں ملی ہے ۔

مثنوی اور قصیدہ مشکل اصناف سخن ہیں اور انھیں کسی شاعر کی قوت طبع اور قدرت بیان

کی پرکھ کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اس اعتبار سے کہ ان دونوں اصناف مین بیان مسلسل اور موضوع واحد ہوتا ہے ان کے اشعار عام محفلوں یا عوامی مواقع پر بہت کم پڑھے جاتے ہین ۔ غزل کا تنوع جسے بعض نقاد انتشار سے تعبیر کرکے اسے ایک نیم وحشی صنف سخن قرار دیتے ہین یہ گنجائش رکھتا ہے کہ اس کے اشعار کو اکثر مواقع پر زینت کلام یا اظہار جذبات کے لئے پڑھا جاسکے ۔ یہی وجہ ہے کہ کنگسناتے غزل کا ظرف مختصر ہونے کے باوجود ہمارے بیشتر احساسات کی ترجمانی کرتا ہے ۔[1] اور اسی لئے غزل مقبول ترین صنف سخن ہے ۔ مومن کے قصائد اور مثنویان اپنی اپنی جگہ لاجواب ہین اور ان کے محاسن سے متعلق حصے مین بحث کی جاتی ہے ۔ یہان مومن کی غزل کے اوصاف خصوصی کا بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کی شہرت کا دارومدار بالعموم غزل پر ہے ۔

کشور غزل مین میر کی تاجداری مسلم ہے ۔ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک جتنے غزل گو شعراء گزرے ہین ان سب مین میر کی سی عظمت والی شخصیت اور کوئی نظر نہین آتی ۔ وہ اپنے مخصوص ملائم لہجے تکلمی انداز بیان سوز و گداز اور فرقت نصیب دل کی ترجمانی سے ایک ایسی تاثیر پیدا کرتے ہین کہ ان کے اشعار بے ساختہ دل کو کھینچتے ہین ۔ ایک ایسے دور مین بھی جب سودا درد قائم اور اثر جیسے باکمال اشخاص دلّی مین موجود تھے ان کی عظمت تسلیم کی جاتی تھی ۔ ان کا کلام جو صنائع و بدائع کی آرائش سے بے نیاز ایہام سے پاک معاملہ بندی سے مبرّا ہے بے اختیار دل مین اترتا محسوس ہوتا ہے ۔ کلیات میر مین بہتر نہین پر شمار نشتر ہین ۔ ان کے اشعار مین سارے عالم پر چھا جانے کی ایک ایسی کیفیت ہے جس

(١) غزل جس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے مختصر خیالات کے اظہار کے لئے نہایت موزون ہے اردو مین مہذب گفتگو کی آرائش غزل کے اشعار سے ہے " امرناتھ جھا ۔ مقدمہ پرجرامپرص ٩٧

کا تجزیہ مشکل نہیں تو چنداں آسان بھی نہیں ۔ یہ کہنا سہل ہے کہ میر کی عظمت کا راز
ان کی اس سادہ پرکاری میں پنہاں ہے جس سے وہ جذبات نگاری کا حق ادا کرتے ہیں ۔ مگر
جذبات نگاری تو کم و بیش سب شاعروں نے کی ہے ۔ بایں ہمہ غزل کے میدان میں کسی اور شخص کو
یہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔ دراصل میر کے ساز غزل میں جو چیز کلیدی سُر یا Key Note
کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کے فراق زدہ دل کی پر خلوص انفرادی آواز ہے ۔ میر کے کلیات میں
ادنیٰ سے ادنیٰ شعر میں بھی غم نصیب دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں ۔ وہ شعر کو
دل کی داستان کا پردہ بناتے ہیں مگر یہ پردہ اتنا دبیز نہیں کہ ان کے قلبی حزن و ملال کی
آواز کو چھپا سکے ۔ جس طرح غالب کا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے(۱) اسی طرح میر کا ہر حرف
شکستہ قیمت دل کی صدا ہے ۔ میر کی غمناکی شور انگیزی اور یہ مخصوص شورش جو ان کے دیوانوں
میں قیامت کا سا ہنگامہ برپا کئے ہوئے ہے ان کے محزون و مضطرب قلب کی صدائے بازگشت ہے جسے
انھوں نے بڑے خلوص اور سچائی سے بیان کیا ہے ۔

مشرق کے اکثر شعراء کی طرح ہمیں میر کے حالات زندگی بھی بہت کم معلوم ہیں ان کے
کلیات، ذکر میر اور مثنویوں سے ذاتی حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے ۔ ذکر میر میں انھوں نے
اپنی اس بیخودی اور ازخود رفتگی کا حال ضرور لکھا ہے جو اکبر آباد سے نکلنے کے بعد ایک مدت
تک ان کے دل پر طاری رہی تھی تاہم ان تمام چیزوں سے صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ میر کے دل
پر نوجوانی میں کیا گزری تھی اور وہ کون ماہ پیکر تھی جس کے فراق نے ان کو ساری عمر محزون و
غمناک رکھا ۔ میر ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جو معرفت و سلوک کی راہ پر گامزن تھا ۔(۲)

(۱) گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے ۔

(۲) ذکر میر ص ۲۸

ان کے مزاج میں عزلت گزینی خاموشی اور اخفاء کا میلان فطری تھا ـ غالبا" انھوں نے اپنے دل کی کہانی لفظ بہ لفظ کسی کو نہیں سنائی ـ شاید انھیں کوئی محرم راز اور دلسوز رفیق ساری عمر نہیں ملا اور ان کی داستان الفت نہ گفتہ ہی رہی ـ کسی تذکرے سے بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ انھوں نے کس دلربا کے ساتھ عشق کیا تھا ـ البتہ صاحب بہار بے خزاں نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے اور صاف لکھا ہے کہ :-

" بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود دربردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت ـ آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بہ چار سوئے رسوائی زند .... از تنگ انشائے راز با دلے بغل پرورد، حسرت و حرمان و با خاطر ناشاد دست و گریبان قطع رشتۂ حبّ وطن ساختہ .... و بعد از خانہ برانداز ی ہا بہ شہر لکھنؤ رسید و بہ ہمین جا بہ صد حسرت جانکاہ ..... جان بہ جان آفرین سپرد ـ تا بہ قید رشتۂ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت ـ از کلام عاشقانہ اش پیداست کہ صد آرزو بخاک بردہ" (1)

اگرچہ اس بیان کی تائید کسی اور تذکرہ نویس نے نہیں کی لیکن خود میر کا کلام اس کی تصدیق کرتا ہے ـ ان کے اشعار جو سر تیز نشتروں کی طرح دل میں گڑھتے ہیں کہے دیتے ہیں کہ میر نے نوجوانی میں کسی ایسی ماہ طلعت کو دل دیا تھا جس کے فراق کی کسک مرتے مرتے ان کے دل سے نہ نکلی ـ جوانی کے بعد کہولت اور کہولت کے بعد پیری کی منزل آئی مگر وہ زخم جو شاعر کے دل پر نوجوانی میں لگا تھا کبھی مندمل نہ ہوا ـ مندرجہ ذیل اشعار صاف اشارہ کرتے ہیں کہ

---

(1) بہار بے خزاں ص ۲۱۸

پڑھاپے نے بھی اس زخم پر مرہم کافور کا کام کرنے کے بجائے اس کاوش و کاہش مین کچھ اضافہ ہی کیا جو حساس شاعر کو عہد شباب مین لاحق ہوئی تھی :

کار دل اس مہ تمام سے ہے　　کاہش اک روز مجھ کو شام سے ہے

شمع سان جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے　　رشتۂ الفت تمامی عمر گردن مین رہا

دل بہم پہونچا بدن مین تب سے سارا تن جلا — آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا
بدر سان اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ — ورنہ پہلے تھا مرا جون ماہ نو دامن جلا

الغرض میر کی غزل مین جو نشترون کی سی کھٹک محسوس ہوتی ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے بیان مین صداقت و خلوص ہے — وہ واردات عشق کہتے وقت سنے سنائے واقعات نظم نہین کرتے بلکہ اس کیفیت کا بیان کرتے ہین جو ان کے دل نے محسوس کی ہے — وہ کیفیات عشق مین اس قدر محو ہین کہ دوسرون کے واقعات سننے سنانے کا انھین ہوش ہی نہین — وہ تو اپنے اس دل کی سرگزشت سناتے ہین جس کے اوج و موج کا آشوب زمین سے فلک تک ہے اور جس سے انھین ہر لحظہ غم کے پیغام آتے رہتے ہین — کلیات میر پڑھتے وقت ہم ان کی قوت بیان یا کمال شعری سے متاثر نہین ہوتے بلکہ ان کے خلوص جذبات اور انفرادی طرز کلام سے مسحور ہوتے ہین جس مین شاعر نے اپنی دلی کیفیت بے کم و کاست بیان کی ہے اور جس مین اس کے ناصبور دل کی دھڑکنین اس شدت سے سنائی دیتی ہین کہ ان کے ارتعاشات مدتون محسوس ہوتے رہتے ہین — یہ وہ خصوصیت ہے جس کی گیرائی ہم آج بھی اسی طرح محسوس کرتے ہین جس طرح آج سے سوا دو ہزار سال پہلے بعض مغربی نقادون نے محسوس کی تھی —[1]

(۱) ارسطو — بوطیقا مترجمہ عزیز احمد ص ٦۲

مومن کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مومن کی خصوصیات لکھتے ہوئے ان کی رنگین معاملہ بندی جدت تراکیب خوبی حذف و ایجاز ندرت تشبیہ و استعارہ انداز بیان کے بانکپن کی طرف اشارہ کرتے ہین۔ اصلی بات صرف یہ ہے کہ میر کی طرح مومن بھی کامل خلوص کے ساتھ اپنے دل کی سرگزشت سناتے ہین۔ اس دل کی جو چالیس سال تک دلی کے حسینون کی زلف دوتا کا اسیر رہا اور جس نے کسی ایک زلف کا پابند نہ ہونے کے باوجود حسن سے پیمان وفا باندھنے کو اپنا شعار بنایا۔ مومن کی غزل اسی عشق پیشہ دل کی داستان ہے۔ یہ کہانی سناتے وقت شاعر کے لہجے مین جو منفرد رنگ پیدا ہوتا اور اس کے بیان مین صداقت و خلوص کی جو لہر جاری و ساری رہتی ہے اس کی تاثیر سات پردون مین بھی نہین چھپتی۔ مومن کا انداز بیان فارسی کے ان شعرا سے ملتا ہے جو واردات و کیفیات عشق کو رچے ہوئے طریقے سے بیان کرنے کے لئے مشہور ہین۔ مومن کے کلام مین فغانی، بیلی، ولی دشت بیاضی، عرفی اور نظیری کی جھلک نمایان ہے۔ اردو کے اساتذہ مین وہ اپنے خلوص بیان اور صداقت اظہار مین میر تقی میر سے متاثر ہین اگرچہ ان کی راہ مختلف ہے۔ میر کی طرح مومن بھی جگ بیتی کی بجائے آپ بیتی سناتے ہین۔ ان کی داستان کا یہ ذاتی آہنگ ہی ان کی خصوصیت ہے جو ان کے دلفریب انداز بیان اور چند دیگر جزوی اوصاف کے ساتھ مل کر ان کا مخصوص رنگ تغزل بن جاتا ہے۔

یہان یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ مومن سے پہلے اور مومن سے بعد چند ایسے شاعر ہوئے ہین جن کے انداز بیان مین یہی انفرادی خصوصیت اوریہی ذاتی آہنگ موجود ہے۔ مثلاً میر جو اپنی داستان عشق نہایت خلوص سے پیش کرتے ہین۔ قائم جس نے دل کی سرگزشت بڑے لمناک لہجے مین بیان کی ہے۔ جرأت جن کے اشعار کو چوما چاٹی کہنے کے باوجود ان[1]

(۱) آب حیات ص ۲۳۸

کی انفرادیت سے انکار ممکن نہیں ۔ غالب جو میرزا منش ہونے اور طبقاتی احساس برتری رکھنے کے باوصف خلوص بیان کا جوہر رکھتے ہیں داغ جس کی غزل محبوب کے ساتھ سینہ زوری طرّاری چھین جھپٹ اور لاگ ڈانٹ کی نمائندہ سہی تاہم ایک مخصوص انداز رکھتی ہے ۔ پھر آخر مومن کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جو ان کے رنگ تغزل کو ان تمام شعراء سے ممتاز کرتی ہیں اور جن کا جائزہ لینے کے بعد ہم مومن کو ان کے مخصوص انداز سے صاف پہچان سکیں ۔

ظاہر ہے کہ میر ہوں یا قائم و جرأت ۔ ہر شخص کا اسلوب جداگانہ ہے ۔ مشق و مزاولت اور مطالعۂ کلام سے مختلف اساتذہ کے رنگ کا صحیح اندازہ کرلینا ممکن ہے ۔ میر کی غزل درد بھرے دل کی آواز ہے جس سے غمناک یادوں اور احساس محرومی کی گونج رہ رہ کر اٹھتی ہے ۔ لیکن وہ اپنے مخصوص انداز فکر سے غم کو ہمارے لئے محبوب و مرغوب بناکر ایک ایسی فضا پیدا کردیتے ہیں جہاں رنج و راحت کی حدیں باہم مل جاتی ہیں ۔ وہ غم و رنج یاس و نامرادی اور ناکامی و محرومی کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ ہمیں ان کی عالی ہمتی سے بعض اوقات ان کے فوق البشر ہونے کا گمان ہوتا ہے ۔ وہ غم پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہیں بلکہ خود مرگ و حیات کو ایسی بے دماغی اور غلط انداز نگاہ بے نیازی سے دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ہمارے سامنے ہیچ ہوکر رہ جاتی ہیں ۔

یہ جو مہلت جسے کہے ہیں عمر　　دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

ہم بھی پھرتے ہیں اک حشم لے کر　　دستۂ داغ و فوج غم لے کر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

عشق کا گھر ہے میر سے آباد   ایسے پھر خانمان خراب کہاں

انھون نہ خاک سے کشتہ مین کم نگاہی کا   دماغ کس کو ہے محشر کی دادخواہی کا

غرض میر کو پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم ایک عام انسان کے بجائے کسی عظیم دیوپیکر شخصیت کے سامنے کھڑے ہین جو رنج و راحت کامرانی و ناکامی کو بے نیازی سے دیکھتا ہواگزر جاتا ہے ۔جس کی نظر مین غم مقصود بالذات نہین بلکہ منازل حیات مین سے ایک منزل ہے ۔ ان مواقع پر ہم میر کے ساتھ چلتے ہوئے جھجھکتے ہین ۔ اس کی یہ عظمت ہی کبھی کبھی ہمین اس سے الگ رہنے پر مجبور کرتی ہے ۔ میر کے بہترین اشعار وہی ہین جو اس نے عام انسانی سطح پر کھڑے ہوکر کہے ہین ۔جہان اس نے حسن کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھا ہے اور جہان اس نے غم کا بیان ایک عام انسان کی طرح کیا ہے ۔میر جب اس انسانی سطح سے بہت بلند ہوجاتے ہین یا جہان ان کی بے دماغی حد سے بڑھ کر بیزاری و ملال کی صورت اختیار کرلیتی ہے تو ہم ان کی اس تلخ نوائی سے اکتا جاتے ہین ۔ان کے بہترین اشعار وہی ہین جن مین غم عشق کا بیان اعتدال سے ہوا ہے اور جن مین حزن کا آہنگ زیادہ شدید یا مایوس کن نہین ہے ۔حسب ذیل اشعار میر کے فن کا عمدہ نمونہ ہین :-

صبح وہ کافر اٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس

کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکون کے سائے سائے گئے

شکوے شکوے کرنے کی بھی آخر اک حد ہوتی ہے

کشتے اس کی تیغ ستم کے گورتین کب لائے گئے

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے

کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق　　　جائے گا جان بھی یہ غم لے کر

میر صاحب ہی چوکے او بد عہد　　　تجھ کو دیتا تھا دل قسم لے کر

صبر تھا ایک مونس ہجران　　　سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار اس سے میر　　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

تیغ جفائے یار سے دل سر نہ کھینچو　　　پھر عہد وفا کو ہم سے دکھلایا نہ جائے گا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز ؟　　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو　　　ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

سادگی دیکھ عشق میں اس کے　　　حسرت جان شاد ہے ہم کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا　　　میر کا طور یاد ہے ہم کو

قائم میر کے معاصر ہیں اور اس پائے کے شاعر کہ بقول آزاد ان کے دیوان کو میر اور سودا سے نیچے رکھنے کو جی نہیں چاہتا(۱)۔ قائم نے بھی غزل میں غم عشق کا بیان کیا ہے مگر میر کے برعکس

---

(۱) آب حیات ص ۲۷۱

وہ غم سے اتنے دب گئے ہین کہ غم ان کے جذبات کا جزو ہونے کے بجائے ان پر چھا گیا ہے ۔
ان کا ہر شعر ناکامی و نامرادی اور رنج و غم کا مرقع ہے ۔ غم کا رنگ ان کے کلام مین اتنا گہرا ہے کہ
زندگی کے باقی تمام میلانات اس کے نیچے دب کر رہ گئے ہین ۔ مجنون گورکھپوری ان کی اس
مغلوبی کو سوگ کا آہنگ کہتے ہین ۔[1] قائم کے حسب ذیل اشعار مین سوگ کے اسی آہنگ کا
عکس ہے :-

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری مر چکے ہین اسی آزار مین بیمار بہت

ست ہون قائم ہوش کیا جانے کس تہی دست کا چراغ ہون مین

آہ اے چرخ ہسیر قائم نام یان جو رہتا تھا اک جوان ہے یاد ؟

لوٹنا خون مین گلستان کی طرح کہہ تو اے دل یہ ہے کہان کی طرح ؟

لے گیا خاک مین ہمراہ دل اپنا قائم شاید اس جنس کا یان کوئی خریدار نہ تھا

دامان گل چین ہے کہان دسترس مجھے ترغیب سیر باغ نہ کر اے ہوس مجھے

جرأت کی خصوصیات کو میر نیے ہر سر مشاعرہ دو لفظون مین بڑی خوبصورتی سے بیان کیا تھا ۔ یہ کہنا
کہ وہ معاملات حسن و عشق بیان کرتے وقت " اپنی کم علمی کے سبب بہت کھل گئے ہین "[2] ۔ ایک حد

(۱) تنقیدی حاشئے ص ۹۲

(۲) صفیر بلگرامی ۔ جلوۂ خضر ص ۲۲۱

تاک جھانک صحیح ہے لیکن اس کھل جانے کا ذمہ دار جرأت کا حسب نسب اور وہ انحطاط پذیر معاشرہ بھی ہے جس میں وہ امراء کے زنان خانوں تک بارپاب ہوکر تاک جھانک کے مزے لیتے تھے ۔ یہی وہ عوامل ہیں جو ان کی غزل کو حسن رکھ رکھاؤ اور معتدل انداز بیان سے شاکر عریانی و ابتذال کے کوچے میں لے جاتے ہیں ۔ تلذذ کی یہی بڑھی ہوئی لے انہیں صحیح تغزل کی حدود سے خارج کرتی ہے ۔ اور انہیں شیفتہ کی زبان سے " نغمہ ہائے خارج از آہنگ "(1) کا طعنہ دلواتی ہے ۔ یہاں جرأت یا کسی اور شاعر کے محاسن و معائب سے بحث کرنا مقصود نہیں ۔ کہنا صرف یہ ہے کہ مختلف میلانات انسان کے مزاج پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ اس کا طرز فکر اور طرز گفتار ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتا ہے ۔ جرأت کے ہاں ہر رنگ کے اشعار ملیں گے مگر ان کے پڑھنے سے جو مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے وہ بے چھپی رنگ ابھری ہوئی گات اور حسن کی ان صفات پر مشتمل ہے جو تلذذ پرستی کی حدود میں داخل ہوکر غزل کو امانت کا سراپا بنادیتی ہیں ۔

غالب آزادہ رو کے کلام میں بھی غم عشق کی کسک موجود ہے ۔ انہوں نے بھی جوانی میں کسی کو دل دیا تھا اور اس غم کا تجربہ کیا تھا جو رگ سنگ سے لہو بن کر ٹپکتا ہے ۔ ہایں ہمہ وہ جس طبقے اور جس خاندان کے فرد تھے اس کا رکھ رکھاؤ انہیں عریانی ابتذال اور برہنہ گوئی سے محفوظ رکھتا ہے ۔ اگرچہ ان کے ساز غزل سے کبھی کبھی ڈھول دھتے کی آواز بھی آجاتی ہے ۔

---

(۱) گلشن بے خار ص ۸۸

مثلاً جرأت ؎ آپ میں رہا اس وقت میں زرا   جوں لب سے لب اور اس کے بدن سے بدن لگا

یاد کیا آتا ہے میرا وہ لگے جانا اور آہ   پیچھے مڑ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائے گا

تاہم وہ طبقاتی احساس برتری کے باعث اپنے آپ کو بہت لئے ہوئے چلتے ہیں ۔ پاس وضع کا حجاب انہیں رہتا ہے اور اگر وہ کبھی محبوب سے آزردہ ہوکر کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں تو یہ ان کا انداز جنون نہیں بلکہ فی الواقع وہ تکلف ہے جو طبقاتی برتری کے احساس نے ان کے خون میں سمو دیا تھا ۔ محبوب سے غالب کا انداز خطاب میر اور جرأت کی طرح عاجزی کا نہیں بلکہ ہمسری کا لہجہ رکھتا ہے ۔ خاندانی ریاست اور درباری آداب دانی نے اس ادعائے ہمسری کو بھی شائستگی کے رنگ میں رنگا ہے ۔ وہ محبوب سے خطاب کرتے وقت نہ عاجزی و انقیادگی اختیار کرتے ہیں اور نہ اس شوخ چشمی و طراری سے کام لیتے ہیں جو آگے چل کر داغ کا شیوہ بنی ۔ غالب غم کا بیان کرتے ہوں یا محبوب سے مخاطب ہوں ان کے اطوار میں ایک سنجیدہ شائستگی ہوتی ہے ۔ ان کا احتجاج اور طنز بھی ایک متوازن انداز رکھتا ہے جس میں جنگ و جدال کے بجائے معقولیت کا پہلو نمایاں ہے :

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا ۔۔۔ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ۔۔۔ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار ۔۔۔ یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیون ہو غیر کے ملنے مین رسوائی

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہان کیون ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہین

عدو کے ہو چکے جب تم تو میرا امتحان کیون ہو

وفا کیسی کہان کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیون ہو۔

داغ بھی ذاتی خصوصیات کے سبب بہ آسانی پہچانے جاتے ہین ۔وہ محبوب کے ساتھ نیازمندی کے قائل نہین ۔ انیسوین صدی کا یہ نواب زادہ محبوب کا غلام بن جانے کے بجائے اس کے ساتھ حریفانہ کشمکش چھین جھپٹ نوک چوک ہولی ٹھولی اور مقابلہ و مجادلہ کا قائل ہے ۔جرأت کی طرح داغ کا معشوق بھی بازاری ہے اور اس کے ساتھ ان دونون شاعرون کا سلوک قطعی فطری ہے ۔داغ کے یہ اشعار اس کے مخصوص انداز کلام کی نمائندگی کرتے ہین ۔

ادھر آ کلیجے سے ~~لگا لون~~ تجھ کو	تجھی پر تو دل آگیا ہے کسی کا
اس نے صبح شب وصال مجھے	جاتے جاتے بھی آکے دیکھ لیا
وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار	اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج
یہ شوق یہ ارمان یہ حسرت یہ تمنا	کیا ہو مرے قابو مین تم آجاؤ اگر آج

تھی کل سے تلاش ان کی مرے قتل پہ اے داغ ۔نکلے وہ خوادار بنے غیر کے گھر آج

بات کیسی وہ کبھی سامنے آتے بھی نہین	چاند سے منہ کی جھلک ہم کو دکھاتے بھی نہین
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہین	صاف چھپتے بھی نہین سامنے آتے بھی نہین

کیا کہا پھر تو کہو " ہم نہیں سنتے تیری " نہیں سنتے تو ہم ایسوں کو سنانے بھی نہیں

مجھ سے اے غیر تری آنکھوں میں کھٹکتے ہی رہے تجھ سے نازک مری نظروں میں سمانے بھی نہیں

زیست سے تنگ ہو اے داغ تو کیوں جیتے ہو جان پیاری بھی نہیں جان سے جانے بھی نہیں

مختصر یہ کہ ہر صاحب طرز شاعر کا انداز اس کے مخصوص ماحول خاندانی میلانات ذاتی رجحانات اور بعض دوسرے عوامل کا ساختہ و پرورده ہوتا ہے ۔ اسی لئے اصول تنقید میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مصنف کی ذات اور اس کے ماحول وغیرہ کا گہرا مطالعہ کیا جائے ۔(1) مومن اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ۔ وہ ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو دربار رس نہ رہا تھا لیکن جاگیردار ضرور تھا، جس میں علوم و فنون کی روایت موجود تھی، جہاں خاندانی امارت نے احساس جمال اور لذت کوشی کے سامان ایک حد تک فراہم کر رکھے تھے ۔ مومن جیسا ذی علم آدمی جس کی نظر میں فارسی اور عربی ادب نیز معانی و بیان کے تمام نکات آئینہ تھے اظہار خیال کی محدود راہیں نکالنے پر قادر تھا ۔ علوم و فنون کا وقار اور آبائی امارت کا احساس انہیں جرأت کی طرح عریانی و ابتذال کی طرف جانے یا داغ کی طرح محبوب سے الجھنے کی اجازت نہ دیتا تھا ۔ انہوں نے اپنی محبت اور محبوب کو بازاری پستی سے اٹھا کر احترام و وقار کی اونچی سطح پر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی رنگین معاملہ بندی جرأت اور داغ کی وقوعہ گوئی سے کہیں زیادہ دلفریب ہے ۔(2) وہ میر یا درد کی طرح کسی خانوادۂ فقر و تصوف کے فرد نہ تھے جو غم کے ساتھ مفاہمت کر کے اسی کو سرمایۂ عیش بنا لیتے اور ساری عمر دست بر سر رہتے ۔ اس کے برعکس انہوں نے دنیا کی جائز

---

(1) ڈاکٹر محی الدین زور ۔ روح تنقید ص ۱۲٦

(2) عبد السلام ندوی ۔ شعر الہند حصہ اول ص ۲۲٦

اور ناجائز لذتوں سے حظ حاصل کیا۔ وہ غالب کی طرح رئیس زادے ضرور تھے لیکن بعض ذاتی میلانات کے زیر اثر ان میں حد سے بڑھا ہوا "حجاب پاس وضع" نہ تھا کہ محبوب سے سر راہ بات کرتے ہوئے جھجکتے۔ ان کے حالات زندگی میں بیان ہوچکا ہے کہ وہ کبھی سر راہ کبھی غرفے پر کبھی کسی محفل عروسی میں کبھی خود اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر مختلف حسینوں سے دو چار ہوتے رہے ہیں۔ راتوں کے سناٹے میں پچھلے پہر کے خاموش لمحوں میں بھری دوپہر میں شادی بیاہ کے ہنگاموں میں دوستوں کے گھروں کی خلوت میں اور خود اپنی حویلی کے بالاخانے پر انھوں نے ایک دو نہیں کم ازکم آٹھ دس پری پیکروں سے معاشقہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ گفت و شنید حرف و حکایت شکوہ شکایت ہم نشینی و ہم آغوشی وصل و کامرانی کے مزے لوٹے ہیں۔ انھیں حسن فروشوں سے ملنے میں بھی عار نہ تھا۔ ان کی محفلوں میں جاکر گانا سننا ان کے حسن کی اداؤں کو چشم محبت سے دیکھنا ~~خلوت نشین بنانا~~ اور ان کے مرنے پر درد ناک تاریخیں کہنا ان کا مشغلہ رہا ہے۔[1] بڑھے ہوئے احساس جمال نے انھیں چالیس سال کی عمر تک لذت کوشی کی طرف راغب رکھا۔ حافظ کی طرح جس نے شراب کو زندگی بنالیا تھا۔ ان کے لئے عشق عدم ناگزیر تھا۔[2] انھوں نے زندگی سے لذت کا آخری قطرہ تک نچوڑا اور نظیری عرفی اور شرف جہان قزوینی کی طرح انھوں نے حسن کی تمام ادائیں دیکھیں۔ بایں ہمہ مختلف علوم میں انہماک بالخصوص علم طب کی نظری اور علمی تکمیل کی بدولت انھوں نے اپنی جوانی و صحت کو قائم رکھا اور جذبات سے بھرپور زندگی بسر کی۔ مومن کو محرومی و ناکامی سے بہت کم واسطہ پڑا۔ وہ اکثر معاشقوں میں سلسلہ جنبانی اور گفت و شنید کے بعد اپنی مراد کو

---

(۱) دیوان فارسی ص ۱۲۰

(۲) اختر اورینوی۔ تنقید جدید ص ۱۲۰

مواقع پہنچے ہین اور ایسا اتفاق کمتر ہوا ہے کہ وہ دیر تک رشک یا نامرادی کی آگ مین جلتے رہے ہون ۔ ایک تندرست اور کامیاب آدمی کی طرح وہ نظربازی، رازونیاز، ہوس و کنار، وصل و فراق، شکوہ شکایت شکر رنجی، طعن و تشنیع، عتاب و خطاب کی منزلون سے گزرے ہین ۔ انھون نے یکے بعد دیگرے مختلف مزاج اور مختلف طبقون کے حسینون سے دل لگایا ہے ۔ ان سب باتون کے اثر سے ان کی غزل مین ایک مخصوص رچاؤ، معاملات کی بوقلمونی، واردات عشق کی گہما گہمی اور ایک خاص ذاتی انفرادی آہنگ کا اجتماع ہوگیا ہے جو دوسرے شعرا کے یہان کم ملتا ہے ۔ یہی رچاؤ رنگا رنگی اور البیلا پن مومن کی خصوصیت ہے ۔ اسی پر مومن کو ناز ہے اور اسی کو وہ اپنا فن کہتے ہین ۔

اردو مین غزل کی تمام روائتین فارسی سے آئی ہین ۔ اس طرح ہماری زبان کو ایران سے جو ادبی ورثہ ملا اس مین اچھائیون کے ساتھ بعض برائیان بھی موجود ہین ۔ فارسی غزل عاشقانہ گفتگو کے ساتھ دنیا کے اور بہت سے امور کو اپنے دامن مین سمیٹے ہوئے ہے ۔ فارسی کے تتبع مین اردو غزل بھی صرف عاشقانہ مضامین کا مجموعہ ہونے کے بجائے اخلاق، فلسفہ، تصوف، مدح و ذم وغیرہ کی معجون مرکب بن گئی ہے ۔ میر سے لے کر آج تک کے تمام غزل گو شعراء کے کلام مین کم و بیش یہ تمام مضامین موجود ہین جس سے ان کی غزل بارہ مسالے کی چاٹ بن کر رہ گئی ہے ۔ غالب جیسے صاحب ذوق بھی اس افراط و تفریط سے نہ بچ سکے اور غزل مین شاہ کے غسل صحت تک کی خبر سنا گئے ۔ وہ باکمال جو درباداری کی لعنت سے آزاد تھے اس معاملے مین کچھ بہتر رہے ۔ تاہم ان کے یہان بھی تصوف و اخلاق کے نکات جا بجا ملتے ہین ۔ بعض نے فلسفیانہ مضامین کو غزل اور قصیدون کی تشبیب مین داخل کیا ہے ۔ بعض کے ہان حکمت کے دقائق نظر آتے ہین ۔ خالص تغزل کا طالب ان سب باتون کو باغ تغزل کا خار سمجھتا اور ان سے اپنے دامن کو بچاتا ہے ۔ وہ غزل مین اپنے مطلب

کی چیز ڈھونڈھتا ہے اور نہیں پاتا ـ جو اساتذہ عشقیہ مضامین باندھنے کے لئے مشہور ہیں ـ ان کے ہاں بھی مختلف طبقوں کے امارد اور ان کے سبزۂ خط کی تفاصیل اس کثرت سے ملتی ہیں کہ طبیعت متنفر ہوجاتی ہے ـ ولی سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک سب اس غیر طبعی محبت کے فریب میں مبتلا ہیں ـ

ولی دکنی نے تو ایک پوری غزل " سرو باغ وفا امرت لال " کے نام پر قربان کردی ہے ـ میر مصحفی انشاء جرأت غرض بیشتر غزلگو حضرات حقیقی یا روایتی طور پر امارد سے اظہار عشق کرتے ہیں ـ بعض اساتذہ جن کے مزاج میں احتیاط زیادہ ہے ایسے الفاظ و افعال استعمال کرتے ہیں جس سے محبوب کی جنس ظاہر نہیں ہونے پاتی ـ لکھنؤ کے اساتذہ یہ ستم کرتے ہیں کہ پری اور حور کے استعارے استعمال کرنے کے باوجود ان کے لئے افعال مذکر لاتے ہیں ـ غرض تغزل کے صحیح لغوی مفہوم کا سراغ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا ـ ایسی غزلیں جن میں ایک خیال مسلسل نظم ہوا ہو یا جن میں کسی ایک واردات قلبی کے تمام پہلو پیش کئے گئے ہوں اردو میں بہت کم ہیں ـ اسی طرح ایسی غزلیں بھی خال خال ہیں جن میں خالصتاً عشق کے مراحل و مقامات کا بیان ہو جو اخلاق تصوف یا فلسفے کے مباحث سے پاک ہوں اور جن کی یک آہنگی وحدت تاثر Unity of Impression کی ضامن ہو ـ

بعض حضرات جو صنف نازک سے اپنی رغبت کا صریحی اظہار کرنا چاہتے ہیں حقیقی محبوبہ کی صفات بیان کرنے کے بجائے ادنی درجے کی عورتوں کا سراپا اور انداز نظم کرنے پر قانع ہوجاتے ہیں مصحفی کی ستنی [1] جس کے انداز انھوں نے آدھی غزل میں لکھے ہیں نواب مرزا شوق کی کہاری [2]

(۱) آب حیات ـ ذکر مصحفی (۲) بہار عشق ـ مثنوی بیان واقعہ ہوتی ہے مگر ہماری مثنویوں میں ایسے نسوانی پیکر بہت کم نظر آتے ہیں جو نسوانی وقار کے نمائندے ہوں ـ میر اور مومن کی مثنویاں اس سے مستثنیٰ ہیں ـ

اور خانگی جو نہایت طرار ہین سب ادنیٰ طبقے کی عورتین ہین ۔ طبقاتی احساس نے متوسط درجے کی با عزت عورتون کو غزل مین نمایان کرنے سے گریز کیا ہے ۔ اساتذہ کے دیوان پڑھتے وقت کبھی کبھی یہ آرزو بہت شدت سے ہوتی ہے کہ ہم کسی ایسے نسوانی پیکر سے قریب ہون جو خاندان تعلیم و تربیت اور انداز فکر و خیال مین ہماری ہمسر ہو ۔ دیوانون کے صفحے الٹتے جائیے ۔ یہ آرزو بہت کم پوری ہوگی ۔ میر کے ضخیم کلیات مین بھی ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے جن مین صنف جمیل کے ان افراد کا سایہ نظر آئے جو معاشرتی یا ذہنی معیار پر آپ کے لئے قابل قبول ہون اور جن سے ذہنی طور پر قریب ہوکر ایک متوسط درجے کا قاری آسودہ ہوسکے ۔ اس آرزو کی تسکین کرنا ہو تو کلیات مومن کا مطالعہ کیجئے جس مین آپ جا بجا مختلف طبقون اور مختلف طبائع کے حسینون سے دوچار ہون گے ۔ ایک غزل مین کسی حیاپرور دوشیزہ کی ادائین نظر آئین گی تو دوسری مین کسی شوخ طرار نازنین کے دلنواز اندازطین گے ۔ ایک صفحے سے کسی نوخیز شی نویلی سے حرف و حکایت کی آواز سنائی دے گی دوسرے سے کسی کارآزمودہ شعلہ پیکر دلربا کے ساتھ گلے شکوے طعن و طنز اور "گلۂ ملامت اقربا" کی صدا آئے گی ۔ ان اوراق مین مہذب و عالی خاندان پردہ نشین خواتین کے دوش بہ دوش آپ مختلف طبقے کی ارباب نشاط بھی دیکھین گے ۔ شاعر کے معنی خیز الفاظ صاف اشارہ کرتے ہین کہ یہ ایک کمسن نوخیز مغنیہ ہے جو پہلی بار محفل رقص و سرود مین آئی ہے اور جو بیباک نوجوانون کی چبھتی ہوئی نگاہون سے سٹی جارہی ہے ۔ یہ ایک جہان دیدہ طوائف ہے جو بے تمیز گھورنے والون کو نگاہ گرم سے ڈانٹ دیتی ہے ۔ یہ ایک خوش اطوار ڈومنی ہے جو اپنے شوہر اور اہل خاندان کی پابند ہے ۔ یہ ایک خانگی ہے جو نئی جوانی کے تقاضون کے باوجود اپنے آپا سے بالکل منحرف ہوجانے پر تیار نہین ۔ غرض کلیات مومن مین کوئی مقام ایسا نہین جہان صنف

جمیل کا سایہ نہ پڑ رہا ہو۔)

(اردو غزل کی ایک اور خصوصیت اس کی رمزیت SYMBOLISM ہے۔ رمزیت ایک کارآمد چیز ہے جس سے اظہار و ابلاغ کے بے شمار راستے کھلتے ہیں)۔ انسان کچھ نہ کہنے پر بھی اس وسیلے کی مدد سے بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔ فارسی کی تقلید میں حسن و عشق کی ترجمانی کے لئے گل و بلبل اور شمع و پروانہ وغیرہ کی علامات اختیار کی گی ہیں۔ ان علامتوں نے شعراء کو درپردہ بہت کچھ کہہ جانے کی سہولت بخشی ہے۔ تاہم جس طرح استعارے کی حد سے بڑھی ہوئی نزاکت اسے باریکی سے تاریکی میں پھینک دیتی ہے اسی طرح (بعض اوقات لیکن رمزیت کا زیادہ استعمال حسن و عشق کے معاملات پر ایسے پردے ڈال دیتا ہے کہ واردات و کیفیات کہیں مبہم اور کہیں مشتبہ ہوجاتی ہیں۔ ایسے مقامات پر جی چاہتا ہے کہ دل کی داستان سیدھے سادے لفظوں میں سنی جاتے)۔ میر بر جو شعر کو سخن کا پردہ بنانے کے خوگر تھے رمزیت کو بڑی کامیابی سے برتا ہے تاہم بعض جگہ ان جیسے باکمال استاد کی سعی بھی چنداں مشکور نہیں ہوسکی۔ اس انداز کے اشعار پڑھ کر قاری خود بخود کہہ اٹھتا ہے کہ "یہ تغزل نہیں ہے۔ دل کی بات صاف الفاظ میں کہتے تو بہتر تھا" (مومن اگرچہ غزل کی قدیم روایت سے باغی نہیں تاہم انھوں نے بالعموم ان سہاروں اور وسیلوں سے قطع نظر کیا ہے جن کو ہمارے غزلگو شعراء آج تک برتتے چلے آرہے ہیں۔ واقعات عشق کی ترجمانی میں انھوں نے گل و بلبل شمع و پروانہ برق و آشیاں[1] کی علامتیں استعمال نہیں کیں۔ اس کے بجائے ان کے کلام میں واردات و کیفیات کا سیدھا سچا بیان ہے) وارستہ مزاج مومن دل کی بات کہتے وقت ان پردوں کو بیچ میں ڈالنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ یا شاید انھیں غیر شعوری طور پر یہ احساس تھا کہ رمزیت سے تغزل کی حقیقی روح کو نقصان پہنچتا ہے۔

[1] اگلا صفحہ دیکھئے

رچاؤ ان تمام نقائص سے جن کا بیان ہوا مومن کی غزل سراسر پاک ہے ان کے دیوان غزل کو اول سے آخر تک دیکھ جائیے غلط ابہام، بے معنی پردہ داری، الجھی ہوئی رمزیت، بے مزہ کنائے، امارد کا سبزۂ خط، تصوف و اخلاق کے نکتے، تار بستر کا سا ناتوان جسم رکھنے والا عاشق، مجروحی جاوید کا مارا ہوا مہجور جس کا دست کوتاہ کبھی سبو تک نہ پہنچا، غرض وہ تمام موضوع اور مضمون جنھیں تغزل کے لغوی اور حقیقی مفہوم سے کوئی تعلق نہیں نظر نہ آئیں گے۔ ان کے بجائے ایک تندرست و توانا انسان کا صحت مند جذبۂ عشق ملے گا جو دلی کی گلیوں میں شادی کی محفلوں میں اپنی حویلی کے کوٹھے اور دوسرے حسن خیز مقامات پر اپنے جذبۂ حسن پرستی کی تسکین کرتا ہے۔ مومن کے دیوان میں قدم قدم پر آپ کو صنف جمیل کے شائستہ حور پیکر مہر جمال افراد کے چہروں کا جلوہ نظر آئے گا جن کے نورانی مکھڑوں کی ضیا کاغذ کی سطح سے پھوٹی پڑتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ شاعر ان سے راز و نیاز اور حرف و حکایت میں مشغول ہے۔ باہم گلے شکوے ہو رہے ہیں۔ ملامت اغیار اور طعنۂ اغیار کا ذکر دونوں کی زبان پر ہے۔ بوس و کنار کی لذت اور ہجر و فراق کی تلخی کا بیان ہے۔ رشک، بدگمانی، ناکامی، سوز الفت، راز و نیاز، وصل و فراق، گلے شکوے، غرض ارضی الفت کے وہ تمام معاملات جو حسن و عشق کا سرمایہ ہیں مومن کی غزل میں یکجا (۲)

---

(۱) برق و آشیان کے استعارے دو چار جگہ اور طفل برہمن کا ذکر ایک بار ضرور آیا ہے مگر یہ الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔

(۲) مومن کا عشق خالص ارضی ہے۔ اسے نہ افلاطونی عشق کے نظریات سے دلچسپی ہے نہ عشق حقیقی کے رموز سے واسطہ۔ اس کی ساری کائنات عشق مجازی کی لذت اور کاہش ہے جس کا اعتراف وہ بیباکانہ کرتا ہے ؎

مومن بہشت و عشق حقیقی تمھیں نصیب   ہم کو تو رنج ہو جو غم جاودان نہ ہو

نظر آتے ہیں۔ ان معاملات کے اظہار میں عشق پیشہ شاعر کا بیان اتنا پرخلوص ہے کہ اسے ہر جگہ بہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔ خیال کی اس مرکزیت نے جو مومن کو حسن و عشق کے موضوع سے ایک قدم ہٹنے نہیں دیتی وہ رچاؤ اور البیلا انداز بخشا ہے جو غزل گوئی کی جان ہے اور جسے عرش گیاوی نے "قرآن ہے کہ دہقان بزورد" سے تعبیر کیا ہے۔(۱) رام بابو سکسینہ اسے صحیح جذبات نگاری کہتے ہیں۔(۲) حقیقت اس کی یہ ہے کہ گوناگوں تاثرات عشق یا پیہم دریچیدہ جذبات الفت کا اظہار ہے جسے مومن عاشق مزاج نے کامل خلوص کے ساتھ ادا کردیا ہے۔ سعدی اور میر کے برعکس جو مفرد خیالات کو انتہائی سادگی سے بیان کرتے ہیں مومن رنگ برنگ کے مرکب متنوع اور متعدد تاثرات کا نقاش ہے۔

یہ خصوصیت جو معاملات عشق کے واقعہ نگار شعرا کا ترکہ ہے اور جس کے مومن واحد وارث ہیں واردات و کیفیات الفت کی تہ در تہ آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں محبت کے جذبات، عشق کے واردات، فن کار کے بے پایاں خلوص اور وارفتہ مزاج عاشق کے شوقِ فراواں نے مل کر ایک ایسی کیفیت پیدا کردی ہے جس کی مثال اردو میں کیا دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے نظر آئے گی۔ مومن کے کلام میں جا بجا آپ کو ایسے اشعار ملیں گے جن میں عاشق صادق کی والہانہ شیفتگی و سپردگی اور تجربات و تاثرات نے مل جل کر شعر کو کہیں تیر و نشتر اور کہیں سحر و اعجاز بنادیا ہے۔ اس انداز کے جو اشعار ہیں ان میں واردات الفت کی تہ داری اور مخلوط و مربوط تاثرات کی کثرت ایک خوش

(۱) حیات مومن ص ۵٦ "میرزا صاحب تو کہنے سننے اپنی شراب میں گلاب ملالیتے تھے مگر مومن اپنی شے دو آتشہ میں پانی ملانا گناہ سمجھتے تھے۔"

(۲) تاریخ ادب اردو مترجم ص ۳۵۸ ذکر مومن

تراشیدہ الماس کے پہلوؤں کی طرح بہ یک وقت ہزاروں جلوے دکھا جاتی ہے یہی وہ خصوصیات میں جن پر دبستان مومن کو ناز ہے [(۱)] مثال کے لئے چند اشعار کا تجزیہ کیجئے ـــ

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال

ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

انتہائی فرسودہ مضمون ہے لیکن شاعر کے بے پایاں خلوص نے اسے نشتر بنا دیا ہے ـ اور کیجئے کہ ایک ایک لفظ اپنی جگہ کتنے تاثرات ذہن کے سامنے لا رہا ہے اور کتنی رنگین بھولی بسری یادوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے ـ اس کے ساتھ اگر مومن کی رنگین جوانی کے واقعات کو پس منظر بناکر دیکھئے تو ان تمام حالات کا مرقع نگاہ کے سامنے آجائے گا جن سے شاعر کی رنگین البیلی جوانی کبھی گزری تھی اور جس کا تجربہ کم و بیش ہر عاشق مزاج نوجوان کو ہوتا ہے ـ

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

چھوٹی بحر ہے اور گنے چنے الفاظ ـ لیکن اس خلوص بیان نے جو میر کی میراث ہے انہی الفاظ میں معانی و مطالب جذبات و تاثرات شوق آرزو یاس اور ناکامی کا تلاطم برپا کر رکھا ہے ـ اگر اچھے شعر کی یہی تعریف ہے کہ وہ حسن خیال حسن الفاظ اور حسن ادا کا مجموعہ ہوتا ہے [(۲)] تو یہ بیت ہر زبان کے بہترین اشعار کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہے ـ عاشق صادق دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنے نقائص و عیوب کے باوجود کبھی نہ کبھی اپنی مراد کو پہنچ جاتا ہے ـ اس کے برعکس وہ خود اپنے جذب و خلوص کے باوصف بیوفا محبوب کو اپنانے میں ناکام رہتا ہے ـ

(۱) احتشام حسین ـ تنقید اور عملی تنقید ص ۲۱۶

(۲) عبدالرحمن ـ مرآۃ الشعر ص ۲۳

معشوق کی کم نگاہی رہ رہ کر اس کے دل مین برچھیان مارتی ہے ـ وہ بوالہوسون کو کامیاب و کامران دیکھتا اور دل تھام کر رہ جاتا ہے آغاز عشق سے انجام محبت تک کے تمام مرحلے اس کی نگاہ مین پھر جاتے ہین اور وہ انتہائے یاس مین زیر لب کہتا ہے کہ ع تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے!

کیا یار کے آنے کی سنی کچھ کہ اجل کی

کاہے کی خوشی مجھ مین ہے جان حزین یہ

اس شعر کے تاثرات کی شدت شعر ماسبق سے بھی زیادہ ہے ـ ناکامی جاوید کے ستائے ہوئے عاشق کو صرف دو چیزون سے راحت مل سکتی ہے ـ دوست کا وصال یا مرگ ناکامی ـ طویل حزن و ملال کے بعد اگر اتفاقا کسی روز اس کے دل مین مسرت کی لہر اٹھتی ہے تو وہ استعجاب کے عالم مین دل سے پوچھتا ہے ع

کیا یار کے آنے کی سنی کچھ کہ اجل کی

یہ جتانے کے بجائے کہ میری راحت یا تو وصل محبوب سے ممکن ہے یا موت سے ~~پورا~~ وارفتہ مزاج عاشق خود اپنے دل سے خطاب کرتا اور پوچھتا ہے کہ آج تجھ مین مسرت و انبساط کی یہ کیفیت کس چیز کا پرتو ہے ـ آمد محبوب کی خبر کا یا مرگ ناگہان کے احساس کا ـ دوسرا مصرع یاس و حرمان کی شدت ظاہر کرنے کے علاوہ اس بات کا اظہار بھی کر رہا ہے کہ راحت و مسرت انہی دو باتون مین منحصر ہے ـ جذبات کی شدت، بیان کے خلوص اور وارفتہ مزاج شاعر کی خود کلامی نے شعر کو نشتر کی سی آبدار آبداری دے دی ہے ـ

توکہان جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے

ہم تو کل خواب عدم مین شب ہجران ہون گے

یہ شعر سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے ۔ سوز و گداز مین ڈوبا ہوا ہے اور اس کی سادگی تاثیر سے مملو ہے ۔ مگر یہان ان اوصاف سے قطع نظر کر کے صرف اس رچاؤ کو دیکھئیے جو متنوع و متعدد تاثرات کی ترکیب سے پیدا ہوا ہے ۔ حرمان نصیب عاشق جو ایک طویل مدت تک فراق کا عذاب سہتے سہتے قریب المرگ ہوچکا ہے اندازہ کرلیتا ہے کہ وہ دنیا مین ایک رات کا اور مہمان ہے ۔ زمانۂ فراق کی تمام تکالیف یکے بعد دیگرے اس کے ذہن مین آتی ہین بدنصیبی کا احساس اس کے حزن و ملال مین اور اضافہ کرتا ہے تاہم اتنا اطمینان ضرور ہے کہ مرنے کے بعد ان غمون سے نجات مل جائے گی ۔ یکایک اسے خیال آتا ہے کہ شب فراق جو آج تک میرے گھر مہمان رہی ہے میرے مرنے کے بعد کہان جائے گی ۔ اب تک اسے میرے غمخانے مین جگہ ملتی رہی ۔ معلوم نہین کل اسے کہین پناہ ملے گی یا نہین ۔ ان الجھے ہوئے خیالات مین غلطان پیچان ہونے کے باوجود اس کا جذبۂ شفقت بروئے کار آتا اور کمال دلسوزی سے شب ہجران کو سمجھاتا ہے کہ "کچھ اپنا بھی ٹھکانا کرلے" ۔ اس شعر مین کوئی فنی اہتمام نہین ۔ انتخاب الفاظ حسن ادا بلندی تخیل سے کوئی امداد نہین لی گی ۔ فقط دلی تاثرات کی بوقلمونی ہے ۔ جذبات کی شدت ہے ۔ واردات قلبیہ کی پر خلوص ترجمانی ہے جو نوک نشتر کی طرح دل مین اتر رہی ہے ۔ نیاز فتحپوری نے جذبات و تاثرات کے اسی رچاؤ سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ "یہ وہ مقام ہے جہان غالب جیسے سدرہ نشین کے پر جلتے ہین" ۔[1] ہمین مومن و غالب پر محاکمہ منظور نہین تاہم بے تکلف اتنا کہہ سکتے ہین کہ اس شدت تاثر مین جو ولی نظیری اور میر تقی میر کا ورثہ ہے کوئی شاعر مومن کا مقابلہ نہین کرسکتا ۔

---

(۱) نگار جنوری ۱۹۲۸ء ص ۳۲

مجھ سے نہ بولو تم اسے کہتے ہیں کیا بھلا ؟
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

یہ صورت کہ ع ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار "۔ منزل الفت میں بارہا پیش آتی ہے ۔ عاشق عالم اضطراب میں کبھی اپنے ہمراز دوستوں سے اور کبھی خدا سے فریاد کرتا ہے کہ ع یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ۔ مومن کسی اور سے فریاد کرنے کے بجائے یار ستمپیشہ سے کہتا ہے کہ ناموس عاشقی کا احترام مجھے کسی دوسرے شخص سے دادخواہی کی اجازت نہیں دیتا ۔ میں آپ سے کسی بڑی آرزو کا بھی طالب نہیں ۔ صرف اتنی تمنا ہے کہ مجھ سے بات کرلیا کریں ۔ اگر آپ اس تمنا کو بھی ٹھکراتے دیتے ہیں تو ازراہ انصاف خود ہی کہئے کہ اس دل آزاری کے کیا معنی ہیں ۔ جذبات الفت میں ڈوبا ہوا عاشق اپنی زبان سے اتنا کہنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ یہ صریحی ظلم ہے ۔ وہ دبی زبان سے صرف اتنا پوچھتا ہے کہ " اسے کہتے ہیں کیا بھلا " ۔ انصاف کیجئے میں جو لطیف طنزیہ پہلو ہے وہ سنگدل محبوب کی بے رخی کو اور زیادہ نمایاں کر رہا ہے ۔

غرض مومن کے تغزل کی اولین خصوصیت وہ رچاؤ ہے جو کاروبار عشق کے ذاتی تجربات سے انھیں حاصل ہوا تھا ۔ الجھے ہوئے مرکب اور پیچ در پیچ تاثرات عشق کا بیان ان کے ہاں اس صداقت و خلوص کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ بے شمار خوابیدہ خیالات جو دماغ کے خلوت خانے میں مدتوں سے پڑے ہوئے ہیں یک بیک جاگ اٹھتے ہیں ۔ یہ عاشق مزاج شاعر واردات عشق کا نغمہ اس بھرپور جوش و خروش سے گاتا ہے کہ ساز دل کے تمام تار بہ یک وقت تھرانے لگتے ہیں ۔ مومن کی اس خصوصیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ چند غزلیں پڑھئے اور اس دلفریب بانکپن نیز اس رچے ہوئے تغزل کی داد دیجیے جو اس کے بیشتر اشعار میں موجود ہے ۔

(۱)

ٹھا نی تھی جی مین اب نہ ملین گے کسی سے ہم — پر کیا کرین کہ ہوگئے نا چار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہین کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہین کس بیکسی سے ہم

مجھ سے نہ بولو تم اسے کہتے ہین کیا بھلا — انصاف کیجیے پوچھتے ہین آپ ہی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا — کیون اپنے جی کو لگتے ہین کچھ اجنبی سے ہم

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل — کہتے تھے ان کو برق تبسّم ہنسی سے ہم

اس کو مین جا مرین گے مدد اے ہجوم شوق — آج اور زور کرتے ہین نا طاقتی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دین — مومن نہ ہون جو ربط رکھین بدعتی سے ہم

(۲)

ناوک انداز جدھر دیدۂ جانان ہون گے — نیم بسمل کئی ہون گے کئی بیجان ہون گے

ایک ہم ہین کہ ہوے ایسے پشیمان کہ بس — ایک وہ ہین کہ جنھین چاہ کے ارمان ہونگے

تو کہان جائےگی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے — ہم تو کل خواب عدم مین شب ہجران ہونگے

ہم نکالین گے سن اے موج ہوا بل تیرا — اس کی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی — پھر وہی پاؤن وہی خار مغیلان ہونگے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہین تواے پردہ نشین — ایک مین کیا کہ سبھی چاک گریبان ہونگے

تاب نظارہ نہین آئینہ کیا دیکھنے دون — اور بن جائین گے تصویر جو حیران ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشق بتان مین مومن — آخری وقت مین کیا خاک مسلمان ہونگے

(۳)

سرمگین چشم سے کیون تیز نظر کرتا ہے — کب مرا نالہ ترے دل مین اثر کرتا ہے

کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب و روز کہ یون — گدگدی دل مین مرے آٹھ پہر کرتا ہے

کلا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا راز نہاں — ایسے غماز کو بھی کوئی خبر کرتا ہے

عیش میں بھی تو نہ جا کے کبھی تم کیا جانو — کہ شب غم کوئی کس طرح سحر کرتا ہے

ذکر کر بیٹھیں بلائی ہی سے شاید میرا — اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں — تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

اک نمکدان سے تو لذت نہ اٹھی اے قاتل — زخم دل عرض نمکدان دگر کرتا ہے

سن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں

مومن اے اہل فن اظہار ہنر کرتا ہے

(۲)

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — نا طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

پھر عیادت آئے ہیں وہ لیکن قضا کے ساتھ — دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

ا نگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

س کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغ خلد ہے — کس جا لیے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے — کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ شب تار ہجر میں — سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے — اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر

مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

مندرجہ بالا سرسری انتخاب سے اس رچاؤ کا اندازہ کیجیے جو ہمارے دوسرے غزل گو

شعراء کے بہ مقابلہ مومن کی ذات سے مخصوص ہے۔ ان کی غزل جو بہ یک وقت متعدد جذبات عاشقانہ کی جامع ہوتی ہے ۔ اس ترشے ہوئے ہیرے کی طرح ہے جس کے سینکڑون پہلو ہون اور ہر پہلو کا رنگ مختلف ہو۔ جذبات کی اس رنگا رنگی ، جامعیت اور گہما گہمی کی وجہ مومن کی وہ بھری پسری حیات معاشقہ ہے جس مین انھون نے جی بھر کر عشقبازی کی ۔ اس آوارگی نے انھین " رسوائے دہر" تو کیا لیکن ساتھ ساتھ وہ صداقت، وہ گہرائی اور وہ سچائی بھی بخشی جو صرف ان شعراء کے کلام مین مل سکتی ہے جنھون نے اپنی عمر کا روبار شوق مین گزاری ہو۔ ہمارے دور کے ایک ادیب نے اس کیفیت کا تجزیہ ان الفاظ مین کیا ہے ۔

" ہر شاعر کی اپنی مخصوص زندگی ، اپنے جذبات ، سوچنے کا مخصوص انداز اور اس کا مخصوص ماحول ہوتا ہے ۔ اردو کے تمام غزل گو شعراء شاعرانہ روایتون کی پابندی کے باوجود ایک انفرادی شان رکھتے مین ۔ لیکن اس سے انکار کرنا دشوار ہے کہ یہ انفرادیت ہر جگہ رسمی اشارون کنایون کی زنجیر مین گرفتار ہے۔ ہماری غزلون کے صدہا دیوانون مین شاعرون نے جو جذبات پیش کیے مین ان مین اکثر جگہ خلوص کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ مومن اردو کے تنہا غزل گو شاعر مین جن کے رنگ تغزل مین ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے ۔ (۱)

یہ واقعہ ہے کہ وہ لوگ جو کسی فن کے لوازم سے رسمی رابطہ رکھتے مین اس فن سے صحیح معنون مین آشنا نہین ہوتے ۔ مومن کے کلام مین جو رچاو اور عاشقانہ شیفتگی کا انداز ہے وہ اسی خلوص اور سچائی کا پیدا کردہ ہے جس نے ساری عمر انہین کاروبار شوق مین مصروف رکھا اور ان سے اچھی غزل کہلوائی ۔ اس دلفریب

۱۔ سید وقار عظیم ۔ مومن کا فن ۔ ادب لطیف سالنامہ [illegible]

کیفیت کا صحیح اندازہ وہی اشخاص کر سکتے ہین جو حسن و عشق کی منزلون سے گزرے ہون جن کی راتین کوچہ کاکل مین اور دن عارض تابان کی روشنی مین بسر ہوئے ہون - جنھون نے نامرادی ، ناکامی ، نامرادی ، ہم آغوشی ، رشک ، حسرت ، وغیرہ کے مختلف مرحلے طے کیے ہون - جنھون نے شہر لب و رخسار کی سیر کی ہو اور جلوہ بام و در سے آنکھین سینکی ہون - جو حسن کی ایک ایک ادا مین محو رہ چکے ہون اور جنھین محبوب کی ذات سے مومن کی طرح والہانہ شیفتگی رہ چکی ہو۔ مومن کا مطالعہ کرنے اور اس سے لذت اٹھانے کے لیے کامل محویت پہلی شرط ہے - تاہم یکسوئی اور توجہ کے بغیر بھی مطالعہ کیا جائے تو اس انتخاب سے اتنا واضح ہوتا ہے کہ یہ عشق پیشہ شاعر اپنے پسندیدہ موضوع یعنی حسن و عشق کے دائرے سے ہرگز باہر نہین نکلتا - اس کی شراب تغزل مین " خمار چشم ساقی " اس طرح ملا ہے کہ پڑھنے والا اسے " ورائے شاعری چیزے دگر " کہنے پر مجبور ہے -

مجنون گورکھپوری
(اردو غزل اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ اسے ایک ایسا شاعر ملا جو اپنی معین کردہ حدود مین رہ کر حسن و عشق کی وہ رچی ہوئی کیفیت دکھاتا ہے جو کہین اور نہین مل سکتی -) یہ صحیح ہے کہ تصوف ، فلسفہ ، اخلاق ، عمرانیات ، معاملات دنیا وغیرہ شامل کرنے سے غزل کا میدان حد نظر تک وسیع ہو جاتا ہے لیکن اس غلط توسیع سے روح تغزل مجروح ہو جاتی ہے - [(۱)] مومن نے بہت اچھا کیا کہ ان تمام غیر متعلق مدا مین سے بے تعلقی اختیار کر کے خالص تغزل پر ہاتھ ڈالا - اس خلوص نے جوان کے حالات زندگی اور واقعات و کیفیات مین ڈوبی ہوئی رنگین جوانی کا پیدا کردہ ہے ، انھین وہ رچاو بخشا جو ان کے فن کی بنیادی خصوصیت ہے -

۱ - مجنون گورکھپوری - تنقیدی حاشیے - غزل کا آبگینہ نظریات فلسفہ و حکمت کی سختی کا متحمل نہین ہو سکتا -

بعض پوری غزلون سے قطع نظر کر کے جو سرا سر اس رنگ مین ڈوبی ہوئی ہین مختلف غزلون سے اس خصوصیت کے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو وہ بھی کافی طولانی ہوگا ہر غزل مین دوچار شعر ایسے نکل آتے ہین جن مین یہ جوہر خاص ہیرے کی تراش کی طرح چمکتا ہے۔ (نظر آتا ہے)

ہم کہا ہوئے تو درد دل زار کم ہوا — بارے کچھ اس دوا سے یہ آزار کم ہوا

کچھ اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی بعد مرگ — ہنگامہ محبت اغیار کم ہوا

کچھ اور مین ہی نہین سب کے سب ہوئے — اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا

سیماب وار مر گئے ضبط قلق سے ہم — کیا قہر ہے طبیعت مائل کو تھامنا

اے ہمدم آہ تلخی ہجران سے دم نہین — کرنا ہے دیکھ جام ہلاہل کو تھامنا

ہم تو بچتے نہین تا شام وہ آئے بھی تو کیا — اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ

اتنی مہلت دے ستمگر کہ پہنچ جائے اجل — دم کے دم اور بھی سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

ناصح ان کو کو میری شکل سے تنفر ہے — تو بھی کم ناکی کیون جانب وفا دیکھیں

کچھ نظر نہین آتا آنکھ لگتے ہی ناصح — گر یقین نہین حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

نکلے آرزو مومن اپنی طرح جب تجھکو — صحن بتکدہ مین ہم خاک پسر پڑا دیکھیں

نالہ ہی نکلے ہے کو ہمدم کہنے کو ہین — لب نہین کہنے مین اب کیا جانے کیا کہنے کو ہین

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہین گلہ — کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہین

دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا — بخت تیرے عاشقون کے نارسا کہنے کو ہین

وہ نہیں آئے نہ آئیں مرگ ظالم تو تو آ — یاں لبِ شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں

ہو گئے نامِ بتان سنتے ہی مومن بیقرار — ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

کیا — نا تے ہو کہ ہے ہجر مین جینا مشکل — تم سے بیرحم پہ مرنے سے تو آسان ہوگا

جیسا کہ بیان ہوا یہ وہی ہوئی کیفیت متعدد و متنوع واقعات و کیفیات کی پیدا کردہ ہے — اس مین وصل و ہجر، کامرانی و ناکامی، حرف و حکایت، طنز و تعریض، ز ز و نیاز، کے تمام رنگ ملے ہوئے ہین۔ لیکن جب اس کیفیت پر حزن و غم کا رنگ غالب آ جاتا ہے تو شعر مین نشتر کی سی تیزی محسوس ہوتی ہے — زہر غم کا اثر اپنا کام کرتا نظر آتا ہے — مومن طبعا" خوش باش تھے مگر غم بہر حال غم ہے — دوسرے باب مین بیان ہو چکا ہے کہ مومن متعدد بار حزن و یاس کے عالم مین رہے ہین — فراق و ناکامی کے رنج نے انھین کئی بار ایسا گرایا ہے کہ وہ مہینوں بستر علالت سے نہین اٹھ سکے — یہان تک کہ احبا و اقربا ان کی زندگی سے مایوس ہو ہو گئے ہین — اس عالم مین ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہوگا وہ یقینا" پر سوز و غمناک ہوگا — یہی وجہ ہے کہ ان کے کلیات مین بعض ایسی غزلین نظر آتی ہین جو سر تا سر حزن و ملال کے آہنگ مین ڈوبی ہوئی ہین — اس حالت مین انھون نے جو کچھ کہا اس کا سوز کہین کہین میر کے غمناک لہجے کی یاد دلاتا ہے —

محروم ہوا مومن ناکام محبت — اے اہل محبت یہ ہے انجام محبت

کر دیا خاک آپ نے اس بت کے دو پہ ہائے ہائے — جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھ کر

ہو گئے دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی — مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جاتے تھا

مجھ سے تم بولو تم اسے کہتے ہیں کیا بھلا — انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

اے اجل کاش الٹ جائیں شب ہجران میں — وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں

اک نالہ ہی کر لوں کہ ہو شاید اسے تاثیر — فرصت نہیں اب ہے نفس باز پسیں یہ

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا — کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

جانے دے چارہ گر شب ہجران میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہو مرے حال تباہ میں

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم — تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

ٹوٹنا جان کا ہو جانے کا دشوار آخر — چارہ ساز و مری امید بندھاتے کیوں ہو

کیا کہیں تم سے اے ہمدردو پوچھو مت مرغان چمن — کیونکر یاں ایام خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں
کنج قفس میں بیٹھ کے کاہے روتے ہیں تنہائی پر — یاد سیر موسم گل سے جی کو کبھی بہلاتے ہیں

ہوں جان بہ لب بتان ستمگر کے ہاتھ سے — کیا سب جہان میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

ان تمام خوبیوں کے باوجود جو رچے ہوئے تغزل سے پیدا ہوئی ہیں بعض مقامات پر جذبات کی شدت نے انداز بیان کو نقصان پہنچایا ہے۔ مومن اپنی کیفیات میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ اظہار جذبات کرتے وقت گفتار کے اسلوب پہ قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے (۱)

۱۔ گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
اقبال

یہی وہ مقام ہے جہاں قاری کا معنوی رابطہ شاعر سے ٹوٹ جاتا ہے اور اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مضمون موزون کرتے وقت شاعر کس عالم میں تھا - حسب ذیل اشعار اگرچہ دل کے گھٹے ہوئے شوق کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن ان کا مجموعی تاثر دلنشینی سے عاری ہے

تھا قلق بر تہی دشمن جان شب فراق - کاٹ کے اپنے سر کو ہم بھینچتے ہیں کنار میں

ہو گئی کیا بلا نے جان بوسہ زلف کی ہوس - پھیرتے ہیں زبان کو ہم کام و دہان مار میں

پہلا شعر ایک ایسا منظر نگاہ کے سامنے لاتا ہے جو امکان کی حد سے خارج ہونے کے علاوہ تسکین و آسودگی سے بھی محروم ہے - یہی کیفیت دوسرے شعر کی ہے - بوسہ زلف کی ہوس میں سانپ کو دیکھنا یا اسے بوسہ دینا تو حدود خیال میں عین ممکن ہے لیکن وہاں مار میں زبان پھیرنا ایسا تصور ہے جو کسی اعتبار سے امکان یا دلکشی کا پہلو نہیں رکھتا - مومن کے کلام میں یہ صورتیں جا بجا نظر آتی ہیں بالخصوص ایسے مواقع پر جب خیالات کا تلاطم اظہار مطلب کے لیے صحیح الفاظ نہیں پاتا - مومن بالعموم الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی کرتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر فراوانی جذبات اور خلوص مقصد کے باوجود ان کے کلام میں اغلاق اور معنوی تعقید پیدا ہو جاتی ہے -

لہجے کی انفرادیت: مومن کا دوسرا وصف وہ منفرد ذاتی لہجہ ہے جس سے ہمیں ان کے سیماب وش، بیتاب دل کی آواز آتی ہے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سنے سنائے واقعات یا عشق کے "اصول موضوعہ" بیان کر دینے کے بجائے اپنے ذاتی تجربات قلمبند کئے ہیں - مومن کی غزل پڑھنے والے کو یہ شکایت کبھی نہیں ہوتی کہ وہ شاعر کی روح سے بیگانہ رہا ہے یا اس کی آواز کو نہیں سن سکا - وہ ہر ہر شاعر کا پرسوز لہجہ سنتا رہتا ہے اور اس سے اپنا ذاتی تعلق قائم کر کے ہمیشہ کے لیے قرب معنوی پیدا

کر لیتا ہے ۔ اور شعراء کے برخلاف جو عشق و عاشقی کے سنے ہوئے مسلّمات تسلیم کر کے
قاری کو اپنی شخصیت سے بیگانہ کر دیتے ہیں مومن کی پرسوز آواز اور بے نیازانہ
لہجہ ہیں ایک معنوی رابطہ (Intellectual Association) عطا کرتے ہیں جو تازیست
ساتھ رہتا ہے ۔ ہم اس کی آواز کو ہزاروں آوازوں میں صاف پہچان سکتے ہیں
ڈاکٹر عبادت اس انفرادی لہجے کو " ذاتی آہنگ " سے تعبیر کرتے ہیں (۱) ۔ ایلزبیتھ
ڈریو اسے داخلی آہنگ کا نام دیتی ہے (۲)

یہ شخصی آہنگ جو کلیات مومن پڑھتے وقت قاری کے کان میں گونجتا رہتا ہے مومن
کے خلوص فن اور ان کے حالات زندگی کا پیدا کردہ ہے ۔ مصحفی کے برخلاف جو معاش
حاصل کرنے کے لیے مختلف قیمتوں کی غزلوں کیا انبار تیار کرتے تھے یا ان شعراء کے
برعکس جو مشاعروں میں دو غزلے سہ غزلے پڑھنے کے لیے ہر ممکن قافیہ تسلیم کرنا
ضروری سمجھتے تھے مومن صرف اپنے دل کی کہانی سناتے تھے ۔ لگی بندھی آمدنی
نے انھیں فکرِ معاش سے ایک حد تک بے نیاز رکھا ۔ ان کے گوناگوں کمالات نے انھیں
اتنا محبوب و محترم بنا یا تھا کہ مشاعروں میں جا کر داد لینے کی تمنا کبھی نہیں
ہوئی ۔ علوم و فنون کی محفل کا یہ صدر نشین اپنے " بے اندازہ کمالات کے نشے میں (۳)
میں اتنا سرخوش تھا کہ راہ چلتے وقت بھی ازخود رفتگی کا عالم طاری رہتا تھا ۔
ظاہر ہے کہ مومن جیسا عشق پیشہ ، وارستہ مزاج شخص کبھی خیالی و قیاسی باتیں
نہیں کر سکتا ۔ وہ روایتی انداز بیان یا عام اسلوب گفتار سے احتراز کرتے تھے

---

۱ ۔ مقدمہ کلیات اردو ص ۲۹ ۔ ۲ ۔ Discovering Poetry ص ۵۵
۳ ۔ سرسید احمد آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۰۶

محمد یحیی تنہا اور دیگر نقادوں کے بقول انھوں نے جو بات کہی وہ اس طرح کہی کہ دوسروں نے اس طرح نہ کہی تھی ۔ اب اسے آپ مومن کی نازک خیالی ، رنگین بیانی یا معنی آفرینی جو چاہے کہہ لیجئے اس کے سوا دیوان مومن میں اور کچھ نہیں ہے" (۱) ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مومن کی غزل ان خیالوں یا حسن و عشق کے موضوعات سے خالی ہے جو عام شعراء نظم کر دیتے ہیں ۔ فرسودہ عمومیت کی بجائے مومن کے کلام میں ان کے جذباتی دل کی سرشار آواز ہے جس کے ایک ایک شعر سے ان کے مزاج ، حالات ، طرز فکر اور عمیق جذبات کا اظہار ہوتا ہے ۔ مضامین وہی روایتی ہیں جو اوروں نے بھی نظم کئے ہیں مگر مومن کا ذاتی آہنگ انھیں انفرادیت عطا کرتا ہے ۔ ذیل کے اشعار پڑھئے اور اندازہ کیجیے کہ ان میں شاعر کی آواز کتنی منفرد اور وارستہ لہجے کی بے نیازی کتنی نمایاں ہے ۔

(۱)

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں ۔ غارت کیا اس نے مجھے غارت ہو کہیں یہ

کیا پار کے آنے کی سنی کچھ کہ اجل کی ۔ کا ہے کی خوشی ہجر میں ہے جان حزیں یہ

اک نالہ ہی کر لوں کہ ہو شاید اسے تاثیر ۔ فرصت نہیں اب ، ہے نفس بازپسیں یہ

یاں تا ہے کو آئے وہ نکئے اے کشش دل ۔ تو لاکھ کہے پھر کوئی لاآتا ہے یقیں یہ

(۲)

سرمگیں آنکھ سے تم نامہ لکاتے کیوں ہو ۔ خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

جن سے منظور رونا ہے ہو جینا بھی ان پر ۔ مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو

ٹوٹ نا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر ۔ چارہ ساز و مری امید بندھاتے کیوں ہو

---

۱ ۔ سراپا سخن الشعراء ص ۲٦۱ ۔

دم قدم سے ہے لگا ۰ جان نکل جائے گی — دیکھ سینے سے مرے پاؤں ہٹاتے کیوں ہو

کھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن — اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

(۲)

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے — پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو پیار آ جائے

کر ذرا اور بھی اے جوش جنوں خوار و ذلیل — مجھ سے ایسا ہو کہ ناصح کو بھی عار آ جائے

نام بد بختی عشاق خزاں ہے بلبل — تو ابھی نکلے چمن سے تو بہار آ جائے

ٹھہر جا جوش جنوں ہے تو تڑپنا لیکن — چارہ سازوں میں ذرا دم دلِ زار آ جائے

(۴)

گو حسد سے ہو پر اب ہے وہی ناصح کی بات — ناحق اس جان جہاں کو اک نظر دکھلا دیا

اس قیامت قد کو شب دیکھا تھا میں نے خواب میں — دل نے محشر کا سماں وقت سحر دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر — جو نہ دیکھا تھا تمام عمر بھر دکھلا دیا

صبح سے تعریف ہے صبر و سکون غیر کی — کس نے شب مجھ کو تڑپتے بے بدر دکھلا دیا

دیکھیں کے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا — اس بت پردہ نشین نے جلوہ کر دکھلا دیا

ان تمام اشعار کا نفسیاتی تجزیہ کر لیجیے — حریت کی تہ میں شاعر کی حیات معاشقہ یا اس کے متعلقہ جذبات کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آئے گا — ذاتی حالات کی ترجمانی اور جذبات قلبیہ کا سچا بیان شاعر میں خود اعتمادی پیدا کر کے غزل کو وہ منفرد لہجہ بخشتا ہے جو متقدمین میں میر، قائم، درد، اور آتش وغیرہ سے مخصوص ہے — متاخرین میں اس کا مکمل اظہار مومن کے ہاں ملتا ہے — (۱)

---

۱ — ضیاء احمد — رسالہ اردو اکتوبر ۷ء " مومن کا کلام ایک طرف تغزل اور لطیف تغزل

سرشار لہجے کی یہی انفرادیت ہے جس نے مومن کی غزل کو تاثیر بخشی ہے اور جس سے ہم اس کو لاکھ پردوں میں بہ سہولت پہچان لیتے ہیں۔

آہنگ کی یہ انفرادیت جہاں خطاب کا انداز اختیار کرلیتی ہے اور زیادہ پرتاثیر ہوجاتی ہے کسی واقعے کا بیان اگر مناسب الفاظ میں کیا جائے یا اگر ادیب قادر الکلام ہو تو اس کی عبارت بجائے خود دلنشین ہوتی ہے۔ لیکن جب یہی بیان خطاب کا اور اس سے بڑھ کر سوال وجواب کا انداز اختیار کر لے تو اس کی دلکشی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ متقدمین میں میر اور درد نے اس طریقے کو بہت کامیابی سے برتا ہے۔[1] مومن جن کی جوانی محبت کی ازخود رفتگی میں بسر ہوئی اس نکتے سے بخوبی باخبر تھے۔ یا یہ کہئیے کہ ان کی وارفتہ مزاجی نے یہ انداز خطاب غیر شعوری طور پر پیدا کر دیا تھا۔ خطاب اور سوال وجواب کا یہ طریقہ ان کے بے نیازانہ لہجے کو مزید انفرادیت بخشتا ہے اور تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ چند اشعار کا تجزیہ بے محل نہ ہوگا۔

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

مضمون فرسودہ ہے لیکن اس تکلّمی انداز نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ شاعر کا طبعی استغناء اسے صراحت وتفصیل کی طرف نہیں جانے دیتا بلکہ اختصار وابہام

بقیہ حاشیہ ۔ میں رئیس المتغزلین نظیری کی یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف معاملہ بندی و وقوعہ گوئی میں میلی و وحشی کا نقش ثانی ہے۔

۲۔ مثلاً "الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

میر ہم تم سے بہت خوش ہوئے مل کر پیارے ۔ اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

سے شعر کی تاثیر کو بڑھاتا ہے۔ اگر شاعر یہاں اپنی وفا اور محبوب کی جفا کی تفصیل قلم بند کرتا تو وہ تاثیر ہرگز نصیب نہ ہوتی جو اس اجمال نے پیدا کی ہے کہ ع میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا ۔

اس غزل کا مقطع بھی یہی خطابی انداز رکھتا ہے ؎

عمر ساں ایمان سے ضد اس غارتگر دین کو بڑھی

تجھ سے اے مومن، خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

مصرع ثانی کے الفاظ ذاتی آہنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انفرادی لہجے کا عمدہ نمونہ ہیں — "خدا سمجھے" کا ٹکڑا لطف بیان کے علاوہ درد اور طیش کا بھی اظہار کرتا ہے۔ یہی انداز خطاب ذیل کے مقطع میں بھی ہے جس سے شاعر کے دل کی آواز سنائی دیتی ہے ؎

در بتخانہ اور عشق بتان اور آپ اے مومن — یہ حضرت آگئی اک بار کیا طبع مقدس میں

اس سے ملتا جلتا اور قریب قریب اسی انداز کا نمونہ یہ شعر ہے ؎

مومن تم اور عشق بتان اے پیرو مرشد خیر ہے

یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر — مذہب عشق اختیار کیا

کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور — اے ستمگار خوش نہیں آتا

درد ہم کو یہ رات دن تیرا — نالہ زار خوش نہیں آتا

پیری میں تغیر حال بہت جا — یوں بھی ارمیر مان ہوتا ہے

مستقل حاشیہ
صفحہ ماقبل

حسب ذیل اشعار بھی خطابی شان رکھتے ہیں اور بعض جگہ خود کلامی (Soliloquy)
کا انداز دکھاتے ہیں ؎

دن بھی دراز رات بھی کیون ہے فراق یار میں
کا ہے کو ہے فرق آگیا گردش روزگار میں

راز نہان زبان اغیار تک نہ پہنچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

کیا کسی بت کے دل میں جگر کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرت مومن اب تمہیں ہم مسجد میں بہت کم پاتے ہیں

شکوہ حرف تلخ کا یا شور بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزہ کہنے کو ہیں
ایک دن کو تو زبان شعلہ دوزخ فرش ہے
قصہ شب ہائے غم روز جزا کہنے کو ہیں
وہ نہیں آتے نہ آوین مرگ ظالم تو تو آ
یان لب شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں

مجھ سے نہ بولو تم اسے کہتے ہیں کیا بھلا ؟
انصاف کیجئے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیان اپنا ہوا برباد کیا ؟

کس کی زلفون کا دھیان تھا کہ مقفہ مین شب

محسود رد چراغ خانہ رہا

کیون لگے دینے خط آزادی　　کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب ؟

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

ورنہ دنیا مین کیا نہین ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر

دل کسی کام کا نہین ہوتا

کیا یار کے آنے کی سنی کچھ کہ اجل کی　　کا ہے کی خوشی ہجر مین ہے جان حزین یہ

چھوڑ کر بتخانہ مومن سجدہ کعبہین نہ کر

خاک مین ظالم نہ یون قدر جبین سائی ملا

نکلے آرزو مومن ایسی طرح جب تجھ کو　　صحن بتکدہ مین ہم خاک پر پڑا دیکھین

سیماب ہے پہلو مین مرے دل تو نہین　　غارت کیا اس نے مجھے غارت ہو کہین یہ

یہ جو ن نے پڑ گئے کیسے گلو سے تا بہ دل روزن　　الٰہی روکتے تھے نالہ شبگیر اکثر ہم

متورجہ بالا اشعار سے وارستہ مزاج شاعر کے ہے نیازانہ لہجے کا اندازہ سمجھ

لینا مشکل نہین ۔ ذاتی لہجے کی یہ انفرادیت اس کے اکثر اشعار بالخصوص مقطعون

مین نمایان ہے۔ مومن کی خصوصیات مین یہ خوبی اگرچہ دوسرا درجہ رکھتی ہے تاہم یہی وہ وصف ہے جو ہمین اس کی روح سے قریب کر کے اس کی ذات کے ساتھ ایک معنوی رابطہ بخشتا ہے۔

تہ داری و معنی آفرینی) اس سے یہ مراد ہے کہ کلام مین ایسے الفاظ و مرکبات آئین اورشاعر اپنے ایجازی اسلوب سے انہین ایسی ترتیب دے کہ ذہن ایک معنی سے دوسرے معانی اور ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہوجائے۔ اس اسلوب کی یہ خوبی شعر کو آئینہ خانہ بنا دیتی ہے جہان ایک آئینے کا انعکاس دوسرے آئینون مین پڑ کر طلسمات کا عالم پیدا کر دیتا ہے۔

فارسی مین اول اول یہ انداز فغانی نے پیدا کیا جس سے اظہار و ابلاغ معانی کی راہین کھل گئین۔ فغانی سے پہلے جذبات نگاری کی یہ صورت تھی کہ بالعموم مفرد خیالات و تاثرات کو سادہ الفاظ مین بیان کرتے تھے۔ سعدی، خسرو، اور حافظ کو دیکھیے۔ دل کی کہانی سادہ الفاظ مین بغیر کسی اہتمام کے سناتے ہین ان کے انداز سے ظاہر ہے کہ ان کا معشوق متحمل ہے جو عاشق کی داستان درد کو صبر کے ساتھ سنتا ہے۔ سعدی اورخسرو کا یہ انداز بیان اگرچہ دلنشین ہے اور اس کی سادگی و تاثیر مین کلام نہین تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب فطرت انسانی کے دقیق پہلوون یا تہ در تہ جذبات وتاثرات کی ترجمانی کرنا ہوتو بیان کی سادگی اظہار مطلب مین کوتاہی کرنے لگتی ہے۔ مطالب تشنہ رہ جاتے ہین اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ معنی کے جسم پر الفاظ کی تنگ قبا جگہ جگہ سے مسک گئی ہے۔ جسم مین جھول

نظر آنے لگتا ہے جو شاعر کے عجز کی چغلی کھاتا ہے۔ فغانی جیسے تغزل کی شریعت کا مجدّد کہنا چاہیے ان کوتاہیوں پر نظر رکھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب تہذیب و تمدن کی ترقی ہوتی ہے تو سادگی و طوالت کا دور ختم ہوجاتا ہے۔ ان کی جگہ تکلف، ترکیب، اختصار اور سہولت رواج پاتے ہیں۔ عام استعمال کی چیزیں جو پہلے سادہ مفرد یا قلیل الاجزا ہوتی ہیں پر پیچ، باتکلف، مرکب اور کثیر العناصر ہوجاتی ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز میں اختصار و ترکیب اور ترکیب میں انتہائی حسن پیدا کر دیا جائے۔

اس کلیے کا اطلاق زبان و بیان پر بھی ہوتا ہے۔ ترقی تمدن کے دور میں زبان نئی سج دھج اختیار کرتی ہے۔ وہ "سادہ" طرز بیان جس میں تام گو الجھاو نہیں ہوتا ختم ہونے لگتا ہے۔ سلیس و مفرد جذبات نگاری کی جگہ تاثرات کی مرقع نگاری کو عروج ملتا ہے۔ ڈھلے ہوئے نگینوں کے بجائے ترشے ہوئے جواہرات کی مانگ شروع ہوجاتی ہے۔ فغانی نے ان تقاضوں کو پہچانا اور سلیس نگاری ترک کر کے خیالات و تاثرات کے مرقعے تیار کیے جو اپنے اختصار کے باوصف گوناگوں مطالب پر حاوی ہیں۔ مثلاً

ساقی مدام بادہ باندازہ می دھد
این بیخودی گناہ دل زود مست ماست

میخوار پر کسی نے اعتراض کیا کہ تمہارا ساقی عجب بد سلیقہ ہے جو پلاتے وقت "ظرف قدح خوار" کا لحاظ نہیں رکھتا۔ میخوار کی طرف سے جواب ملا کہ ساقی تو بہت اندازہ دان ہے لیکن دل کی کم ظرفی کا کیا علاج کہ کمبخت دو ہی چلو میں مدہوش

ہوجاتا ہے ۔ شعر کا ایک ایک لفظ شاعر کی دقت نظر اور تلاش کا آئینہ دار ہے۔ دل زود مست کی ترکیب پورے جملے کا کام دے رہی ہے۔

مقصود صحبت است زگل ورنہ بوئے گل

انصاف اگر بود زصبا بے توان شنید

یہاں بھی موزوں حذف و ایجاز کی بدولت قاری کا ذہن محذوف عبارتوں کو خود فراہم کر لیتا ہے ۔ تمام مطالب کو فغانی نے صحبت گل اور بوئے گل کی رمزیت سے ادا کیا ہے جامعیت اور اختصار و ایجاز کا جو عالم ہے محتاج بیان نہیں ۔ انداز بیان کی یہ تہ داری جس سے مطالب خود بخود ابلتے ہیں ۔ فغانی کے کلام میں نمایاں ہے۔ نظیری عرفی اور دسویں صدی کے دیگر فارسی شعراء نے اس انداز بیان کو مزید ترقی دی مومن کی نگاہ میں عرفی اور نظیری کا انداز ایسا سمایا ہوا ہے کہ وہ اکثر معاملات میں ان دونوں استادوں کی تقلید کرتے ہیں ۔ جو بات فارسی ادب نے تین صدیوں کی کاوش کے بعد پیدا کی اس کا عمدہ نمونہ اردو میں مومن نے پیش کیا ۔ ان کی ذہانت نے جو معاملات عشق کے لیے وقف تھی اردو غزل کو عرفی کی تہ داری و معنی خیزی سے آشنا کیا اور اپنے متبعین کو بتایا کہ مناسب تراکیب ۔ منتخب الفاظ اور اچھوتے اسلوب سے معانی و بیان کے معجزے کس طرح دکھائے جاتے ہیں ۔ اکثر زبانوں کا نقطۂ تحول پیدا کرنے والے شاعر وہی ہیں جو رسم و رہ عام سے ہٹ کر چلے اور زمانے نے انہی کے نئے راستے کو شاہراہ تسلیم کیا ۔ مومن نے بھی تغزل کی نئی راہیں نکالیں ۔

اس معاملے میں عرفی کی طرح مومن نے بھی وہی طریقے اختیار کیے جو ذہن پر

خیالات و معانی کے دریچے کھول دیتے ہیں ۔ وہ بالعموم کوئی کلیہ یا مفروضہ انتہائی بے نیازی سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا وہ ایک آفاقی حقیقت ہے۔ پھر اس مفروضے سے واقعات ونتائج کا استنباط اس طرح کرتے ہیں کہ گویا سارا معاملہ ایک ریاضی صداقت ہے۔

بعض اوقات وہ اس مفروضے کو بیان کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ اس کے مناسبات کا چلتا سا اشارہ کرکے اپنے جذبات واحساسات کو ایک تسلیم شدہ صداقت کی طرح بیان کر جاتے ہیں ۔ تاثرات کو اتنے یقین اور قطعیت سے پیش کرنے سے انداز بیان میں بڑی دلنشینی پیدا ہوجاتی ہے جسے بعض نقاد نازک خیالی سے تعبیر کرتے ہیں (۱) ۔ لیکن یہ نزاکت تخیل جو مومن کی شاعرانہ اداؤں میں سے ایک ہے اس خیال بافی یا دقت تخیل سے پاک ہے جو بیدل ، ناصر علی اور غنی کا شمیری وغیرہ کے کلام میں جا بجا الجھن پیدا کر دیتی ہے۔ مومن کی تہ دار نازک خیالیاں فکر کو کاوش کے بجائے لذت بخشتی ہیں ۔ یہاں چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

لے تو ہی بھیج دے کوئی پیغام تلخ اب

تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لئے

یعنی یہ تو مسلّم ہے کہ سنگدل محبوب کی سخت کلامی عاشق کے حق میں زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے ۔ اب جب کہ مریض الفت کو طبیبوں نے جواب دے دیا ہے اور ازرہ شفقت یہ طے کر لیا ہے کہ زہر دے کر اس کی تکالیف کا خاتمہ کیا جائے۔ بدنصیب عاشق

۱۔ رام بابو سکسینہ ص ۲۵۸

کوخیال آیا کہ محبوب کا پیغام تلخ زہر سے کہیں زیادہ مہلک ہے۔ اس عالم میں اس کی دلی خواہش یہی ہوسکتی ہے کہ زہر کا احسان اٹھانے کے بجائے یار جفا کار کے تلخ پیغام کو سن کر جان دے دوں ۔ چنانچہ اس سے التجا کرتا ہے کہ مجھے اسی طرح موت سے ہم آغوش کر دے ۔ اس میں اتنا نکتہ اور ہے کہ معشوق کا دلشکن پیغام اگرچہ ہلاکت آفرینی میں زہر قاتل کی تاثیر رکھتا ہے تاہم عاشق بہ ہر صورت اسے زہر پر ترجیح دیتا ہے۔

ہجر بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاش زہر

غم پر حرام خوار توکل نہ ہوسکا

یہ مقطع ماسبق شعر کی طرح ایک کلیہ پر قائم ہے۔یعنی غم بجائے خود زہر کی طرح (یا اس سے بھی کچھ زیادہ) ہلاکت آفرین ہے۔ اب جو عاشق زہر حاصل کرنے کی فکر میں ہے تو کوئی محرم راز دوست اسے اس جستجو میں پا کر ملامت کرتا ہے کہ کمبخت تجھ سے غم پر قناعت نہ ہوسکی ۔ ان تمام مفاہیم کے علاوہ لفظ حرام خوار اس بات کا اشارہ کر رہا ہے کہ (اسلام میں) زہر کھا کر خودکشی کرنا فعل حرام ہے۔ وسیع المعانی الفاظ سے معنی خیز اشارے کرنا اور ان سے ایجاز کے معجزے دکھانا مومن کا خاص فن ہے ۔ جو اس شعر میں نمایاں ہے :-

شب غم میں کیسا ہجوم بلا ہے

زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

شب فراق میں آلام و مصائب کی کثرت ایک عام مضمون ہے۔ مومن ان کی شکایت کرنے کے بجائے یہ دعوی کرتا ہے کہ میں عشق کے مصائب سے گھبراتا نہیں بلکہ عاشق صادق

کی حیثیت سے انھین ہمیشہ خوش آمدید کہتا ہون - مصائب فراق مجھے عزیز مہمانون کی طرح پیارے ہین چنانچہ شب ہجر مین انھین مرحبا کہتے کہتے میری زبان تھکی جاتی ہے- یہان شاعر کے پر اعتماد لہجے کی بے نیازی پر غور کیجیے جو اس کے دعوے کی تائید کر رہی ہے-

ایک دن کو تو زبان شعلہ دوزخ قرض دے

قصہ ہجرانے غم روز جزا کہنے کو ہین

شب فراق کے مصائب اور سوز غم کی شدت عام مضمون ہے- مومن کا مفروضہ یہ ہے کہ سوز غم کا بیان کرنے کے لئے شعلے کی زبان ضروری ہے- کیونکہ آتش عشق کی سوزش کے بیان کا حق وہی ادا کرسکتی ہے -مومن ان تمام مفروضات کو پس منظر ڈال کر نہایت بے نیازی کے ساتھ دوزخ سے کہتا ہے کہ آج (روز محشر) ایک دن کے لئے مجھے شعلے کی زبان مستعار دے دے- ان تمام معانی کے دوش بہ دوش شعر کے لہجے سے یہ بات روشن ہے کہ آتش ہجران شاعر اور دوزخ مین مدتون سے بےتکلفی اور دوستانہ ربط و ضبط ہے- لہذا پوری بےتکلّفی کے ساتھ اس سے زبان شعلہ قرض مانگتا ہے - اس مفہوم کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شاعر نے مصائب عشق کو روز محشر تک چھپائے رکھا ہے - آج جب کہ ہر شخص داور محشر کے سامنے اپنی داستان کہہ رہا ہے تو وہ بھی سوزِ غمہائے نہانی کا قصّہ سنانے پر مائل ہوگیا ہے لہجے کی بے نیازی اتنا اشارہ اور کرتی ہے کہ شاعر کو قصّۂ غم سنانے کی چندان تمنا نہین - یہ بھی ایک " انداز جنون " ہے کہ اسے یہ خیال آگیا ہے - کثیرالمعانی الفاظ سے معنی خیز حذف وایجاز کے ذریعہ خیالات کی تہین قائم کرنے مین مومن

کو جو دسترس ہے اس کے نمونے اس قسم کے اشعار مین بہ کثرت ملتے ہیں:-

کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا

مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

ع — نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

ایک طے شدہ مسئلہ ہے- اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص اس کے برعکس صبر کی نصیحت کرے اسے دیوانہ سمجھنا چاہیے- مومن ان تمام مفروضات و مسلّمات کا اشارہ تک نہیں کرتے بلکہ صرف ناصح کا قول بیان کر کے مذکورہ بالا مسلمات کا پس منظر ہمارے ذہن مین قائم کر دیتے ہیں اور نہایت لطیف طنز سے (جس کے وہ بادشاہ ہین) یہ کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں کہ ع

مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

اس مصرعے کی یہ بلاغت تعریف سے مستغنی ہے کہ ناصح کو براہ راست دیوانہ کہنے کے بجائے اپنی بد قسمتی کا اشارہ کیا ہے کہ افسوس مجھے ناصح بھی ملا تو ایسا جو دیوانہ ہے- اگرچہ بالواسطہ اس سے یہی مراد ہے کہ ناصح نادان ہمیشہ بے تکی بات کرتا ہے

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آ گیا مجنون کا

سائے سے مرے وحشت اے رشک پری اتنی

یہ مضمون کہ عاشقی مین ہم مجنون و فرہاد کے قبلہ گاہ ہیں عام ہے- اکثر شعراء نے یہ خیال نظم کیا ہے مثلاً

جان دادگان عشق سے پوچھو رہ فنا

اس مین جناب خضر ابھی نابلد سے ہین ذوق

کوئی عشق میں مجھ سے افزوں نہ نکلا

کبھی سامنے ہو کے مجنوں نہ نکلا۔ آتش

سمجھ کے رکھیو قدم دشت عشق میں مجنوں

کہ اس دیار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

کون لیتا تھا نام مجنوں کا

جب کہ عہد جنوں ہمارا تھا ۔ میر

ظاہر ہے کہ ان تمام اشعار میں ادعا کا سیدھا انداز ہے۔ مومن جو تہ دار بات کہنے کے فن میں ماہر ہیں سیدھا ادعا نہیں کرتے بلکہ پہلے ایک مفروضے کو پس منظر بناتے ہیں ۔ یعنی عاشقی کے میدان میں مجنوں تو میرے سائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد معشوق وحشت پیشہ سے خطاب کرتے ہیں کہ تم محفل میں مجنوں کا نام سنتے ہی وہاں سے اٹھ گئے۔ حالانکہ وہ بے چارہ میرے مقابلے میں محض سایہ ہے۔ اس شعر میں یہ دونوں مفروضے کہ (۱) معشوق کو ذکر عشاق سے نفرت ہے (۲) مجنوں میرے سامنے بے حقیقت ہے۔ بالکل مذکور نہیں ۔ تاہم معنی خیز الفاظ سے یہ دونوں باتیں ازخود مترشح ہیں ۔ اس پر مجنوں ۔ وحشت ۔ پری اور سائے کے الفاظ سے جو لطیفہ ایہام وتناسب پیدا ہوا ہے نکتہ شناس اصحاب سے داد طلب ہے۔ اسی انداز میں یہ مقطع بھی ہے اور یہی پہلو رکھتا ہے

بہت نازاں ہے تو اے قیس وحشت پر دکھا دوں گا

کتابوں میں کہیں قصہ جو مومن کا نکل آیا

یعنی تم تو ابھی چار دن سے میدان عشق میں وارد ہوئے ہو۔ تم سے پہلے اس فن

کے ماھر کامل جناب مومن گزرے ھین ۔ جن کی داستان الفت کا بون مین درج ھے۔

الفاظ سےمعنی آفرینی کےعلاوہ مومن ایک اور طریقے سے بھی یہ مقصد حاصل کرتے ھین ۔ وہ مناسب تشبیہون کے ذریعے کسی شے مین چند اوصاف متعین کرتے ھین اور پھر ان اوصاف سے مختلف صفات کا انتساب کسی موصوف سے (بالعموم معشوق سے) کرتے ھین ۔ آزاد کا بیان ھےکہ ۔

" ان کی زبان مین چند وصف خاص ھین جن کا جتلانا لطف سے
خالی نہین ۔ وہ اکثر ایک شے کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے ذات
شے کی طرف نسبت کرتے ھین اور اس ھیر پھیر سے شعر مین
عجب لطیف لطیف معانی پنہان کر دیتے ھین " ۔ (۱)

امتیاز احمد صاحب کے الفاظ مین اس صورت کو " استعارہ بالکنایہ " کہا جا سکتا ھے (۲)
راقم کے خیال مین یہ تشبیہ مرسل کی ایک صورت ھے جو مومن کے پیچ در پیچ
انداز بیان سے تو ترا شیدہ الماس کی طرح نئے نئے رنگ دکھاتی ھے ۔ اس وصف کا تجزیہ
کرنے کے لئے ایک شعر پڑھیے ؎

کتنا شعاع مہر نے حیران کیا ھمین
تکتے ھین کب سے روزن دیوار کی طرف

اس مین لود رپردہ یہ مفروضہ پوشیدہ ھےکہ جب کبھی محبوب روزن دیوار کے
قریب آکر جھا نکتا ھے تو تاب حسن کی وجہ سے روزن اسی طرح جگمگا نے لگتا ھے جیسا
کہ شعاع آفتاب پڑنے سے ۔ اس مماثلت کی وجہ سے کبھی کبھی مغالطہ بھی ھوجا تا ھے اور

---

۱ ۔ آب حیات ص
۲ ۔ نگار مومن نمبر ص ۲۸

یہ صورت پیش آتی ہے کہ روزن در حقیقت شعاع آفتاب سے چمکتا ہے اور ہم غلطی سے سمجھتے رہتے ہیں کہ اس کی تابانی معشوق کے عارض پر نور کے انعکاس سے ہے۔ ایسے ہی عالم میں تعلی کر کہتا ہے کہ آج شعاع مہر نے ہمیں مغالطے میں ڈال کر کتنا پریشان کیا ہے"۔ تخیل کی یہ لطافت جب انداز بیان کی تہ داری سے ملتی ہے تو شعر آئینہ خانہ بن جاتا ہے۔ اسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں

> " ان کی نازک خیالیاں شطرنج کے نقشوں کی
> طرح دقت نظر کی حامل ہوتی ہیں[1] "۔

مندرجہ ذیل شعر بھی یہی پہلو رکھتا ہے

> واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں
>
> عالم شب وصال کے نظروں میں پھر گئے

واعظ کہا کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سورج کی حرارت و تابانی انتہا درجے کی ہوگی اس بیان سے شاعر کا خیال شب وصل کی طرف جاتا ہے جب وہ معشوقہ مہر جمال کے ساتھ ہم آغوش تھا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے محبوب کے ساتھ قرب تام حاصل تھا یا میرا سر اس کے عارض پر نور کے برابر ایک ہی تکیے پر تھا۔ وہ واعظ کے اس بیان کا حوالہ بھی نہیں دیتا کہ قیامت کے دن سورج سوا نیزے پر آجائے گا۔ ان دونوں واقعات پر حذف و ایجاز کا گہرا پردہ ڈال کر دونوں کی مماثلت کا اشارہ کرتا ہے اور اپنے مخصوص رنگین انداز میں کہتا ہے کہ واعظ کے بیان سے شب وصال کا عالم میری نگاہ میں پھر گیا۔ جب انتہائی قرب کے باعث محبوب کی تاب حسن سے

۱۔ دلی کا دبستان شاعری ص ۲۲۹ (۱۹۲۹ء)

میری نگاہ خیرہ ہوئی جاتی تھی اور اس نے بھبکتے ہوئے جسم کی لطیف حرارت میری رگ و پے مین سرایت کر رہی تھی ۔

نیند مین یا رب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا
ہے زمین سے روشنی افلاک تو ر اسمان تلک

یہان بھی محبوب کی تاب حسن کا بیان ہے جو ایک مفروضے پر قائم ہے۔ یعنی عارض محبوب کی تابانی کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی نقاب ہٹ جاتی ہے تو اس کی تنویر سے زمین آسمان روشن ہو جاتے ہین ۔ اس مفروضے کو بیان کئے بغیر انتہائی استعجاب سے سوالیہ انداز مین پوچھتا ہے کہ نہ جانے کس مہر جمال کے چہرے سے دوپٹہ ہٹ گیا ہے۔ جو اس کے روئے نور کی تنویر زمین سے آسمان تک پھیل گئی ہے۔ مومن سحر بیان اتنی پُرکاری پر قناعت نہین کرتا بلکہ لطیف احتیاط کے ساتھ " نیند مین " کا ٹکڑا بڑھا کر محبوب کی شرم و حیا کا اشارہ بھی کرتا ہے کہ وہ حیا شعار بیداری کے عالم مین ہرگز چہرے کو بے نقاب نہین ہونے دیتی ۔ صرف نیند مین کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ نقاب چہرے سے سرک جاتی ہے اور اس کی روشنی زمین و زمان مین پھیل جاتی ہے۔

ہر آن آپ ذکر کا ہوا مین عاشق زار
وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

اس شعر کی معنی آفرینی پر غور کرنے سے پہلے میر اور نظیری کے اشعار سن لیجئے جو ایک حد تک اسی مضمون کے حامل ہین ۔

سراپا میں جس جا نظر کیجئے

وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

دونوں استادوں نے سراپا ئے یار کی خوبی کا بیان کیا ہے کہ ہر عضو اتنا دلکش
ہے کہ ساری عمر اسی ایک عضو کی خوشنمائی دیکھے جائیے تب بھی دل سیر نہ ہو۔
یہ مضمون شاید مومن کی نظر میں تھا ۔انھوں نے اسے لطیف تر پیرائے میں پیش
یا – یعنی محبوب کی ادائیں اتنی دلفریب ہیں کہ اس کی ہر ادا اور ہر انداز
یک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہیں – میں ابھی ایک انداز پر فریفتہ ہوں کہ
وسرا انداز جو اس سے بھی دلکش ہے نظر کے سامنے آتا ہے اور میں اس میں محو ہو
اتا ہوں – یہاں تک کہ مومن کا مضمون میر اور نظیری کے مضمون سے متحد ہے۔
ن کا فن اس کے بعد شروع ہوتا ہے – دوسرے مصرعے کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں
ہ جو شخص محبوب کی ایک ادا کے بعد دوسری پر فریفتہ ہو جائے اسے وفادار نہیں
کہہ سکتے – وفاداری جس میں استواری کی شرط لازمی ہے ۰ اس بات کی طالب ہے
ہ انسان صرف ایک ادا ۰ صرف ایک انداز کا عاشق رہے۔ اگر کوئی شخص یکے
عد دیگرے مختلف اداؤں پر جان دیتا ہے تو شیفتگی کے باوجود اس کی وفا میں
صور ہے – میرا یہی حال ہے کہ ہر لحظہ محبوب کی ایک نئی ادا پر عاشق ہوتا ہوں
ور وہ انتہائے سادگی سے مجھے وفا شعار سمجھے جاتا ہے – حالانکہ اس کلیے کی

رو سے جو دوسرے مصرعے میں بیان ہوا ہے میں بے وفائی کا ارتکاب کر رہا ہوں۔

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں

بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے

اس مقطعے میں ایجاز و اختصار کی پرکاری اور مناسب الفاظ کی معنی آفرینی دیکھیئے ۔ دوسرا مصرع پوری قطعیت کے ساتھ دعوی کر رہا ہے کہ ہمارا دین (صنم پرستی) یقینا" اسلام سے بہتر ہے اور یہ بھی یقینی امر تھا کہ ایک نہ ایک دن مومن اس مذہب میں داخل ہو کر رہے گا ۔ اب جب کہ وہ مذہب عشق اختیار کر چکا ہے تو پوچھنے والا انتہائی بے پروائی سے پوچھتا ہے کہ آپ نے کب سے بتوں کی بندگی شروع کر دی ۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کہتا ہے کہ آخر آپ بھی ہمارے دین متین میں آگئے ۔ اچھا ہوا ۔

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر

کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

قائل کے نزدیک صنم کی شان اس سے کہیں بلند ہے کہ لوگ اس کے قدم پر سجدہ کرنے کی جرأت کر سکیں ۔ اس مفروضہ حقیقت کو بیان کرنے کے بجائے تنبیہ کے انداز میں خطاب کرتا ہے کہ اے مومن کہیں اس کے قدم پر سجدہ کرنے کی جرات نہ کر بیٹھنا دوسرے مصرعے میں صنم کی بلند پائگی کو تقابل کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ ایسی بیہودگیاں کعبے میں ہوا کرتی ہیں ۔ لیکن صنم کے ساتھ ایسی بیباکی کا تصور انتہائی گستاخی ہے جو آئین بت پرستی میں ہرگز جائز نہیں ۔

غرض یہ تہ داری جو مومن کی غزلوں میں کہیں آئینہ خانے کا اور کہیں طلسمات کا عالم دکھاتی ہے۔ اتنی پر لطف ہے کہ اس سے معانی کے لطیف پہلو از خود منعکس ہوتے ہیں۔ اس وصف میں مومن کا شریک اگر کوئی ہے تو مرزا غالب ہیں لیکن ان کی معنی آفرینی غزل اور قصیدے میں متعدد دنیوی مطالب پر صرف ہوئی ہے۔ خالص تغزل کے دائرے میں مومن سے بڑھ کر اردو کے کسی اور شاعر نے یہ جلوہ نہیں دکھایا۔ اس انداز کے مزید مطالعے کے لیے حسب ذیل اشعار بلا تبصرہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے

رہ گیا سینے میں اس کا کوئی پیکان ہوگا

میں مر گیا وہ چشم جو یاد آئی اور یار

حیران میں کہ مے تھی پیالے میں سم نہ تھا

جنبشِ نرگسِ جنت نے رلایا مومن

چشم کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

چھوڑ کر بتخانہ مومن سجدہ کعبے میں نہ کر

خاک میں ظالم نہ یوں قدر جبیں سائی ملا

جانا حرام ہجر بتاں میں تو کیا گناہ

پیر مغاں شراب ہے شیشے میں سم نہیں

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشت باغ کو

کچھ رنگ بوئے گل کے سوا ہے صبا کے ساتھ

کھا کھا کے زخم سوئے نمک زار پر دریغ

کھو بیٹھے اپنی جان تن آسانیون مین ہم

یون لب خنجر کے بوسے متصل لیتے نہ تھے

زخم کاری کی ہوس مین کام میرا ہوگیا

حسرت بوسۂ کاکل کا کیا ہم نے علاج

زخم دل مشک سے اے ناصیہ ہو بھرتے ہین

باد بہار مین ہے کچھ اور عطر بیزی

تم آج کل مین شاید سوئے چمن گئے ہو

اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق مین

بالین سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا

مومن اس بت کے نسیم ناز مین ہی

تم کو دعوائے اتقا نہ رہا

ہے سخاوت اسے قرار کہان کہ ہے عادت طبیعت ثانی

معاملہ بندی مقالہ ھذا کے دوسرے باب مین مومن عاشق مزاج کی حسن پرستی کا بیان ہوا ہے — یہ بھی ذکر ہوچکا ہے کہ وہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت مند انسان تھے — ایک تندرست و صحیح القوی جوان کی حیثیت سے انھون نے زندگی کی لذتون سے خوب حظ اٹھایا تھا اور عہد شباب مین متعدد حسینون سے کاروبار عشق کا سلسلہ قائم کیا تھا — ان کے ذاتی حالات سے متعلق مثنویون سے جوان کی حسیات معاشقہ کی "منظوم تحریرین" (۱) مین پتہ چلتا ہے کہ انھون نے جوانی کے رنگین دور مین گناہ عشق کا ارتکاب کئی بار کیا تھا — کم از کم آٹھ دس پری پیکر حسن کے حسن و جمال اور انداز و ادا کی تفاصیل مثنویون مین درج ہین ۔ ان کی منظور نظر رہ چکی مین یہ تعداد بھی صرف تحریری شہادتون کی بنا پر معین کی گئی ہے ورنہ ڈاکٹر عبادت کے بقول "ایسے ایسے عشق مومن نے نہ جانے کتنی بار کیے تھے" (۲) — معزز گھرانون کی پردہ نشین خواتین کے علاوہ انھون نے متعدد کنیزون ۔ خانگیون ۔ طوائفون اور ڈومنیون کے حسن سے آنکھین سینکی تھین — نجوم — رمل — جفر — طلسم سامری — طب — عملیات اور نہ جانے کتنے فنون ان کے ناخنون مین پڑے تھے — جن کی بدولت انھین ہر طبقے کے گھرانون مین رسائی حاصل تھی — وہ خود توعاشق مزاج تھے ہی لیکن ان کے مردانہ حسن ۔ خوش پوشی ۔ جامہ زیبی ۔ شائستگی اور خوش بیانی نے بھی انھین "محبوب دلہا" بنا دیا تھا — (۳)

---

۱ — اقتدیا زاحد — نقاد و مومن نمبر ص ۵۷ ۲ — مقدمہ کلیات اردو — ص ۲۶

۳ — اس معاملے مین وہ رومی شاعر اووڈ بس سے بہت مشابہ ہین جو بہت خوش پوش اور آراستہ و پیراستہ رہتا تھا اور اپنی خوبروئی و خوش پوشی کی بدولت حسینون کا مطلوب و محبوب تھا — اپنی کتاب The Art of Love مین (ص ۵۷ و ما بعد) آرائش و پیرائش کے نیز آداب مجلسی کے اکثر نکات بیان کئے ہین —

انگریزی شاعر بائرن کی طرح حسین جس کا حسن لندن کی خواتین کو مقناطیس کی طرح کھینچتا تھا زیبا شمائل مومن پر بھی دلّی کی دلربا ئین جان چھڑکتی تھیں — مثنویوں کے علاوہ دیگر شہادتوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھیں ان معاشقوں میں نیا زمندی کی چندان نوبت نہیں آئی — وہ بہ یک وقت عاشق بھی تھے اور معشوق بھی (1) — انھوں نے کار وبار شوق اتنی بار کیا تھا کہ اس فن کا کوئی پہلو ان سے مخفی نہ رہا تھا — اور وہ تمام صورتیں جو عاشق و معشوق کے درمیان پیش آتی ہیں ایک مرتبہ نہیں کئی بار انھیں پیش آئی تھیں —

ظاہر ہے کہ جو شخص معاملات عشق کا اتنا ماہر ہو اس کی نظر سے ان کا کوئی گوشہ چھپا نہیں رہ سکتا — مومن نے راہ عشق کے تمام پیچ و خم دیکھے تھے — وہ راتوں کی تاریکی، دوپہر کی خاموشی اور پچھلے پہر کی سناٹے میں حسینوں سے ملا کرتے تھے — خلوت کے ان رنگین لمحات میں عرض تمنا، اظہار محبت، گلے شکوے، شکر رنجی، طنز و طعن، بوس و کنار، استقبال و داع غرض تمام مرحلے پیش آتے تھے — وہ جذباتی آدمی تھے اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنی سرگزشت کو نظم کرنے کا میلان ان میں فطری تھا — یہ بھی معلوم ہے کہ انھیں امراء یا بادشاہوں کے دربار سے تعلق نہ تھا لہذا ان کی تمام قوت شعری معاملات الفت بیان کرنے کے لئے وقف تھی — میلی — ولی اور وحشی کی طرح جو تمام عمر عشق کی کیفیات نظم کرتے رہے مومن نے بھی اپنے قلم کی روانی کو مہر و محبت کی واردات لکھنے کے لئے وقف رکھا — ایک نقاد کے بقول " جس طرح نابان نے

---

1 — میں اسیر اسکے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا
مومن

شراب کو اپنی زندگی بنا لیا تھا ۔ مومن کے لئے عشق صنم ناگزیر تھا ۔(۱)

ان کی غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں حسن وعشق کی دلفریب ادائیں محبت کے معاملے اور الفت کے وقوعے پوری صداقت کے ساتھ نظم ہوئے ہیں ۔ مومن کی معاملہ بندی اسی صداقت وخلوص کے طفیل دوسروں کی وقوعہ گوئی سے ممتاز ہے ۔

اس خصوصیت میں جسے مومن نے بڑی خوبی کے ساتھ نبھا ہا ہے ہمیشہ افراط وتفریط کا امکان رہتا ہے ۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ معاملات الفت بیان کرنے میں شاعر ذرا بہکا اور ابتذال کے گڑھے میں گر کر بوالہوسی کی کیچڑ میں لت پت ہوا جرأت کی کمزوری یہی تھی کہ وہ محبوب کے ساتھ بات کرتے وقت انتہائی عجز و انکسار کی تصویر بن جاتے ہیں لیکن جوں ہی طبیعت مزے میں آتی ہے خلوت تک کی واردات پوست کندہ الفاظ میں بیان کر نے لگتے ہیں ۔ ان کا یہ غیر معتدل انداز زبانی گفت و شنید پر قانع ہونے کے بجائے ابھری ہوئی گات اور مخمل جیسے ملائم پیٹ پر ہاتھ پھیرنے کی لذت بیان کرنے لگتا ہے ۔ یہی وہ منزل ہے جہاں انہیں " چوماچاٹی " (۲) اور " نغمہ ہائے خارج از آہنگ " (۳) کا طعنہ سننا پڑتا ہے ۔

جرأت مومن کے پیشرو تھے ۔ داغ نے مومن سے تیس پینتیس سال بعد کا زمانہ پایا ۔ داغ بھی معاملہ بندی کے لئے مشہور ہیں لیکن وہی بے اعتدالی جس

---

۱ ۔ اختر اوریثوی ۔ تنقید جدید ص ۱۲۰ (۲) شیفتہ گلشن بے خار ۔ ص ۸۸

(۳) آبحیات ص ۴۲۸

نے جرأت کو خراب کیا ۔ داغ کے لئے بھی باعث رسوائی ہوئی ۔ اگر یہ سچ ہے کہ ماحول
و وراثت انسان کے مزاج کی تشکیل میں دو اہم ترین عناصر ہیں تو جرأت اور داغ
دونوں کو اس بے راہ روی میں معذور سمجھنا چاہئیے ۔ ان استادوں کے حسب نسب وغیرہ
کی تفاصیل میں جانا بیکار ہے ۔ دونوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کر لینا کافی ہے ۔
جرأت اگرچہ ایک پست طبقے کے فرد تھے لیکن ان کی خوش بیانی ۔ بذلہ سنجی اور
بدیہہ گوئی نے انھیں امراء کی محفلوں کا گلدستہ بنا دیا تھا ۔ وہ آج ایک امیر
کے گھر کل دوسرے کے یہاں مہمان ہوتے تھے اور ان کی طرح طرح سے نازبرداریاں
کی جاتی تھیں ۔ لطیفہ گوئی کی بدولت وہ امراء کی ڈیوڑھیوں تک پہنچ جاتے
اور ماہ پیکر کنیزوں سے حرف و حکایت کر لیتے ۔ داغ اپنے باپ کی طرف سے موروثی
نواب زادے تھے تاہم بعض دوسرے عوامل نے اور قلعے کی اس عیش خیز زوال
آمادہ فضا نے جو ایک رو بہ انحطاط خاندان کی رگوں میں عیاشی کی افیون
داخل کرتی رہتی ہے انھیں بھی لذت پرست بنا دیا تھا ۔ بے لگام بد تربیت سلاطینوں
اور شہزادوں کی صحبت نے انھیں تہذیب و متانت کی صحیح تعلیم دینے کے بجائے
نوک جھونک ۔ دھینگا مشتی ۔ چھیڑ چھاڑ اور سوقیانہ رکاکت کی طرف مائل کر دیا
تھا ۔ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے لال قلعے کی محفل درہم برہم کر دی تو قسمت نے
اس تباہ حال مجمع کو اخلاقی اعتبار سے اور پست کر دیا ۔ وہ دل کے زخموں پر
اندمال بخش مرہم رکھنے کے بجائے عیش و غفلت کے پھاہے لگا کر درد سے بچنے کی راہیں
سوچنے لگے ۔ ان تدبیروں میں جو گریز کا انداز رکھتی تھیں عیاشی ۔ نشہ بازی

اور لہو ولعب کو نمایاں دخل تھا جس نے اکثر قدیم باوقار گھرانوں کو برباد کر دیا ۔ داغ ایسے ہی افراد مین سے تھے ۔ ان کی نوجوانی قلعے کی زمزمہ سنجی مین جوانی رامپور کے پرسکون شبستانون مین اور کہولت حیدرآباد کے قدرشناس دربار مین بسر ہوئی ۔ ہر جگہ انھین تسکین جذبات کا سامان میسر آتا رہا ۔ مومن جیسا علم وفضل اور خاندانی زہد و ورع ان کے حصے مین نہ آیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مطلق العنان جذباتیت نے معاملات عشق کے بیان مین انھین حد سے زیادہ بیباک بنا دیا تھا ۔ حسب ذیل اشعار پڑھئے اور اس ابتذال و رکاکت کا اندازہ کیجیے جس کی پستی کا احساس داغ کو عمر کی کسی منزل مین نہ ہوسکا ۔

تم کو ہے وصل غیر سے انکار
اور اگر ہم نے آکے دیکھ لیا

بجا ہے آپ نہ تھے ہمکنار خلوت مین
عدو سے آپ کی تصویر بولتی ہوگی

کیا کہا پھر تو کہو " ہم نہین سنتے تیری "
نہین سنتے تو ہم ایسون کو سناتے بھی نہین

مومن بھی معاملہ بند ہین لیکن جرأت اور داغ کے برخلاف ان کی معاملہ بندی احتیاط و اعتدال کا دامن تھامے چلتی ہے ۔ آبائی امارت ، خاندانی

زہد و تقوی اور ذاتی علم و فضل انھین ابتذال کی پستی مین گرنے سے محفوظ رکھتے مین – ایک مہذب و شائستہ رئیس زادے کی طرح وہ بڑے رکھ رکھاؤ سے معاملات عشق کا بیان کرتے ہین اور جس طرح ان کی حیات معاشقہ باوقار پردہ دار اورخوش اطوار تھی اسی طرح ان کی وقوعہ گوئی نہایت متین ومہذب ہے – معاملات الفت بیان کرنے مین انھون نے جرأت کو اپنا پیش رو پایا لیکن اسے نمونہ نہین بنایا – ایک نقاد کے بقول انھون نے عشق و ہوس کے جذبات بیان کرنے مین بھی دلّی کی تہذیب کو نبا ہا [(1)] – اورعریانی وابتذال کی کیچڑ سے دامن شعر کوداغ دار نہ ہونے دیا – فارسی کا بہترین ادب اورعرب کے ان شعراء کا کلام مومن کی نظر مین تھا جن کی محبوبہ عفیف اورغیرت مند ہوتی ہے ہمین معلوم ہےکہ انھون نے حسینان بازاری سے بھی تھوڑا بہت ربط رکھا تھا – اس سے بھی انکار نہین کہ معاملہ بندی کے بعض اشعار ان کی علمیت اورشرافت کی سطح سے پست ہین لیکن مذکورہ بالا تمام وجوہ کی بدولت ان کی وقوعہ گوئی مین ایک شریفانہ رکھ رکھاؤ اورمہذب متانت موجود ہے – آل احمد سرور کا یہ قول کہ " مومن کی شاعری علمیت اور ایک پردہ نشین آرٹ کے باوجود جرأت کی چوما چاٹی پر مبنی ہے [(2)] " – میرے نزدیک قابل قبول نہین – اس بارے مین صحیح رائے وہی ہے جوصاحب شعرالہند نے پیش کی ہے –

" ان کی عاشق مزاجی نے ان کوجرات کے رنگ یعنی معاملہ بندی کی طرف مائل کیا لیکن انھون نے اس مین بھی دلی کی شان قائم

---

۱ – عبدالسلام ندوی – شعرالہند – حصہ اوّل ص ۲۲۶ – (۲) نئےاور پرانے چراغ – ص ۴۲

رکھی اور نہایت متانت وتہذیب سے عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے"۔ (۱)

صفیر بلگرامی کا نظریہ بھی یہی ہے ۔

جرات اس رنگ کے موجد تھے مگر بہ سبب کم علمی کے
بہت کھل گئے تھے۔ مومن خان کے علم نے ان واقعات
کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسا پردے مین
رکھا کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے"۔ (۲)

صفیر کی مراد یہی ہے کہ جرات کو اظہار وابلاغ معاملات کا صحیح سلیقہ نہ تھا ۔ اس کے برعکس مومن کے علم وفضل نے انھین عرب اور ایران کے بہترین شعراء کے انداز بیان سے آشنا کر رکھا تھا ۔ وہ معاملات عشق کو پورے اہتمام سے بیان کرنے پر قادر تھے ۔ ان کی افتاد طبع جس مین پردہ داری کو ایک مقام حاصل ہے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ کسی معاملے کو کھل کر بیان کرین ۔ ان کی تہ داری ایک بات مین دس باتون کا اشارہ کر جاتی ہے۔ مومن کی وتوعہ گوئی جو اکثر شاعرون سے زیادہ دلفریب اور رنگین ہے اس کا راز ان کے پہلودار انداز کلام مین مضمر ہے جو ایک ایک حرف سے متعدد مطالب بیان کر جانے کی قدرت رکھتا ہے۔ انھون نے حرف وحکایت ، اختلاط ، گلہ شکوہ ، تغافل ، شوخی وطراری وغیرہ کے معاملات نظم کئے ہین اور ہر جگہ ان کا انداز دوسرون سے مختلف ہے ۔ محبوب کی شوخی گفتار کا تذکرہ سب کرتے ہین لیکن مومن کا طریقہ ملاحظہ ہو ۔

کہے ہے چھیڑ نے کو میرے کو سبھون مرے بس مین
نہ ملنے دون کسی معشوق اور عاشق کو آپس مین

۱- شعر الہند حصہ اول ص ۲۲۶ ۔ (۲) جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۲۱

بے تعلقی و بے وفائی محبوب کا شیوہ ہے لیکن ستم بالائے ستم دیکھیے کہ مجھ سے کنارہ کش رہنے کے علاوہ یہ ارادہ بھی رکھتا ہے کہ کسی کو کسی سے ملنے دے۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اس مطلعے میں بھی حذف و ایجاز نے متعدد معاملات جمع کر دئے ہیں۔ شاعر اپنے محبوب سے تغافل کا گلہ کرتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میری کنارہ کشی صرف یہ آزمانے کے لئے تھی کہ تمہارے جذبہ دل کی تاثیر کتنی ہے۔ اگر میں تم تک نہ آیا تو ظاہر ہے کہ تمہارا جذب ناقص ہے۔ محبوب کی طراری اور شاعر کا عاجزانہ لہجے سے یہ کہنا کہ

ع میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

لطافت معاملہ کے علاوہ نفسیاتی آہنگ بھی رکھتا ہے۔ سن کے میری مرگ بولے "مر گیا اچھا ہوا کیا برا لگتا تھا جس دم سامنے آجاتے تھا"۔

سنگدل محبوب کے مزاج اور معاملات کا نقشہ اتنے درد و سوز کے ساتھ بیان کرتا بہت کم تاثیر ہے۔ مومن کے کلام میں شکایت آمیز معاملات کا بیان بھی اتنے ہی درد سے ہوا ہے۔ وہ کہیں اپنی وفا کہیں اپنے حلم و تحمل اور کہیں اپنی محبت کا حوالہ دے کر یار جفا شعار سے دل کی داستان کہتے ہیں۔

مومن کسی نے مجھ پر ترجیح دی اس کو
جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

آپ کی کون سی بڑھی عزت

مین اگر بزم مین ذلیل ہوا

اس مقام پر شکوہ شکایت کا ہلکا رنگ اور گلہ مندی کا خفیف سا اثر فریقین کے مزاج کی ترجمانی کر رہا ہے۔ محبوب نے عاشق کو قصداً محفل مین ذلیل کیا ہے ظاہر ہے کہ عاشق کا فطری اور پر تاثیر انداز گفتگو یہی ہے کہ وہ محبوب سے پوچھے " تم نے کیا مزہ پایا ؟ " چنانچہ وہ بے حد دھیمے لہجے مین جس سے گلہ مندی ٹپک رہی ہے پوچھتا ہے کہ میری خواری سے آپ کی عزت مین کیا اضافہ ہوا۔

کیون چھیڑنے کو مجھ کو برا ہونے لگا کیون

ہے غیر کا نامہ۔ نہ مرا خط جبین پہ

محبوب محض چھیڑنے کے لئے عاشق کو اس کے رقیب کا خط دکھلا کر کہتا ہے کہ دیکھنا اس کی عبارت یا تحریر کتنی بےڈھنگی ہے۔ دل شکستہ عاشق غمناک لہجے سے جس مین طنز کا خفیف سا عنصر شامل ہے کہتا ہے کہ اس کی تحریر بھلا کیسے بری ہو سکتی ہے۔ یہ تو غیر کا خط ہے۔ میرا نوشتہ تقدیر نہین ہے۔

مومن کے مزاج نے ان کی دیگر خصوصیات کلام کی طرح معاملہ بندی مین بھی اپنا رنگ دکھایا ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ ان کی طبیعت مین غالب کی سی شوریدگی یا وہ بڑھا ہوا احساس برتری نہ تھا جو انھین کبھی کبھی محبوب سے بھی الجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مومن علم و فضل اور امارت کے باوجود محبوب سے جھنجھلاتے نہین بلکہ ایک جہان دیدہ عاشق کی طرح اپنے طنزیہ انداز سے جوان

۷

کا خاص حسن یہ ہے۔ اس کی دلکشی رکون کو چھیڑ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں ۔ طعن وطنز کا یہ رنگ وقہقہہ کولی میں بھی موجود ہے۔ محبوب اگر غیرون کے ساتھ سرگوشی کر رہا ہے تو مومن اسے براہ راست منع کرنے کے بجائے نکہ طعنہ دی کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ ان سے بات کر لیں ۔ اس کے بعد ہم بھی اپنے دل کی داستان آپ کو سنانا چاہتے ہیں ؎

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ

آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

اسی انداز میں یہ شعر بھی ہے اگرچہ اس کا لہجہ ذرا سخت ہے ؎

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن اوروں کی بات

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

بیان معاملات میں طنز کی یہ نسری بہت لطافت پیدا کر دیتی ہے۔ جرات کے برخلاف جس کے لہجے میں لجاجت وانکسار کا بدنما رنگ ہے یا داغ کے برعکس جو محبوب کے ساتھ بات کرتے ہوئے نوک جھونک سے گزر کر جنگ وجدال پر اتر آتے ہیں مومن کے یہاں شکایت اور طنز کا دھیما انداز ہے ۔

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو

عذر کچھ چاہیئے ستانے کو

طنز کا یہ نرم انداز اشارہ کر رہا ہے کہ آپ ہمیشہ ظلم وستم کرتے رہے ہیں ۔ اب جو یہ امتحان اور آزمانے کا عذر آپ کر رہے ہیں یہ محض بہانہ بازی ہے۔ حرف وحکایت کرتے وقت لطیف شکایت آمیز لہجہ مومن کی خصوصیت ہے جس کا اظہار ان کی بعض

غزلون مین مسلسل ہوا ہے۔

کیون الجھتے ہو جنبش لب سے
خیر ہے مین نے کیا کہا صاحب
کیون لگے دینے خط آزادی
کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

بعض مقامات پر مومن نے معاملات الفت کا بیان انتہائی سادگی سے کیا ہے ایسے موقعون پر خلوص جو سادگی کا نتیجہ ہے وقوعہ کولی کو پرتاثیر بنا تا ہے۔

تڑپ نے لوٹنے رونے کا باعث صاف کھل جاتا
ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بیوفا لگتی

عیش مین بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طرح سحر کرتا ہے

بہت خوب کہا ہے

مین احوال دل مر گیا کہتے کہتے
تھکے تم نہ بس بس سنا کہتے کہتے

چلے تم کہان مین نے تو دم لیا ہے
فسانہ دل زار کا کہتے کہتے

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس نگاہ کا
آنکھین وہ کہہ رہی ہین جو لب سے بیان نہ ہو

دیوان غزلیات مین بعض ایسے مقام بھی ملتے ہین جہان مومن نے پہلو داری طنز مزاح وغیرہ کا سہارا نہین لیا بلکہ واقعے کو بے کم وکاست نظم کر دیا ہے۔اس نوع کی مثالین ان غزلون مین زیادہ ہین جہان شاعر یاد ماضی کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے

عالم خیال میں کسی سے باتیں کرتا ہے۔ ان مقامات پر محویت و استغراق کا یہ عالم ہے کہ شاعر ان تمام خوش آئند معاملات کو جو آغاز الفت کے زرین دور میں پیش آتے تھے "فردا" "فردا" یاد کرتا ہے اور یاد ماضی کو جو حرمان نصیب عاشق کا بیش بہا خزانہ ہے سینے سے لگاتا ہے۔ چنانچہ بعض غزلیں سراسر بیان معاملات کے لئے وقف ہیں اور اردو ادب میں ان کی جامعیت کا جواب نہیں مثلاً

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم جو تھا مرے حال پر

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم

گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا

وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا

سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا

میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اختصار کی غرض سے یہاں اس نظم کے چند اشعار نقل کیے گیے۔ معاملات عشق کی اتنی کثرت اوران کا اتنا پرخلوص بیان کم دیکھنے مین آتا ہے۔ دورحاضر کے ایک نقاد جن کی نظر اسلامی ثقافت پر ہے مومن سے خفا ہین مگر اس غزل کی وحدت تاثّر اور خلوص بیان کے معترف ہین (۱) ۔

معاملات کی یہی کثرت ان غزلون مین بھی نمایان ہے جن مین شاعر یاد ماضی کے بجائے وقتی جذبات سے سرشار ہے اور خود کلامی کے انداز مین ان باتون کا ذکر کرتا ہے جو آغاز الفت کے امید افزا زمانے مین اس کے دل مین ہلچل مچا رہی ہین ۔

پھر سینہ سوز داغ غم شعلہ فام ہے

پھر گرم جوشی دل و سودا ئے خام ہے

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھ کر

از بسکہ یاد جلوہ بالائے بام ہے

—

پھر آ گیا ہے کون سے بیباک کا خیال ــ یہ کیا ہوا کہ رخصت ناموس و نام ہے

جلون سے کس پری کا نظارہ ہوا نصیب ــ پھر اپنے تکیے چننے کیون دھوم دھام ہے

جی چاہتا ہے پوچھے کوئی " کیا وہ مر گیا " ــ پھر ایک بات کہنے مین قصہ تمام ہے

پھر کس نے مسکرا کے مجھے بیوفا کہا ــ کیون کہہ رہا ہون بندہ تو صاحب غلام ہے

پھر پردہ در ہے کس کی وہ انگلی حنائی سی ــ جو شکل صبح چاک گریبان تمام ہے

کس کم سخن نے دیکھ مجھے آہ کی کہ پھر ــ اپنے سے بھی چھپکے رہنے مین کچھ کچھ کلام ہے

۱۔ محمد اکرم ۔ حکیم فرزانہ ص ۲۳۸

پھر کچھ صدا نے پاسے دل مردہ جی اٹھا　　　پھر جلوہ ریز کون قیامت حرام ہے

پھر دوری بتان میں نہیں خواب کا خیال

مومن ہمارے دین میں سونا حرام ہے

بعض مواقع پر خلوص بیان اتنا بڑھ گیا ہے کہ مومن نے ان معاملات کو بھی بےنقاب کر دیا ہے جو پردے میں رہتے تو بہتر تھا ۔ ہنرمند کا کام فطرت کو بعینہ پیش کر دینا نہیں بلکہ اس پر فن کی ہلکی سی نقاب ڈال کر مکروہ پہلوؤں کو چھپا دینا ہے ۔[1] مومن نے بیان معاملات میں جہاں اس نکتے کو فراموش کیا ہے رکاکت و ابتذال پیدا ہو گیا ہے ۔ حسب ذیل اشعار اسی بے اعتدالی کا نتیجہ ہیں اور اپنے خلوص و صداقت کے باوجود لطافت سے عاری ہیں ۔[2]

اے شب وصل غیر بھی کاٹی

تو مجھے آزمائے گا کب تک

وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی

یہ سوچ ہے کیا نہ ہوا صدا کے خواب میں

میرے گھر بھی پھرتے چلتے ایک دن آ جائے گا

دو مبارکباد اب کے یار ہر جائی ملا

---

۱ — Elizabeth Drew, Disc. Poetry chapter III

۲ — نواب مصطفیٰ خان نے ایسے ہی مواقع کے لئے کہا ہے ۔ شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول　اگر اسلوب عبارت میں نزاکت کم ہو

ملے دشمن سے ہو کر بے حجاب آپ　　نہ شرم آئی مرے شوق نہان سے

کود کر گھر مین ترے پہنچا تو مین پھر کیا کہون

دل دھڑک جاتا تھا کھٹکے کے برابر رات کو

صبحدم مہتاب کا سا رنگ کیون ہے گر نہ تھا

بوالہوس کے پاس تو اے نازپرور رات کو

۵

<u>ندرت اسلوب</u> ہر شخص کے بات کہنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ ایک شخص کوئی بات کہتا ہے لیکن کوئی متوجہ نہین ہوتا۔ دوسرا آدمی اسی مفہوم کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ دل مین اتر جاتا ہے۔ ابن رشیق اور نظامی عروضی سمرقندی شاعر کے لئے اس بات کو لازمی قرار دیتے ہین کہ اسے اساتذہ سابق وحال کا کلام بہ کثرت یاد ہو تاکہ وہ ادائے مطالب کی دشوار گزار وادی کو بہ آسانی طے کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ جن شعراء کے انداز بیان مین ندرت ہوتی ہے وہ اپنی بعض کوتاہیون کے باوجود اپنے معاصرین مین ممتاز رہتے ہین۔ میر کا یہ دعوی کہ اس کا شعر سن کر سامع سر دھننے پر مجبور ہوتا ہے یا غالب کی یہ تعلی کہ میرا انداز بیان دوسرے سخنورون سے الگ ہے اسی وصف خاص کا اشارہ کرتے ہین

مومن نے اس وصف مین بھی اپنی برتری کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے کلام کی تہ داری اور معنی آفرینی کا بیان ہو چکا ہے۔ بیان کی تہ داری جس سے مطالب خود بخود ابلتے ہین بڑے اہتمام کی طالب ہے۔ اس کے لئے شاعر کو بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے

انداز بیان ایک فطری جوہر ہے جو شاعر کے کلام کو بے ساختگی کے باوجود دل نشین بناتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی بات کہنے مین کسی کاوش یا اہتمام کی ضرورت مطلقاً" پیش نہین آتی۔ حالانکہ درحقیقت عام راستے سے ہٹ کر بات کہنے کے لئے متعدد تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہین۔ جن مین الفاظ کا انتخاب بات کہنے کا طریقہ حذف، ابہام وغیرہ شامل ہین۔ غالب کا اپنے ہم کوش ہم فنون پر طنز کہ آپ لوگ کس روش خاص پر نازان ہین، بھی معنی رکھتا ہے کہ تم رسم و رہ عام سے الگ ہوکر چلنے کی صلاحیت نہین رکھتے۔

مومن اور غالب مین جہان اور بہت سی باتین مشترک ہین یہ وصف بھی وجہ اشتراک ہے کہ وہ رسم وراہ عام سے بچ کر اپنا راستہ نکالتے ہین۔

ہماری شاعری مین ایسے موضوعات جن پر مختلف شعراء نے اظہار خیال کیا ہو بے شمار ہین۔ ہر شخص اپنی قوت بیان یا انداز کلام کے مطابق اس مضمون کو نظم کرتا ہے۔ یہ خیال کہ محبوب کا گھر یا اس کا کوچہ بہشت سے بہتر ہے کئی بار نظم ہوا ہے۔ غالب نے بھی کوئے محبوب کو جنت پر ترجیح دی ہے۔

کم نہین جلوہ گری مین ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہین

ان کا یہ شعر انداز بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ جنت کوکئی باتون مین کوئے یار کے برابر قرار دینے کے بعد یکایک یہ کہہ کر ذلیل کر دینا کہ " اس قدر آباد نہین " ندرت اسلوب کی اچھی مثال ہے۔ مومن بھی یہی خیال ادا کرتے ہین۔ اور اس

پر تکلف انداز ہے جس کے نمونے انھون نے نظیری کے کلام مین دیکھے تھے بہت دلکش طریقے سے کوچۂ محبوب کو باغ خلد پر ترجیح دیتے ہین ؎

اس کی گلی کہان یہ توکچھ باغ خلد ہے
کس جا نے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ہاتھ

اسلوب کی نزاکت نے بات کو کہین سے کہین پہنچا دیا۔ محذوفات نے (جن کو قاری کا ذہن خود فراہم کر رہا ہے) عاشق کو ایسے عالم مین دکھا یا ہے کہ گویا وہ مرنے کے بعد باغ بہشت مین داخل ہو چکا ہے۔ لیکن دل مین کوئے یار کی یاد ایسی سما ئی ہے کہ وہ جنت کی نزہت و طراوت کو ہیچ سمجھتا ہے۔ یہا ن تک مضمون کی حدود تھین۔ انداز بیان کی خوبی اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ لفظ " کچھ " کا ابہام جہان باغ خلد کی بے مائگی کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ شاعر اسے ایک آدھ مرتبہ دیکھ چکا ہے اور کوئے محبوب کے مقابلے مین حقیر قرار دے چکا ہے۔ اب جو بعد مرگ اسے باغ خلد جیسی بے رونق جگہ مین لا یا گیا ہے (جہا ن بقول مرزا غالبؔ اقامت جاودانی ہے ") تو وہ بڑی بیچارگی سے اپنی بد قسمتی کا ماتم کرتا اور کہتا ہے کہ افسوس موت مجھے کہان لا کر چھوڑ گئی۔

پارہ کر کسیے مین اسکے آستان سے لے گئے
ایک بھی میری نہ مانی لا کہ سر پٹکا کیا

ندرت اسلوب نے اس شعر کے اکثر ٹکڑون کو دلفریب بنا دیا ہے۔ پہلا مصرع قطعیت کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے کہ آستان یار کے مقابلے مین کعبہ بالکل غیر دلکش اور

بے برکت مقام ہے۔ چارہ کرون بے از خود رفتہ عاشق کو تیسرک وتیشن کے خیال سے کسی مین پہنچادیا کہ یقینا " بیت اللہ کی برکت سے اس کے حال خراب کی اصلاح ہو جائے گی ۔ لیکن یہ امید نہ پوری ہونی تھی نہ ہوئی ۔ مصرع ثانی مزید شدت سے عاشق کے عقیدے کی تائید کر رہا ہے جو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے کسی جانے سے خاک فائدہ نہ ہوگا ۔ " ایک بھی میری نہ مانی " سے جہان چارہ گرون کی جابرانہ ضد کا اظہار ہو رہا ہے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ تدبیر بیکار ہے ؎

ہے اعتبار میرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہان چشم پاسبان کے لئے

وہ خصوصیات جو مومن کے اسلوب کلام مین دلکشی پیدا کرتی ہین متعدد ہین ان مین سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اکثر صراحت کے بجائے کنایہ اور ابہام واجمال سے کام لیتے ہین کچھ کچھ تو ۔ بھی ۔ کیا ۔ کیا کیا ۔ کتنا ۔ کیسا ۔ سا ۔ کم کم ۔ وغیرہ وہ الفاظ ہین جو صراحت وقطعیت کی سطح سے نیچے رہتے ہین اور ان کا مبہم ہونا ہی قاری کے تخئیل کو پر لگا کر اڑاتا ہے ۔ اس شعر مین " کیا کیا " مبہم طریقے پر شدت اعتماد کی انتہا ظاہر کر رہا ہے ۔ پاسبان اتنا فرض شناس اور مستعد ہے کہ بھول کر بھی غافل نہین ہو سکتا ۔ لیکن چونکہ میرے بخت خفتہ پر اسے کامل اعتماد ہے لہذا کامل اطمینان سے سوتا ہے ۔ تجاہل آمیز مبہم الفاظ سے انداز بیان مین جو لامحدودیت پیدا ہوتی ہے اسے علم معانی کے نکتہ شناس خوب جانتے ہین ۔

اس کی مثالیں اساتذہ کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں ۔

فردوسی
نظامی

مگر شہ نداند کہ در روز جنگ

چہ سرہا بریدم در اقصائے زنگ

بہ یک تاختن تا کجا تاختم

چہ گردن کشان را سر انداختم

تا کجا اور چہ کا ابہام لا محدود زور بیان کا حامل ہے جو صراحت

سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح ۔

میر ؔ

کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنا نے گئے

جسی تڑپے ہے جان جلے ہے حال جگر کا کیا ہوگا

مجنون مجنون لوگ کہے ہیں مجنون کیا ہم سا ہوگا

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز

اسی خانہ خراب کی سی ہے

غالب

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی

گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

تجاہل و ابہام سے معیار کیفیت پیدا کرنے کا فن مومن خوب جانتے ہیں ۔ مثال

کے لئے ذیل کے اشعار دیکھیے ۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے بھی تو کیا　　　اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ

اے روز حشر کچھ شب ہجران بھی کم نہین بد نام ہو جہان مین تیری بلا جبث

کیا خجل ہون اب علاج بیقراری کیا کرون دھر دیا ھا تھ اس نے دل پر تب بھی دل دھڑکا کیا

کچھ قیس اور مین ہی نہین سب کے سب موئے اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا

کیا یار کے آنیکی سنی کچھ که اجل کسی کا ہے کی خوشی ہجر مین ہے جان حزین پہ

کچھ شور محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکین پہ

دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا بخت تیرے عاشقون کے غار سا کہنے کو ہین

انداز بیان کی ندرت بعض اوقات ان مفروضات کے ذکر سے پیدا ہوتی ہے جو قائل کے نزدیک ایک مسلم حقیقت ہین لیکن دوسرے اشخاص اکثر ان کی صداقت سے اعراض کرتے ہین — یہ امر که درد عشق کا علاج صرف موت سے ہو سکتا ہے۔ عاشق کے نزدیک محکمات مین سے ہے۔ اس لئے پورے یقین سے اپنے تجربے کا ذکر کرتا ہے —

سم کھا موئے تو درد دل زار کم ہوا
بارے کچھ اس دوا سے یہ آزار کم ہوا

لفظ کچھ کے ابہام نے لطف بیان مین اضافہ کر دیا — یعنی اس دوا سے بھی شفائے کامل حاصل نہ ہوئی تھوڑا سا افاقہ البتہ ہو گیا —

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو
ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

گویا یہ ایک حقیقت ہے کہ محبوب کے زاہد فریب حسن کو دیکھ کر صبر کرنا محال ہے ناصحون کی جماعت عاشق زار کو بڑی دیر سے ملامت کر رہی تھی کہ یکا یک وہ دشمن صبر و شکیب ادھر آ نکلا ۔ اب عاشق کی بن آئی ۔ چنانچہ کامل طمانیت کے ساتھ ناصحون سے خطاب کرتا ہے کہ اب اپنے دل کو سنبھال لو تو جانون ۔ آہی کیا کا ٹکڑا اشارہ کرتا ہے کہ عاشق کو اپنے دعوے کی تصدیق کے لئے صرف محبوب کے آنے کا انتظار تھا ۔ انداز بیان کی دل نشینی کے لئے الفاظ کی یہ دروبست ضروری ہے۔[1] گرچہ مومن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ " یہ لفظ پیرائی نداشتہ "[(1)] ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ کبھی کبھی الفاظ وعبارات کے انتخاب مین کاوش کرتے تھے۔

راز نہان زبان اغیار تک نہ پہنچا

کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

یہ شعر کسی مسلمہ حقیقت کے بجائے اس سیدھی سادی منطق استخراجی پر مبنی ہے جس سے ہر شخص زندگی مین اخذ نتائج کیا کرتا ہے۔ شاعر کا تجربہ ہے کہ جو بات محبوب سے کہی جائے وہ اسے رقیبون تک پہنچا دیتا ہے اس نے محبوب کو متعدد خطوط لکھ کر اظہار الفت کیا ہے لیکن رقیب اب تک اس راز سے بے خبر ہین ۔ واقعات کی اس ترتیب سے یہ نتیجہ نکلتا کہ ہمارے خطوط یار تک نہین پہنچے انداز بیان کی لطافت مین اضافہ کر رہا ہے۔

آتی ہے بوئے داغ شب تار ہجر مین

سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

---

۱ ۔ مقدمہ دیوان مومن از شیفتہ ۔

یہان بھی واقعات کی ترتیب سے نتائج اخذ کئے گئے ہین ۔ لہجے کی وہ انفرادی
بے نیازی جو مومن کی خصوصیت ہے اور جس کی مثالین پہلے بیان ہو چکی ہین اس شعر
مین پورے حسن سے نمایان ہے ۔ تاریک رات مین عاشق کو اپنے سینے سے داغ کی بو
آ رہی ہے ۔ معاً اسے خیال آتا ہے کہ جوش وحشت مین بارہا کر یبان چاک کرتے کرتے
وہ سینے کے بھی ٹکڑے اڑا چکا ہے ۔ غالباً آج بھی وہی صورت پیش آئی ہے ۔ سینے
سے بوئے داغ کا نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قبا کے ساتھ سینہ بھی چاک ہو چکا ہے
بہ این ہمہ اسے اضطراب یا استعجاب مطلق نہین ۔ لہجے کی بے نیازی اشارہ کر رہی
ہے کہ یہ صورت پہلے بھی کئی بار واقع ہو چکی ہے ۔ مصرع ثانی کا مبہم غیر واضح
انداز عاشق کے تحمل اور حوصلے کا ثبوت دینے کے علاوہ بے پایان سوز وگداز کا
بھی مظہر ہے ۔ " شب تار ہجر " کا ٹکڑا انتخاب الفاظ کا شاہکار ہے اور یہ اشارہ
کر رہا ہے کہ تاریک رات مین نگاہ کام کرنے سے قاصر ہے لہذا قوت شامہ سے مدد لینی
پڑی ۔ انداز بیان کی ندرت جب اس کمال کو پہنچ جائے تو صاحب مرآۃ الشعر کی
رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ محض ندرت اسلوب شعر کی
کامیابی کے لئے کافی ہے ۔ میر اور غالب دونون نے یہی مضمون باندھا ہے ۔ محاکمہ
(۱) (۲)
و مقابلہ کا ارادہ نہین تاہم انصاف اتنا کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ندرت بیان ، سوز و
گداز اور رچے ہوئے انداز کی دلآویزی مین دونون بزرگ مومن کی سطح تک نہین پہنچ سکے

۱ ۔ شمس العلماء مولوی عبدالرحمن ۔ مرآۃ الشعر ص ۹۱

۲ ۔ آتش غم مین دل جلا شاید دیر سے بو کباب کی سی ہے (میر)

داغ دل گر نظر نہین آتا بو بھی اے چارہ گر نہین آتی (غالب)

استنباط نتائج کرتے ہوئے کبھی کبھی مومن خوش طبعی کا ثبوت دیتے ہیں اور اسلوب میں شگفتگی پیدا کرنے کے لئے شوخی طبع کا سہارا لے لیتے ہیں ۔ ان کے کلام میں یہ صورت کم ملتی ہے ۔ بیان کی شوخی میں مرزا غالب ان کے حریف غالب ہیں ۔ تاہم جہاں کہیں مومن نے شوخی بیان سے کام لیا ہے اسلوب میں نزاکت و لطافت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں مثلاً

محتسب آپ کے آنے سے ہوا دیر خراب

قصد کعبے کا نہ کیجیے کا بہ این یمن قدوم

ظاہر ہے کہ جن قدموں کی برکت سے بت خانہ برباد ہوگیا وہ کعبے میں پہنچ کر بھی یہی تاثیر دکھائیں گے ۔

ایک اور ذریعہ جس سے مومن مختلف مواقع پر کام لیتے ہیں تکلفی لہجہ اور انداز خطاب ہے ۔ ندرت اسلوب پیدا کرنے کے لئے مومن نے اس ذریعے کو خوب برتا ہے اور مناسب حذف و ایجاز یا دوسرے ذرائع کے امتزاج سے بعض مقامات پر ایسے اسالیب بروئے کار لائے ہیں جن کی ندرت تعریف و توصیف سے بالاتر ہے ۔

جراح کیا سوچا بتا ۔ کیا رنگ دیکھا ۔ کیا ہوا

کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

زخم جگر کا کاری یا ناقابل علاج ہونا عام مضمون ہے ۔ اکثر اساتذہ نے یہ مضمون باندھا ہے اور چاک جگر کا رفو یا مرہم کی چارہ سازی سے باہر ہونا نظم کیا ہے مومن نے ان مطالب کو پیش کرتے ہوئے عجب سحر کیا ہے ۔ " کھول لی پٹی " کا ٹکڑا

اپنے انوکھے انداز سے بےشمار تاثرات دامن میں لئے ہوئے ہے ۔ جراح نے زخم جگر کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ بہت گہرا ہے ۔ تاہم اس کی خود اعتمادی نے حوصلہ بخشتی ہے اور وہ امید و بیم کے عالم میں اس پر پٹی باندھ دیتا ہے ۔ یکایک سابقہ تجربہ اسے بتاتا ہے کہ ایسے زخم ہمیشہ جان لے کر رہتے ہیں ۔ ان کی مرہم پٹی کرنا اور زخمی کو فریب میں مبتلا رکھنا بے سود ہے ۔ وہ تذبذب میں پڑ جاتا ہے ۔ یاس اور امید کی اس کشمکش میں بالآخر یاس غالب آتی ہے اور وہ بادل ناخواستہ باندھی ہوئی پٹی کھول لیتا ہے ۔ مجروح جواب تک جراح کے ذہنی تلاطم سے بےخبر ہے اضطراب کے عالم میں اس سے پوچھتا ہے کہ تو نے میرے زخم دیکھ کر کیا فیصلہ کیا ۔ زخموں کی کیا کیفیت ہے ۔ پٹی جو تو نے باندھی تھی کس لئے کھول لی ؟ شاعر کی نفسیاتی ژرف نگاہی یہاں بے اختیار تحسین طلب ہے ۔ زخمی شخص جس نے اپنے علاج کے لئے بہترین جراح کو بلایا تھا اس کے تذبذب کو تھوڑا بہت بھانپ چکا تھا ۔ اب جو اس نے پٹی کھول لی تو اضطراب کے عالم میں صرف ایک بات پوچھنے کے بجائے پے در پے سوالات کرتا ہے کہ جراح کیا سوچا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا ۔ کیوں پٹی کھول لی ۔ مصرع ثانی کا ملاجاتی اختتام (Abrupt close) مجروح کے اضطراب کی مکمل ترجمانی کر رہا ہے ۔

مندرجہ ذیل اشعار بھی خطابیہ لہجہ رکھنے کے علاوہ اسلوب بیان کی دلکشی کے حامل ہیں ۔

خون جان پہ لب بتان ستمگر کے ہاتھ سے

کیا سب جہان میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

اے ہمدم آہ تلخی ہجراں سے دم نہیں

کرتا ہے دیکھ جام ہلاہل کو تھامنا

آغوش گور ہوگئی ساری لہولہان آساں نہیں ہے آپ کے بسمل کو تھامنا

جوں نکہت گل جنبش ہے جی کا نکل جانا اے باد صبا میری کروٹ تو بدل جانا

سینے میں جو دل تڑپا دھر ہی تو دیا دیکھا پھر بھول گیا کیسا میں ہاتھ کا جل جانا

یعنی اس سے پہلے بھی کئی بار دل سوزاں پر ہاتھ رکھنے سے ہتھیلی جل چکی (جل گئی) ہے مگر اضطراب میں مجھے ہوش نہ رہا اور آج پھر وہی غلطی ہو گئی ۔

اسلوب گفتار کی راہیں اتنی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے ۔ آدمی کی ذہانت ہر موقع پر ظاہر ہوتی ہے چنانچہ انداز بیان میں بھی مومن کا " ذہن بے خطا " متعدد راہیں نکال لیتا ہے ۔ حذف و ایجاز وہ دلفریب حربہ ہے جس سے ادیب محدود ے چند الفاظ میں بہت سے مطالب کہہ سکتا ہے ۔ اگر وہ اپنے فن میں سلیقہ رکھتا ہے تو عبارت کے چند فقرے اس طرح حذف کر جاتا ہے کہ قاری کا ذہن انہیں از خود فراہم کر لے ۔ وہ شعر یا عبارت کے چند الفاظ سے اپنا کام نکا لیتا ہے اور باقی مضمون کو اس قرینے سے حذف کر دیتا ہے کہ ' چھوٹا ہوا مضمون الفاظ کی تہ میں قبا کے نیچے سے صاف جھلکنے لگتا ہے ۔ فارسی میں فغانی نے اسی طرز کو رائج کیا تھا جس کا عروج نظیری اور عرفی کے اشعار میں نظر آتا ہے ۔ مومن

عرفی کا معنوی شاگرد ہے اور حذف وایجاز میں اس کے قدم بہ قدم چل کر اسالیب بیان میں وہ لطافتیں پیدا کرتا ہے کہ "ان من البیان لسحرا" ۔ کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ اگرچہ اس کا مقطع "محشر بہ دامان ذہن" کہیں کہیں محذوفات کی کثرت سے اغلاق و تعقید پیدا کر دیتا ہے۔[1] تاہم اکثر مواقع پر اس کی یہ ادا دل آویزی بیان سے ہمکنار رہی ہے ۔

میں نہ کہتا تھا مصور کہ وہ ہے شعلہ عذار

دیکھ تو صفحہ قرطاس پہ تصویر نہ کھینچ

اس مفروضے سے قطع نظر کہ روئے آتشناک کی حرارت سے قرطاس تصویر جل اٹھتا ہے مصرع ثانی کے آخر میں اتنی بات اور محذوف ہے کہ وہی ہوا جو میں کہہ چکا تھا یعنی قرطاس تصویر میں آگ لگ گئی ۔

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے

صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

قائل کا یہ عقیدہ کہ مجھ بدنصیب کا ایک نہ ایک مصیبت میں مبتلا رہنا یقینی ہے ۔ یہاں محذوف ہے ۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ صیاد کی طرف سے تو اطمینان ہے لیکن اب یہ خدشہ ہے کہ کہیں آشیانے پر بجلی نہ گر پڑے ۔ ایسے ہی مقامات کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں ۔

" قلبی واردات ہمیشہ ابہام اور اجمال کی مقتضی ہوتی ہے

شرح درد اور ذکر جمال کا یہ وابہام چاہتا ہے اور یہ

---

۱ ۔ آل احمد سرور ۔ نئے اور پرانے چراغ ۔ ص ۱۵۷

چاھتا ھے کہ جو بات کی جائے مبہم طور پر کی جائے۔ دل کو

کنایہ و اجمال پسند ھے اور دماغ کو تشریح و وضاحت۔

مومن کی عادت ھے کہ کنائے کے ساتھ کچھ مطالب اور ان

کی منطقی کڑیان چھوڑ جاتے ھین جس سے سامع کو

ذرا ٹھٹک کر سوچنا پڑتا ھے کہ وہ کیا کہہ گئے"۔ (۱)

گو حسد سے ھو پر اب بھی ھے وھی ناصح کی بات

ناحق اس جان جہان کو اک نظر دکھلا دیا

یہان ایک دو نہین پوری تین باتین حذف کی گئی ھین۔

۱) ناصح مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ محبوب کی الفت ترک کر دے۔

۲) مین نے محبوب کے زاھد فریب حسن کا ثبوت دینے کے لئے اسے ایک لمحے کے لئے محبوب کا جلوہ دکھا دیا۔

۳) لیکن میرا یہ فعل بے نتیجہ نکلا کیونکہ ناصح اب بھی ترک عشق کی تاکید کئے جا رھا ھے۔ اگرچہ میرا گمان ھے کہ اب اس کی یہ نصیحت میری بھی خواھی کے بجائے رقابت کے جذبے پر مبنی ھے۔

تاھم الفاظ کی مناسب نشست حذف شدہ مضامین کا اشارہ کر رھی ھے۔

مومن سے اچھی ھو غزل تھا اس لئے یہ زور شور

کیا کیا مضامین لائے ھم کس کس ھنر سے باندھ کر

مصرع اول کے الفاظ یہ پہلو رکھتے ھین کہ مومن سے بہتر تغزل ممکن نہین۔ پھر بھی ھم نے طرح و سخن پر کوشش کی ہر کہ ھماری غزل اس سے بڑھ جائے۔ دوسرے مصرعے کے آخر مین

۱۔ اردو غزل۔ ص ۲۸۱

اتنی عبارت اور محذوف ہے کہ ہم نے بہت نازک مضامین نظم کیے تاہم اس تمام اہتمام کے باوجود ہمیں اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی ۔ حذف وایجاز کی بدولت شعر میں اتنی دل آویزی پیدا ہو گئی ہے کہ تعلی شاعرانہ کے مضمون میں اس سے بہتر شعر بہ مشکل ملے گا ۔

ایجاز کی ان تمام لطافتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض جگہ حذف و ایجاز کی یہ کوشش بے مزہ بلکہ بے معنی ہو جاتی ہے ۔ خصوصاً ایسے مقام پر جہاں حذف شدہ ارکان متعدد ہوں یا ان کے مفاہیم میں اتنے بعید واسطے واقع ہوں کہ ذہن سامع کو ان تک پہنچنے میں غور وفکر کے ہفت خوان طے کرنے پڑیں ۔ مثلاً

کھلا ئے نہ کیوں سرمہ گوسالہ کو

خجل سامری چشم پر فن سے ہے

سامری کا سحر ، اس کے گوسالے سے آواز نکالنا جس سے بنی اسرائیل مسحور ہو کر اسے پوجنے لگے تھے ، سرمہ کھانے سے آواز کا بیٹھ جانا ، چشم پرفن کی سرمے سے مناسبت وغیرہ وغیرہ ایسے مقدمات ہیں کہ جب تک ان سب کو فراہم نہ کر لیجیے شعر کا مفہوم سمجھنا مشکل ہے ۔

اچھی ہے وفا مجھ سے جلتے ہیں جلیں دشمن

تم آج ہوا سمجھو جو روز جزا ہوتا

یعنی بدخواہ اور بدکردار رقیب اگر مجھ سے جلتے ہیں تو جلنے دو ۔ ان کا انجام روز جزا بھی یہی ہونا تھا ۔ (دوزخ میں جلنا) لہذا اگر آج ہی انہیں یہ عذاب اٹھانا پڑے تو کیا برا ہے ۔ حلقۂ تنقید معنوی کی یہ صورتیں مومن کی اسی بڑھی ہوئی

پیوند کاری سے پیدا ہوتی ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل کا نازک آبگینہ بقول سید عابد علی عابد ان سنگریزون کے ساتھ مفاہمت نہیں کرتا (اصول انتقاد ادبیات ص٥٠٦)

ندرت اسلوب کے سلسلے مین مومن کا ایک اور دستور یہ ہے کہ وہ لطیف تاثرات کو مجسم بنا کر پیش کرتے اور انہیں محسوسات کی شکل دے دیتے ہیں ۔ یہ استعارے کی ایک دلکش صورت ہے ۔ تاثرات کے تجسم (Personification) مین نظیری مومن کا پیشرو ہے اور غالبا" انھون نے اس سے یہ شیوہ سیکھا ہے ۔ اردو مین میر نے بھی یہ انداز اختیار کیا ہے ۔ اور غزل مین کمتر لیکن مثنویون مین جا بجا اس سے کام لیا ہے ۔ مومن نے اپنی غزلون مین خال خال اس قاعدے کو راہ دی ہے البتہ مثنویون مین اکثر اس سے فائدہ اٹھا یا اور احساسات کی ترجمانی کی ہے ۔

پھر تلخ کامیون نے کیا جان و دل سے کوچ

پھر آرزوئے بوسہ کا لب پر مقام ہے

اس کو مین جا مرین کے مدد اے ہجوم شوق   آج اور زور کرتے ہین ناطاقتی سے ہم

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے   کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

ع   آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مومن نے مثنوی شکایت ستم مین ایک مقام پر اپنی وہ حالت نظم کی ہے جب فراق کے جانکاہ درد کی تکلیف رفتہ رفتہ کم ہو گئی ہے اور ان کے نوجوان دل نے غم کے بجائے عیش و مسرت کو اپنا مہمان بنا یا ہے ۔ اس موقعے کے چند اشعار یہان درج کیے جاتے ہین

صبر بھی شکل دکھا جائے کبھی   دل نہ ملنے پہ بھی آجائے کبھی

اشک بھی آنکھوں سے کم بہتے تھے   جان وآرام بھی مل رہتے تھے

کچھ دنوں میں ہوا غم اور بھی کم   پھر ذرا اور بھی کم اور بھی کم

پھر تو وہ خبط وہ سودا ہی گیا   دل بیمار بحال آ ہی گیا

منھ پہ اک سرخی کی تہ سی آئی   رنگ رفتہ نے جھلک دکھلائی

چوتھی مثنوی میں بھی ایک مقام ایسا ہی آیا ہے اور تجسم کے ذریعے تاثرات کی ترجمانی ہوئی ہے ۔

عیش کو پھر مہمان بلایا   ربط قدیمی یاد دلایا

تازہ کھلا گل باغ طرب میں   ربط ہوا گلخندہ ولب میں

ہوگئی یاری دل سے خوشی کی   ٹھہری تبسم سے بھی ہنسی کی

اس مثنوی میں بینائی ہجر کا بیان بھی اسی انداز میں ہے اور میر کی مثنویوں کی یاد دلاتا ہے ۔

وہ تو گئے یہ کہہ کے ادھر کو   یاں قلق آیا دیکھنے گھر کو

لے گئے میرا چین وہ بالکل   ساتھ سدھارے صبر وتحمل

سوز نہانی تابی دوزخ   سینہ کرے مہمانی دوزخ

دوسری مثنوی قصہ غم میں آغاز عشق کی فضا کی کیفیت اس طرح نظم کرتے ہیں ۔

اب عشق ہوا ہے مہربان پھر — بیتاب ہے جان نا توان پھر

پھر پہنچے ہے اب پیام الم — پھر آنے لگا سلام غم کا

غم کرنے لگا ہے غمگساری — دیتی ہے قرار بے قراری

گستاخ ہے آہ خونچکان پھر — منہ لگنے لگی ہے کچھ فغان پھر

تناسب الفاظ — یہ خوبی مومن کے معنوی محاسن مین سے نہین تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کا یہ وصف قاری کے ذہن پر لطافت معنی کی راہین کھول کر فکر کو لذت بخشتا ہے۔

تناسب الفاظ کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ لفظی مناسبات اگر بہت قریب کی ہون تو ذوق سلیم ان سے گھبرا اٹھتا اور کبھی رعایت لفظی، کبھی ایہام کہہ کر ان پر ابتذال کی مہر لگا دیتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ پیش پا افتادہ مناسبات اس بات کا ثبوت ہین کہ ادیب انتخاب الفاظ کے معاملے مین عاجز یا بد ذوق ہے۔ قریبی نسبت رکھنے والے الفاظ بہرحال ادیب کی کم کوشی، سہل انگاری اور ادبی تہی مائگی کی دلالت کرتے ہین۔ لکھنئو کے اکثر شعراء کو اس شوق نے خراب کیا۔ ان مین امانت سب سے زیادہ بد نام ہین کہ ان کے قریب قریب ہر شعر مین کئی کئی رعایتین ملتی ہین[1]۔ آتش کا رنگ اساتذہ لکھنئو سے بالکل مختلف ہے اس لئے ان

۱۔ مثلاً" یہ کس کی زلف کی ناگن نے اے دل مار ڈالا ہے
کہ کوسون تک مری تربت پہ پھیلا کوڑیالا ہے

تری جالی کی کرتی کے تصور مین یہ رویا ہون — بھر دیکھ کر آنکھون کو کہتے ہین کہ جالا ہے

گرا یا مصحف عارض کو ہم چشمون کی نظرون سے — ہوا ہے اے صنم خط سیہ کا خط جو کالا ہے

نہ کیونکر بید مجنون تازہ ہو مثل دل لیلی — کہ ہر جادہ دشت وحشت مین مرے اشکون کا نالا ہے

کے دیوان اور ان کے شاگردوں کے کلام میں رعایت لفظی کے داغ کم ہیں ۔ لیکن ناسخ کے تلامذہ آخر تک اس قباحت سے آگاہ نہ ہو سکے ۔ ان کے یہاں یہ عیب کثرت سے موجود ہے

مشرق و مغرب کے اہل قلم ہمیشہ انتخاب الفاظ کی اہمیت کے قائل رہے ہیں ۔ ارسطو ۔ سوفوکلیز ۔ ڈرائیڈن ۔ کالرج ۔ سروالٹر اسکاٹ ۔ ابن قتیبہ ۔ سکاکی ۔ شمس قیس سب کے سب الفاظ کے مقام شناس تھے ۔ معاصر نقادوں میں بھی لفظ کو یہی اہمیت حاصل ہے ۔ دور حاضر کی ایک نقاد کا خیال ہے کہ " شاعری تو الفاظ کا کھیل ہے جو مناسب اجتماع سے طاقت پکڑتے ہیں ۔ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب نفسیات ہمیں بتا دے گی کہ لفظ یا مجموعۂ الفاظ سے ہمارے دل و دماغ میں جو ہنگامہ برپا ہوتا ہے اس کا تجزیہ کس طرح کیا جا سکتا ہے (الزبیتھ ڈریو ۔ انکشاف شاعری ص ۱۶۲ وما بعد) ۔

لفظ بہ ظاہر صورت ہے لیکن اور صورتوں کے برعکس یہ معنی بدوش ہے ۔ ایک رمز آفرین اور خیال افروز کلمہ ذہن پر معانی کی راہیں کھول دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ عربی و فارسی کے اہل بلاغت نے اہتمام لفظ کی خصوصی سفارش کی ہے[1] ۔ فارسی کا عراقی دبستان اسی خصوصیت کا مظہر ہے کہ الفاظ کے لغوی اور وضعی معانی کے علاوہ ان کے معنوی تصورات اور خیالی رابطوں سے ایجاد معنی کا حق ادا کرتا ہے ۔ ادیب کا فرض ہے کہ لفظ کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو اور اسے رکیک مطالب کے لئے (یعنی ہوئی رعایت لفظی) کے لئے استعمال نہ کرے کیونکہ جب

بقیہ حاشیہ) کیا تازہ ہے نخل غم کو ٹھنڈی سانس بھر بھر کے
بڑی محنت سے میں نے یہ شجر جاڑے میں پالا ہے

الفاظ اپنا صحیح منصب ادا کرنے کے بجائے بازی گری کے لئے وقف ہوجاتے ہیں تو ذوق سلیم ان سے ابا کرنے لگتا ہے۔ البتہ اسی قسم کی رعایت لفظی کے نفکار تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج رعایت لفظی کو ایک ذلیل صفت سمجھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اگر الفاظ کے معنوی رابطے لطیف ہوں اور ان کی باہمی نسبتیں ذرا پیچیدہ واقع ہوئی ہوں تو ذہن پر ان کی لطافتوں کا اثر بہت دیر پا ہوتا ہے اور ایک ایسی لذت بخشتا ہے جو خام یا سریع الزوال نہیں ہوتی ۔ روابط معنوی کا لطیف اور خیال انگیز ہونا ہی بلاغت ہے۔ اگرچہ بلاغت کی تعریف میں بعض اساتذہ یہ کہہ کر فارغ ہوگئے ہیں کہ " کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔(۱) لیکن یہ قول جامع نہیں ہے۔ جامع و مانع بات یہی ہے کہ الفاظ کے معنوی روابط بہ کثرت ہوں کلام کے مختلف الفاظ میں وحدت ابلاغ (Unity of communication) کا جوہر ہو اور ہر لفظ کی معنی خیزی مضمون کے پیچیدہ ترین پہلوؤں کی طرف دلالت کرتی ہو۔

مومن کے علم و فضل نے انہیں عربی اور فارسی کی بلاغت کے بہترین فن پاروں سے آشنا کیا تھا ۔ اردو زبان میں عربی بلاغت ڈھونڈھنا یا دلالت معنی کے عمدہ نمونوں کی جستجو کرنا چنداں نتیجہ خیز نہیں ۔ تاہم جو اساتذہ عرب و فارس میں اچھا مقام رکھتے ہیں ان کے کلام میں مذکورہ صفات کا جلوہ نظر آتا ہے۔ مومن کے

بقیہ حاشیہ ص) یہ غزل ایہام تناسب کا معتدل نمونہ ہے ورنہ بعض اشعار اس قدر غیر معتدل ہیں کہ ان کا حوالہ دینے کو بھی جی نہیں چاہتا ۔

۱ ۔ (بقیہ) شمس قیس رازی ۔ المعجم ۔ ص ۳۲۱ جلد اول ۔

۱ ۔ (ص ۲۵۱) ابن قتیبہ ۔ دینوری ۔ الشعر و الشعراء ۔ جلد اول ص ۲۱۵ ۔ شبلی بھی یہی کہتے ہیں

یہان سعدی یا جریر واسطی جیسی بلاغت تو یقینا[1] نہین ملتی لیکن ان کی طبیعت نے انھین سطحی رعایت لفظی سے محفوظ رکھا ہے اور انتخاب الفاظ کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جو ایہام تناسب کی لطیف صفات کا حامل ہونے کے علاوہ دلالت معنی کا جوہر بھی رکھتا ہے اور جس سے قاری کا ذہن حسن معانی کی لذت اٹھاتا ہے۔ راقم کے نزدیک اس وصف کو تناسب الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہین ۔

مومن کی صلاحیت ایجاد اس معاملے مین متعدد راستے نکالنے پر قادر ہے وہ کبھی دو مختلف زبانون کے ہم معنی الفاظ سے ، کبھی ذو معنی لفظون سے اور کبھی ایسی عبارتون سے جن کے بعید ترین پہلو کسی مضمون سے وابستہ رکھتے ہین لطف معنی پیدا کرنے مین کامیاب ہوجاتے ہین ۔ اس قاعدے کی وضاحت کے لئے چند اشعار بطور مثال پیش کرنا مناسب ہے جن کے معنوی رابطون سے دوسرے اساتذہ کی طرح مومن نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

غالب — دل مین آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہین

مومن — دیکھا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا
بخت تیرے عاشقون کے نارسا کہنے کو ہین

دونون استادون نے رسیدن کے اسم فاعل رسا سے لطافت معنی پیدا کی ہے۔ مومن کے شعر مین رسیدن کے ساتھ اردو مصدر یعنی پہنچانا بھی آیا ہے اس لئے لطافت مین کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نصیب انسان کو ایک حال سے دوسرے حال تک

پہنچا دینا وصال کہنا غلط ہوگا ۔ اس شعر مین ایک اور لطافت یہ بھی ہے کہ

"کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا" ۔ ایک ایسا محاورہ ہے جو تنزل اور خرابی کی

طرف اشارہ کرتا ہے لیکن چونکہ رسیدن اور پہنچنا اپنے مجرد لغوی معنی مین

ترقی وتکمیل کا پہلو رکھتے ہین اس لئے شاعر اس سے مضمون کی راہین نکالنے مین

کامیاب ہوگیا ہے ۔

وصال اپنے عام مفہوم کےعلاوہ عارفون اور عاشقون کی وفات کے لئے بھی بولا

جاتا ہے کہ ان کا مرنا ذات الہی کے ساتھ واصل ہوجانے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ میر کا شعر ہے

ہجر مین میر کا وصال ہوا

آج قصہ ہی انفصال ہوا

مومن بھی اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم سے مضمون آفرینی کرتے ہین ۔

اجل سے خوش ہون کسی طرح ہو وصال تو ہے

نہ آئے لاش پہ وہ پھر یہ احتمال تو ہے

اول الفت ہے یارب وصل ہی مین ہو وصال

ہم کو تو جینا نہ رکھیو آمد ہجران تلک

دم نکلنے یا مرنے کے دو معنی ہین ۔ موت کا آنا اور فریفتہ ہونا ۔ غالب نے متعدد مفہوم

مین مضمون نکالا ہے ۔

محبت مین نہین ہے فرق جینے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہین جس کافر پہ دم نکلے

مومن نے بھی اس لفظ سے مضمون آفرینی کی کوشش کی ہے۔

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں

مجھے فکر جواب نے مارا

یہی لفظ ایک اور شعر میں بھی آیا ہے۔ چونکہ اس میں تغزل کا رنگ دلفریب ہے

اس لئے لطافت معنی چمک اٹھی ہے۔

کیا سنائے ہوکہ ہے ہجر میں جینا مشکل

تم سے بیرحم پہ مرتے ہیں تو آسان ہوگا

سوختن مصدر کے مشتقات اور جلنا یا جلن وغیرہ سے عشق اور رشک کے معنی میں بالعموم

نکلتے ہیں ۔ گلزار نسیم میں پریوں کی غمّازی سے بکاولی کا آگ میں ڈالا جانا مشہور

ہے۔ نسیم نے اس مقام کو یوں نظم کیا ہے۔

کافور سی جل اٹھی سراپا

ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا

غالب نے جو مرا ند پنبہ کی گرمی سے صحرا کا جل جانا نظم کیا ہے۔ میر کے کئی شعر

اس لفظ کے ہیر پھیر سے وضع ہوئے ہیں ۔

آتی ہے محفل میں تو فانوس میں آتی ہے شمع

وہ سراپا دیکھ کر پردے میں جل جاتی ہے شمع

سب میں بے پردہ رہی پردۂ فانوس میں شمع

لگ گئی آگ ترے خانۂ ناموس میں شمع

مومن کے متعدد اشعار اسی صدر کے مشتقات پر مبنی ہین ۔

اے پردہ نشین چلون اٹھا دے کہ نہ جل جائے

کرتا ہون مین سوز غم پنہان کی حکایت

اس کو بھی کوئی پردہ نشین ہی جلائے ہے

فانوس سے سنا ہے یہ راز نہان شمع

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو

جون سوز دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو

ان مثالون سے یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ مومن رعایت لفظی پر مائل تھے ۔ کچھ شک نہین کہ پردہ نشین ۔ پنہان ۔ نہان ۔ سوز ۔ جلن ۔ آگ بن جانا ۔ ایہام تناسب رکھتے ہین لیکن مومن نے ان لفظون کو اس طرح برتا ہے اور معنوی نسبتین اتنی بعید واقع ہوئی ہین کہ رعایت لفظی کی رکاکت کا یہان سایہ تک نہین پڑتا ۔ یہ صحیح ہے کہ مومن کے کلام مین بعض جگہ ایہام اور رعایت لفظی ذرا مبتذل طریقے سے آئے ہین مثلاً ۔

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے

آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

دشمن سے ہے چشم مہربانی

محروم نگاہ آشنا ہون

ع طفلی سے غلغلہ ہے مرا شیخ و شاب مین

تاہم بحیثیت مجموعی ان کے یہان یہ رکیک انداز بہت کم ہے۔ جس طرح ان کی متین طبیعت انھین معاملہ بندی مین بے اعتدالی سے بچاتی ہے اسی طرح رعایت لفظی کے معاملے مین بھی وہ بہت محتاط ہین اور صرف وہی لفظ استعمال کرتے ہین جو مضمون کے ساتھ معنوی رابطہ رکھتا ہو۔ حسب ذیل اشعار اس وصف کے حامل ہین ان سے محظوظ ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ الفاظ کے وسیع مفہوم پر نظر رکھی جائے

جیتے جی غیر کو ہو آتش دوزخ کا عذاب
گر مری نعش پہ وہ شعلہ عذار آ جائے

مومن اس بت نے گر نہ چاہا نہ سہی
ہم خوش ہین اسی مین جو خدا نے چاہا

مردا زکی ہے رقیبون کو آرزو
شاید زمان ہجر کے امیدوار ہین

دھو دیا اشک ندامت نے گناہون کو مرے
تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہوگیا

ان ناتوانیون پہ بھی تھے خار راہ غیر
کیونکر نکالے جاتے اس کی گلی سے ہم

کہان ہے تاب نازپری اے کاش

جلا دے آتش گل آشیان کو

کیونکہ نہ آدمی رات جاگے وہ جس کا دھیان ہو

آ ہوئے نیمخواب مین نرگس نیم باز ســـین

تابندہ وجوان تو بخت رقیب تھے

ہم تیرہ روز کیون غم ہجران کو بھا گئے

ہے دل مین غبار اس کے گھر اپنا نہ کرین گے   ہم خاک مین ملنے کی تمنا نہ کرین گے

وحشت ہے عشق پردہ نشین مین دم بکا   منہ ڈھانکتے ہین پردۂ چشم پری سےہم

جون نقاب اٹھی مری آنکھون پہ پردہ پڑ گیا۔کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر

تھا شب چراغ خانۂ دشمن وہ شعلہ رو   کیا کیا جلا ہے صبح تلک جس پہ سان شمع

مومن نے بعض مقامات پر وسیع المعانی محاورات سے مضمون آفرینی کی ہے۔ وہ ذوق یا نذیر احمد کی طرح محاورہ بندی کے دلدادہ نہ تھے۔ چنانچہ دیگر امور کی طرح یہان بھی استدلال سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان محاورات لطف معنی کے ساتھ مل کر لطافت مضمون پیدا کرتے ہین مثلاً " اٹھ جانا مرجانا ترک کے طاوہ کسی اخلاقی قدر کے مٹ جانے کے معنی بھی رکھتا ہے۔ مومن نے ایک مصرعے مین دونون مفہوم جمع کیے

ہین ۔ تغزل کا دامن بدستور ہاتھ مین ہے اس لئے مضمون کی خوبی دوبالا ہو گئی ہے۔

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے

اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہان سے حیا کیساتھ

یعنی جس طرح دنیا سے حیا اٹھ گئی ہم بھی اٹھ جاتے۔

یہی انداز حسب ذیل اشعار مین بھی ہے ۔

مجھ پہ عاشق نہین ہے کچھ ظالم صبر آخر کرے وفا کب تک

کیا پڑی رہتی ہے اے پردہ نشین جو بیمار

بد دعا دین تری چلون کو جو ہم دیتے ہین

یک چند اور کاہش غم چشم ~~[illegible]~~ التفات

مین یار کی نظر مین سما یا نہین ہنوز

توبہ گنہ عشق سے فرمائیے ہے واعظ

یہ بھی کہین دل دے کے گنہگار ہوا ہے

اے ستم پیشہ مرے بعد کہان نشۂ عشق ۔ دیکھ خمیازہ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

ہوتے ہین قتل غیر اُدھر ہے نگاہ لطف ارمان مرے نکلتے ہین تلوار کی طرح

حسن انجام کا مومن مرے بارے میں خیال   یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

مومن کے لئے مارا جانا (شہید ہونا) روحانی معراج ہے۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھئے تو معشوق کا یہ کوسنا کہ " تو مارا جائے / قتل ہو جائے) عاشق کے حق میں ایک طرح کی دعا ہے۔

اس لفظی تحبیر سے مومن لطف مضمون پیدا کرتے ہیں جس کا اظہار غزلوں کے مقطعوں میں بالخصوص ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ مومن اپنے تخلص کو نبھانے میں فرد ہیں۔ ذیل کے مقطعوں سے اس خصوصیت کا ثبوت ملتا ہے۔

ذکر بتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی

کچھ اب تو کفر مومن دیندار کم ہوا

ہو نہ بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن

دیکھ دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

مومن و دیر خدا خیر کرے   طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

پیہم سجود و پائے صنم پر دم وداع۔ مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

کھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن

اب چھپاتے ہو بہت بات بناتے کیوں ہو

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن   آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

ہجر بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاش زہر

غم پہ حرام خلط و توکل نہ ہو سکا

مومن اس بت کے نیم نا زمین ھی

تم کو دعوا ئے آتشنا نہ رھا

بت کدہ جنّت ھے چلیے بے ھراس　　لب پہ مومن ھرچہ بادا باد کیا

آ و مومن تمھین بھی دکھلا دون　　سیر بتخانے مین خدا ئی کی

وہ دن گیے کہ زلف وکژاف چھا د تھا　　مومن ھلاک خنجر نازبتا ن ھے اب

ھرگزنہ را م وہ صنم سنگدل ھوا　　مومن ھزار حیف کہ ایما ن گیا عبث

نکلےآرزو مومن ایسی طرح جب تجھ کو　　صحن بتکدہ مین ھم خاک پر پڑا دیکھین

مذکورہ بالا طریقون کے علاوہ مومن ترا دف سے یعنی ایک زبان یا مختلف زبانون کے ھم معنی الفا ظ سے بھی لطف مضمون کا حق ادا کرتے ھین — یہ طریقہ متقد مین کے ھان بھی موجود ھے (۱) — مومن کے کلا م مین یہ صورت بالخصوص بالعموم مثنوی مین ملتی ھے —

آ گیا دوھی دن مین روز نشور　　منتشر ھوگئی وہ بزم سرور

آ گیا جان کر قرار وثبات　　واہ اس کے کلا م کی کیا بات

واہ ہوئے تن ممن ایذا م　　ع　　بات عصمت مین یہ سخن آ ئی

۱ـ مثلا " سعدی کا " گربۂ ابو ھریرہ " اسی قبیل سے ھے۔

بعض جگہ کسی لفظ کے معروف معنی کے دوش بدوش وہ اس کے مخفی وبہم مفہوم کو شامل کر کے لطف کلام مین اضافہ کرتے ہین — یہ لفظی نکتہ سنجی کی ایک صورت ہے جو کبھی کبھی پر لطف معلوم ہوتی ہے —

یہ کس سے ہو کہ ان لطفون پہ گستاخ نہ ہو — غیر ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

یعنی رقیب اگرچہ محبوب کا منظور نظر ہونے مین ہماری برابر ہو گیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہم جیسا نہین ہو سکتا — کیونکہ ہم تو احترام معشوق کے پیش نظر کبھی اپنا دست گستاخ نہین بڑھاتے اور وہ بے تمیز ذرا سی عنایت پر کھل کھیلنے لگتا ہے —

بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ

اچھا بھی کرین گے تو کچھ اچھا نہ کرین گے

یعنی اگر اسے تندرست کر دین گے تو بھی چندان خوب نہ ہو گا — یہ وہی بات ہوئی کہ

ع اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

بعض مواقع پر اختلاف معنی یا ذو معنی محاورے سے نکتہ سنجی کرنے کی یہ سعی مشکور نہین ہوتی اور کلام بے لطف ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً" یہ شعر —

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے

آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

رکاکت وابتذال کا نمونہ ہے —

اسی طرح جب وہ کسی لفظ کے بعید واسطون یا روایتون کا سہارا لے کر تخلیق معنی کرنا چاہتے ہین تو بات بے مزہ ہو جاتی ہے — دہن محبوب کو نقطہ

کہنے کے بعد معدوم فرض کر لینا عجیب سا مضمون ہے۔ غالب نے یہ مضمون نظم کیا لیکن لطف پیدا نہ کر سکے۔ ٹھیک اسی انداز میں مومن نے بھی کوشش کی اور ناکام رہے۔ دونوں کے اشعار یہ ہیں ۔

غالب — دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

مومن — دیکھنا اس دہن تنگ کے بوسے کا مزہ
کہ ہر سنّاک تمنّا نے عدم کرتے ہیں

مومن کے یہ اشعار بھی اسی بے اعتدالی کا نتیجہ ہیں ۔

آبرو رہ گئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ
اشک شادی ہی سے گو چشم کو نم کرتے ہیں

غیر سے ہے وہ گرم صحبت یے
کیون نہ غیرت کرے کباب ہمیں

طنز فن گفتگو میں طنز ایک کارآمد حربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اچھا ادیب شوخی طبع سے کام لے کر حریف کی کسی کمزوری کا اس طرح اشارہ کرتا ہے کہ وہ تلملا اٹھتا ہے۔ بعض ادیب اس ذریعے سے اپنے معاشرے کی اصلاح کا کام لیتے ہیں ۔ چنانچہ مغربی ادباء میں سے سوفٹ تھیکرے اور برنارڈ شا اسی خصوصیت کے لئے مشہور ہیں ۔ اردو میں نذیر احمد ، رتن ناتھ سرشار اور اکبر الہ آبادی اس راہ کے سالک

ہین — ان کے ناولون اور اکبر کے اشعار بے جھوٹی نمائش، بیہودہ رسوم اور مغرب کی اندھا دھند نقالی کے خلاف بڑے پر لطف انداز مین تبلیغ کی ہے جس کی دلدوزی زہریلے نیزون کی سی کھٹک رکھتی ہے۔

مومن کے پیش نظر سیاسی یا اصلاحی مقاصد نہ تھے۔ ان کی قوت بیان حسن و عشق کے معاملات کے لئے وقف تھی۔ طنز مین بھی ان کا روئے سخن بالعموم محبوب کی طرف ہے۔ اس سے کچھ بچ رہتا ہے تو وہ اسے زاہد، واعظ یا محتسب کی تواضع مین خرچ کرتے ہین۔

طنز نگاری ایک نازک فن ہے جو ہجو، فحش پھکڑ اور آوازے سے بہ مراتب لطیف تر ہے۔[(۱)] اس کی خوبی یہی ہے کہ حریف کے پہلو مین چٹکیاں لے لے کر اسے بیقرار کر دیا جائے۔ وہ تلملا جائے لیکن اس کے پہلو سے خون ٹپکنے نہ پائے۔[(۲)] یہ ایک طرح کی بند چوٹ ہے۔ اس کی لطیف تلخی سست زہر کی طرح مدتون کام کرتی رہتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر طنز نگار سے کہا جائے کہ تم نے مخاطب پر حملہ کیا ہے تو وہ بڑے معصومانہ طریقے سے کہہ سکتا ہے کہ مین نے کچھ بھی نہین کہا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی بیوفا سے یون خطاب کرے کہ ؎

ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب
مومن
غیر اور تم بھلے بھلے صاحب

تو اس پر بد گوئی کا الزام نہین لگا سکتے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بیوفا کہہ رہا ہے

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا — اردو ادب مین طنز و مزاح ص ۵۸

۲۔ سید وقار عظیم — مومن کا فن — ادب لطیف سالنامہ ۱۹۶۷ء

ہیں — ان کے ناولوں اور اکبر کے اشعار بے جوش نمائش ، بیہودہ رسوم اور
مغرب کی اندھا دھند نقالی کے خلاف بڑے پر لطف انداز میں تبلیغ کی ہے جس کی
دلدوزی زہریلے تیروں کی سی کھٹک رکھتی ہے —

مومن کے پیش نظر سیاسی یا اصلاحی مقاصد نہ تھے — ان کی قوت بیان
حسن وعشق کے معاملات کے لئے وقف تھی — طنز میں بھی ان کا روئے سخن بالعموم
محبوب کی طرف ہے — اس سے کچھ بچ رہتا ہے تو وہ اسے زاہد ، واعظ یا محتسب کی
تواضع میں خرچ کرتے ہیں —

طنز نگاری ایک نازک فن ہے جو ہجو ، فحش پھکڑ اور آوازے سے بہ
مراتب لطیف تر ہے —(۱) اس کی خوبی یہی ہے کہ حریف کے پہلو میں چٹکیاں لے لے کر
اسے بیقرار کر دیا جائے — وہ تلملا جائے لیکن اس کے پہلو سے خون ٹپکنے نہ پائے —(۲)
یہ ایک طرح کی بند چوٹ ہے — اس کی لطیف تلخی مست زہر کی طرح مدتوں
کام کرتی رہتی ہے — اس پر طرہ یہ کہ اگر طنز نگار سے کہا جائے کہ تم نے مخاطب پر
حملہ کیا ہے تو وہ بڑے معصومانہ طریقے سے کہہ سکتا ہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا —
ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی بیوفا سے یوں خطاب کرے کہ —

ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب
غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
مومن

تو اس پر بدگوئی کا الزام نہیں لگا سکتے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بیوفا کہہ رہا ہے

---

۱ — ڈاکٹر وزیر آغا — اردو ادب میں طنز و مزاح ص ۵۸

۲ — سید وقار عظیم — مومن کا فن — ادب لطیف سالنامہ ۱۹۴۷ ع

حالانکہ در پردہ مراد یہی ہے کہ میں نہیں بلکہ مخاطب ہوتا ہے یا جب وہ کسی غلط گو شخص کے قول کا اعادہ کر کے یہ کہے کہ ؎

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو ‏ میر

تو اس پر بد زبانی کا الزام نہیں لگا سکتے حالانکہ اس نے کمال طراری سے مخاطب کو جھوٹا کہہ کر اس پر اپنا عدم اعتماد ظاہر کیا ہے۔

طنز اسی گنجائش کی بدولت گفتگو کا کارآمد جزو ہے کہ ہم اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے نہایت نرمی سے حریف پر اس میٹھی چھری کا وار کر سکتے ہیں۔

کاروبار شوق کے سلسلے میں مومن کو حریف مزاج کے پنہاں طناز سے واسطہ پڑا تھا لہذا ان سے زیادہ اس فن کو کون جان سکتا تھا۔ انہوں نے ہر مناسب موقع پر اس حربے سے کام لیا ہے اور دلبران خود کام کے سینے پر خوب چرکے لگائے ہیں۔ ان کے وار کاری لیکن بڑے جچے تلے ہاتھ سے لگائے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ وہ خشونت اور لہجے کی وہ درشتی جو ایک حد تک مرزا غالب کے ہاں یا بدتر انداز میں داغ کے اشعار میں نظر آتی ہے اور جو اُن کے کلام کو احتجاج بلکہ لڑائی کی صورت دیتی ہے[1]۔ مومن کے اشعار میں آپ کو نہ ملے گی۔ وہ مخاطب کے قول کا اعادہ کئے بغیر یا اس کے عیب ظاہر کئے بغیر

---

(1) مثلاً

غالب ‏ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

غالب: پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ‏ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اس سہولت سے اور اتنے ملایم لہجے مین وار کر جاتے ہین کہ طنز کی دھار دل سے جگر تک اتر جاتی ہے —

غیر عیادت سے برا مانتے
قتل کیا آن کر اچھا کیا

ستم آزار ظلم جور و جفا
جو کیا سو بھلا کیا صاحب

غیر ہے بیوفا پہ تم تو کہو
ہے ارادہ نباہ کا کب تک
~~دیکھئے دستے طور سا کب تک~~

جہان کہین مومن کا لہجہ ذرا تند ہوگیا ہے وہان طنز کی نرم دھار مین تعریض کی خراش پیدا ہوگئی ہے — ایسے مواقع پر ان کی آزردگی غالب کے تیکھے پن کی یاد دلاتی ہے جس مین طعن • احتجاج اور استہزاء کا ملا جلا رنگ ہوتا ہے — ذیل کے اشعار یہی پہلو رکھتے ہین

مجھ پہ بعد امتحان بھی جور کم کیونکر کرین + وہ ستائین غیر کو ایسا ستم کیونکر کرین

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر مین جینا مشکل   تم سے بیرحم پہ مرنے سے تو آسان ہوگا

ہم سمجھتے ہین آزمانے کو   عذر کچھ چاہئیے ستانے کو

بقیہ حاشیہ) کیا کہا پھر تو کہو ہم نہین سنتے تیری
نہین سنتے تو ہم ایسون کو سناتے بھی نہین   داغ

ہے شرط ہم پہ حمایت مین گو نہ گو نہ ستم   کبھی محبت دشمن کا امتحان نہ ہوا

مین بھی کچھ خوش نہین وفا کر کے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

آپ مجھ سے نباہین کیسے   سچ ہے با وفا حسن بیوفا ہے عشق

(مومن کی غزلون مین طنز کے تیر ذرا وقفون سے چلتے ہین) لیکن واسوخت مین جو طعن و طنز کی خاص جولان گاہ ہے وہ اس بے پناہ حربے سے مسلسل کام لیتے ہین وہ کبھی براہ راست بیوفا محبوب پر حملہ کرتے اور کبھی اپنے اوپر ڈھال کر اس کی غلطیان جتاتے ہین ۔

مین ہی تو رہا ہون کہین شب کو خوش و خرم   مین نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم

میری ہی تو گردن مین پڑا جاتے ہے کچھ خم   آتی ہے جماہی پہ جماہی مجھے پیہم

میری ہی تو آنکھون مین غضب نیند بھری ہے

میری ہی جبین ہے کہ جو گھٹنون پہ دھری ہے

مین ہی تو کہین رات کو بیدار رہا ہون   مین ہی تو کف غیر سے میخوار رہا ہون

مین ہی تو مئے وصل سے سرشار رہا ہون   لذت دہ اوباش ہوس کار رہا ہون

بدمستیان میری ہی تو آنکھون سے عیان ہین

میرے ہی تو ہونٹون پہ یہ بوسون کے نشان ہین

ظاہر ہے کہ اس صورت مین طنز و طعن کی نشتریت نہایت شدید ہو گئی ہے

سہل ممتنع | معانی و بیان کے ادا شناسون کے حسب تصریح سہل ممتنع کلام کی وہ دلنشین سہولت و سلاست ہے جس کی سادگی سے لوگون کو یہ گمان گزرے کہ ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں لیکن جب کہنے لگین تو اپنے عجز کا احساس ہو۔[1] یہ الفاظ دیگر اس سے کلام کی وہ سلاست اور انتہائی صفائی مراد ہے جو الفاظ کی سادگی، لہجے کی سہولت اور دلنشین انداز سے پیدا ہوتی ہے اور جس پر صرف ان اشخاص کی دسترس ہوتی ہے جو زبان و بیان پر کامل قدرت رکھتے ہون۔

مومن پر عربی اور فارسی کا رنگ خاصہ گہرا ہے جس کا اظہار اکثر دل آویز طریقے سے ہوتا ہے لیکن بعض جگہ بالخصوص قصائد مین وہ ایسی مشکل تراکیب نامانوس مرکبات اور ثقیل الفاظ استعمال کرجاتے ہین کہ انھین حل کرنے کے لئے لغات اور قاموس سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہ این ہمہ چونکہ وہ غزل کے مزاج سے آگاہ ہین اس لئے غزلون مین اس غلطی کا ارتکاب نہین کرتے۔ تغزل مین ان کی زبان بالعموم سلاست اور سہولت ادا (Ease of Expression) کی حامل ہوتی ہے۔ عبدالرحمن آہی اور شیفتہ کے حسب تحریر وہ اظہار خیال مین الفاظ کی چندان پروا نہین کرتے۔[2] صرف معنی سے سروکار رکھتے ہین۔ پھر بھی وہ اس دور کے شاعر ہین جب زبان منجھ کر صاف ہو چکی تھی اور دلی والے جن پر انیس کی صاف ستھری اردو کا اثر پڑا ہو یا نہ پڑا ہو ذوق کی سلیس بامحاورہ زبان کو پسند کرتے تھے۔

۱۔ شبلی ۔ موازنہ انیس و دبیر ۔ طبع اول ۔ اعظم گڑھ پریس ص ۱۰۵

۲۔ مقدمہ کلیات مومن ۔ ص ٦٢

اس رجحان کے سبب غالب سے "آسان کہنے کی فرمائش" کی جاتی تھی ـ چنانچہ وہ اہل دہلی کے اس مسلسل مطالبے نیز مولانا فضل حق صاحب کے اشارے سے آخر مین سادہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے ـ مومن کی ذہانت حالات کی رفتار پر نظر رکھتی تھی اور تغزل کی ضروریات سے آگاہ تھی ـ انہون نے غزل مین بالعموم صاف و سلیس زبان استعمال کی ہے ـ بہ این ہمہ فارسی و عربی کی بلاغت نے جو انہین کبھی پست بیان یا رکیک و فرسودہ محاورات کی طرف جانے کی اجازت نہین دیتی ان کی سلاست کو ایک با وقار و متین انداز بخشا ہے جو تغزل کے مزاج کے عین مطابق اور رکاکت سے محفوظ ہے ـ لطف بیان سے محظوظ ہونے اور ان خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب ناگزیر ہے ـ

آج اس بزم مین طوفان اٹھا کر اٹھے
یان تلک روئے کہ اس کو بھی رلا کر اٹھے

ہو عذاب شب یلدا اسیرمائی یا رب
زلف منہ سے کہین اس مہر لقا کے اٹھے

اف ری گرمی محبت کہ ترے سوختہ جان
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

گرچہ ہم صفحہ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

شعر مومن کہے جو بیٹھ کے اس کے آگے
خوب احوال دل زار سنا کے اٹھے

مین نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
مین نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

کیا خجل ہون اب علاج بیقراری کیا کرون
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تب بھی دل دھڑکا کیا

سوچیئے علیا تھے مین آنکھون سے دریا جائے ہے
شمع ساں کس نے یہ ذکر اس محفل آرا کا کیا

کیا خلش تھی رات دل مین آرزوئے قتل کی — ناخن شمشیر سے مین سینہ کھجلا یا کیا

عرش ایمان سے جدا اس غارتگر دین کی ہوسی — تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

اس قیامت قد کو شب دیکھا تھا مین نے خواب مین — دل نے محشر کا سمان وقت سحر دکھلا دیا

مین ہون سے تعریف ہے صبر و سکون غیر کی — کس نے شب مجھ کو تڑپتے ہوئے در دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر — جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

نا ہا لفتہ کانہ لون کا جب تلک ہے دم مین دم — تو نے چاہت کا مزہ اے فتنہ گر دکھلا دیا

اس کے دل مین اب خیال قتل مر دہ آئے ہے — موت کو کس نے الٰہی میرا گھر دکھلا دیا

دیکھین کے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپکا — اس بت پردہ نشین نے جلوہ گر دکھلا دیا

کرتے وفا امید وفا پر تھا بھر — پھر کیا کرین کہ اس کو سر امتحان نہین

پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا — قابو مین دل نہین مرے بس مین زبان نہین

ڈرتا ہون آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیا نہین

یہ اشعار مذکورہ بالا صفات کے علاوہ نفس تغزل کے لحاظ سے بھی قابل ستائش ہین — ان مین شاعر کی پاکیزہ زبان کمال سہولت سے اظہار مطالب کر رہی ہے — لیکن سہل ممتنع کا زیادہ دلکش نمونہ مومن کے وہ اشعار ہین جو انھون نے مختصر بحرون مین کہے ہین — میر کی طرح مومن بھی چھوٹی بحرون مین شعر روان ۰ کا کمال زیادہ دکھاتے ہین — ان کے اس وصف سے محظوظ ہونا ہو تو یہ چند غزلین بطور نمونہ پڑھیئے —

اختصار اجازت نہین دیتا کہ طولانی اقتباسات سے مقالے کو گرانبار کیا جائے۔

لہذا مختصر انتخاب پر قناعت کی جاتی ہے۔

ہم سمجھتے ہین آزمانے کو	عذر کچھ چاہئیے ستانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ	پھونک کر میرے آشیانے کو
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال	ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
کوئی دن ہم جہان مین بیٹھے ہین	آسمان کے ستم اٹھانے کو

کیون نہ ہوتے عزیز غیر تمہین	میری قسمت مین خوار ہونا تھا
صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ	اے دل بیقرار ہونا تھا
رات دن بادہ قسم مومن	کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے	کہین صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہ تاب شکن	دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
اے قیامت نہ آئیو جب تک	وہ مری گور پر نہ ہو جائے
میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو	کہین دامان تر نہ ہو جائے
ہجر پردہ نشین مین مرتے ہین	زندگی پردہ در نہ ہو جائے
مومن ایمان قبول دل سے مجھے	وہ بت آزردہ کر نہ ہو جائے

سر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مومن مضطر
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اس انداز میں جہاں کہیں شعر میں تکلمی لہجہ آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی بے تکلف باتیں کر رہے ہیں — یہاں بھی سادگی و سلاست کے باوجود لطیف متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا کہ سہل ممتنع کی شان یہی ہے —

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

کیوں الجھتے ہو جنبش لب سے
خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

ستم آزار ظلم جور جفا
کیا
جو کہا سو بھلا صاحب

کیوں لگے دینے خط آزادی
کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا
رات تم کس سے تھے خفا صاحب

کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں
کس کا شب ذکر خیر تھا صاحب

نام عشق بتاں نہ لو مومن
کیجئے اب خدا خدا صاحب

غزلوں کے علاوہ مثنویوں کے متعدد مقامات نیز بعض قطعے مثلاً سید احمد صاحب

کے خروج اور گلشن بیخار کی تاریخ والے قطعات بھی صفائی اور لطف زبان کے عمدہ نمونے پیش کرتے ہیں ۔

غنائیت[6] سہل ممتنع کے ذیل میں جو رقیق و لطیف الفاظ کے بہترین اجتماع سے عبارت ہے یہ کہنا بھی مناسب ہو گا کہ غنایت غزل کے لوازم سے ہے ۔ مشرق میں Lyric Poetry یعنی غنائیہ شاعری کی کامل ترین صنف غزل ہی ہے ۔ اس کا بنیادی مطالبہ ہے کہ الفاظ میں روانی اور ترنم ہو ۔ حافظ کسی حریف پر طعن کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ

ع صنعت کرامت اما شعر روان نہ دارد

چھٹی صدی ہجری کا ایک ایرانی نقاد غزل میں موزون مترنم الفاظ کی اہمیت کا اظہار اس طرح کرتا ہے ۔

" باید کہ بنائے آن بر وزن خوش و مطبوع والفاظ عذب و معانی رایق و مروق نہند و در نظم آن از کلمات مستکرہ و سخنان خشن محترز باشد"[(1)] ۔

یہی وجہ ہے کہ ادیب کا الفاظ کی صوتی اقدار سے باخبر ہونا ضروری ہے ۔ اردو میں مصحفی ولی درد اور مومن الفاظ کی غنائی مناسبات سے آگاہ تھے ۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ یہ سب حضرات موسیقی سے شغف رکھتے تھے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غزل گو کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ موسیقی کے مقامات سے باخبر ہو ۔ مومن کی اکثر غزلیں اس مناسبت کا اظہار کرتی ہیں ۔ بہ نظر اختصار بحث کے مطلعے یہاں درج کئے جاتے ہیں

ع اجل جان بہ لب تیرے شیون سے ہے

ع ثمانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

حاشیہ (1۔ شمس قیس ۔ المعجم ص ۳۰۶)

ع سرمگین آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو

ع ان سے بدخو کا کرم بھی ستم جان ہوگا

ع سر کھا موئیتو درد دل زار کم ہوا

مکر شاعرانہ[۱۵] گفتگو کا ایک پہلو یہ ہے کہ اپنے مطلب کی بات ایسے طریقے سے کہی جائے کہ اس میں سامع اپنا فائدہ سمجھے۔ عام بات چیت میں یہ طریقہ برتا جاتا ہے لیکن شعر میں بہت کم دیکھا گیا ہے۔ بات سے بات نکلنے کا یہ انداز جس میں مومن کو بہت مہارت ہے نکتہ سنجی کی ایک صورت ہے۔ ضیا احمد صاحب اسے " مکر شاعرانہ " کہتے ہیں (1) ۔ یہ طریقہ کہیں کہیں لطافت مضمون میں اضافہ کر کے مومن کی لطیف معاملہ بندی کو اور حسین بنا دیتا ہے۔ مثلاً "

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا

میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

قائل کا مقصد یہ ہے کہ محبوب میری طرف بھی دیکھے ۔ لیکن اسے اس طرح سمجھاتا ہے کہ اگر تم میری طرف نہ دیکھو گے تو اغیار سمجھ جائیں گے کہ تم کس خاص وجہ (شرم) سے میری طرف دیکھنے سے احتراز کرتے ہو۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ جس طرح اوروں کی طرف نگاہ کرتے ہو میری جانب بھی ایک غلط انداز نگاہ ڈال لیا کرو۔

مومن عاشق طبیعت معاملات محبت کے ماہر اور عشق کی نفسیات سے باخبر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں یہ عیارانہ انداز جا بجا آ گیا ہے۔ ذیل کے اشعار یہی

۱۔ مقدمہ دیوان غزلیات ۔ ص ۵۹

پہلو رکھتے ھین —

شعلۂ دل کو نا زتابش ھے ‏ اپنا جلوہ ذرا دکھا جا نا

———

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہیتھیے سروکار ‏ چھوڑ دو ن آج و فا کر ھو وفا سے بیزار

———

منظور ھو تو وصل سے بہتر ستم نہین ‏ اتنا رہا ھون دور کہ ھجران کا غم نہین

———

یعنی غم ھجر کا اتنا عادی ھو گیا ھون کہ وہ میری طبیعت بن گیا ھے — اب مجھ پر ظلم کرنے کی یہی صورت باقی رہ گئی ھے کہ مجھے وصل سے کامیاب کیا جائے۔

مومن فن عاشقی کا استاد تھے — وہ محبوب کو رقیب کے ساتھ ملتے یا اس پر مہربان ہوتے دیکھتے ھین تو بڑے دلفریب انداز سے اپنا مطلب عرض کرتے ھین مثلاً " محبوب نامۂ غیر کو آنکھون سے لگا نا چاہتا ھے — مومن سمجھاتے ھین کہ نامے کو سرمے میس کرنا (جو ایک طرح کا اظہار ھے) یہ معنی رکھتا ھے کہ تم اس کو خاک آلودہ کر کے ذلیل کروگے — ذیل کے اشعار یہی انداز رکھتے ھین —

سرمگین آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیون ھو ‏ خاک مین نام کو دشمن کے ملاتے کیون ھو

———

محفل مین تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے ‏ منظور ھے پنہان نہ رہے راز تو دیکھو

———

ھے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا ‏ جادو بھرا ھوا ھے تمھاری نگاہ مین

———

تاب نظارہ نہین ~~بے~~ آئینہ کیا دیکھنے دون ‏ اور بن جائین گے تصویر جو حیران ھون گے

———

جب مجھے رنج دل آزاری نہ ھو ‏ بیوفا پھر حاصل بیداد کیا

———

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہین — جہت دوستی تم کو دشمن سے ہے

—

ایسی ادا سے بوسہ دو لب کا کہ شادی مرگ ہون

جور و ستم کا میری جان لطف و کرم سے کام لو

—

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہین — دل ہی نہین ہاتھ سے دیکھو کیا

—

~~تیک عاس نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار — چھوڑ دو ن آج وفا کر ہو وفا سے بیزار~~

—

محاکات نگاری کسی جذبے کے زیر اثر انسان یا حیوان پر جو کیفیتین طاری ہوتی ہین اور اعضائے جسم کی جو صورت و حالت واقع ہو جاتی ہے اس کی تصویر کشی شاعری کا اہم کارنامہ ہے۔ ارسطو اسے شعر کے تین ارکان مین شمار کرتا ہے۔ یہ ہر نوع یہ وصف بڑی اہمیت رکھتا ہے اور صرف ان شعراء کے یہان ملتا ہے جن کی قوت مشاہدہ زبردست ہو۔ شبلی نے موازنہ مین اس کی متعدد مثالین کلام انیس سے پیش کی ہین ۔ انیس کے برخلاف جن کا موضوع صدہا جذبات پر حاوی ہے غزل گو شعراء صرف ایک جذبے یعنی عشق اور اس کے لوازم سے تعلق رکھتے ہین ۔ ظاہر ہے کہ "ظرف تنگنائے غزل" محاکات نگاری کی محدود گنجائش رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات مومن مین اس کے نمونے کم ملتے ہین ۔ تاہم جتنے ہین ان مین سے چند یہان درج کیے جاتے ہین ۔

مگر رقیبون نے سر اٹھایا کہ یہ نہ ہوتا تو بے مروت

نظر سے ظاہر حیا نہ ہوتی حیا سے گردن مین خم نہ ہوتا

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے

کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

کسی بے باک شیدائی کا محبوب کو گھورنا ۔ صاحب حیا معشوق کا غیظ آلود نگاہ سے اس کو چشم نمائی کرنا اور پھر اس کا جھینپ کر رہ جانا ۔ حرکات و صور کی متعدد حالتیں ہیں ۔ دو مصرعوں میں ان کی اس طرح تصویر کشی کرنا شاعر کی بڑی کامیابی ہے ۔

گلہ ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ وہ کیوں مسکرائے بجا کہتے کہتے

یہاں عجب لطافت سے محاکات نگاری ہوئی ہے ۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی شوخ چشم آدمی کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کیا جاتا ہے تو وہ قطعی خاموش یا نادم نہیں ہوتا بلکہ رفع خجالت کے لئے کچھ کلمات کہتا ہے مثلاً " بجا ہے ۔ بجا فرمایا سچ کہتے ہو ۔ مومن نے ان دو مصرعوں میں الجھے ہوئے جذبات و احساسات کی نقاشی بڑی سہولت سے کی ہے ۔ عاشق کا ہرجائی محبوب سے ہرزہ گردی کا گلہ کرنا ۔ محبوب کا حسب دستور بجا کہنا لیکن یہ سوچ کر کہ فی الواقع عاشق کا الزام صحیح ہے کچھ نادم ہوجانا ۔ پھر رفع خجالت یا اظہار برأت کے لئے مسکرا دینا اور یہ کوشش کرنا کہ میرے مسکرانے سے عاشق مجھے بے گناہ اور اپنے الزام کو بے بنیاد سمجھے تہ در تہ جذبات و تاثرات ہیں جن کی ترجمانی مختصر بحر کے ان دو مصرعوں میں ساحرانہ انداز سے ہوئی ہے ۔ ایسے مواقع پر لفظ بجا کے معنی ہمیشہ یہ ہوتے ہیں کہ تمہارا الزام بیجا اور غلط ہے ۔ شوخ دیدہ محبوب کی یہ طراری کہ بجا

کہتے کہتے معا "مسکرا دے - چہرے پر ندامت آمیز شوخی کے نقوش پیدا کرتی ہے جن کی مصوری اس شعر میں بہ درجہ کمال موجود ہے - اس میں مومن کے اس مخصوص انداز بیان کو اور شامل کر لیجیے جو اس نے "وہ کیوں مسکرا نے" کا ٹکڑا شامل کر کے پیدا کیا ہے اور جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شوخ چشم محبوب کی اس طراری سے وہ خود بھی پیچ و تاب کے عالم میں ہے اور اشتباہ و عدم تیقّن کی حالت میں خود اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ وہ کیوں مسکرا نے بجا کہتے کہتے ۔

مندرجہ ذیل اشعار بھی محاکات نگاری کا نمونہ ہیں اگرچہ ظاہر ہے کہ ان میں شاعر کا موقلم صحیح نقاشی سے قاصر رہا ہے ۔

کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہے یہ جو پوچھو
تو وہیں مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

لگی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر ہیکہ یاد آیا کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قہ قہ کر

کس کی خبر آنے کی ہے کس لئے ہے یہ بیتابی کس لئے ہیں ہم ہر دم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

پھرتے ہیں سو سو و سوسے جی میں دل میں سو دے آتے ہیں کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے ہیں

دمبدم رو نا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

نزاکت تخئیل [12]

قوت متخیلہ مختلف امور کی توجیہ اپنے انداز مین کیا کرتی ہے بچپن مین جب انسان کا ادراک ناقص ہوتا ہے یا عالم خواب مین جب اس کے دماغی قوی پر نیند کے سرخ پردے پڑ جاتے ہین یہ قوت آزاد ہو جاتی ہے اور عجیب عجیب صورتین نگاہ کے سامنے پیش کرتی ہے ۔ قریب قریب یہی کیفیت وجدان کے عالم مین طاری ہوتی ہے اور شاعر مختلف چیزون کو دیکھ کر ان کی خیالی تعبیر و توجیہ کرتا ہے ۔ اس حالت مین وہ ہر چیز کو عام انسانون کے نقطہ نظر سے ہٹ کر دیکھتا ہے ۔ مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے اور غور کیجئے کہ شاعر کی چشم تخئیل نے مختلف اشیاء یا کیفیات کو بہ طور خود کس طرح محسوس کیا ہے اور ان کی ترجمانی کس طرح کی ہے ۔

میر
یہ جو مہلت جسے کہتے ہین عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

غالب
سیاہی جیسے گر جائے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت مین یون تصویر ہے شبہائے ہجران کی

میر
دامن پر فانوس کے تھا یون سما نشان خاکستر کا
شوق کی مین جو نہایت پوچھی جان جلیہو وانے سے

سودا
لالۂ صحرا نہین ہے خون نے فرہاد کے
جوش مین آ کر لگا دی کوہ کے دامن مین آگ

غالب
کوہکن گرسنہ مزدور طربگاہ رقیب
بیستون آئینہ خواب گران شیرین

غالب — آئے ہیں لخت ہائے جگر درمیان اشک

لاتا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

المختصر شاعر کی قوت متخیلہ اسے حقائق و اشیاء کو مختلف صورتوں میں دکھلاتی ہے — جن اشخاص کی یہ قوت بہت قوی ہوتی ہے وہ اشیاء کو فرداً فرداً دیکھنے کے بجائے انھیں ایک منظم سلسلے میں مسلسل دیکھتے ہیں — اور ان کا بیان بڑے پرعظمت انداز میں کرتے ہیں — ڈانٹے کا طربیہ خداوندی — محی الدین ابن عربی اندلسی کی فتوحات مکیہ — ابو العلاء معری کی غفران — ملٹن کی فردوس گمشدہ اور اقبال کا جاوید نامہ منظم و مسلسل خیالات کی شعری فلمیں ہیں جنھیں لافانی تخیل نے ابدیت عطا کر دی ہے —

ہمارے غزل گو شعراء میں غالب اس خصوصیت میں اوروں سے آگے ہیں "پر مرغ تخیل کی رسائی"[1] کہاں تک ہے اس کا کچھ اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے — مومن اس میدان کے مرد نہیں ہیں — وہ واردات عشق کو اتنی بے ساختگی سے بیان کرتے ہیں کہ جوش اظہار میں انھیں خیالی بافی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی — ہمارے اکثر شعراء پر یہی کلیہ صادق آتا ہے کہ جن کی طبیعتوں میں ہیجان و ولولہ ہے وہ واردات و کیفیات کو صداقت سے بیان کرتے ہیں — جن کی طبائع میں سکون اور غور و فکر کا ملکہ ہے ان کے ہاں ایک ایسا ٹھہراؤ ملتا ہے جو انھیں تفکر و تدقیق کی طرف راغب کرتا ہے — یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں فکر کی تہیں بہت زیادہ ہیں فارسی میں اکثر متاخرین مثلاً بیدل — ناصر علی — غنی کاشمیری نے خیال بندی

۱— اقبال

کے لئے مشہور ہیں ۔ اردو میں غالب اور اقبال نے زبان کو تخئیل کے خزانے عطا کئے ہیں

مومن عاشق طبیعت کو تخئیل سے زیادہ سروکار نہ تھا ۔ دل کی دنیا میں بسنے والا یہ از خود رفتہ شاعر قلبی واردات کو تغزل کے سازپر سنانے میں اتنا محو رہتا تھا کہ اسے خیال بافی کی فرصت ہی نہ تھی ۔ تاہم اس کے کلام میں کہیں کہیں تخئیل کا ہلکا رنگ نظر آتا ہے اس پر بھی تغزل کی تہ اس طرح چڑھی ہوئی ہے کہ ہم شاعر کے حسن خیال سے لطف اندوز ہونے کے بجائے تغزل کے رچاؤ سے متاثر ہوتے ہیں ۔

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاتے ہے
شمع سے کس نے یہ ذکر اس محفل آرا کا کیا

شمع کے سر سے شعلے اٹھتے دیکھ کر اور آنکھوں سے سیلاب امنڈ رواں پا کر شاعر کا تخئیل یہ اندازہ کرتا ہے کہ غالبا" کسی نے اس کے سامنے اس شعلہ شمائل معشوق کا ذکر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ شمع رشک کی آگ میں جلی جاتی ہے ۔

کس واسطے اے شمع زبان کاٹتے ہیں لوگ
کیا تو نے بھی کی تھی شب ہجراں کی شکایت

گلگیر سے شمع کی زبان کٹتے ہم سب نے دیکھی ہے ۔ شاعر کے حافظے میں یہ بھی محفوظ ہے کہ ہجر کے مصائب بیان کرنے پر لوگوں نے اسے ٹوکا تھا اور اسے بے صبری و کم حوصلگی کا طعنہ دیا تھا ۔ اس کا تخئیل شمع کی زبان کٹتے دیکھ کر فورا" یہ توجیہ کرتا ہے کہ شاید شمع نے بھی شب ہجراں کی تکالیف بیان کی ہوں گی جو

بیچاری کی زبان کاٹی جارہی ہے۔

ذیل کے اشعار جن میں سے بعض تشبیہ کا پہلو رکھتے ہیں تخیل کی صورت گری سے وجود میں آئے ہیں ۔

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب
محو دود چراغ خانہ رہا

یہ جو ن لے پڑ گئے کیسے گلو سے تابہ دل روزن
الہی روکتے تھے نالہ شبگیر اکثر ہم

ربط اس سے ہے مثل شعلہ و شمع
مرجاؤں گر ایک قدم جدا ہوں

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشت باغ کو
کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

۱۳

نفسیاتی ژرف نگاہی بیان واقعات کے مختلف لوازم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان دوسروں کے مزاج اور حالات کا مطالعہ کر کے ان کی نفسیات سے واقف ہو جائے اور اظہار واقعہ میں ان نکات سے غافل نہ ہو جو علم النفس نے اسے بتلائے ہیں

مومن کی عمر کا بڑا حصہ حسینان دہلی سے ملنے ملانے میں بسر ہوا ۔ اگرچہ انھوں نے سعدی یا نظیر کی طرح دنیا کی سیر نہیں کی اور ان کی جولانی طبع

صرف عاشقی کے رنگین شیریں محل تک محدود ہے تاہم اس یک فن نے انہیں عاشق و معشوق کی نفسیاتی کیفیتوں سے خوب آگاہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وقوعہ گوئی کا یا اظہار معاملات کے یہ سلسلہ نفسیاتی ژرف بینی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں ۔

دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک

میں بھی ذرا آرام لوں • تم بھی ذرا آرام لو

مدعا صرف یہ ہے کہ محبوب کو کچھ عرصے کے لئے جور وجفا سے باز رکھا جائے۔ نفسیات کا یہ نکتہ شاعر کی نگاہ میں ہے کہ اگر کسی کو کوئی بات سمجھائی جائے تو وہ اکثر اس خیال سے اس کو نامنظور کر دیتا ہے کہ ممکن ہے افہام و تفہیم کے پردے میں کوئی فریب چھپا ہوا ہو۔ لیکن اگر مخاطب پر یہ واضح کر دیا جائے کہ جو کچھ میں سمجھا رہا ہوں اس میں تمہاری بھلائی کے علاوہ خود میرا بھی فائدہ ہے تو مخاطب کے ذہن سے اشتباہ و شک رفع ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کو مان جاتا ہے کہ شاعر کی نفسیاتی ژرف بینی نے اس لئے دوسرے مصرعے میں " میں بھی ذرا آرام لوں " کا ٹکڑا رکھا ہے۔ (نفسیاتی ژرف نگاری) مزید لطف یہ ہے کہ مخاطب کو مقدم رکھنے کے بجائے اپنی ذات کو مقدم رکھا ہے تاکہ مخاطب کی نگاہ پہلے اس نکتے پر پڑے کہ متکلم کو اپنا فائدہ منظور ہے۔

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی

آشیاں اپنا ہوا برباد کیا ؟

عالم اسباب میں بعض اوقات یہ صورت پیش آتی ہے کہ بظاہر ایک بات کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا لیکن واقعات مابعد سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاں روز جو کیفیت واقع ہوئی تھی اس کا سبب یہ تھا ۔ مابعد الطبیعیات کے ایسے واقعات آئے دن سنے جاتے ہیں اور ہم ان کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔ ایک عزیز کا کسی دور افتادہ عزیز کی تکلیف یا موت سے کسی اطلاع کے بغیر ازخود افسردہ ہونا اکثر سننے میں آیا ہے " دل را بہ دل رہیست " کہہ کر ان باتوں کی توجیہ بالعموم کی جاتی ہے ۔ علم النفس کی روشنی میں ان واقعات کی صحیح توجیہ و توضیح کبھی نہ کبھی ممکن ہوجائے گی ۔ شاعر کو ان تمام مباحث سے غرض نہیں ۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ کچھ دنوں سے قفس میں جی لگنے لگا ہے ۔ صحیح وجہ معلوم نہیں تاہم نفسیاتی بصیرت اصلی سبب کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتی ہے اور وہ جہل و عرفان کے برزخ پر کھڑا ہوکر حسرت سے کہتا ہے کہ شاید ہمارا آشیان برباد ہوچکا ہے ۔

مندرجہ ذیل اشعار میں نفسیاتی تاثر وانفعال کا بیان بہ طریق احسن ہوا ہے ۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارمان ہوں گے

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا وگرنہ خواب کہاں چشم پاسبان کے لئے

ہو نہ بیتاب ادا تمہاری آج نازکرتی ہے بیقراری آج

ہنستے جو دیکھتے ہین کسی کو کسی سے ہم　　منہ دیکھ دیکھ روتے ہین کس بیکسی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا　　کیون اپنے جی کو لگتے ہین کچھ اجنبی سے ہم

جراح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا　　کیون کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

بے پردہ غیر سے نہ ہوا وہ شب کہ صبح　　آنکھون مین شرم تھی نہ نظر مین حجاب تھا

---

۱۴ ذوقِ جمال

مومن کے ذاتی حالات مین بیان ہو چکا ہے کہ وہ حسن صورت رکھنے کے علاوہ خوش پوشی جامہ زیبی اور نفیس مزاجی کا نمونہ تھے - عمدہ خوراک اچھا لباس بہترین ساز و سامان سے گھر کو مزین کرنا انھین مرغوب تھا - جس کا ذکر

ع　　یاد ایامِ عشرتِ فانی' والے قصیدے مین ہوا ہے (۱) - مختلف واقعات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا احساس جمال بہت بڑھا ہوا تھا - حسینون سے ملنا - دیوان خانے کو مناسب ساز و سامان سے آراستہ رکھنا - سوداگرون سے بہترین ملبوس خریدنا عطر اور پھولون کا بیحد شوق یہ سب باتین ثابت کرتی ہین کہ ہر شے مین حسن کی جستجو اور حواس خمسہ کو حسن سے لذت یاب کرنا ان کی طبیعت کا خاص میلان تھا - یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام مین تلذذ حواس کی مثالین بہ کثرت ملتی ہین ان کی حسن پرستی صرف آنکھون تک محدود نہ تھی - لذت کوشی کا تقاضا تھا کہ نظر کے ساتھ باقی حواسون کو بھی بہرہ مند کیا جائے - شہر لب و رخسار کی

---

۱ ـ کلیات مومن ص ۲۱۶

سیر کرتے وقت مہر طلعت حسینوں کے دمکتے مکھڑوں سے بصارت کو بہرہ یاب کرنے کے علاوہ انھوں نے ایک ایک حواس کو دعوت نشاط دی ہے۔ ان کی غزل میں جو رنگینی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ قدم قدم پر اس تلذذ کا بیان کرتے ہیں جو انھوں نے مختلف حواسوں کے ذریعے محسوس کیا تھا۔ گلبدن گل اندام معشوقوں کے ساتھ ان کی راتیں اس طرح گزری ہیں کہ صبح کے وقت ان کی قوت شامہ نے نسیم چمن کی طرف التفات نہیں کیا۔ گل پیرہن حسینوں کے رنگین لباس، ان کے معطر جسم ان کے دمکتے چہرے جن کی تابانی سے دروبام پر شفق پھولتی معلوم ہوتی ہے ان کی وہ آواز جو شعلے کی طرح لپکتی محسوس ہوتی ہے، ان کی آب رواں جیسی رفتار، گداز بدن کا لمس، زبان کی لذت، غرض کون سی حس ہے جس کی تسکین کا سامان مومن نے جی بھر کر نہیں کیا۔ احساس جمال اور تلذذ حواس کے اس رحجان نے ان کے کلام میں بھی راہ پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات مومن میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جن میں مختلف حواسوں کے لئے دعوت نشاط موجود ہے مثلاً

کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی

ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں

بوئے گل کا اے نسیم صبا اب کس کو دماغ   ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن بر رات کو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک   شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

یاد بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی   تم آج کل میں شاید سوسن میں گئے ہو

یاد آیا سوئے دشمن اس کا جاناگرم گرم　　پانی پانی ہو گیا مین موج دریا دیکھ کر

چلون میں کس پری کا نظارہ ہوا نصیب　　پھر اپنے تکنے چقنے کی کیون دھوم دھام ہے

پھر پردہ در ہے کس کی وہ انگلی ہلال سی جو مثل صبح چاک گریبان تمام ہے

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھکر　　ازبسکہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

نہ جانے کیون دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی　　بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

یاد مین اس در دندان کی مواجاتا ہون　　کارالماس مرے حق مین گہر کرتا ہے

کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب و روز کہ یون　　گدگدی دل مین مرے آٹھ پہر کرتا ہے

پانوؑ تک پہنچیں وہ زلفیں پُر خم　　باندھئے اب سرو کو آزاد کیا

حسرت بوسۂ کاکل کا کیا مرہم بنا　　زخم دل مشک سے اے غالیہ مو بھرتے ہین

یہ حد سے بڑھے ہوئے احساس جمال ہی کا کرشمہ تھا کہ مومن کسی مہر جمال کی نبض دیکھنے گئے تو اس کے خوبصورت ہاتھ کو چھوتے ہی گرفتار عشق ہوگئے۔ مثنوی قول غمین کے یہ اشعار اسی واقعے کا اشارہ کرتے ہین۔ (۱)

---

۱ ـ کلیات مومن ص ۲۱۷

مین نے اس نبض پہ جون ہاتھ دھرا ۔ ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا

صاف صندل سے زیادہ وہ ہاتھ ۔ نرم مخمل سے زیادہ وہ ہاتھ

پنجہ مہر کا سا شعشعہ نور ۔ دست گل بستہ رہے جس کے حضور

تلذذ احساس کی یہ افراط ان کی عاشق مزاجی کا ایک سبب تھی ۔

چنانچہ مثنویان شاہد ہین کہ وہ کبھی کبھی کی آواز سن کر کبھی چلون سے محض ایک جھلک دیکھ کر اور کبھی کسی گل اندام کی خوشبو سونگھ کر دل و دین نثار کر بیٹھے ۔

۱۵

جدت تراکیب

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مطالب کثیر کو تھوڑے الفاظ مین بیان کرنے کے لئے مختلف تدبیرین کرنا پڑتی ہین ۔ جامع و معنی خیز تراکیب کا استعمال ان میں سے ایک ہے ۔ ایک عمدہ ترکیب بندش کی چستی کے علاوہ متعدد مفاہیم کو نہایت سہولت سے ادا کر دیتی ہے ۔ فارسی مین خاقانی ۔ سعدی ۔ نغانی عرفی اور نظیری نے اس حربے سے اکثر کام لیا ہے ۔ ان بزرگون نے کہین ادائے مطالب کے لئے ۔ کہین چستی بندش کے واسطے اور کہین شوکت بیان کی غرض سے عمدہ تراکیب کا استعمال کیا ہے اور اپنے مقصد مین کامیاب ہوئے ہین ۔ مغرب کا " عظیم ترین واحد دماغ یعنی ارسطو بھی آج سے سوا دو ہزار سال پہلے تراکیب کی ایجازی افادیت پیش نظر رکھتا تھا ۔ اس نے اپنی کتاب " بوطیقا " مین ترکیب الفاظ تخفیف اور اشباع کی خوبیان واضح کی ہین جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر ذہین شخص

مرکبات کی ایجازی سہولت سے استفادہ کرتا ہے[1]۔

مومن کو فارسی ادب پر عبور تھا ۔ بالخصوص عرفی اور نظیری کی ادائین ان کی نظر مین ایسی سمائی تھین کہ اکثر معاملات مین ان کی تقلید کرتے تھے ۔ چنانچہ بہت خوشنما ترکیبون سے مطالب ادا کرنا انھین بہت مرغوب تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو جیسی زبان مین جس کی صرف و نحو بلکہ جس کا رسم الخط ایجاز و اختصار کا طالب ہے ۔ عمدہ ترکیبون کے بغیر الجھے ہوئے پیچ در پیچ خیالات کی ترجمانی مشکل ہے ۔ متقدمین اردو نے اس طرف توجہ کم کی کیونکہ ان کو اس بات کی چندان حاجت نہ تھی ۔ لیکن انیسوین صدی مین انگریزون کے تسلط اور دو مختلف الطبع قومون کے ملنے جلنے سے فکر و خیال کے نئے راستے کھلنے لگے تھے اور بعض اہل ہند انگریزی ادب سے ایک حد تک آشنا ہو چلے تھے ۔ دہلی کالج کے نصاب مین جو انگریزی کتابین تھین ان مین سے اکثر کے ترجمے دہلی کے ذی علم آدمیون سے کرائے جا رہے تھے ۔ ان حالات مین نہ درتہ خیالات اور اصطلاحات کی ترجمانی کے لئے ایجاز الفاظ کی ضرورت شدید تھی ۔ اس مقصد کے لئے دیگر وسائل کے علاوہ وسیع المعانی تراکیب کا استعمال ناگزیر تھا ۔ غالب اور مومن دونون نے فارسی ادب سے متاثر تھے ۔ انھین دہلی کالج سے واسطہ بھی تھا لیکن ان دونون اساتذہ نے اپنے کلام مین بلیغ ترکیبون سے کام لےکر دوسرون کے لئے یہ شاہراہ کھول دی اور اس معاملے مین مومن اپنے سربرآوردہ حریف سے کچھ آگے ہی رہے ۔ انھون نے تمام اصناف سخن مین معنی خیز تراکیب استعمال کر کے بڑی سہولت سے مطالب ادا کئے ۔ مثال کے لئے چند

---

۱ ۔ ارسطو ۔ بوطیقا مترجمہ عزیز احمد ص ۸۰

ترکیبین اور ان کے مفہوم لکھے جاتے ہین تاکہ ایجاز و تفصیل کا مقابلہ ہو سکے ۔

زبان بیہودہ سائل	وہ زبان جسے بیجا سوال کی عادت ہو ۔
دور گرد	وہ شخص جو کسی جگہ سے دور دور پھرے ۔ پاس نہ آئے ۔
نازخصلت	جس کی عادت ناز کرنا ہو ۔
نیا زفن	جو نیا زمندی کا عادی ہو ۔
شوق شکوہ اثر	ایسی الفت جس مین شکوہ شکایت کا رنگ بھی ہو ۔
بیمار اجل چارہ	وہ بیمار جس کا علاج صرف موت سے ہو سکے ۔
ادا زپرست	حسینون کے انداز و ادا کا پجاری ۔

ظاہر ہے کہ دو تین لفظون کی اچھی سی ترکیب پورے جملے کا کام دیہ سکتی ہے ۔ بندش کی چستی اس کے علاوہ ہے جسے ضمنی فائدہ سمجھئے ۔

تراکیب کے برمحل استعمال سے زبان و بیان کو وسعت حاصل ہوتی ہے اور اگر دور حاضر مین اردو کو مختلف علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم بننا ہے تو کثیرالمعانی تراکیب کی ایجاد ناگزیر ہے ۔ مومن نے جو شعوری طور پر صرف معاملات الفت کا بیان کرنا چاہتے تھے ۔ ترکیب کو اسی محدود مقصد کے لئے برتا ۔ تاہم ان کی طبیعت اتنی ایجاز پسند تھی کہ وہ دو یا تین لفظون پر قناعت کرنے کے بجائے کئی کئی الفاظ کی طولانی تراکیب وضع کرنے پر مائل تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام مین بعض جگہ صرف ایک ترکیب نے پورے مصرع کو گھیر لیا ہے ۔ ان مین سے بعض کے نمونے حسب ذیل ہین ۔

ع　دور گرد بارگاہ عاشقی　وہ شخص جو عاشقی کی بارگاہ سے دور دور رہے۔

ع　اندا ز پسند کفر کیشان　کفر کیش معشوقوں کے انداز کا عاشق۔

ع　جمع احباب پریشان گردان　جو دوستوں کی جمعیت کو پریشان کرتے (فلک)

ننگ رسوا کن انداز حیا　جو شرم و حیا کے نام کو بٹا لگا دے۔

دل رشک آشنا　وہ دل جو عرصے سے رشک کا مزہ چکھ رہا ہو۔

بہ الم خو کردہ　جسے رنج والم کی عادت پڑ گئی ہو۔

افسر داغ بہ سر　جس کے سر پر داغوں کا افسر (تاج) رکھا ہو۔

تراکیب کی وسعت مفہوم دکھانے کے لئے صرف چند نمونے لکھ دئے گئے ہیں ورنہ ان کا صحیح حسن اور پوری معنی خیزی دیکھنا ہو تو اشعار میں ان کے صحیح مقام پر دیکھئے تاکہ ربط مطلب سے ان کی تمام خوبیاں واضح ہوجائیں اور یہ بھی اندازہ ہوسکے کہ ایک موزون گٹھی ہوئی ترکیب سے مصرعے کی بندش کتنی چست ہوجاتی ہے۔

مت مانگیو اُن بتوں سے کہ ہے حرام　مومن زبان بیہدہ سائل کو تھاما

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث　یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کھا عبث

کب ٹوٹ کے نازخمکدوں پر　یہ طبع نیازمند آئی

بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ　اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ آرزو ہائے دل رشک آشنا کہئیے کو ہین

مذکورہ بالا مثالین صرف غزلون مین ہیں جن کا ہر شعر بالعموم دوسرے شعر سے بے تعلق ہوتا ہے۔ مثنوی مین واقعات کا مسلسل بیان ہوتا ہے لہٰذا اس مین وسیع الفاظ اور ترکیبون کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہہ وجہ ہے کہ مومن نے اپنی مثنویون مین تراکیب کا استعمال زیادہ کامیابی کے ساتھ کیا ہے جس کی مثالین حسب ذیل ہین ۔

۱) مومن اپنی نوجوانی کا ماجرا بیان کرتے ہین :۔

آشفتۂ کاکل پریشان — اندازپرست کفر کیشان

دل بستۂ دام تار زنار — جاروب کش دکان خمار

مدہوش شراب نوجوانی — سرشار نشاط و شادمانی (۱)

۲) پانچوین مثنوی حنین مغموم مین تند خو محبوبہ مومن ہرجائی کو ملامت کرتے ہوئے ہے

اے ہوس آمیز رنگ عاشقی — دشمن ناموس و ننگ عاشقی

اے خراب حالت عبرت فزا — اے مطیع حسرت فرمان روا

دور کرد بارگاہ عاشقی — کج خرام شاہراہ عاشقی (۲)

۱۔ مثنوی قصۂ غم ۔ کلیات مومن ص ۲۸۳

۲۔ کلیات مومن ص ۳۶۷

٣) ایک عاشق کے جوش جنون کا نقشہ دیکھئے جو مومن نے صرف تراکیب سے کھینچا ہے۔ پنسل کے خاکے کی طرح یہ نقشہ رنگینی سے عاری لیکن اشارتی صلاحیت کے اعتبار سے مکمل ہے۔

اک جوان تھا بہ الم خوکردہ   شور وحشت کا نمک پروردہ
حکم بے ربط دہ ملک جنون   افسر داغ بسر جون مجنون
کیا کہا کریہ کہا کچھ نہ کہا   نہ رہا مرتبہ اس کا نہ رہا
قیس اک طفل دبستان جنون   اور وہ استاد زباندان جنون

---

۴) معشوقہ سے خطاب (ایک خط مین)

اے گل گلستان رعنائی   نو بہار ریاض زیبائی
اے مہ آسمان حسن وجمال   بے نظیر جہان وہم وخیال
اے در شاہوار ناسفتہ   گوہر تابدار ناسفتہ
اے گل تازہ بر نیامدہؐ   اے نہال بہ بر نیامدہؐ

۵) معشوقۂ حور شمائل کے مرثیے مین ۔

شبنم کو پھر ہے جانب خورشید التفات   شرمندہ سا زمہر درخشان کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا   اس دست رشک پنجۂ مرجان کو کیا ہوا
دعوی ہے شوخیون کا غزالان دشت کو   اس خوش نظر کی جنبش مژگان کو کیا ہوا

---

٦) غیر مرئی اور غیر محسوس اشیاء کا بیان یون بھی مشکل ہے۔ نظم مین قیود شعر

قدم قدم پر حائل ہوتی ہیں اور مثنوی کے مختصر مصرعے زیادہ الفاظ کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ این ہمہ مومن کی قوت ایجاد نے تراکیب کے ذریعے حمد جیسے نازک مرحلے میں خدا کی ذات و صفات کا بیان جس سہولت سے کیا ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے ۔

شہ مسند کبریا و جلال	مہ بے زوال سپہر کمال
گل گلستان تنزہ نسیم	نسیم ریاض تقدس شمیم
بہار چمن زا و بے رنگ و بو	تبسم دہ غنچہ آرزو
ہیولیٰ طرا زندہ جزو و گل	نگارندۂ صورت خار و گل
چمن آفرین باغبان دہور	مہین نخلبند خفا و ظہور
ادائے شکر خندہ آموز گل	قد افزائے گلبن رخ افروز گل
مرصع نگار سپہرِ فلک	قلمدان سپار دبیر فلک
تتق بند جلبابِ شبہائے تار	خطا بخش ہوشہائے تیرہ کار
پذیرندۂ توبۂ جرم کوش	سیاہی زدائے رخ بادہ نوش

(آسمان)

جمع احباب پریشان گردان	وحشت افزائے بیابان گردان

(ذکر عاشق)

کہ تھا اس شہر میں اک خانہ ویران	جنون تعلیم فرمائے اسیران

قصیدون مین بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے لکھ چوڑے مطالب دو یا تین لفظون

کے مرکبات سے ادا ہو گئے ہیں ۔

وہ شوخ برق خان خانہ میں ملا دیوے اگر ہو حسرت دنبالہ گردی محمل

فردوسی ایک خار جنان بیان تھا　　　　گلریز میرے دم سے ہوئی داستان تیغ

خنجر جان شگاف میں اس کے　　　　ابرو ئے یار کی سی پتلی سی

روز جنگ اس کے نسیم جولان میں　　　　صرصر صاد کی سی جولانی

یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض تراکیب جو پورے پورے مصرعے کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اپنی طوالت اور عربی و فارسی الفاظ کی کثرت کے باعث مشکل معلوم ہوتی ہیں ۔ بایں ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے بغیر مختصر مصرعوں میں وسیع مطالب کا ادا کرنا دشوار تھا ۔ سہولت بیان کے لئے ترکیب کی اتنی پیچیدگی تو گوارا کی جا سکتی ہے ۔ البتہ جب مومن جوش ایجاد میں ترکیب در ترکیب کے عمل سے مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں تو اغلاق پیدا ہو جاتا ہے وہ طویل مرکبات کے اول و آخر میں مزید الفاظ لگا کر ترکیب کو الجھا دیتے ہیں ۔ مثلاً ممدوح کو یہ دعا دینا کہ

ع　　　　تجھ کو ہمیشہ عشرت تازہ عروس دوہری

ظاہر ہے کہ " تازہ عروس دوہر " بجائے خود بڑی مشکل ترکیب تھی ۔ اس سے

پہلے عشرت کو مضاف بنانے اورآخر مین یائے توصیفی کا مزید اضافہ کرنے سے ترکیب کی طوالت اور پیچیدگی بہت بڑھ گئی ہے۔ اسی طرح یہ مصرع

ع   کہ قدر نسیم رقص مرغ بسمل جا زمین پر ہے۔ بہت پیچیدہ اورغور و فکر کا طالب ہے۔ مومن کے مزاج مین یہ بات اتنی راسخ تھی کہ وہ معروف ترکیبون پر بھی معطوف یا مضاف کا اضافہ کر لیتے تھے۔ مثلاً " جانگاہ اور دل آرا بالعموم مستعمل ہین ۔ وہ ان پر ایک ایک لفظ بڑھا کر تصرف کرتے ہین ۔

اور ہمین بھی چاہ کا لپکا   عشق دل وجان کاہ کا لپکا

تھی جو وہ بزم جان و دل آرا   اس کا تھی مین ہی محفل آرا

مگر حق یہ ہے کہ یہ تصرف دلکش اور دل آویز ہے۔

۱۲

ندرت تشبیہ

مومن کے کلام میں مجرد تشبیہیں کم ملتی ہیں — وہ زیادہ تر تشبیہ مرکب یا تشبیہ مرسل سے کام لیتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں شاعر کے بیان تخیل کو اظہار کا راستہ ملتا ہے — بجائے اس کے کہ رفتار یار کو قیامت سے یا موج دریا سے یا باد بہار سے تشبیہ دیں — مومن کی پرتکلف طبیعت بالواسطہ ان چیزوں کی مشابہت کا اشارہ کر کے لطافت بیان پیدا کر دیتی ہے[1] — تشبیہ مرسل میں حرف تشبیہ بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے اور دو چیزوں کی وجہ شبہ کا بیان ضمناً اس نزاکت سے کیا جاتا ہے کہ گویا تشبیہ مقصود ہی نہ تھی — مومن اس میں مزید نزاکت کا اضافہ کرتے ہیں — وہ کبھی اظہار تعجب کر کے اور کبھی استفہامی انداز پیدا کر کے بڑی لطافت سے وجہ شبہ کا اظہار کرتے ہیں حسب ذیل اشعار اس خصوصیت کے مظہر ہیں —

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب محو دود چراغ خانہ رہا

یاد آیا سوئے دشمن اس کا جانا گرم گرم پانی پانی ہوگیا میں موج دریا دیکھ کر

اب ضرور ہے مثال جو دی اس خرام کو یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

ہوتے ہیں پائمال گل اے باد نو بہار کس سے اڑائی تو نے یہ رفتار کی طرح

واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں عالم شب وصال کے نظروں میں چھا گئے

---

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھئے

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھکر   از بسکہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

نہ جانے کیون دل مرغ چمن کہ سیکھکئی   بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

جی میں ہے ہو تیون کی لڑائی اس کو بھیجدون   اظہار حال چشم گہربار کے لئے

خمیازہ جس کا مرا دل کھینچتا ہے آج   آغوش رشک حلقۂ اہل مزا ہے آج

جلچلی نرگس جنت نیولا یا مومن   چشم کافر کے اشارے ہین نظر مین پھرتے

غرض وہ تہ داری اور انداز جس کا ذکر ان کے تغزل کے سلسلے مین آ چکا ہے تشبیہ مین بھی کار فرما ہے۔ بعض اوقات وہ اس معاملے مین بڑی نزاکتین دکھاتے ہین۔ مثلاً* تشبیہ دیتے ہوئے یا وجہ شبہ بیان کرتے ہوئے اثبات کے بجائے انکار یا عدم تشابہ کا اظہار کرتے ہین۔ اس منفی یا سلبی انداز سے جس مین اثبات در پردہ مخفی ہے بات کی لطافت بڑھ جاتی ہے۔ ایک دو مثالین دیکھئے

۱؎ تمام نازک خیالون کا یہی انداز ہے چنانچہ غالب کی تشبیہین بھی اسی نوعیت کی ہین۔
کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ   خط پیالہ سراسر نگاہ گلچین ہے

(حاشیہ ص ۳۹۶)

دیکھنا لذت ہے مرے دل کی ہم آغوشی کی ... ہے نگاہ آئینہ تیرا سر ... [illegible]

کشش ابروئے صنم کی سی نہین اے مومن تا کہ سجدے کرے دل طاقِ محراب نہین

تشبیہ آئینہ سے جو ہوتا تھا آپ آپ مل جائے خاک مین وہ بدن واسینا

اس کی گلی کہان یہ تو کچھ باغِ خلد ہے کس جا لئے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

دیکھیے کہسان چشم سے بہتر آنکھ سے ٹپکے خون کبوتر

لیکن
مومن کے کلام مین سادہ تشبیہین کم ہین جہان آئی ہین بہت سلیقے سے آئی ہین —

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

ربط اس سے ہے مثلِ شعلہ و شمع مر جاون گر ایک دم جدا ہون

بے حجا نہ یہ رونا کون مجلس مین کہ ہے غرق جون آئینہ وہ شوخ حیا فن آب مین

ع کب دوپٹہ یہ مری طرح گرا پڑتا تھا

استعارے مین بھی مومن نے یہی نزاکت ملحوظ رکھی ہے —

~~آآلان~~ آغوش گور ہوگئی ساری لہولہان آسان نہین ہے آپ کے بسمل کو تھامنا

ہیں دو زخ سے تیرے جلتا ہون شعلے کی طرح ہاتھ ملتا ہون

وہ تو گئے یہ کہہ کر ادھر کو یان قلق آیا دیکھئے گھر کو

پھر پہنچے ہے اب سلام غم کا پھر آنے لگا پیام غم کا

محاورہ بندی | یہ مومن کا فن نہین — وہ اس میدان کے نشیب و فراز سے واقف ہین لیکن اس مین جولانی نہین دکھائی — غالب (اور مومن) کے یہان محاورے کا استعمال کم ہے — ~~اس~~ اس خیال سے کہ مومن کی شاعری کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہ جائے — چند محاورات جو ان کے کلام مین ملتے ہین درج کئے جاتے ہین —

اٹھ جانا = مر جانا یا کسی اخلاقی قدر کا مٹ جانا

بیہودہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے

اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہان سے حیا کے ساتھ

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو ضعف کے باعث کہان دنیا سے اٹھا جائے ہے

آنکھ لڑانا :

نہ کیون اٹھ جائین اس محفل سے عجب یہ طور ہم دیکھین

لڑائے آنکھ تو غیرون سے بیٹھا اور ہم دیکھین

آنکھ چرانا :

کل تم جو بزم غیر مین آنکھین چرا گئے

کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

پانی بھرنا

شمع پر کچھ نہین موقوف کہ سارے ظالم

پانی آگے ترے اے مہ بدر جو بھرتے ہین

دل بیٹھنا

دل ہی مانند نشان کف پا بیٹھ گیا

پانو کیا کوچے سے اس ہوش ربا کے اٹھے

دم دینا (فریفتہ ہونا ۔ دھوکا دینا)

دم نہ لے اے اثر آہ کہ معلوم ہوا

جن پہ دم دیتے ہین ہم وہ ہمین دم دیتے ہین

دکھ بھرنا

کہین ہو جائے وصال آہ بلا سے چھوٹون

ہجر کا دکھ کوئی کب تک دل ناشاد بھرے

دل پھٹنا (نفرت ہوجانا)

چاہتا ہے کہ دل اس تنگ قبا سے پھٹ جائے میرے ناصح کا ہے دنیا سے نرالا اخلاص

طوفان اٹھانا

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگون نے

مفت بیٹھے بٹھائے لوگـــون نے

سلام کرنا

ع کر سلام ایسی عشقبازی کو

فتنہ اٹھنا

گھر مین آیا پہ خوف سے جی جائے

فتنہ اٹھنے سے جان بیٹھی جائے

منھ پھانا (اظہار بیزاری)

ع منھ پھا کر وہ اٹھ گئی وان سے

گل کھلنا

کیا گل کھلے گا دیکھئے ہے فصل گل تو دور

اور سوئے دشت بھاگتے ہین کچھ ابھی سے ہم

ہوا باندھنا

نالۂ شب نے یہ ہوا باندھــــی

ہوگیـــا گل چــــراغ بلبل کا

یہ محــاورات اگرچہ مناسب طــریقے سے نظــم ہوئے ہــین لیکن سچ پوچھو تو محــاورہ بندی کی قــلمرو مین ذوق فرمان فرمائے مطلق ہین — مومن یا غالب ان کی سطح تک نہــین پہنچــتے — یہ اور بات ہے کہ محاورہ بجائے خود چنــدان قابل اعــتنا چیز نہــین —

اصطلاحات علوم دوسرے باب مین بیان ہوچکا ہے کہ مومن مختلف علوم و فنون مین مہارت رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ طب ، نجوم اور جفر مین ان کا پایہ بلند تھا اور اسی لئے شیفتہ اور سرسید نے انھین " زیب وسادہ " کمالات بے اندازہ " لکھا ہے ان علوم سے قطع نظر انھین عملیات ، طلسم ، تعویذ اور نہ جانے کتنے فنون مین دخل تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام مین ان تمام علوم وفنون کی اصطلاحین آئی ہین ۔ ان کا بیان جہان لطافت سے ہوا ہے زینت کلام کا سامان بن گئی ہین لیکن اکثر مقامات پر خاقانی کی طرح اغلاق وپیچیدگی پیدا کرنے کی ذمہ دار ہین ۔ ظاہر ہے کہ اکثر اشخاص ان علوم سے ناواقف ہین اور ان دقیق اصطلاحون کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہین ۔

طب

تشریح کا صفحہ وہ تن زار
ہر ہر رگ و پے غرض نمودار

ترے ایام مین باقی نہ رہا پسکہ فساد
چشمہ خضر مین انہار عروق مجذوم

ایک قصیدے مین مختلف طبی اصطلاحات بہ کثرت آئی ہین ۔ مثلا " صالح الکیموس ، ہضم رابعہ ، انقباض طبع ، کیلوس ، ایلاوس ۔ یہ تمام الفاظ طبیبون کی سوا اور کسی کی سمجھ مین نہین آسکتے ۔ البتہ ایک قطعہ جس کا ذکر دوسرے باب مین ہوچکا ہے اور جس مین مومن نے اپنی جانکاہ علالت کا بیان کیا ہے بہت

دلچسپ ہے ۔

نجوم

جون ہی اس گھر مین ہوا میرا گزر　　آئی کچھ تثلیث زھرہ کی نظر

قران انجم سیارہ برج آبی مین　　ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے

کر دیا گردش سپہر نے حیف　　برج خاکی سیر کیوانی

کیا فروغ آتش فراق مین ہے　　مشتری زہرہ مہر احتراق مین ہے

ہے عطارد کو ان دنون مین زوال　　خط تقد پر مٹ سکے یہ محال

ان کے علاوہ سہم السعادت ، تربیع ، تقابل ، مزاج سیارگان ، وغیرہ ایسی اصطلاحین مین جن کا مفہوم سمجھنا کمال فن کے بغیر ممکن نہین ۔

ھندسہ

ع　　نہ کیون ہو شکل حماری کو نازشکل عروس

صرف و نحو

رواج حسن عمل تیرے دور مین یہ ہوا

کہ گفتگو مین بھی مرفوع ہو گیا فاعل

تصوف

وداد و خشم ترا صوفیون نے دیکھا ہے

جبھی تجدد امثال کے ہوئے قائل

فلسفہ

پا کے الزام دست خالی سے

فلسفی پیٹتا ہے اپنا سر

یعنی فلسفی کو جس کا عقیدہ ہے کہ خلا محال ہے اس کا دست خالی طعنہ

دیتا ہے کہ او ر وہ بیچارہ اپنا سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔

اس نوع کی اصطلاحین قصائد مین بہ کثرت ہین اور افسوس ہے کہ

بعض جگہ ان کے اغلاق نے کلام مین اشکال پیدا کر دیا ہے۔

اسلامی روایات | مومن کا خاندان خانوادۂ ولی اللہی کا معتقد تھا۔ خود ان

کی استعداد عربی و فارسی نہایت عمدہ تھی اور ان کا " ذہن بے خطا ، مختلف واقعات

ونظائر پر نگاہ رکھتا تھا۔ ان تمام باتون کے باعث ان کے کلام مین ایک طرح کا اسلامی

شعور موجود ہے۔ //یہ انداز ان کی گفتگو طرز فکر اور طرز بیان پر چھایا ہوا ہے

اور ان اشخاص کو بالخصوص مرغوب ہے جو اسلام کے احکام، روایات اور واقعات سے باخبر

ہون۔ //

تونے جو قہر خدا یاد دلایا مومن شکوہ جور بتان دل سے فراموش ہوا

خدا کی بے نیازی ہائے مومن ہم ایمان لائے تھے نازبتان سے

وصل بتان کے دن تو نہین یہ کہ ہو وبال مومن نماز قصر کرین کیون سفر مین ہم

ھندی صنم آفت جہان ہے — سوگند پیمبر حجازی

بوسہ صنم کی آنکھ نہ لیتے ہی جان دی — مومن کو یاد کیا حجر الاسود آگیا

پند کو حال زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے — کام دل جس کو ملا یان بعد رسوائی ملا

ہجر بتان میں تجھ کو ہے مومن تلاش زہر — غم پسر حرام خوار تو کل نہ ہوسکا

میں اور یہ بدعت تپش دل کے سبب ہے — مومن مرے سینے پہ رہے بعد فنا ہاتھ

یہ لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ کرک یوسف، ناقہ صالح اور واقعہ خضر و موسیٰ کے حوالے غزل اور قصیدون مین آئے ہین — بعض جگہ عربی عبارتون اور عربی مصرعون کو بے تکان تضمین کر دیا ہے۔

صنائع وبدائع (شبلی کے بقول صنائع فارسی شعر کے داغ ہین) اگرچہ اس مقولے مین ایک حد تک صداقت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی و اردو کے اکثر شعراء نے صنعتون کا استعمال کیا ہے۔ ان مین فردوسی سعدی اور حافظ سے لے کر میر سودا غالب سبھی شامل ہین — مومن نے بھی اس طرف کچھ توجہ کی ہے۔ کہین لطافت کے ساتھ اور کہین غیر مستحسن طریقے پر صنائع وبدائع کا استعمال

کیا ہے۔ ان میں صنعت تضاد (طباق) رعایت لفظی ، قول بالموجب ، قصر، سیاقۃ الاعداد، وغیرہ ہیں ۔ لیکن جس صنعت کے وہ زیادہ دلدادہ ہیں وہ تضاد یا طباق ہے۔ میر کی طرح وہ بھی اسے بہت استعمال کرتے ہیں ۔ان صنائع کی مثالیں اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں ۔

۱) تضاد (طباق)

ٹوٹنا جان کا ہوجانے کا دشوار آخر　　　چارہ سازو مری امید بندھاتے کیوں ہو

اس کے کوچے سے نہ اٹھتا تھا قدم　　　بیٹھے جاتے تھے ہراک گام پہ ہم

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے　　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

شوق نے مضطرب کیا مجھ کو　　　تیرے ملنے نے کھو دیا مجھ کو

ع　　تمہارا منہ چھپانا دیکھئے کیا کیا دکھاتا ہے

ع　　آج کیا بند و بست ہے در کھول

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں　　　آسمان کے ستم اٹھانے کو

۲) رعایت لفظی ۔ اس صنعت کا میدان پستیاں اور بلندیاں رکھتا ہے۔ اگر پستی کی طرف جائے تو ضلع جگت بن جاتی ہے اور لطافت کی بلندی پر پہنچے تو

بلاغت کا انداز دکھاتی ہے۔ تناسب الفاظ کے عنوان مین اس کی کافی مثالیں آ چکی ہین
مزید تشبیہین جن مین پست و بلند دونون موجود ہین حسب ذیل ہین ۔

برق کا آسمان پر ہے دماغ   پھونک کر میرے آشیانے کو

شعلہ رواب تو اٹھا دے چلمن

مجھ
شوق پنہان نے جلا یا ہاتھ کو

———

شربت مرگ آب حسرت شور بختی زہر غم

تلخ کامی سمجھیے کیا کیا گوارا ہوگیا

———

مثنوی نگاہت ستم مین وہ مقام بہت دل آویز ہے جب نو عمر عاشق کے والدین
اسے عشقبازی پر ملامت کرتے اور اپنے پاکیزہ کردار کی مثال دے کر ترک الفت کی
نصیحت کرتے ہین ۔

عزت و شان خاندان کو دیکھ   جاہ ہم اوج آسمان کو دیکھ

جون فلک سرکشی سے باز آ تو   پھر نہ ہمراہ ماہ سیط تو

کیون روش تیری بے محابا ہے   یہ چلن سب خلاف آبا ہے

کون تھا محو آئینہ رو کا   تشنہ لب آب تیغ ابرو کا

کس کو تھا اشتیاق چشم سیہ   کون تھا تختہ مشق کلک مژہ

غش ہوا کون غمبرین مو پر   دم دیا کس نے تیغ ابرو پر

کس کو تھا شوق مصرع گیسو   منتخب کس کے تھے بیاض گلو

ان کے دوش بدوش ایسی رعایتیں بھی ہیں جن کی پستی امانت کے اشعار کی یاد دلاتی ہے۔ ایسے مواقع پر آل احمد سرور کا یہ کہنا درست ہے کہ ذوق اور مومن دونوں شاہ نصیر کی بدولت رعایت لفظی کے کوچے میں رسوا ہوئے۔(۱)

پانی پھینکا تو کرم جو نہ سمجھ | مومن یہ دیا ہے اس نے پھینکا تجھ کو

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منھ | اے شب ہجر تیرا کالا منھ

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے | آنکھ لگانے جانے کا چرچا کیا

---

۲) قول بالموجب — یعنی قائل کے قول سے اپنے مطلب کی بات نکالنا۔

یہ بذلہ سنجی کی ایک صورت ہے۔ معاملات عشق کے ماہر مومن اسے بہت کامیابی سے استعمال کرتے ہیں۔

توبہ گنہ عشق سے فرماتے ہیں واعظ | یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

یارب کوئی معشوقۂ دلجو نہ ملے اب | جوان کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جو اب نہیں | لیکن سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

دے دیا کیجئے بوسہ طلب اول پر | سچ کہا تم نے مزہ حرف مکرر میں نہیں

وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے | مژدۂ وصل سنا تے ہیں مجھے

۱۔ نئے اور پرانے چراغ ص ۱۲۲

سیاقۃ الاعداد یعنی کلام میں شمار اعداد کا داخل کرنا

جز نہ سپہر میں مرے دشمن تو اور بھی لیکن پڑے غضب یہی دو تین چار ہیں

براعۃ الاستہلال صنائع معنوی میں اس صنعت کا خاص مقام ہے۔

مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ مطلعے میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو نظم کے موضوع

مثلاً شادی، غمی، تہنیت، تعزیت کا اشارہ کرتے ہوں ۔ عرفی کو یہ صنعت بہت

مرغوب تھی ۔ غالب نے بھی بعض فارسی قصائد میں اس سے کام لیا ہے ۔ مومن

نے بعض مثنویوں اور اکثر قصائد میں اس کو برتا ہے مثلاً

قصیدۂ حمدیہ :

الحمد لواهب العطایا اس شور نے کیا مزہ چکھایا

قصیدۂ درمدح وزیر الدولہ :

یاد ایام عشرت فانی نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

قصیدہ درمنقبت صاحب ذوالفقار مولا علی مرتضیٰ :

کٹتی ہے میری تیغ زبان سے زبان تیغ

کیونکر سخن فروش ہوں سوداگران تیغ

معشوقہ حور یشتیم کے مرثیے کا مطلع بھی اس پاکیزہ صنعت کا شاہکار ہے

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج

آغوش رشک حلقۂ اہل عزا ہے آج

مومن نے نظم کے علاوہ نثر میں بھی اس صنعت کا استعمال کیا ہے چنانچہ بعض فارسی

رقعات کے اولین الفاظ نفس مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہیں[1] ۔

ایہام

یہ منقد میں یعنی شاہ مبارک آبرو ، حاتم اور ناجی کا تبرک ہے جو مومن کے عہد میں ختم ہو گیا تھا ۔ ایک دو شعر اس صنعت کے کلیات اردو میں نکل آتے ہیں ۔

حسن انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال ۔۔۔ یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

مارا جانا قتل ہونے کے معنی رکھتا ہے لیکن یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ مومن کا مارا جانا شہادت کہلاتا ہے جو مرتبۂ عظیم ہے ۔

آنچلوں سے کہو مقیش کہاں چھوٹتا تھا ۔۔۔ کب دوپٹہ یہ مری طرح کرا پڑتا تھا

حسن تعلیل

تکلیف سے جوں پنجۂ گل لال ہوا تھا

نازک ہے بس اب چھوٹ دے اے رنگ حنا ہاتھ

چشم خونبار مری آپ نے تلووں سے ملی ۔۔۔ ورنہ ایسا بھی کہیں رنگ حنا ہوتا ہے

تجنیس

طلب وصل کس انداز سے ہم کرتے ہیں

شوق نامہ اسے وصلی پہ رقم کرتے ہیں

قصر

تفریق کی سلبی یا منفی صورت سمجھئے ۔ اس کا انداز یہ ہے

[1] انشائے مومن صفحہ ۱۰۵ و صفحہ ۱۷۱

کہ کسی صفت یا حالت کو ایک شے کے ساتھ مخصوص کر کے دوسری چیز کو اس صفت یا حالت سے الگ کر دیتے ہیں[۱] معاملہ بندی میں جہاں رد و بدل، سوال و جواب اور مباحثہ و مناقشہ کی صورت پیدا ہو وہاں اس صنعت کا جوہر کھلتا ہے۔ عشق یا زمومن نے واسوختوں میں اس کا استعمال کیا ہے۔ بطور مثال ایک بند درج کیا جاتا ہے:۔

چھوڑ دینا تھا تمہیں جھوٹ قسم کو نہ مجھے　　دل سے کھونا تھا اس انداز ستم کو نہ مجھے

بھول جانا تھا جفا شیوہ صنم کو نہ مجھے[۲]　　نیست کر دینا تھا اندوہ و الم کو نہ مجھے

قابل ترک تھی خوئے ستم آرا نہ کہ میں

لائق سہو تھی یہ رنجش بیجا نہ کہ میں

کچھ زبان زور نہیں ہے کہ جو چل ہی نہ سکے　　غم کچھ ارمان نہیں ہے کہ نکل ہی نہ سکے

۱۔ نجم الغنی خان ۔ بحر الفصاحت ۔ ص ۵۸۳

۲۔ یعنی جفا نے پیہم

دیگر اصناف شعر

مثنویات

مثنوی کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ شاعری کی عظیم ترین صنف ہے۔ اس لئے نہین کہ دیگر اصناف کے مقابلے مین یہ بہ درجہ ہا ضخیم ہوتی ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ طولانی قصون کو بیان کرنے کے لئے شاعر کو بڑے اہتمام کرنا پڑتے ہین ۔ ہر منظوم قصہ متعدد واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کو باہم ترتیب دینا ۔ مختلف مراحل سے گزار کر نقطہ عروج تک پہنچانا ۔ اور بالآخر آخری منزل تک لاکر پورے قصے کو ایک نامیاتی ہیئت بخشنا بہت محنت کا طالب ہے ۔ کچھ شک نہین کہ غزل کے اشعار اور رباعی کے چار مصرے بھی ریاض چاہتے ہین لیکن مثنوی پر بےحد کاوش کرنا پڑتی ہے۔ واقعات کا ربط وتسلسل برقرار رکھنے کے علاوہ (جو بجائے خود بہت مشکل ہے) قصے کے کردارون کی خصوصیات قائم رکھنا ۔ مختلف مواقع پر ان کے مزاج کی بنیادی خوبیان پیش کرنا ۔ نفسیات کی بھول بھلیون مین ان کے مخصوص اوصاف کی نقاشی ایسے مشکل کام ہین جن کے لئے ذہن کاوش بھی ضروری ہے اور فنی اہتمام بھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء جو غزل کے مرد میدان ہین مثنوی مین سست رو نظر آتے ہین اور عرفی جیسے زبردست استاد کو بھی " رنگ فصاحت نداشت " کا طعنہ سننا پڑتا ہے ۔ غرض مثنوی وہ صنف ہے جس مین شاعر کا اصلی جوہر بخوبی پرکھا جا سکتا ہے اور جس مین دنیا کی عظیم ترین ادبی تخلیقات پیش کی گئی ہین ا؎

۲؎ مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۳۹ (بہ تصرف سعید)

۱؎ امداد امام اثر ۔ کاشف الحقائق ص ۳۰۱

حالی نے اس صورت کو مثال کے ذریعے اس طرح سمجھایا ہے کہ " پتیلی کے باورچی سے دیگ نہیں پک سکتی " [۱] ۔ ظاہر ہے کہ غزل کے شعر میں ایک جذبے یا خیال کو نظم کر دینا نسبتاً سہل ہے ۔ اس کے مقابلے میں کسی داستان کے اجزاء و کیفیات کا باہم مربوط رکھنا ۔ واقعات کو ایک دوسرے سے چسپاں کرنا اور سب سے بڑھ کر واقعات کی جزئیات کا اهتمام بڑے ادق مرحلے ہیں جن سے گزرنا بہت محنت طلب ہے [۲] ۔

ہمارے اذہان پر مومن کے تغزل کا جادو کچھ اس طرح مسلط ہے کہ ان کی مثنویاں پس منظر میں جا پڑتی ہیں ۔ حالانکہ قادر الکلامی کے نقطۂ نظر سے مثنویاں ہی شاعر کی عظمت و قدرت کا معیار ہیں کہ ان میں وہ داخلی کیفیات بیان کرنے سے زیادہ خارجی واقعات کا

مثنوی میں مومن کا پایہ بہت بلند ہے۔

اظہار کرتا ہے ۔ اس معیار سے جانچئے تو سترہویں صدی عیسوی وہ زمانہ ہے جب دکن میں

نیا پیرا

اردو کا بخوبی آغاز ہو چکا تھا ۔ ہندو حکمرانوں کے چھوٹے چھوٹے رجواڑے ختم کر کے حوصلہ مند سلطانوں کے مختلف خاندان دکن پر حکومت کر رہے تھے ۔ قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان شاعروں کے قدر دان تھے اور انہیں شاہانہ عنایات سے نوازتے تھے ۔ ایسا زمانہ تخلیق کے لئے نہایت سازگار ہوتا ہے ۔ پنڈار اور سوفو کلیز کا یونان نیز شیکسپیر کا انگلینڈ تخلیقی قوتوں کے محرک تھے [۳] دکن کا بھی ان دنوں یہی حال تھا ۔ ابن نشاطی کی پھول بن ۔ وجہی کی قطب مشتری ۔ مقیمی کی چندر بدن ماہ یار ۔ غواصی کی سیف الملوک بدیع الجمال ۔ نصرتی کا علی نامہ اسی دور تخلیق کے ثمر پیش رس ہیں ۔ صرف قطب شاہی دور میں ۱۹ عدد مثنویاں لکھی گئی تھیں [۴] ۔ جن میں سے بعض کے اشعار کی تعداد اسی ہزار تک پہنچتی ہے ۔

---

[۱] مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۳۹ ۔ [۲] عبد السلام ندوی ۔ شعر الہند جلد دوم ص ۲۸۰ (۴) تاریخ مثنویات اردو ص ۱۴
[۳] ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ ۔

شمالی ہند میں محمد شاہی دور میں جب اردو کو عروج تازہ نصیب ہوا تو شعراء نے مثنوی سے چنداں اعتناء نہ کیا۔ غزل ان دنوں مقبول ترین صنف تھی۔ آخری مغل حکمرانوں کے زمانے میں غزل کے دوش بدوش قصیدے مثنویوں کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ سیاسی اعتبار سے یہ دور قومی پستی کا زمانہ ہے جس میں عمدہ تخلیقات کا وجود میں آنا مستبعد ہے تاہم اس دور انحطاط میں بھی بعض شعراء نے مثنویاں لکھ کر اردو کے ادبی سرمائے میں خاصہ اضافہ کیا۔ ان میں مومن کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جن کی چھ مثنویاں بہ تفریق ذیل ہمارے سامنے ہیں:۔

مثنوی	سال تصنیف	تعداد اشعار	بحر
۱۔ شکایت ستم	۱۲۳۱ھ	۶۰۲	خفیف مسدس مقطوع
۲۔ قصۂ غم	۱۲۳۵ھ	۵۱۱	ہزج مسدس اخرب محذوف
۳۔ قول غمین	۱۲۳۶ھ	۵۲۲	رمل مسدس مخبون محذوف
۴۔ تف آتشین	۱۲۴۱ھ	۳۳۶	متقارب مسدس اثلم
۵۔ حنین مغموم	۱۲۴۴ھ	۵۱۱	رمل مسدس مقصور یا محذوف
۶۔ آہ و زاری مظلوم	۱۲۴۶ھ	۵۲۴	ہزج مسدس محذوف

یہ مثنویاں مومن کی حیات معاشقہ کی منظوم تصویریں ہیں [۱] جن میں انہوں نے آغاز الفت کی رنگین یادوں اور ناکامی الفت کی درد ناک محرومی کے نقشے کھینچے ہیں۔ داخلیت ان مثنویوں کا وصف امتیازی ہے۔ ان کا خارجی پہلو نسبتاً کمزور ہے۔ وجہ یہ ہے کہ واقعات کی کثرت جو رزمیہ اور بزمیہ داستانوں کے دامن کو پھیلاتی ہے ان مثنویوں میں بہت کم ہے۔

۱۔ امتیاز احمد۔ نگار مومن نمبر ص ۵۷

مومن کے یہ تمام معاشقے ۔ آغاز محبت ۔ سلسلہ جنبانی شوق ۔ وصل اورمہجوری ومحرومی کے مرحلون سے گزر کر ختم ہوجاتے ہین ۔ ان مین فارسی یا اردو کی مشہور مثنویون کے سے مافوق الفطرت عناصر ۔ محیرالعقول واقعات ۔ داستانی پھیلاونہین ہین ۔ ایک تازہ عشق نظرباز نوجوان کی عاشقی کے قصے ہین جنہین اس نے کسی تکلف یا اہتمام کے بغیر لکھ دیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا داخلی پہلو جتنا مکمل ہے خارجی تفصیلات اتنی میسرحاصل نہین ہین ۔ اسی بنا پر نواب امداد امام اثر نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ :۔

"واضح ہو کہ مثنوی نگاری کے لئے داخلی شاعری کے علاوہ کچھ خارجی خصوصیات کی بھی حاجت ہے ۔ مومن خان خارجی شاعری سے کوئی بہرہ نہین رکھتے تھے ۔ اس لئے ان کی مثنویان امورخارجیہ سے تمام ترمعرا ہین ۔ ان کی مثنویون مین کہین بھی کسی سینری کا بیان دکھائی نہین دیتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مجرد داخلی شاعری کا برتنے والا شاعرحسب مراد مثنوی نہین لکھ سکتا" [۱]

امداد امام صاحب کا یہ اعتراض صرف ایک حد تک صحیح ہے ۔ مومن نے مثنویون مین کہین کہین چاندنی رات ۔ صبح وشام دشت وصحرا کی منظر نگاری بھی کی ہے ۔ (دیکھئے شکایت ستم) لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ خارجی کیفیات لکھنے مین ماہر نہ تھے ۔ بااین ہمہ اس ایک کمی کے باوجود بحیثیت مثنوی نگاران کا کمال مسلم ہے ۔ اردوادب مین شکایت ستم اور قول غمین جیسی مثنویون کا جواب نہین ملتا ۔ ان مین باکمال شاعر نے کیفیات عشق نظم کرنے کے علاوہ بے درد عزیزون کی رخنہ سازی ۔ بزرگون کی سخت گیری ۔ غمازون اور رقیبون کی خانہ برانداری ۔ شادی بیاہ کی محفلون ۔ خلوت کی چہلون اور

---

[۱] کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۷۱

چھیڑون کےایسے مرقعے پیش کیے ہین کہ واقعہ نگاری کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مومن نفسیات کے نکتون سے بھی غافل نہین ہوئے۔ وہ ہر شخص کے تاثرات نفسی سے باخبر ہین اور اسے نہایت صحت کے ساتھ پیش کرتے ہین ۔جس کی مثالین مومن کے ذاتی حالات کے بہ سلسلہ تحریر ہو چکی ہین ۔ پھر جب یہ خیال آتا ہے کہ انھون نے پہلی مثنوی شکایت ستم سترہ سال کی عمر مین لکھی تھی تو نوجوان شاعر کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔یہان مختصر اقتباسات درج کیے جاتے ہین جن سے واضح ہوگا کہ مومن سترہ سال کی عمر مین بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مثنوی نگاری کے بنیادی مطالبات سے واقف تھے۔ تسلسل مضمون ربط کلام ۔ قدرت بیان ۔واقعہ نگاری کے اتنے عمدہ شاہ کار ان مثنویون مین موجود ہین کہ یہ صنف شعر مومن کی ذات پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

۱) راز عشق فاش ہوجانے پر مختلف عزیزون کی برہمی ۔

وان سے ناچار آئےہم گھر مین	پانون رکھتے وہان اژدر مین
آستانے پہ جون قدم رکھا	سر پہ بار سنگ غم رکھا
دیکھتا ہون (کیا) سارا گھر ہے غمین	جو نظر آئے ہے سو چین بہ جبین
اقربا کی نگاہین قہرآلود	دست دشمن مین تیغ زہرآلود
گھر سے اٹھی صدا ملامت کی	ایک اک نے جدا قیامت کی
بد زبانون نے آکے منہہ پہ کہا	جا کہ تو اپنے کام کا نہ رہا
ہم کو بد نام کر دیا تونے	اے زبون کار کیا کیا تونے
نام کو خاک مین ملا یا حیف	تونے جون کاف سر اٹھا یا حیف
کب تلک در گزر بھلا ہووے	کیا کیا پہ ترا برا ہووے

آرزو تھی کہ نکلین گے ارمان	کہ خدائی کے کرتے تھے سامان
اس توقع سے اب ہوے مایوس	آ گیا فرق بات مین افسوس
حسن کے ایسے صفات نامعقول	نہ کرے گا کوئی جہان مین قبول ا؎

سب جانتے ہین کہ مختلف عزیزون یعنی باپ – چچا – مان – بہن – وغیرہ کی ناراضی اور ملامت کا انداز مختلف ہوتا ہے – رنگین نوا شاعر نے اس منزل مین بڑی کامیابی سے مختلف عزیزون کی برہمی کے نقشے کھینچے ہین جن مین تغزل کی رنگینی موجود ہے –

۲) اسی داستان الفت کا ایک باب یہ بھی ہے کہ پہلی محبوبہ کی ناگہانی وفات کے صدمے سے مومن بیمار رہنے لگے – اس عالم یاس مین ایک اور زہرہ جبین (جو غالبا" مومن کی ہمسائی ہے) آئی اور اپنے جمال دلفروز سے نیز تسلی وتشفی کے کلمات سے ان کے زخمی دل پر مرہم لگایا – نتیجہ یہ ہوا کہ عاشق مزاج شاعر اپنے غم کو بھول کر اس کے دام عشق مین گرفتار ہوگیا – یہ تمام واقعات اس طرح بیان ہوئے ہین • –

لب جان بخش چارہ جو کیا کیا	الفت آلودہ گفتگو کیا کیا
واہ اس لب کی چارہ فرمائی	بات مین آ گئی توانائی
پوچھنا اب مزاج کیسا ہے	غش یہ پھر تم کو آج کیسا ہے
جان سے یون گزر نہین جاتے	موئے کے پیچھے مر نہین جاتے
حظ اٹھاو ذرا جوانی کے	کچھ مزے دیکھو زندگانی کے
عمر رفتہ کی جستجو کب تک	اپنے مرنے کی آرزو کب تک
آخر اک روز جان جانی ہے	یہی دو دن کی زندگانی ہے

ا؎ کلیات اردو ص ۲۵۵

اٹھ ذرا آپ کو سنبھالو بس	چل غم حسرتیں نکالو بس
آگیا جان کو قرار و ثبات	واہ اس کے کلام کی کیا بات
صبر آنے لگا مجھے کم کم	شوق جتنا بڑھا ہوا غم کم
متصل کی جو اس نے دلداری	نہ رہی زندگی سے بیزاری

ان اشعار میں مومن نے واقعہ نگاری سے کام لیا ہے۔ ربط و تسلسل کا یہ عالم ہے کہ ہر شعر اگلی بیت سے مربوط ہے اور بیان کا سلسلہ کمال انتظام سے قائم ہے[1]۔ یہی عالم اور مثنویوں کا ہے۔ قول غمین میں ایک جگہ یہ کیفیت بیان کی ہے کہ فراق محبوب کے بعد رفتہ رفتہ دل اس صدمے کو بھول گیا اور طبیعت بحال ہو کر اپنے اصلی رنگ پر آ گئی[2] (وفا نا آشنا عاشقوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔

اس مقام پر نفسیاتی ژرف بینی کے علاوہ قدرت بیان دیکھنے کے قابل ہے ۔

۲) چندے اس غم میں براحال رہا	کیا کہوں آہ کہ کیا حال رہا
پر ذرا جینے کا کچھ طور بھی تھا	ان خیالوں میں خیال اور تھا
صبر بھی شکل دکھا جاتا تھا	دل نہ ملنے پہ بھی آجاتا تھا
کئی دن میں ہوا غم اور بھی کم	پھر ذرا اور بھی کم اور بھی کم
پھر تو وہ خبط وہ سودا ہی گیا	دل بیمار بحال آہی گیا
رنگ رفتہ نے جھلک دکھلائی	منہ پر اک سرخی کی تہ سی آئی

---

۱) شعر الہند جلد دوم ص ۳۸۱ مثنوی کے بنیادی اوصاف

۲) کلیات اردو ص ۳۱۱

(۲) ایک اور مقام پر محبوبہ سے جدائی کا عالم بیان کیا ہے جو دہلی سے کسی اور شہر کو روانہ ہوتی ہے ۔ داستان فراق کے اس باب مین سوز و گداز اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے ۔ پردہ نشین معشوقہ سے ملنے کے موقعے کم ملتے ہین اور اگر وہ کسی دوسرے شخص کو محکوم ہو تو اس سے ملاقات بالعموم مختصر ہوتی ہے ۔ مومن نے وداعی ملاقات کا حال لکھتے ہوئے اس مختصر صحبت کا ذکر ایسے درد ناک انداز مین کیا ہے کہ دل سے دھوان اٹھتا محسوس ہوتا ہے ۔

یعنی وان کوچ کی ان کے ٹھہری	ناگہان کوچ کی ان کے ٹھہری
جس گھڑی ہم تلک آئی یہ خبر	چھا گئی یہ خبری سی دل پر
اس مین پیغام پر آیا وان سے	ترجمان لعل لب جانان سے
کہ سنا تم نے سفر ٹھہر گیا	اپنا جانا اب ادھر ٹھہر گیا
یون جدائی کی خبر کاہے کو تھی	دور گردون یہ نظر کاہے کو تھی
جو کچھ اس وقت بلا نے چاہا	وہ فلک نے نہ خدا نے چاہا
خیر وہ تو نہ ہوا پر نہ ہوا	چاہا تھا جو نہ ہوا پر نہ ہوا
لیکن اس وقت ذرا فرصت ہے	ہے مکان اور کا اور خلوت ہے
جی مین آجا ئے تو آجاو یہان	آن کر شکل دکھا جاو یہان
سن کے یہ حال مین باحال تباہ	بیخود نہ ہوا اس کے ہمراہ
پایہ شوق کہان تک پہنچا	وہ تھے جس جائے وہان تک پہنچا
کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی	کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
مل کے حسرت زدگان بیکس	دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام	پر یہ بولے وہ ذرا جی کو تھام

که یه کیا حال ہے کیون روتے ہو	مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اورون سے لگا لیجیو جی	نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہم چلے حسرت و حرمان کے ساتھ	تم رہو خوش کسی جانان کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا	تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا
کہہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی	ہچکیان لیتی ہوئی روتی ہوئی

یہ فن پارے ربط کلام ۔ تسلسل مطالب اور قدرت بیان کا شاہکار ہین جن مین اظہار مطلب کمال سہولت سے ہوا ہے ۔ یہ فرقت نصیب شاعر کے دل کی داستان ہین اور ان مین ایسے مقامات متعدد ہین جن کا سوز و گداز میر کی شعلۂ عشق اور نواب مرزا کی زہر عشق کی سی تاثیر رکھتا ہے ۔ راز اس تاثیر کا یہی ہے کہ یہ مثنویان آپ بیتی ہین جن مین دل باختہ شاعر نے " شعر کو سخن کا پردہ " بنا کر سوز الفت کا بیان کیا ہے ۔ اسی بنا پر رام بابو سکسینہ نے بہت خوب لکھا ہے کہ :۔

> " ان کی مثنویان سرتیز نشتر ہین جن مین حرمان نصیب عاشق کے سوز الفت کا اظہار ہے ۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہین اور مضطرب دلون کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہین " (۱)

مجرد داخلی کیفیات بیان کرنے مین مومن دوسرے مثنوی نگار شعراء کے ہم عنان ہین ۔ واقعہ نگاری مین بھی وہ کسی اعتبار سے کم نہین کیونکہ ان کی قوت بیانیہ واقعات کی جزئیات کو نہایت اہتمام سے بیان کرنے پر قادر ہے ۔ جذبات کی مصوری مین بھی وہ کامل ہین ۔ ان اوصاف

۱) تاریخ ادب اردو مترجم ص ۲۷۱

کا اعتراف گارساں دتاسی ، شیفتہ ، صابر ، نساخ ، عبدالسلام ، عبدالحی ، رام بابو سکسینہ ڈاکٹر اعجاز حسین ، سید وقار عظیم وغیرہم نے کیا ہے[۲] ۔ بہ این همه مثنوی اتنی عظیم صنف سخن ہے اور اس کے مطالبات اتنے متنوع ہیں کہ ہر شاعر ان سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ۔ منظرنگاری انھی مطالبات میں سے ہے ۔ اگرچہ مومن کی مثنویوں میں کہیں کہیں مناظر کی تصویریں بھی ملتی ہیں لیکن ان کا انداز سادہ بیان کی صراحت کے بجائے تغزل کی داخلیت رکھتا ہے ۔ دراصل وہ داخلیت جو مومن کا مزاج تھی انھیں بیان واقعہ یا تفصیل مناظر سے ایک حد تک باز رکھتی ہے کیونکہ دونوں کے رستے جدا جدا ہیں ۔ بہ این همه کہیں کہیں مناظر کے مرقعے بھی موجود ہیں جن کا نمونہ یہ ہے : ۔

۱) شب ماہ کی تفصیل ۔۔

ایک شب جوش انبساط و سرور	ساغر مہ لبالب مے نور
شرم اس شب سے شمع طور کرے	لیلۃ القدر اخذ نور کرے
ذرہ ذرہ غبار نورانی	صبح محشر کی سی درخشانی
زیر خاک آسمان دکھائی دے	بے نشاں کا نشان دکھائی دے
عالم آئینہ تجلی ذات	جنبش عرش گردش اوقات

۲) پر فضا جنگل کا نقشہ

اور اس پہ وفور ابر و باران	ہنگامۂ عید بادہ خواران
ابر و گل و سبزہ سب طرب خیز	افلاک و زمین سرور انگیز
جی چاہا کہ سیر دشت کیجیے	مے ابر شراب ناب پیجیے

۲ـ سخن شعراء ص ۲٦٤ گلشن بیخار ص ۱۹٦ گل رعنا ص ۳۰۲ تذکرۂ شعرا کریم الدین ص ۲۴ وغیرہ

- آخر ہوئے مضطرب شتابان | لیجی گئی الفت بیابان
دیکھیں تو کچھ اور ہی ہے عالم | صحرا بھی نہیں بہشت سے کم
خودرو گل دشت کیسے کیسے | شاید کہ بہشت مین ہون ایسے
ہر رنگ کے گل جو ہیں نمودار | صحرا کی زمین ہے صحن گلزار
ان پھولون سے ہےزمین جو رنگین | صحرا ہے نگار خانۂ چین
ہنگامۂ سیر کس قدر گرم | گل گشت مین شیخ شہر سرگرم

مناظر کے یہ نقشے بجائے خود بے عیب ہیں — ان مین فارسی تراکیب — دقت خیال مبالغہ آرائی اور حسن تعلیل کے باوجود جو سلاست بیان مین حائل ہور ہے ہین قادرالکلامی اور صفائی زبان نے منظر نگاری کا حق ایک حد تک ادا کر دیا ہے — تاہم یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کے نقشے اگرچہ تلق کی طلسم الفت یا دیا شنکر کی گلزار نسیم سے بہتر ہین پھر بھی منظر نگاری کا عمدہ نمونہ نہین ہین — ان مین وہ تفصیل اور صداقت نہین پائی جاتی جو میر حسن کی سحرالبیان کے منظر مین ہے اور جن سے اردو ادب کا ہر طالب علم واقف ہے

میرحسن نے جنگل کی چاندنی رات کا جو نقشہ پانچ سات شعر مین کھینچا ہے اس کی دلنشینی کا یہ عالم ہے کہ ذہن کے پردے سے کبھی محو نہین ہوتا — اس بنا پر صاحب کاشف الحقائق کا یہ قول ایک حد تک صحیح ہے کہ :-

" مومن کی مثنویان امور خارجیہ سے مبّرا ہین [۱] "

ان تمام اعتراضات کے باوجود جو نواب امداد امام اثر نے ان مثنویون پر کیے ہین ان کی ادبی عظمت مین کلام نہین — ربط کلام — بیان واقعات اور تسلسل عمدہ مثنویون

---

[۱] امداد امام اثر — کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۷۲

کے امتیازی اوصاف ہیں۔ [۲] یہ سب مومن کی مثنویوں میں موجود ہیں - سوز و گداز اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ میر کی شعلۂ عشق اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق کے سوا اردو کی کوئی اور مثنوی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی - علاوہ ازیں ان میں شاعر کی رنگین نوجوانی کے مشاغل ذاتی واقعات - احباب اور ہمراز شاگردوں کا ذکر اور اس کے معاشقوں کی تفصیلات اس کثرت سے ہیں کہ وہ مومن کے ذاتی حالات کے سلسلے میں نہایت قیمتی دستاویزوں کی حیثیت رکھتی ہیں - رام بابو سکسینہ کا یہ کہنا کہ

" یہ مثنویاں مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت ہیں "

حقیقت پر مبنی ہے - شاعر کے خلوص بیان کا یہ عالم ہے کہ انھیں پڑھتے وقت قاری پورے طور پر مصنف کی رفاقت اختیار کر لیتا ہے - وہ رنج وملال فرحت وانبساط کامرانی و ناکامی غرض ہر موقعے پر مصنف کے ساتھ چلتا ہے - کلام میں خلوص و تاثیر کا جوہر وہ چیز ہے جو قاری کو کشاں کشاں ساتھ لئے پھرتا ہے اور وہ اختتام داستان پر مصنف کے دل ملال میں شریک ہوکر اس غم کا امین بن جاتا ہے جس کا داغ شاعر کے محزون دل پر لگا ہوا ہے -

مومن کی مثنویوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ

" ان مثنویوں کو حکمت آموزی سے کوئی علاقہ نہیں -
دس شعر بھی ان میں ایسے دکھائی نہیں دیتے جن میں
کسی اعلی قسم کے ذہنی مسائل حوالۂ قلم ہوئے ہوں -
عموما" جتنے داخلی مضامین نظم کئے گئے ہیں وہ غیر مہذب
نوجوانوں کی پسندیدگی کے قابل ہیں - ایسے مضامین کسی حکیم
کو کیا مطبوع ہوسکتے ہیں [۳]

۲- عبدالسلام - شعرالہند جلد اول ص ۱۸۸ ۳- امداد امام اثر کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۲۴

یہی مصنف دوسری جگہ لکھتے ہین : ـ

" ان کی کوئی مثنوی بھی ایسی نہین جو کسی پہلو

بھی مفید معاشرت ہو ـ اکثر مثنویان عشقیہ ہین

جن سے کوچہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسی ہین کہ سوائے

نوجوانان غیر مفید کے ان کا گزار کسی اور دماغ مین نہین

ہو سکتا " (۲)

ان اعتراضات کا جواب صائب کی زبان سے دینا چاہیے کہ جس نے کہا تھا کہ " شعر مرا به مدرسه که برد " ـ کلام کی افادیت ایک مختلف چیز ہے ـ بنیادی وصف ہرگز نہین ـ اگر عشق و عاشقی پر یہی قدغن لگا دی جائے تو ہماری شاعری بلکہ دنیا کی شاعری کے اکثر سفینون کو دریا برد کرنا پڑے گا اور ہمارے سرمایۂ ادب مین " میلاد اکبر اور راہ نجات کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے گا " ـ (۳) میتھو آرنلڈ کے بقول ادب زندگی کا آئینہ دار ہے ـ وہ ادب جس مین شاعر کا مزاج اور ماحول منعکس نہ ہو ـ جس مین زندگی کے چلتے پھرتے مرقعے اور معاشرت کی صحیح تصویرین نہ ہون سراسر فرضی اور غیر حقیقی ہے ـ یہ درست ہے کہ مومن کی زندگی کوچہ گردی مین گزری اور پینتالیس سال کی عمر تک وہ ہوسناکی ولذت کوشی کے دلفریب جال مین پھنسے رہے لیکن اس سے ان کے کمال شعر پر حرف نہین آتا ـ حکیم مومن خان کا مطالعہ کرنے والے کو یہ صورت حال پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے کہ وہ فرخی اور اقبال کی طرح " شاہد ناز اور تازہ عشق " تھے ـ شرع کے نقیب

۲ـ امداد امام اثر ـ کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۷۲

۳ـ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ـ غزل اور متغزلین ص ۱۹۱

یا اخلاق وحکمت کے داعی ومدعی نہ تھے۔ ان کا خمیر محبت سے ہوا تھا چنانچہ جوانی بھر وہ شاہد ان شیرین و یاران رنگین کی صحبت سے دل بہلاتے رہے [۱] میر عبدالحی تاباں کی طرح جنہوں نے شراب کو اپنی زندگی کا جزو بنالیا تھا مومن نے عشقبازی کو سرمایہ حیات بنایا تھا ڈاکٹر اعجاز حسین نے ان کے اسی پہلو پر نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

" ان کی مثنویاں ان کی حیات کی آئینہ دار ہیں
جن میں جذبات کی آمد ۔ زبان کی روانی وسلاست خاص
طور پر قابل ذکر ہیں " ۔[۲]

آل احمد سرور کو بھی اعتراف ہے کہ مومن کے ہاں فلسفیانہ فطانت اور فقیرانہ ترک نہیں ہے ۔ وہ شاعر شباب تھے اور انھوں نے اپنے بے قرار مضطرب دل کی داستان غزل اور مثنوی کے پردے میں سنائی ہے۔ ان سے فلسفیانہ مباحث یا اخلاقی مواعظ کا مطالبہ نازیبا ہے ۔ لذت کوشی اور اخذ نشاط ان کا مقصد حیات تھا ۔ صوفیانہ سپردگی اخلاق آموزی اور حکمت نگاری سے انھیں واسطہ نہ تھا۔ [۳] امداد امام صاحب صحرا نے محبت کے اس غزال پر گھاس لادنے کا اصرار کرتے ہیں اور اس سے حکمت واخلاق کے دفاتر لکھوانا چاہتے ہیں جو اصولاً " ایک غلط مطالبہ ہے ۔

البتہ اتنا کہنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ دوسری مثنوی قصہ غم میں ایک مقام پر عریانی وابتذال کا پہلو موجود ہے ۔ غالباً " مومن نے واقعہ نگاری کے شوق میں وہی انداز اختیار کیا ہے جس نے کچھ عرصہ پہلے میر اثر کی مثنوی خواب وخیال پر عریانی ورکاکت کا داغ لگا یا تھا ۔ دونوں مثنویوں کے بعض اشعار جن میں شاعر عالم خیال میں محبوب سے مخاطب ہے ہم مضمون ہیں مثلاً " :-

---

۱۔ شیفتہ ۔ گلشن بے خار ص ۱۹۶ ۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو ص ۱۵۶
۳۔ آل احمد سرور ۔ نئے اور پرانے چراغ ص ۲۲

میراثر

وہ ترا روٹھ کر نہ کرنا بات

چھاتی پر مسکرا کےمارنا لات [1]

—

وہ ترا پیار سے لپٹ جانا

اور دل کھول کر چمٹ جانا

—

وہ ٹھنکنا دماغ داری سے

پھر بلکنا وہ آہ و زاری سے

—

تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ

نیند آتی ہے اب مجھے نہ جھنجھوڑ

مومن

آہستہ لگا لی آہ لاتین

حیلے کی وہ کیسی کیسی باتین [2]

—

پہرون ہی گلے سے لپٹے رہنا

یہ رنج نزاکتون پہ سہنا

—

وہ چین بہ جبین ہو کے کہنا

کن بیکسیون سے رو کے کہنا

—

بے رحم تو مجھ کو اب تو دے چھوڑ

بس چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ

غرض اس ایک مثنوی مین یہ عریانی موجود ہے۔ تقابل و موازنہ سے اندازہ ہوتا ہےکہ مثنوی لکھتے وقت مومن کے ذہن مین میراثر کی خواب وخیال اور میر تقی میر کی مثنویون کے نمونے موجود تھے ۔ مثنوی مین غزل کا پیوند لگانا بھی انھون نے ان ہی دو استادون سے سیکھا ہے۔ خواب وخیال کاانداز تو شعراء کی نگاہ مین ایسا کھبا کہ نواب مرزاشوق تک نے اپنی مثنوی بہار عشق مین اس کاتتبع بلکہ اس سے استفادہ کیا ہے۔ ممکن ہےکہ مومن نےبھی تقلید کی رو مین بہ کراس مثنوی مین عریانی و رکاکت کے یہ مناظر نظم کئےہون ۔ بہرحال یہ چیزین ان کے لئے وجہ معذرت نہین بن سکتین ۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ " قصۂ غم " مین مومن

---

[1] خواب وخیال ص ۸۵ و ۸۷

[2] کلیات مومن اردو ص ۲۹۸ و مابعد

نے صحیح اخلاقی حدود سے تجاوز کیا ہے۔غالبا" اسی سے حکیم عبدالحی نے بھی یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کی مثنویاں اخلاقی حیثیت سے پست ہیں [۱]

بہ حیثیت مجموعی مومن کی ان تخلیقات نے مثنوی نگاری کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے ۔ شکایت ستم ۔ قصہ غم اور قول غمین مثنوی نگاری کے تمام مطالبات پر پوری اترتی ہیں ۔ چوتھی مثنوی تف آتشین اپنی شوخ بیانی ۔ برجستگی اور مترنم ۔ اچھوتے کہاتی بحر (متقارب مسدس اثلم) کے لحاظ سے بہ غایت دلپسند ہے۔ باقی دو مثنویاں اوسط درجے کی ہیں ۔ ان کی " جہادیہ " ولولہ انگیز نظم کی عمدہ مثال ہے جس میں مسلمانوں کو شامل جہاد ہونے اور سید احمد صاحب کے لشکر میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ان تمام امور کے پیش نظر مومن کی مثنویوں کے باب میں قول فیصل وہ ہے جو جلال الدین احمد نے تاریخ مثنویات اردو میں درج کیا ہے کہ :-

" ان کی مثنویوں میں آپ بیتی ہونے کی وجہ سے
داخلی رنگ نمایاں ہے ۔ مضمون آفرینی ۔ تکلف ۔ معاملہ بندی
اور بدیع الاسلوبی جوان کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہے
ان مثنویوں میں علی وجہ الکمال موجود ہے۔ البتہ کہیں
کہیں عریانی پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن از روئے انصاف جو
جذبات و واردات مومن نے اپنی مثنویوں میں دکھائے ہیں
ان کی واقعیت میں کلام نہیں ۔ صرف چند عریان مضامین کی وجہ
سے کلام کی خوبیوں کا چھپا دینا تذکرہ نویس یا تبصرہ نگار کی بصیرت
کے منافی ہے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ نواب مرزا شوق اور قلق کی مثنویاں معرض
بحث میں لائی جائیں اور مومن کی مثنویوں کو بقول امداد امام یہ کہکر نظرانداز
کردیا جائے کہ ان سے کوچہ گردی کی بو آتی ہے " [۲]

---

[۱] گل رعنا ص ۳۰۲ [۲] تاریخ مثنویات اردو ص ۱٦۷ و مابعد

قصائد

قصیدہ اصناف سخن میں خاص اہمیت کا مالک ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شعراء کا جوش بیان جسے " ظرف تنگنائے غزل " میں راہ نہیں ملتی، قصیدے میں ظاہر ہونے کا موقع پاتا ہے ۔ چنانچہ یہ صنف شاعر کی ندرت بیان کی کسوٹی سمجھی گئی ہے ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس ذریعے سے شعراء سلاطین کے دربار میں باریاب ہو کر بیش بہا صلے حاصل کرتے تھے ۔ اس طرح قصیدہ سخن گو کے لئے مایہ اعتبار بھی تھا اور موجب منفعت بھی ۔ فارسی عربی اور اردو شعراء کے دیوان اٹھا کر دیکھئے تو قصیدوں کا بے پایاں طومار نظر آئے گا جن میں سلاطین وقت اور امرائے ذیجاہ کی مدح کے دفتر محفوظ ہیں ۔

دیگر اصناف سخن کی طرح قصیدہ نگاری کے بھی کچھ خصائص و شرائط ہیں ۔ ابن رشیق کا قول ہے کہ ارتباط اجزائے قصیدہ ایک ضروری وصف ہے ۱؎ شمس قیس رازی پر شکوہ الفاظ اور متانت و رزانت اسلوب کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے ۲؎ ۔ اردو کے نقاد بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ قصیدے کے الفاظ متین ۔ جزیل ۔ باوقار ۔ شاندار ہونے چاہئیں ۔ کیونکہ ممدوح کے اوصاف مثلاً " شجاعت ۔ سخاوت ۔ عدل وغیرہ خود گرانمایہ ہیں اور شاندار الفاظ کے طالب ۳؎ ۔ یہی خصوصیات نیز حسن مخلص ۔ لطافت مدح وغیرہ وہ امور ہیں جو کسی شاعر کو کامیاب قصیدہ گو بناتی ہیں ۔ ممکن ہے کہ ایک شخص اچھا غزلگو ہو لیکن کامیاب قصیدہ نگار نہ ہو ۔ فارسی میں حافظ کی اور اردو میں میر کی یہی صورت ہے ۔

۱؎ العمدہ ۔ جلد دوم ص ۹۲ ۲؎ المعجم ص ۳۱۸

۳؎ عبدالسلام ۔ شعر الہند جلد دوم ص ۳۲۲

پچھلی صدی تک فن شعر کے ماہر سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ جملہ اصناف سخن پر قادر ہو ــ یہی نہین بلکہ اس سے مختلف مواقع پر حسب حال تضمین مثلاً سہرا ــ تقریظ تہنیت ــ مرثیہ وغیرہ کہنے کا بھی مطالبہ کیا جاتا تھا ــ تاریخ گوئی بھی اس کا فرض سمجھا جاتا تھا ــ اس طرح شاعر کوان تمام اصناف و ضروریات کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا ــ یہ اور بات ہے کہ جو خود دار وغیور اشخاص دنیا داری سے بر طرف تھے وہ ان چیزون کا چندان اہتمام نہ کرتے تھے ــ میر کا یہی عالم تھا ــ آتش اور ناسخ نے عمر بھر مدح و تہنیت سے کام نہین رکھا ــ انیس و دبیر کی راہ ہی اور تھی ــ انھین ان چیزون سے سروکار نہ تھا ــ

مومن خوددار وغیور آدمی تھے ــ انھون نے جیتے جی کسی دربار سے یا کسی امیر کی سرکار سے واسطہ نہین رکھا ــ کلیات اردو اور دیوان فارسی مین چند قصیدے ہین جو بہ استثنائے دو قصائد سرا سر مذہبی رنگ رکھتے ہین یعنی خدا کی حمد اور اکابر دین کی منقبت مین ہین ــ دو مدحیہ قصیدے جو ہین ان کی صورت یہ ہے کہ پہلا راجہ اجیت سنگھ (رئیس پٹیالہ کے بھائی) کی مدح مین ہے جس نے سرراہ مومن کو گزر تے دیکھ کر بڑے اکرام سے بلایا تھا اور ان کی نجوم دانی سے استفادہ کر کے شکر یے کے بطور ایک ہتھنی انعام مین دے کر بہ اعزاز رخصت کیا تھا [۱] ــ اس لئے اس قصیدے کو دراصل شکر یے کی نظم سمجھنا چاہیے ــ دوسرا قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

---

[۱] عرش گیاوی نے یہی لکھا ہے (حیات مومن ص ۱۲۷) مومن کے ایک آزادہ رو ــ دریدہ دہن معاصر یعنی عبداللہ خان اوج کی تعریض سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ راجہ اجیت سنگھ نے ان کے علم نجوم سے خوش ہو کر انعام دیکر رخصت کیا تھا ؎

جھومون مین وہ مومن مکان لیتا ہے

نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

یادایام عشرت فانی نہ وہ ہم ہین نہ وہ تن آسانی

وزیرالدولہ والی ٹونک کی مدح مین ہے جو سید احمد صاحب کے مرید ہونے کی حیثیت سے مومن کے پیر بھائی تھے اور جنھون نے مومن کو فریضۂ حج ادا کرنے کی ترغیب دی تھی اور مومن نے شکریے اور معذرت کو قصیدے کے پیکر مین ڈھال کر جواب دیا تھا کہ دنیائے دون کے مکروفریب اورنفس امارہ کے فریب مین پھنسا ہوا ہون اس لئے سردست فریضۂ حج اداکرنا ممکن نہین ان دونون قصیدون مین شاعرانہ مضمون آفرینی ۔ مبالغہ آرائی ۔ مدح سرائی سبھی کچھ ہے لیکن ظاہر ہےکہ مومن نے انھین تقریب ملاقات یا حصول انعام کی نیت سے ہرگزنہین کہا۔ المختصر مومن کے بیشتر قصائد ارادت وعقیدت کے پھول ہین جنھین بدنام کوچہ کرد لیکن خوش عقیدہ شاعرنے مذہب کی بارگاہ پر چڑھا یا ہے۔

ان قصیدون کی نوعیت سے قطع نظر کر کے صرف یہ دیکھنا چاھئیے کہ یہ فن کےمطالبات پر کس حد تک پورے اتر تے ہین ۔ مومن کے دلفریب تغزل کا زمزمہ کانون مین اس طرح گونجتا ہوا ہے کہ ان مثنویون کی طرح قصیدے بھی ماند ہوکر رہ گئے ہین حالانکہ قادر الکلام مومن کی قدرت بیان کاجوہر انھی اصناف مین کھلا ہے ۔ مومن کے فارسی کلام کوچھوڑ کر (جس کی بحث کسی اگلی فصل مین آئےگی) کلیات اردو مین ۹ قصیدے ہین ۔ ان مین سے دو مدحیہ مین جن کا بیان ہوچکاہے ۔ ایک حمد باری تعالی مین ہے ۔ایک نعت سید المرسلین مین ۔ باقی پانچ اکابر دین کی منقبت مین ہین جن مین شاعر کا جوش عقیدت ۔زور بیان کے ساتھ دست و گریبان ہے ۔ یہ سب فنی اعتبار سے قابل ستائش ہین ۔ ان کا جوش وخروش شکوہ الفاظ ۔ متانت مضامین ۔ پختگی زبان اورزورکلام کہین خاقانی وعرفی کی یاددلاتاہے اورکہین سودا کے انداز دکھاتا ہے ۔ مومن نے فارسی تراکیب کا سے (جن کے وہ استاد ہین)

کام لے کر اظہار وابلاغ کی نئی راہیں پیدا کی ہیں اور اس قدرت بیان کو سرحد کمال تک پہنچایا ہے ۔ جس کے اظہار کے لئے غزل کا پیمانہ ناکافی تھا ۔ ذیل کی مثالوں سے مختلف خصوصیات واضح ہوں گی ۔۔

۱) شکوہ الفاظ اور زور کلام

کٹتی ہے میری تیغ زباں سے زبان تیغ	کیونکر سخن فروش ہوں سوداگران تیغ
حساد سر سے پانوں تلک خون میں ڈوب جائیں	جوہر اگر دکھاوں میں اپنے بسان تیغ
یہ دل خراشیاں مرے اشعار شوخ کی	سینے پہ منکروں کے ہیں لاکھوں نشان تیغ
ہووے نہ میری حجت قاطع کے سامنے	سرگرم لاف و دعوی برش زبان تیغ
پھر جوش آگیا دم خوننابہ بار کو	پھر تیزی زبان پہ ہے قربان زبان تیغ

اس تمہید کے بعد جس میں تعلی کا تلاطم ہے ۔ شاعر اصل مطلب کی جانب آتا اور ممدوح (علی مرتضی) کی مدح کرتا ہے ۔ اس قصیدے کا مطلع براعۃ الاستہلال کا شاہکار ہے ردیف میں بھی بلاغت کا پہلو ہے کیونکہ صاحب ذوالفقار کی شجاعت کا اشارہ کرتی ہے ۔

آتی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار	لیجا و منکروں کے لئے ارمغان تیغ
شیر خدا علی کہ شجاعت سے جس کی ہے	سر پنجہ اسد پہ زنخ زن بنان تیغ
کیا دور اسکے دست کرم کے اثر سے گر	یاقوت ریز ہو مژہ خونفشان تیغ
سیف وقلم ہیں دونوں ستون کاخ دین کے	حیران ہوں باب علم کہوں یا جہان تیغ
دشمن کا ایک نیم اشارے میں کام ہو	ابرو کا تیرے عکس پڑے گر میان تیغ

وزیر الدولہ کی مدح میں بھی تجمل الفاظ کا یہی عالم ہے ۔ چونکہ اس قصیدے کی ہیئت مجموعی بہت رواں دواں ہے اس لئے مضمون آفرینی کے دوش بدوش الفاظ کی شوکت دیدنی ہے ۔

یہان مدحیہ اشعار کا مختصر انتخاب پیش کیا جا تاہے:۔

کردے ساز ے جہان کو سیراب	بحر ہمت کی اس کے طغیانی
بخشش بے شمار سے مشکل	ہے دبیر فلک کو دیوانی
بے سخاوت اسے قرار کہان	کہ ہے عادت طبیعت ثانی
حملۂ شیرگیر سے اس کے	نعرہ زن ضیغم نیستانی
خنجر جان شکاف مین اس کے	ابروئے یار کی سی بُرّانی
اتنی رمح دیکھ لے اس کا	توعصا بھول جائے ثعبانی
روز جنگ اس کے نیم جولان مین	صرصر عاد کی سی طغیانی [۱]

۲) __قدرت بیان__ ۔ دیگر اصناف کی طرح قصیدے مین بھی مطالب و مدعا بیان کرنے کے مواقع آتے ہین ۔ قادر الکلام شاعر اس منزل سے بہ سہولت گزرتا ہے۔ مومن نے ہر مقام پر یہ مرحلہ بخوبی طے کیا ہے۔ مثلاً حمد مین اپنے گناہون کا اعتراف کر کے خدا تعالےٰ سے دعا کرتے ہین کہ مجھے حسن پرستی کے پھندے سے آزاد کر دے :۔

اللہ غم بتان مین یہ چند	بے فائدہ جان کو کھپایا
ہر حلقہ دام آرزو نے	طوق لعنت مجھے پہنایا
کرتے رہے شکر بخت بیدار	ساتھ اپنے صنم نے گر سلایا
اللہ میر ے گناہ بے حد	وہ ہین کہ شمار کو تھکایا
مجھ کو بھی بچالے جیسے تونے	یوسف کو گناہ سے بچایا
اس کا مرے دل پہ ایک پرتو	جس شعلے نے طور کو جلایا

مومن کہے کس سے حال آخر
ہے کون ترے سوا خدایا [۲]

۱؎ کلیات اردو ص۲۲۲ ۲؎ ایضاً ص۱۸۲

مخلص یا گریز مین شاعر کے انداز بیان کا امتحان ہوتا ہے۔ مومن نے غزل مین انداز بیان کے بے شمار معجزے دکھائے ہین لیکن عجب اتفاق ہے کہ گریز مین وہ کامیاب نہین۔ اکثر نقادون کا فیصلہ ہے کہ ان کی گریز پر لطف نہین ہوتی ۔ وہ اس کمی کی تلافی اپنی دیگر خصوصیات سے کرتے ہین مثلاً زور بیان جس سے وہ متنوع و متعدد مطالب اداکرنے پر قادر ہین ۔ بعض خصوصیات مین وہ اکثر قصیدہ نگارون سے ممتاز ہین ۔ مثلاً رنگین بیانی جس کا جلوہ غزل مین جابجا نظرآتا ہے ۔ قصاید مین بھی موجود ہے۔ رنگین مزاج شاعر خوب سمجھتا ہے کہ غزل اور قصیدے کے شرائط مختلف ہین تاہم قصاید کی تشبیب مین جو بالاکثر اکابر دین کی منقبت مین ہین ۔ غزل کی رنگینی کا التزام رکھتا ہے۔ کسی مین بہار کاسمان ۔ کسی مین بے وفا معشوق کی شکایتین اورکسی مین حسینون کے ظلم وستم کا ذکر کر کے تغزل کا انداز پیدا کردیتا ہے۔ غزل ہی کی طرح جا بجا نئے مطلعون کا پیوند کرنا بلکہ قصیدون کے درمیان مین بالقصد ایک غزل شامل کر دینا مومن کو بہت مرغوب ہےجوان کے ذوق غزل سرائی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔یہان تشبیب کی چند مثالین درج کرنا مناسب ہے جس سے ان کی رنگین نوائی کا اندازہ ہوگا :-

۱) نعتیہ قصیدے کی تشبیب

چمن مین نغمہ بلبل ہے یون طرب مانوس	کہ جیسے صبح شب ہجر نالہا ئے خروس
نوائے طوطی شکرفشان کی لذت سے	سماع و رقص مین اہل مذاق جون طاوس
صفا سے وہ درودیوار باغ کا عالم	کہ آشیانون مین دشوار طائرون کو جلوس
گر اس بہار کی بو تک کو ہوا لگ جائے	شمیم جامہ یوسف کبھی نہ ہو محسوس

۲) ایک اور قصیدے کی تشبیب تمام وکمال غزل کا رنگ رکھتی ہے ۔ ذیل کے اشعار پڑھیے اور غور کیجئے کہ غزل میں اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے :-

جو اس کی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل — تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں — میں نیمجان نہ رہا امتحان کے قابل

وہ شوخ برق عنان خاک میں ملا دیوے — اگر ہو حسرت دنبالہ گردی محمل

وہ شمع انجمن ناز ہا ئے حوصلہ سوز — جو سمجھے خواری مشتاق رونق محفل

وہ بے نیاز کہ لیلی بھی گر رکاب میں ہو — نہ پھر کے دیکھے کہ کون آئے ہے پس محمل

وہ بد شعار طرحدار دلربا جس سے — امید وصل خطا ترک آرزو مشکل

ساتویں قصیدے میں جو سیدنا امام حسن ؑ کی منقبت میں ہے اور جس کا تقدس رنگینی سے ابا کرتا ہے ۔[۱] آزادہ رو شاعر صہبا و صنم کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے :-

چاہنا خلق کو صہبا و صنم سے محروم — ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم

محتسب نے خم مے چھین لیا یا قسمت — ایسے کمبخت کے ہاتھ آئے ہمارا مقسوم

کہیں ایسا نہ ہو وہ غیرت حور آ جائے — ہے بہت میرے جنازے پہ فرشتوں کا ہجوم

گاہ کہتا ہے جنون عشق کو کہ کفر و حرام — جہل کرنے کو پڑھے تھے مرے ناصح نے علوم

تعلی شاعروں کی فطرت میں داخل ہے ۔ قصیدے کا جوش وخروش تعلی شاعرانہ کے لئے اور بھی موزوں ہے چنانچہ مومن نے قصائد میں جا بجا خود ستائی کی ہے ۔ ممدوح کی مدح کرتے کرتے

---

[۱] ابن رشیق العمدہ جلد دوم ص ۱۹۱ ۔ اس کی رائے ہے کہ جو قصیدے مقدس ہستیوں کی مدح میں ہوں ان میں تشبیب کی رنگینی جائز نہیں ۔

اپنے کمالات بیان کرنا مومن کو بہت مرغوب ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ مومن پر عرفی
رنگین نوا کا اثر بہت شدید ہے۔ غزل مین انداز بیان کی نئی راہین نکالنا۔ نادر تراکیب سے
ایجاز واختصار کے معجزے دکھانا اور بات کو ذرا پیچ دے کر کہنا مومن نے عرفی ہی سے سیکھا
ہے۔ بعض اشعار کے مضامین عرفی سے ماخوذ ہین۔ انتہا یہ ہے کہ فارسی قصائد سب کے
سب عرفی کے تتبع مین کہے ہین۔ تعلی مین بھی عرفی کی طرح مومن بلند آہنگی کرتے ہین اور
اپنے کمالات کا نقارہ اس زور سے بجاتے ہین کہ شعرائے سلف اورمعاصرین کی تنقیص کا پہلو
نکلنے لگتا ہے۔ مومن کا یہ انداز قابل اعتراض ہے اور اس کی بحث ان کے عادات واطوار کے ذیل مین
ہو چکی ہے۔ یہان صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جو شاعر فی الواقع قادر الکلام ہوتا ہے وہ
بیان واقعات کے علاوہ اپنے کمالات کا اظہار کرنے مین بھی کتنی قدرت سے کام لیتا ہے۔ وزیرالدولہ
والے قصیدے مین مومن نے اپنے کمالات کا بیان اسی طرح کیا ہے :۔

میرے سینے کے صفحے مین ہے رقم	علم دانا دلان یونانی
مین روش دان حکم برجیسی	مین ادا فہم سیر کیوانی
ہون وہ نباض جس کے ناخن مین	حرکات عروق شریانی
سامنے میری تر زبانی کے	نطق الکن حدیث سحبانی
میرے زاغ قلم کی نیم صریر	صد صفیر ہزار دستانی
میرے گوہر تمام ناسفتہ	میرے یاقوت سب بدخشانی

ایک اور خصوصیت جس کا ذکر غزل کے ذیل مین ہو چکا ہے مومن کی ایجاد تراکیب ہے۔
غزل کی بہ نسبت قصیدے مین مومن نے اس ذریعے سے زیادہ کام لیا ہے۔ انھون نے نادر تراکیب

وضع کر کے ادائے مطالب کو آسان کر لیا ہے اور ایجاز و اختصار کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں صرف چند تراکیب کی مثالیں درج کی جاتی ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ باکمال شاعر اس ذریعے سے کام لیکر زبان و بیان کے کتنے راستے نکال سکتا ہے :-

۱) راجہ اجیت سنگھ کے مدحیہ قصیدے کی تمہید -

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری

کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

مجھ کو فغاں سے کام اور ذکر میں اہل خانقاہ

دیر میں شور بید خواں میکدے میں نواگری

شعلۂ شمع سے فزوں چہرہ مرا زریر گوں

رنگ شفق سے بیشتر گریہ مرا معصفری

۲) اس قصیدے کی دعائیہ ابیات میں بھی تراکیب کی یہی ایجازی خصوصیت جلوہ گر ہے۔

تاکہ ہے بیت ہفتمیں قوّت لولی فلک

تاکہ نہم میں ہے مزج بہر عروس خاوری

تجھ کو نصیب دولت صحبت نوجوان نگار

تجھ کو ہمیشہ عشرت تازہ عروس دربری

تا رہے الفت آزما ناز و غرور دلربا

تا رہے آرزو فزا طرز ادائے دلبری

جور پہ تیرے جاں نثار غارتیاں دین و دل

وصل سے تیرے کامیاب لب شکراں عسکری

۴) اسی طرح وزیر الدولہ کے مدحیہ قصیدے مین :-

زیر ران اس کے توسن چالاک — رشک اسپ سپہر گردانی

مانع سعی دلپسند اس کو — ملک عالم کی تنگ میدانی

گل جبینی پہ تیری قربان ہو — نو بہار ریاض رضوانی

داغ سے تیرے جام عشرت سے — گل دامان پاک دامانی

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا اشعار مین مشمولہ تراکیب ایجاز واختصار کے ذریعے بڑے طویل مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہین — تراکیب کے علاوہ مومن نے لفظی تصرفات سے بھی جا بجا کام لیا ہے انہی دونون قصائد مین انہون نے بعض الفاظ کے آخر مین یائے تحتانی کا اضافہ کر کے حاصل مصدر یا اسم صفت بنائے ہین — توسیع زبان کے لئے اس قسم کی مساعی بہت مفید ہین — ان کی چند مثالین درج ذیل ہین :-

کب تلک اعتکاف بتخانہ — کب تلک کنج دیر و رہبانی

آب و تاب کلام سے اس کے — آب ہو لولوی و مرجانی

گرز سے اس کے بار گردن ہے — منفو مدعی کی سندانی

کبھی تیونگی زبان ہے فزون — خوان نعمت کی اس کے الوانی

ایک اور قصیدے مین بھی تصرف سے یہی فائدہ اٹھایا ہے اور الفاظ قافیہ کے آخر مین یائے تحتانی بڑھا کر ساغری — آب پیکری — صرصری — تشدری — غضنفری — سگی — کافری وغیرہ الفاظ تراشے ہین —

مومن کے قصائد کی یہی خوبیان ہین جو انہین اردو قصیدہ گوئی مین سودا کے بعد ایک

امتیازی مقام عطا کرتی ہین ۔ ان کے زور کلام کا یہ عالم ہے کہ آٹھ آٹھ صفحے کے قصیدون مین کہین ضعف وعجز کا نشان ظاہر نہین ہوتا ۔ تجمل الفاظ اور شکوہ بیان مین ان کا پایہ مسلّم ہے ۔ قدرت بیان کے لحاظ سے وہ صف اول مین جگہ پانے کے مستحق ہین اور بہ حیثیت مجموعی قصیدہ نگار شعراء مین ان کا مقام بہت بلند ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی دلفریب غزل سرائی نے باقی تمام اصناف سخن کو پس منظر مین ڈال دیا ہے ۔

ان اوصاف کے باوجود ان کے قصائد اسقام سے خالی نہین ۔ مثلاً معنوی تعقید جو مطلب کو ذرا پیچ دے کر کہنے سے کہین کہین پیدا ہو جاتی ہے یا مشکل الفاظ و تراکیب جو اردو مین غیر مستعمل یا نامانوس ہین ۔ بعض تلمیحات ایسی ہین جنھین صرف وہ اشخاص سمجھ سکتے ہین جنھین قرآن و حدیث اور اسلامی روایات پر عبور حاصل ہو مثلاً

جب نہ تب والضّحیٰ پڑھے ہے امام ۔۔۔ مقتدی تاسنین " فلا تنہر"

افعی رمح دیکھ لے اس کا ۔۔۔ تو عصا بھول جائے ثعبانی

پاکبازی کی طمع ہم سے گنہگاروں سے ۔۔۔ کیا ہوئے عشق مین اے زہرہ جبین وہ معصوم

ظاہر ہے کہ جس شخص کو قرآن سے ربط نہ ہو یا جس کو حضرت موسٰی کے عصا کا واقعہ اور ہاروت و ماروت کا انجام معلوم نہ ہو اسے ان اشعار سے حظ حاصل نہ ہوگا ۔ اسی طرح وہ اشعار جن مین علوم و فنون کی اصطلاحات آتی ہین عوام کی فہم سے بالا تر ہین مثلاً

آہ سے میری کرم وخشک زہرہ و ماہ کا مزاج
گریہ سے میرے سرد و تر طبع بروج آذری

بعض قصائد مین ادق الفاظ اس کثرت سے آئے ہین کہ صراح و قاموس سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ مدوس ۔ دختر طیموس "زلیخا" شکل عروس (علم هندسه کی ایک شکل) چگل ۔ مدخل ظل ساوران سے بڑھکر افصح وائل (سحبان) دخان مقل ۔ مثلث خامل ۔ اسی نوع کے کلمات لفظا فصاحت و سلاست مین مخل ہوتے اور کلام کو عسیر الفہم بنا دیتے ہین ۔

---

۱ ۔ امداد امام اثر ۔ کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۲۲

رباعیات

رباعی مختصر ترین صنف سخن ہے جس مین شاعر کسی مفرد خیال کو اختصار کے ساتھ لیکن مکمل طریقے پر ادا کرتا ہے۔ دیگر اصناف کی طرح اس کے بھی کچھ بنیادی اصول ہین ۔ مختصر حکیمانہ اقوال ۔عالمگیر صداقتون اور محدود تاثرات کو بیان کرنے کے لئے رباعی سے زیادہ موزون اور کوئی صنف نہین ہے۔ اس کے چار مصرے اپنی تعمیر و ترتیب کی خوبی سے کسی جذبے کے اتار چڑھاو کو نظم کرنے اور آخری مصرعے مین اسے کمال اختصار سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہین ۔

مومن نے اس صنف مین بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کے کلیات مین ۱۲۹ رباعیان ہین جو للہ نعت ۔ منقبت ۔ عشق و محبت ۔ شکوہ شکایت۔ توبہ و انابت کے مضامین اور ذاتی حالات پر مشتمل ہین ۔بہ حیثیت فن یہ خاصی کامیاب ہین اگرچہ ان مین وہ استحکام مضمون اور دل نشینی نہین جو عمر خیام یا ابو سعید ابوالخیر کی رباعیات کا جوہر ہے۔ ذیل کے انتخاب سے ان کی خوبیون کا اندازہ ہوسکتا ہے :۔

پامال ہون مین اگر جفا سے ناصح　　　کیا کام تجھے تیری بلا سے ناصح
جس بت کو کہ پوجے خلق مین دل بھی نہ دون　　　کیا ظلم ہے ڈر ذرا خدا سے ناصح

ہر روز ہون مثل مہر سر تا پا داغ　　　ہر رات ہے سوز سینہ مانند چراغ
سیماب کی طرح جان مضطر کے سبب　　　مر کر بھی ہوا نہ مجھ کو جلنے سے فراغ

ذاتی حالات کے بطور کہین کہین رباعیات مین ان چھلون ۔ چھیڑون اور لگاوٹون کا ذکر بھی ہے جو کسی شوخ ۔چنچل حسینہ اور مومن کے درمیان کبھی ہوئی تھین ۔ مثلاً

کرتا ہے نگاوشین وہ رشک مہ عید | بے وجہ نہین یہ جوش دریائے امید
پانی اس نے جو تجھ پہ پھینکا مومن | نزد امنی وصال کی ہے یہ نوید

جیسا کہ بیان ہوا مہرو محبت کی مستی مین کبھی کبھی رنگین مزاج شاعر کو فکر عقبی بھی ستاتی تھی اور وہ ہوا و ہوس کے کھیل سے اکتا کر توبہ کرنے پر مائل ہوتا تھا ۔ اس عالم مین ایک مقام پر خود کو یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ سید احمد صاحب کے لشکر مین شریک ہو کر ثواب جہاد حاصل کرو اور راہ خدا مین جان دے دو ۔ یہ مطالب بعض رباعیون مین محفوظ ہین ۔

مومن ہے تمہین جو کچھ بھی پاس ایمان | ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہان
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز | وہ جان جسے کرتے تھے بتون پر قربان

بعض رباعیان شاعر کے ذاتی عقائد پر روشنی ڈالتی ہین جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن اصلاح پسند معقولی آدمی تھے اور اس عقیدے کے تھے جس کے پیروون کو آج کل اہل حدیث کہا جاتا ہے ایک رباعی سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ مومن نے آخر عمر مین پیری مریدی کا دھندا بھی کرنا چاہا تھا ۔ اس سے حکیم ناصر نذیر فراق کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے جنھون نے لکھا ہے کہ خواجہ میر درد کی سجادہ نشینی اور بارہ دری کی وراثت کے سلسلے مین مومن نے کئی بہروپ بھرے تھے [۱] ۔

مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے | جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ ہے اللّٰہ اللّٰہ | جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

غرض بہ حیثیت فن رباعیون کا مقام چندان بلند نہین تاہم ان سے مومن کے ذاتی حالات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے ۔

---

۱ ۔ میخانۂ درد ص ۲۰۵

واسوخت

عنوان خود پکارتا ہے کہ عاشق مزاج شاعر اس صنف مین جلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے۔ فارسی مین وحشی یزدی کا واسوخت مشہور ہے۔ مختلف شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفی و نظیری کے علاوہ جن شعراء کا اثر مومن پر پڑا ان مین وحشی بھی شامل ہے۔ مومن نے وحشی کی بحر مین اپنا واسوخت لکھا ہے۔ جس کا انداز بیان بھی اس سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ چنانچہ پہلا بند ہی اس مطلب کو واضح کرتا ہے :۔

دوستو عشق نہفتہ نے ستایا ہے مجھے　　　آتش شوق نہانی نے جلایا ہے مجھے

کیا کہون کیا غم پنہان نے دکھایا ہے مجھے　　　ضبط وحشت نے یہ دیوانہ بنایا ہے مجھے

چہرۂ راز سے پردہ نہ اٹھاون کیونکر

کو غم پردہ نشین ہے یہ چھپاون کیونکر

باقی بند حسن ترتیب کے لحاظ سے مکمل ہین ۔ان مین حرمان نصیب شاعر نے آغاز الفت اور لذت وصال کے مزون کا ذکر کرنے کے بعد اس جانکاہ تکلیف کا بیان کیا ہے جو معشوق کی بیوفائی سے اس کے دل نے اٹھائی ہے۔ وہ اسے گزشتہ زمانے کی یاد دلاتا ہے جب شاعر کے سوا اس کا کوئی اور چاہنے والا نہ تھا ۔ یہ مقام نہایت دلچسپ ہے اور اس مین مومن کے مخصوص انداز بیان کا پرتو موجود ہے۔

ایک اور واسوخت اس سے مختصر بحر یعنی بحر رمل مسدس مخبون مین ہے جس کی زبان کی سلاست دیدنی ہے۔ اس کے بعض اشعار واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہین جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واسوخت شاعر کی واردات عشق کا مرقع ہے۔ تیسرا واسوخت مثمن ہے اور فنی اعتبار سے

کامل ترین ہے۔ اس میں زبان کی دلنشینی ۔ انداز بیان کا بانکپن ۔ تغزل کا عمدہ امتزاج اور واقعات کی فنی ترتیب بہت دلکش ہے۔ دو ایک بند پڑھکر اس کی دلآویزی کا اندازہ کیجیے

کل گھر میں وہ بیٹھے تھے سراسیمہ و حیران　　اس حال کہ دیکھے سے ہوا حال پریشان
غصے کے سبب چھپ نہ سکی رنجش پنہان　　سمجھا میں کہ یوں بھی تو ہے مایوس و حرمان
انصاف کرو صبر کرے کب تلک انسان　　ناچار کہا طعن سے میں نے کہ مری جان وحرمان

کس سوچ میں بیٹھے ہو ذرا سر تو اٹھاؤ
للہ کو دل نہیں ملتا ہے پر آنکھیں تو ملاؤ

وہ ہی تو میں ہوں ہمدم و دمساز تمہارا　　مد نظر چشم نظر باز تمہارا
جس پر کہ ہوا صرف سب انداز تمہارا　　اک عمر تلک جس پہ رہا ناز تمہارا
وہ محرم ہر غمزۂ غماز تمہارا　　پوشیدہ نہ تھا جس سے کوئی راز تمہارا

حسن آئینہ دیدۂ دیدار طلب تھا
سرحلقۂ عشاق وفادار لقب تھا

یہ تینوں واسوخت نہایت کامیاب ہیں ۔ مومن نے ان میں دلآویز ترکیبوں ۔ عمدہ صنائع اور دلکش طرز بیان سے واقعات و جذبات کی ترجمانی کرکے فن کا حق ادا کیا ہے۔ انداز بیان کا بانکپن۔ تغزل کی رنگینی اور نسوانی خصوصیات کا ہلکا سا پرتو ان کا وصف امتیازی ہے۔[1] یہ اس رکاکت و عریانی سے بھی پاک ہیں جس نے واسوخت امانت کو بدنام کرکے اسے شائستہ صحبتوں سے خارج کر دیا ہے۔

---

۱ ۔ عرش ۔ حیات مومن ص ۱۳۰ " اوروں نے اسے بازاری رنگ میں رنگا لیکن مومن نے خون جگر میں ڈبویا "

ترجیع بند

نظم کی یہ صنف بھی مثنوی کی طرح (لیکن چھوٹے پیمانے پر) ایک مخصوص ہیئت تعمیر کی طالب ہے۔ دس دس بارہ بارہ اشعار کے متعدد بند جن میں سے ہر بند کا ردیف قافیہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس صنف کے اجزاء ہیں جن کے آخر میں ایک شعر جسے بیت ترجیع کہتے ہیں بار بار آتا ہے۔ اس صنف کی امتیازی شرط یہ ہے کہ ہر بند کے آخری اشعار بیت ترجیع کے ساتھ مضمون میں اتنے متحد ہوں کہ پورا بند ایک خود مکتفی وحدت بن جائے۔ کلیات اردو میں ایک ترجیع بند ہے جس میں چودہ بند گیارہ گیارہ شعر کے ہیں۔

ترکیب بند

اس کی بھی وہی صورت ہے جو ترجیع بند کی لیکن اتنا فرق ہے کہ موخر الذکر کے ہر بند کے بعد بیت ترجیع بار بار آتی ہے اور اس میں ہر بند کے بعد ایک نئی بیت لاتے ہیں جس کا ردیف و قافیہ بند سے مختلف ہوتا ہے۔ تعمیر و ترتیب کے لحاظ سے یہ صنف بھی باقاعدہ منصوبے کی طالب ہے۔ کسی بسیط خیال کے مختلف پہلو دکھانے کے لئے یہ صنف نہایت کارآمد ہے۔ اردو میں حالی کا مرثیۂ غالب اور محمد اسمٰعیل کی نظم " قلعۂ اکبرآباد " اس کی نہایت بلیغ مثالیں ہیں۔

کلیات مومن میں ایک ترکیب بند موجود ہے جو شاعر نے کسی " معشوقہ حور شیم " کے مرثیے کے طور لکھا ہے۔ گیارہ گیارہ اشعار کے بارہ بند اس میں ہیں جو تمام تر سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وضع کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن نے کسی پردہ نشین صاحب حیا معشوقہ کی موت

پسر یہ مرثیہ کہا ہے۔ عاشق مہجور کے زخمی دل کی خونتا بہ فشانی دیکھنا ہو تو اس مرثیے کو پڑھیے جس میں شعلہ بجان عاشق نے دائمی فراق کا زخم کھا کر تہ دل سے آہ و فریاد کی ہے۔ معلوم نہیں کون سی معشوقہ مہر جمال کی موت پر مومن نے یہ نقش لکھی تھی کہ آج تک دل ناصبور کے دھڑکنے کی صدا اس سے آتی ہے۔ اس کا مطلع صنعت براعۃ الاستہلال کا عمدہ نمونہ ہے۔ اختصار کے خیال سے مختلف بندوں کے تھوڑے تھوڑے اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ مومن مختلف اصناف سخن پر کتنے قادر تھے۔ یہاں شیفتہ کے قول کی صداقت بھی ظاہر ہوتی ہے جن کی رائے ہے کہ کسی شخص کو کسی ایک صنف سخن میں وہ مقام حاصل نہیں جو مومن کو تمام اصناف میں میسر ہے۔ (۱)

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج ۔۔۔ آغوش رشک حلقہ اہل عزا ہے آج

پانی کے بدلے منھ میں لہو بھر آئے ہے لہو ۔۔۔ لب کا شے میں ہائے کہاں وہ مزا ہے آج

اتنے کہاں حواس کہ تدبیر مرگ ہو ۔۔۔ اپنی خبر نہیں مجھے کیا جانے کیا ہے آج

اتریں گلے سے گھونٹ نہ آب حیات کے ۔۔۔ دل آہ زندگانی سے کتنا خفا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا

ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

کھودی خزاں نے رونق گلزار ہائے ہائے ۔۔۔ پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے

پھرتی نہ تھی جو پردہ نشین گھر میں بے حجاب ۔۔۔ نعش اس کی جائے ہے سر بازار ہائے ہائے

وہ شمع مہر پرتو وہ جلوہ بجھ گئی ۔۔۔ دن رات ہے فروغ شب تار ہائے ہائے

نظارہ ہے محرک ماتم ہزار حیف

ابرو ہوئے ہلال محرم ہزار حیف

۱۔ گلشن بے خار ص ۱۹۵

مدفن بلیز مین چمن واصیبتا | مدد و مہر و وہ غنچہ دہن واصیبتا
جشن ناز نین صنم پہ گران تھا حریر چین | اس کا غلاف کعبہ کفن واصیبتا
نہ منکر و نکیر کو نا چار وہ جواب | جو حور سے کرے نہ سخن واصیبتا
جس کو شکستن دل عاشق عذاب ہو | وہ اور جانکنی کی محن واصیبتا
تشبیہ آئینہ سے جو ہوتا تھا آپ آپ | مل جائے خاک مین وہ بدن واصیبتا

کیا اعتبار دہر کا عبرت کی جا ہے یہ

عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

وہ مہر جلوہ زیر زمین اے فلک دریغ | گردون نشین ہو خاک نشین اے فلک دریغ
ہرگز سوائے روز قیامت نہ ہو صعود | اتنا ہبوط زہرہ جبین اے فلک دریغ
یوسف لقا و کرکے اجل اے زمانہ آہ | عیسیٰ نفس ہو مرگ گزین اے فلک دریغ
اس کو کہ جس کا نقش قدم رشک مہر ہو | کرتے ہین خاک کا ل کہین اے فلک دریغ

یہ نیم جان بھی کاش اجل کی پسند ہو

شیون کا غلغلہ مرے گھر سے بلند ہو[1]

کلیات اردو کے آٹھ صفحون پر یہ عدیم المثال نظم پھیلی ہوئی ہے۔ دنیائے شاعری مین ایسے شخصی مرثیے جن مین سوز و گداز اس درجے کو پہنچ گیا ہو بہت کم ملین گے۔ راقم کی نگاہ مین حماسہ ابو تمام کے مرثیے ہین۔ فردوسی۔ کمال۔ حافظ اور فیضی کے تحریر کردہ مرثیے بھی نظر مین ہین حالی کا مرثیہ غالب بھی سب نے پڑھا ہے لیکن مومن خان نے اس ترکیب بند مین فراق زدہ دل کی دھڑکنین اس طرح ضبط کر دی ہین کہ سوا سو سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے

۱۔ کلیات اردو ص ۵۲۰ و مابعد

راقم کوکافی تحقیق و تفتیش کے باوجود معلوم نہ ہوسکا کہ یہ مرثیہ کون سی معشوقہ سے متعلق ہے — مولانا ابوالخیر کا اندازہ ہے کہ یہ امۃ الفاطمہ المعروف بہ صاحبجی کے مرنے پر کہا گیا تھا — عرش گیاوی بھی یہی رائے رکھتے ہین [1] — کلب علی خان فائق رامپوری کو اس سے انکار ہے — گلشن بےخار مین شیفتہ نے اس مرثیے کا ذکر نہین کیا [2] جس سے ایک ضعیف احتمال یہ قائم کرسکتے ہین کہ یہ ترکیب بند ۱۲۵۰ھ کے بعد لکھا گیا ہوگا — یہ بھی پتہ نہین چلتا کہ جس " عیش محل " کا نام ایک بند مین آیا ہے وہ دلّی کی کون سی عمارت تھی اور اس کے مکین کون تھے — یہ تمام امور غیر معلوم ہین جو بات واضح ومعلوم ہے وہ یہ ہے کہ اس مرثیے کا سوز وگداز ایک ایسے دل کے زخم دکھاتا ہے جسے صدمۂ فراق نے مجسم جراحت کر کے چھوڑ دیا تھا ۔

۱۔ حیات مومن ص ۵۴

۲۔ گلشن بےخار ص ۱۹۶

قطعات

فارسی مین قطعات سے بالعموم اخلاق وحکیمانہ مضامین ادا کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ سعدی اور ابن یمین کے بیشتر قطعات اسی نوعیت کے ہین ۔ مومن کی اردو کلیات مین پانچ قطعے شامل ہین لیکن یہ سب کے سب ان کے ذاتی حالات سے متعلق ہین جن مین مہجور و محزون شاعر نے درد فراق کی کیفیت غم ہجر مین بیماریون کے شدائد وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان مین سے دو قطعات اندازاً " ۱۲۳۶ھ کے قریب لکھے گئے ہین جب مومن امۃ الفاطمہ صاحب جی سے جدا ہوکر غم فراق کے جانکاہ مصائب مین مبتلا تھے۔ دونون قطعون کے مخصوص الفاظ اس محبوبہ مہر تمثال سے جدائی اور اس کے اشتیاق وصال کا اشارہ کرتے ہین۔

ایک قطعے مین تپ فراق کی شدت اور طبیبون کی تشخیص کا خاکہ اڑا یا ہےجو مرض کے اصلی سبب سے غافل اور اپنی اپنی بےنتیجہ چارہ سازی مین مشغول ہین ۔ اس قطعے مین شاعر کا انداز استہزاء بعینہ عرفی سے ملتا ہے جس نے اپنی بیماری کی بحرانی حالت مین طبیبون کی تجاویز اور بعض بےدرد عیادت کرنے والون کی مزاج پرسی کا نقشہ کھینچ کر اپنےدل سوزان کی بھڑاس نکالی ہے (۱) یہ سب قطعات زبان و بیان کے لحاظ سے بےعیب اور اظہار مطالب کے اعتبار سے قابل تعریف ہین ۔

تضا مین

کلیات مین متعدد تضامین ہین جن کی صورت یہ ہے کہ مومن نے عرفی قدسی حافظ کلیم ۔ علی قلی میلی ۔ وحشی یزدی اور نظیری کی غزلون پر اردو کے تین تین مصرعے لگا کر مخمس

۱۔ شعرالعجم جلد سوم ۔احوال عرفی

بنا دیا ہے ــ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی ایک اردو غزل کو بھی مخمس کیا ہے ــ خواجہ میر درد کے مشہور شعر سے

جی کی جی ہی مین رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

پسر چار چار مصرعے لگا کر مسدس کیا ہے ــ

تضمین کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ کسی شعر پر جو زاید مصرعے لگائے جائین وہ اس شعر کے مضمون سے اتنے متحد ہون کہ اس پیوند کاری مین تکلف و آورد کا رنگ محسوس نہ ہو اس نقطۂ نظر سے مومن کی یہ کوششین چندان قابل ستائش نہین ــ تضمین کے مصرعے بالعموم بےلطف ہین جنھین آزاد مزاج شاعر کی سرسری کاوش کا نتیجہ سمجھنا چاہیے ــ مثلاً

قابل چارہ نہین ہے مرا احوال سقیم   رو گیے سر پہ مرے سارے اطبائے فہیم
تجھکو مومن کی سی الفت ہے نہ ویسا تو حکیم   اشک بیہودہ مریز این ہمہ از دیدہ کلیم
گرد غم را نتوان شست بہ طوفان از من

معمّے

معمّیٰ اصناف سخن مین شمار نہین ہوتا ــ اسے تاریخ کی طرح ایک صنعت کہہ سکتے ہین ــ مومن کے مجموعہ کلام مین اور چیزون کے دوش بہ دوش چھ معمے بھی ہین جو مختلف اشخاص کے نامون کا اشارہ کرتے ہین ــ ان کی بنیاد الفاظ کے معانی اور حروف ابجد کی قیمت کے الٹ پھیر پر ہے جس کا اندازہ حسب ذیل مثالون سے ہو سکتا ہے :ــ

معمّی بہ اسم مومن

کیفیت وصال بس اب کچھ نہین رہی　　　　کیونکر نہ هون ملول مین شب کچھ نہین رہی

" ملول مین " سے (لیل) کوخارج کر دیجیے جو شب کا عربی مترادف هے — مومن رہ جائےگا

معمّیٰ بہ اسم محبوب علی

مرجا رقیب رشک سے کو ہے وصال یار

هے اس کی چشم شوخ ادا میرے واسطے

مرجا فعل امر هے جس کا فارسی مترادف " میر " هے — یار کا مترادف محبوب هے — میر کے وصال یعنی ملنے سے میر محبوب بنا — چشم کا عربی مترادف عین هے جس کا صوتی متبادل " ع " هے — میرے واسطے کوعربی مین " لی " کہتے هین — ع کو لی سے ملا یا تو علی بنا اور اس طرح میر محبوب علی کا نام اس گرہ پیچ جھالے سے برآمد هوا۔

معمّیٰ بہ اسم مہتاب رائے

یئے کیونکر کہ هے سب کارالٹا　　　　هم الٹے بات الٹی یار الٹا

هم — بات اور یار کو معکوس کر دیجیے تو مہ تاب رائے بنتا هے — بقول محمد حسین آزاد ایسا معمّیٰ کبھی سننے مین نہین آیا [(۱)] — بہرحال اس نوع کی تخلیقات جنھین بنیادی طور پر ادب سے کچھ علاقہ نہین محض شعبدون کی حیثیت رکھتی هین اور مومن کی هزار شیوہ طبیعت کیکر شمون مین سے هین —

۱ـ　آب حیات ص ۲۵۱

تاریخ گوئی یہ ایک دلچسپ مگرمشکل فن ہے۔ مسلمانون نے اسے ایجاد کیا اوراس مین دنیا کی اور کوئی قوم ان کی شریک نہین(۱)۔ اس کی بنیاد حروف ابجد کی عددی قیمت پر ہے۔کسی فقرے یا مصرعے مین با معنی الفاظ کا نی کوشش وکاوش کے بعد اس طرح رکھے جاتے ہین کہ حروف کی مجموعی عددی قیمت سے کسی واقعے کا سال نکل آتا ہے۔ دشمن پر فتح یا بی، شاہانہ جشن، عظیم واقعات وحادثات سے لے کر ولادت، وفات، غسل صحت، تعمیر عمارات، شادی بیاہ غرض ہر تقریب پر تاریخی فقرے یا مصرعے کہے گئے ہین ۔ تاریخی نام بھی یہی پہلو رکھتے ہین۔

عربی کے حروف ابجد عددی قیمتین رکھتے ہین ۔ اس سے یہ خیال آتا ہے کہ عربون مین زمانہ قدیم سے یہ فن موجود ہوگا۔ مگر ایسا نہین ۔اہل عرب کو یہ شوق نہ پہلے تھا نہ آج ہے۔ متعدد وجوہ سے جن کی تفصیل یہان بیمحل ہوگی ایرانیون کو تاریخ گوئی کا میلان ہوا۔ الفاظ واسماء کی عددی قیمتون کوانھون نے سیاسی اورمذہبی اشارون کا حامل بنا کر عجیب عجیب شعبدہ بازیان کین جس کا سلسلہ پچھلی صدی مین بابیون اور بہائیون تک قائم رہا۔ الفاظ کی عددی ایمائیت کا گورکھ دھندا وہان آج تک موجود ہے۔ مرزا غالب نے جو ایرانی ثقافت کے نمائندے تھے

۱۔ اگرچہ سنسکرت مین بھی حروف کی عددی قیمت معین ہے لیکن اس زبان مین تاریخی مصرعون یا عبارتون کے نمونے نہین ملتے ۔ دیکھئے غرائب الجمل ۔ تصنیف عزیز یار جنگ ص ۲

اپنے ایک مشہور نعتیہ قصیدے[۲] مین نیز مثنوی " ابر گہر بار " مین لفظ احمد کے الف سے اللہ کی میم سے محمد کی اور ح د کے اعداد سے بارہ اماموں کی ذات کا استدلال کیا ہے۔

ایران مین نوین اور دسوین صدی ہجری مین یہ شوق اتنا بڑھا کہ ایک ایک واقعے کی صدہا تاریخین کہی گئین ۔ سلطان سلیم عثمانی اور شاہ اسمعیل صفوی کے درمیان جو معارکات ہوئے ان مین دونون درباروں کے شعراء نے فتح کی تاریخین کہین ۔ بعض نے مسلسل مثنویان لکھین جن کے ہر مصرعے سے فتح کا سال نکلتا ہے[۳]۔

زبان فارسی کے ذوق نے ہندوستان و پاکستان مین بھی یہ شوق پیدا کیا ۔ چنانچہ دسوین صدی ہجری مین کہ اکبر کا زمانہ ہے بے شمار تاریخین کہی گئین ۔ علماء فضلاء شاعر مورخ غرض کوئی ذی علم اس شوق سے خالی نہ تھا ۔ بعض اشخاص تو اس مشغلے مین ایسے ڈوبے تھے کہ غیر شعوری طور پر بھی ان کے منہ سے جو جملے نکل جاتے تھے ان سے کسی معاصرانہ واقعے کا سال برآمد ہوتا تھا[۴] ۔ اس فن مین استغراق کی ایک وجہ تو وہ مسرت ہے جو انسان کو کسی معمے کے حل کر لینے یا پہیلی کو سمجھ لینے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسری وجہ حریفانہ چشمک یا رقابت ہے جس کی تسکین فخر آمیز یا ہجو یہ اشعار کی طرح اہانت آمیز تاریخی مصرعے سے ہوتی ہے۔ عہد اکبری مین ملا عبدالقادر بدایونی کو یہی مرض تھا ۔ وہ تمام اشخاص جو اختلاف عقیدہ و مسلک کی بنا پر ملا صاحب کے معتوب تھے اسی دودھاری تلوار سے ہو قیمہ ہو کر آج تک ان کی " منتخب التواریخ " مین پڑے تڑپتے ہیں ۔

۲ ۔ کلیات غالب فارسی ص ۱۶۹ (۳) تاریخ ادبیات ایران از براؤن جلد چہارم ص ۲۵۱

۴) ملا عبد القادر مین یہ ملکہ اتنا قوی تھا کہ [illegible] (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

یعنی ۱۰۰۲ھ مین فوت ہوا ۔ اس کی تاریخیں بہی اندا زلئے ہوئے ہین ۔ عناد کا غبار تاریخی عبارتون سے اب تک اڑ تا نظر آتا ہے ۔ بود فیضی ملحد ے ۔ قاعدہٴ الحاد شکست ۔ چہ سگ پوستے مرد وغیرہ ۔ فیضی ہی پر موقوف نہین ۔ شیخ مبارک ۔ بیرم خان خان زمان بہادر خان [1] سب اسی چھری کے نیم بسمل ہین ۔

دسوین صدی ہجری کے بعد تاریخ گوئی کو اور ترقی ہوتی گئی ۔

مغلون کے دور زوال مین جب کہ قوم کی فعالیت ختم اور تخلیقی قوتین مضمحل ہورہی تھین کسی محنت طلب کام کے بجائے ادیبون اور شاعرون کی طبّاعی آسانی سے تاریخ گوئی کی طرف منتقل ہوجاتی تھی ۔ یہ فن آسان نہین ۔ مناسب الفاظ سے مطلوبہ اعداد حاصل کرنا ریاضت ۔ مشق اور جانکاہی کیسلا و علم الحساب کی مہارت کا بھی طالب ہے ۔ با این ہمہ چونکہ مشغلہ دلچسپ ہے اس لئے اردو اور فارسی کے شعراء نے گذشتہ صدی مین بے حدو حساب تاریخین کہی ہین جن مین سے بعض کمال فن کے پیش نظر داد کی مستحق ہین ۔ بعض ایسی ہین کہ اپنی معنی خیزی صفائی اور بے ساختگی کے لحاظ سے معجزانہ شان رکھتی ہین ۔ شعرا ئے لکھنئو اس فن کی طرف زیادہ مائل تھے ۔ ناسخ اپنی زود گوئی کے لئے مشہور تھے ۔ ان کے شاگرد میر علی اوسط رشک ان سے بھی بڑھ گئے ۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے ۔ دہلی مین

بقیہ) اسی خصوصیت کے باعث ان کا لقب حیدر معما ئی پڑ گیا تھا ۔ ۱ ۔ منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی ۔ ان اشخاص کا بیان ۔

۲ ۔ آبحیات ص ۲۸۹

مومن ذوق اور غالب معاصر تھے۔ موخر الذکر دونوں استاد تاریخ کہنے پر قادر ضرور تھے مگر اس کا شوق نہ رکھتے تھے۔ بہت کم تاریخیں کہی ہیں ۔ ان کی تلافی حکیم مومن خان نے کر دی کہ ان میں یہ ملکہ بہت قوی تھا ۔ انھوں نے اس فن میں تخرجہ ۔ تعمیہ ۔ اختیار حروف اوسط غرض مختلف داؤ پیچ سے بڑی دلچسپ تاریخیں کہی ہیں ۔ بعض تاریخیں سادہ بھی ہیں جن کے حروف سے سن مطلوب بے تکلف نکل آتا ہے۔ ان تاریخوں کے موضوعات گوناگوں ہیں ۔ دوستوں کے بنا کردہ مکانات کنویں مسجد حوض سبیل امام باڑہ باغ شادی غمی غرض ہر واقعے کی تاریخ کہی ہے۔

مومن کی طباعی و ذہانت کا اظہار ان کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا ۔ اکثر ایسا ہوا کہ دوران درس یا وعظ میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو روایات یا علمی نکات بیان کئے انھوں نے باپ کے مطب میں ادنیٰ تغیر کے ساتھ سنا دئے۔ [1] ظاہر ہے کہ ذوق اور غالب کی طرح انھوں نے بھی لڑکپن میں شعر اور تاریخ کہنا شروع کر دیا ہوگا ۔ ان کی شاعرانہ قدرت کا اولین قابل تعریف نمونہ ان کی پہلی مثنوی " شکایت ستم " ہے جس کا تاریخی نام انھوں نے ایک شعر میں نظم کر دیا ہے ؎

این نالۂ شکایت ستم نام

با من خود گفت سال اتمام [2]

اس سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتا ہے جب مومن کی عمر سولہ سال تھی۔ یقین ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے غزلیں کہنے لگے ہوں گے مگر ان کا تاریخیں تعین اب آسان نہیں۔ البتہ تاریخیں اپنے سنین کے لحاظ سے ترتیب دی جا سکتی ہیں ۔ ترتیب زمانی کے اعتبار

۱۔ حیات مومن ص ۳۸ (۲) کلیات اردو ص ۲۳۹

ہے دوسری تاریخ ایک شخص غلام حیدر کی ہے جو ۱۲۳۲ھ میں فوت ہوا ۔ قطعہ
وفات دو شعر کا ہے مگر درد انگیز ہے ؎

دردا کہ ازین جہان فانی
شد سوئے جنان
~~بگذاشت جہان~~ غلام حیدر

گفتم پئے سال رحلت او
بگذاشت جہان غلام حیدر (۱)

بظاہر یہ تاریخ سادہ معلوم ہوتی ہے مگر فی الواقع تخرجہ ہے ۔ غلام حیدر
کے اعداد (۱۲۹۳) میں سے جہان کے عدد (۵۹) خارج کر کے ۱۲۳۲ھ نکالا ہے ۔
تین سال بعد جب مومن کی عمر بائیس سال تھی ان کی دادی کا انتقال ہوا ۔ شاعر
نے "دخلت بالنعیم" سے ۱۲۲۷ھ نکالا ۔ قطعہ وفات یہ ہے

چو کہ اس غم سرا سے رحلت کی
جدۂ مومن پر یشان نے
سال تاریخ حسب حال کہا
دخلت بالنعیم رضوان نے
۱۲۲۷ھ

خاندان ولی اللہی سے بالخصوص شاہ عبدالعزیز سے مومن کو خاص عقیدت تھی ۔ ان کی وفات
پر جو قطعہ لکھا اس میں یہ صنعت رکھی ہے کہ فقر ۔ دین ۔ فضل ۔ فخر ۔ لطف ۔
کرم ۔ علم ۔ عمل (جو کہ مولانا مرحوم کی صفات تھیں) اور ان کے مر نے سے "بے سر وپا ہوگئیں"

۱۔ دیوان فارسی ص ۲۲۱

کے اول و آخر حرف کو ترک کر کے صرف درمیانی حروف (مثلاً "فقر" میں سے ق) کے اعداد لیکر ۱۲۳۹ھ حاصل کیا ہے۔ قطعہ بجائے خود اچھا اور ایک لطیفے کا حامل ہے۔

انتخاب نسخہ دین مولوی عبدالعزیز

بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل

جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آ گیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایمان میں خلل ؟

مجلس درد آفرین تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ اپنی بے بدل

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے

فقر و دین ، فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل (۱)

مومن نے اپنی عمر کے آخری سال یعنی ۱۲۶۸ھ تک بیسیوں تاریخیں کہی ہیں — انہیں ان کی اقسام کے اعتبار سے یعنی سادہ ، تخرجہ اور تعمیہ کی جدا گانہ قسموں کے تحت الگ الگ پیش کرنا مناسب ہے۔

۱) سادہ — ان میں کوئی صنعت یا کمی بیشی کا ڈھکوسلا نہیں — الفاظ سے پورا سال مطلوب نکلتا ہے —

سید احمد صاحب بریلوی کا سال جہاد —

گلاب تاب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ
کہ فکر مدحت سبط قسیم کوثر ہے

وہ کون امام جہان و جہانیان احمد
کہ محض مقتدی سنت پیمبر ہے

وہ قہرمان فلک توسن و نجوم حشم
کہ ترک چرخ غلام اس کا مہرچاکر ہے

وہ شاہ مملکت ایمان کہ جس کا سال خروج

" امام برحق مہدی نشان علی فر " ہے (۲)

۱۲۴۲ھ

۱ــ کلیات اردو — ص ۲۲۱ (۲) ایضاً ص ۲۲۲

کالے صاحب اس دور کے باخدا بزرگ تھے ـ اہل دہلی ان کا حد سے بڑھ کر احترام کرتے اور خود بادشاہ وقت ظفر انھین اپنا قبلہ گاہ مانتے تھے ـ ۱۲۶۸ھ مین خدا سے واصل ہوئے ـ قطعہ وفات مختصر ہے ـ مصرع تاریخ مین ارادت سے ملی ہوئی شوخی کا رنگ جھلکتا ہے ؎

ہوش جس دم وفات حضرت کی | مجھ کو تاریخ کا خیال آیا
ہاتف غیب نے کہا ناگاہ | کالے صاحب کو سرخ رو پایا (۱)

۱۲۶۸ھ

مولوی زین خان سرحد کے معرکہ جہاد مین شامل ہونے کے لئے گئے مگر کسی اختلاف کے باعث بد دل ہو کر واپس آ گئے ـ مومن اس تحریک کے نقیب تھے ـ زین خان کی یہ غداری سخت ناگوار گذری ـ قطعہ تاریخ مین جی بھر کر غصہ اتارا ہے ـ سگ اور خر سے تشبیہ دینے کے بعد کہتے ہین کہ ان چیزون سے کہین زیادہ ذلیل ہے ـ آخر مین سعدی کے ہاتھ سے دشنام و شناعت کا ہنٹر لے کر اس کی پشت پر رسید کرتے ہین ؎

مولوی زین خان کہ باہمہ علم | حالش از سگ خراب تر باشد
رفت و چندے بہ فوج دین جاکرد | تا ز صدقش بہ دل اثر باشد
خر عیسیش خواندم و خجلم | کہ ز دجّال ہم بتر باشد

سال تاریخ بازگشتن اوست

"چون بیاید ہنوز خر باشد" (سعدی)

۱۲۶۱ھ

(۲) تخرجہ بعض مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ مادہ تاریخ اچھا نکل آتا ہے مگر اس مین چند سال

۱ ـ کلیات اردو ص ۲۵۱

زیادہ ہوتے ـ شاعر نہین چاہتا کہ اپنی محنت اور اس لاجواب مصرعےکو ضائع کرے ـ لہذا حسب دستور مناسب اشارہ کر کے کسی حرف یا لفظ کے اعداد خارج کردئے جاتے ہین ـ یہ اشارہ جتنا لطیف ہوتاہے ، اتنا ہی تخرجہ کو پر لطف سمجھا جا تاہے ـ اگرچہ یہ الٹ پھیر صرف ضرورت کے ماتحت کیا جا تاہے اور مومن سے پہلے مستحسن نہ سمجھا جاتا تھا مگر انھون نےتخرجہ مین وہ ندرا کستین پیدا کین کہ اس کا مرتبہ سالم و ثابت تار یخون سے بڑھ گیا ـ مثلا"

" بگذاشت جہان غلام حیدر " بظاہر صاف تاریخ معلوم ہوتی ہےلیکن تخرجہ کا اشارہ ہے کہ " غلام حیدر " نے " جہان " کو " چھوڑ دیا " ـ غلام حیدر کے اعداد (۱۲۹۳ھ) سےجہان کےعدد (۵۹) خارج کردیجیے تو مطلوبہ سال ۱۲۳۴ھ نکل آتا ہے ـ اس نوع کی لطافتین مومن نے بہت پیدا کی ہین ـ جو فی الحقیقت ستائش کی مستحق ہین ـ

اپنے والد غلام نبی خان کی تاریخ مین یہی پہلو رکھا ہے کہ الفاظ تاریخ سے (جوایک آیت کا ٹکڑا ہین) جنازہ کے اعداد خارج کئے ہین [۱] اختصار کے لحاظ سے یہان آخری شعر لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

جنازہ اٹھا یا فرشتون نے آ
٦٦ | تو قد فاز فوزا" عظیما" کہا
۱۳۰۷

۱۳۰۷ مین سے ٦٦ خارج ہوکر سال وفات ۱۲۴۱ھ نکلتاہے ـ جنازہ اٹھا نے" کا اشارہ ازبس لطیف ہے ـ

ایک بیٹی (محمدی بیگم) کے پیدا ہونے کی تاریخ مین نال کٹنے کا اشارہ کر کے نال کے اعداد (۸۱) خارج کئے ہین ؎

نال کٹنے کےساتھ ہاتف نے | کہی تاریخ " دختر مومن "
۱۳۳۰

۱۳۳۰ ـ ۸۱ = ۱۲۵۱ھ

۱۔ کلیات اردو ص ۳۳۲

اسی سال دلی کا کوتوال کسی وجہ سے معزول ہوا ۔ مشہور ضرب المثل کے اعداد بقدر ۶۱ زیادہ تھے ۔ اس میں سے " کام " کے عدد خارج کر کے تاریخ گوئی بلکہ لطیفہ گوئی کی داد دی ہے
۶۱

شحنۂ دہلی خلق آزار | بچۂ افغان رشوت خوار (۱)

خوار ہوا بارے اس سال | لوگوں کا تھا یار اقبال

سب نے کہا جب چھوٹا کام | اترا شحنہ مردک نام
۶۱ | ۱۳۲۰ ۔ ۶۱ = ۱۲۵۹ھ

خان حامدعلی کی وزارت کی تاریخ " فکر " کے بغیر یوں کہتے ہیں ۔

پھر تاریخ یوں کہا بے فکر | خلعت آصفی مبارک ہو
۳۰۰ | ۱۵۵۴ ۔ ۳۰۰ = ۱۲۵۴ھ

کسی نے حوض تعمیر کیا ۔ اس کا مادہ تاریخ بقدر تین عدد بڑھا ہوا تھا ۔ تیز ذہن استاد نے اس میں سے " آب " نکال لیا جس کے عدد تین ہیں ۔

تاریخ بنائی او چہ پرسی | از چشمۂ فیض آب بردار
۱۲۳۸ ۔ ۳ (۱۲۳۵ھ)

ایک شخص خوشوقت رائے نے شراب خانہ تعمیر کیا ۔ شاعر دیندار سہی مگر تاریخ کہنے میں تعصب کو راہ نہیں دی ۔ " خمخانے " سے " مے " لے لی ۔

خوشوقت رائے میکدہ نو بنا نہاد | خوش وقت مےکشان بہ زندان شوق اسیر

حیران ستادہ دید بمن پیر مے فروش
گفتم کہ فکر چیست " ز خم خانہ مے بگیر
۱۲۹۶ ۔ ۵۰ (۱۲۴۶)

---

۱ ۔ کلیات اردو ص ۲۵۰

(۳) تعمیہ ۔ اس کا انداز بھی تخرجہ سے ملتا جلتا ہے فرق یہ ہے کہ تخرجہ کے برعکس تعمیہ مین کچھ عدد بڑھائے جاتے ہین ۔ مادہ تاریخ مین چند اعداد کی کمی ہو تو مناسب اشارے سے چند اعداد کا اضافہ کر کے سال مطلوبہ برآمد کرتے ہین ۔ اچھے استاد اس فن مین بڑی لطافتین دکھاتے ہین ۔ مومن نے بھی بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے ۔ اپنے باپ حکیم غلام نبی خان کا سال وفات بڑے سلیقے سے نکالا ہے ؎

پدرم شد الا اسیر دام اجل	وحش از بند آشیجان رسد
طائرے بود آسمان پرواز	رفت بر شاخسارِ قرب نشست
بہ من الہام گشت سال وفات	کہ غلام نبی بہ حق پیوست
	۱۱۳۳ ۱۰۸

یعنی غلام نبی حق سے جا ملے ۔ ۱۱۳۳ + ۱۰۸ = ۱۲۴۱ھ

مومن کو اپنی چھوٹی بہن سے بہت محبت تھی ۔ اسے بیٹی کی طرح سمجھتے تھے ۔ ۱۲٦۸ھ مین مومن کے مرنے سے کچھ (چند) ماہ پہلے کئی بچے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی قطعہ وفات سے شاعر کے دل کا درد ٹپکا پڑتا ہے ۔ یہاں آخری شعر لکھا جاتا ہے ؎

داغ جگر گداز نہادہ فراق تو ۱۲٦۰	برفرق دختر و پسران و برادرت

یعنی تیری جدائی تیری دختر ۔ پسر اور برادر کے سر پر داغ جگر گداز چھوڑ گئی ہے ۔ یہاں حسب دستور لفظ " سر " سے دختر ۔ پسر اور برادر کے حروف اول کا اشارہ ہے جن کے عدد بالترتیب ۴ ۔ ۲ ۔ ۲ ہوتے ہین اور ان کا مجموعہ ۸ بنتا ہے ۔ ۱۲٦۰ مین ۸ کا اضافہ کر کے بڑی لطیف ترکیب سے ۱۲٦۸ھ نکالا ہے ۔

(۲) تعمیہ و تخرجہ کے علاوہ خوب ۔ جمع ۔ تفریق کے ذریعے بھی تاریخیں کہی ہیں ۔

مثلاً اپنے دوست تفضل حسین خان کے باغ کی تاریخ بڑے ایسے پیچ سے نکالی ہے مگر خوبی یہ ہے کہ بہت خوب نکالی ہے۔ باغ تفضل حسین سے خار و خس کو صاف کر کے (خارج کر کیا) باد بہار و ہوائے گل کو داخل کیا ہے (جمع کیا ہے) ۔

تاریخ رنگ ریزی این تازہ بوستان	مومن کہ ہست بلبل گلزار و نظم گفت
تا در رسید باد بہار و ہوائے گل	خود خار و خس ز باغ تفضل حسین رفت
	۱۲۶۷ ۲۲۲۱

اول باغ تفضل حسین میں سے خار و خس کو خارج کر کے ۹۷۲ حاصل کیا ۔ اس ۹۷۲ میں باد بہار و ہوائے گل کے اعداد ۲۹۲ جمع کئے جس سے ۱۲۶۷ھ حاصل ہوتا ہے ۔

امامن دلی کی مشہور طوائف تھی کہ حسن وجمال کے ساتھ خوش اطواری میں بھی بے نظیر تھی ۔ جوانی کی بھری بہار میں بازار وجود سے شہستان عدم کو روانہ ہوئی[1] ۔ مومن اس کی اداؤں کے پرستار تھے ۔ اس کا قطعۂ وفات بڑے اہتمام سے کہا ہے اور مادۂ تاریخ غم و رنج و آزار کے آخری حروف ساقط کر کے نکالا ہے جن کے حذف کا اشارہ بڑی لطافت سے کیا ہے ۔ مومن نے یہ قطعہ بڑی دلسوزی سے کہا ہے جس سے ان کا دلی تعلق ظاہر ہوتا ہے ۔ یہاں چند اشعار لکھے جاتے ہیں ۔

خزان دیدہ شد نوگلے در جوانی	جوانے چنین باغ امکان ندارد
دریغا کہ جان جہان دلربائے	یخاک از جہان رفتہ و جان ندارد
امامن کہ مانند او لعبتے خوش	پس پردہ گردون گردان ندارد
دمید او چہ سنبل ز طرف مزارش	خم و پیچ آن زلف پیچان ندارد

۱۔ دیوان فارسی ص ۱۲۰

کجا عشقبازے کہ یارب نہ سنجد — کجا مہرکیشے کہ افغان ندارد

چو امید وصلش بہ مردن فتادہ — خوشا دردمندے کہ درمان ندارد

چہ گویم ز سالِ وفاتش چہ گویم — غم و رنج و آزار پایان ندارد

۱۲۵۱ھ

فارسی کلام

مزاج اور انداز فکر ایسی چیزین ہین کہ خواہ انسان کسی زبان مین کلام کرے ان کا رنگ برابر جھلکتا ہے ۔ ان کی خصوصیات کلام کے ضمن مین وہ تمام اوصاف واضح کئے گئے ہین جو ان کے طرز تغزل سے مخصوص ہین یعنی رچاو ۔ شخصی آہنگ ۔ معاملہ بندی ۔ لطیف و رنگینی ۔ رعنائی و تناسب الفاظ وغیرہ یہی خوبیان انکی فارسی غزل مین جلوہ گر ہین ۔ اردو کلام مین جن نقائص کی طرف باب ہذا مین اشارے کئے گئے ہین وہی عیوب فارسی مین بھی ہین بلکہ مادری یا ملکی زبان نہ ہونے کے سبب وہ اپنی تمام تر فارسی دانی کے باوجود اردو سے زیادہ غلطیاں کرتے ہین جس کا اعتراف رومی کی طرح انھین بھی ہے ۔ غزل مین ان کی نظر معاملات الفت اور تغزل کے رچاو پر مرکوز رہتی ہے جس کا اشارہ وہ ایک مقطعے مین کرتے ہین :-

مومن طراز شعر بہ یاران گزاشتم
ہیچ است ہر چہ جز غزل عاشقانہ ہیچ

ان سب باتون کے با وصف ان کی قادر الکلامی مین کلام نہین ۔ سوز و گداز ۔ شخصی لہجہ ۔ وقوعہ گوئی رعنائی الفاظ غرض کون سا رنگ ہے جو انکے تغزل کی قوس قزح مین موجود نہین ۔ بعض غزلین سر تا سر مرصع اور زبان و محاورہ کے لحاظ سے قابل تعریف ہین : -

یک زخم بود لم اگر آن نازنین زدہ است	صد طعنہ بر شفاعت جان آفرین است
برخیز کاہے از روش اے غیر تا کجا	آخر نہ ہمچو من فلک بر زمین زدہ است
سوزم جدا ز شعلہ عذارے کہ تاب او	آتش بہ آشیانہ روح الا مین زدہ است
من بیگناہ و نیست عدو کشتنی چرا	ظالم گرہ بر ابرو و چین بر جبین زدہ است
گوش شنیدہ دعوی اعجاز از لبش	جان فال عیش بر نفس واپسین زدہ است
پامال کردہ است سپہرم براہ تو	گاہے کہ بر مراد زدہ است این چنین زدہ است

مومن ز بزم زاہد ناپاک الحذر
دست ہوس بہ دامن حوران عین زدہ است

سر بریدۂ من پائے قاتل افتادہ است — گرہ ز جبہہ کشودن چہ مشکل افتادہ است

زناز پردہ بہ رخ افگند چہ بد بختم — میانۂ من و او عشق حائل افتادہ است

گداخت تا دل روحانیان بہ نیم نگاہ — ز سحر چشم تو شورے بہ بابل افتادہ است

تمام درد شدم تا اسیر خود سازم — دل ترا کہ بہ آزار مائل افتادہ است

ز فرط شوق رہ عشق طے نہ شد ورنہ — ہزار بار گزارم بہ منزل افتادہ است

فلک ز زلزلۂ قیس گو بہ رقص بیا — ز ناقہ محمل و لیلی ز محمل افتادہ است

وصال بت طلبد مومن اے خدا رحمے — کہ بر امید تو در فکر باطل افتادہ است

انھون نے بعض غزلین حافظ نظیری اور غالب کی زمینون مین بھی کہی ہین — یہان موازنہ و تقابل مقصود نہین اس لئے بعض غزلون کے مطلعے لکھنے پر اکتفا مناسب ہے : —

بسمل شد و جلاد تر انداز بیباکش نگر — خورد آب پیکان بلا مژگان تمناکش نگر

از کف دشمن گرفتم جام را — می شناسم گردش ایام را

گر دل ہمگی خون شود و خون رود از دل — مشکل کہ تمنائے تو بیرون رود از دل

قصائد مین بھی ان کا زور کلام اور شوکت الفاظ اسی نہج پر ہین جو اردو قصیدون مین پایا جاتا ہے — دیوان فارسی کے تمام قصیدے عرفی کی زمینون مین ہین — ان مین قدرت بیان نے تدریجی ترقی سے زور اور قوت کے اتنے اچھے نمونے دکھائے ہین کہ بے شبہ عرفی کی روح مومن سے شاد ہو گئی ہوگی قطعات مین بھی مدعا نگاری نے بیان کو رفتہ رفتہ نقطۂ عروج تک پہنچا کر فن کا حق ادا کیا ہے — غرض ان کی قدرت بیان مسلم ہے — مرض الموت کے آخری ایام مین حکیم احسن اللہ خان کے اشارے سے انھون نے ان ردیفون مین فی البدیہہ غزلین کہی ہین جو دیوان مین خالی تھین — (۱)

نثر مین خطوط — تقاریظ اور تقویمون کا ایک مجموعہ ایک (انشائے مومن) ان سے یادگار ہے — یہ چیزین جہان ان کے ذاتی حالات پر روشنی ڈالتی ہین وہان ان کے آراستہ اور مقفی اسلوب کا جلوہ بھی دکھاتی ہین — انشاء کے صفحات ۲۲ ۵۲ ۷۱ ۱۰۹ ۱۲۹ پر جو خطوط ہین ان کی بلاغت کہین کہین سعدی کی محکم بیانی کا نمونہ پیش کرتی ہے — بعض خطوط مین تلازمات کی کثرت اور مقفی نگاری کا اہتمام تکلف بلکہ تصنع (۲) کی حد تک بھی پہنچا ہوا ہے کہ اس دور مین یہ روش عام تھی —

مقالۂ ہذا کی غرض اصلی مومن کے اردو کلام سے متعلق ہے — اس لئے ان کی فارسی شاعری یا نثر نگاری کے بہ سلسلہ صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے —

---

۱ — مقدمہ دیوان فارسی مومن ص ۲

۲ — انشائے مومن ص ۱۰۵ و ص ۱۳۱

معیوب شاعری

مخالفانہ تنقید بھی عجب وادی پر خار ہے کہ دنیا کے تمام ادیبون کے دامن یہان تارتار ہین ۔ اکثر شعراء کو اپنے زمانے مین یا کچھ عرصہ بعد مخالفانہ تنقید کا نشانہ بننا پڑا ۔ میر بد دماغ ٹھہرائے گئے ۔ غالب کو مہمل گو کہا گیا ۔ انوری اور جامی کو بد مزاج اور فحش گو کا لقب ملا ۔ بائرن کو محض نقاد بتایا گیا ۔[1] ورڈس ورتھ کو تکیل اور تنوع سے عاری قرار دیا گیا[2]۔ مومن بھی مذہبی اور سیاسی وجوہ سے بعض نقادون کی نفرت کا شکار ہوئے ۔اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسانی کوشش کی طرح مومن کے کلام مین بھی فنی اسقام موجود ہین جن کا بیان کرنا نقد و نظر کے تقاضون کے مطابق ہے ۔

اس باب مین مومن کے محاسن شعری کا بیان ہوا ہے ۔ ان کے تغزل کی خوبیان واضح کرنے کے ساتھ وہ معائب بھی ضمناً بیان کئے جا چکے ہین جو کسی خصوصیت مثلاً معنی آفرینی یا معاملہ بندی کی افراط و تفریط سے پیدا ہوئے ہین ۔ ان مین اغلاق ۔ تعقید معنوی اور لفظی عیوب سر فہرست ہین ۔ ان مین سے ہر ایک جدا گانہ تشریح کا طالب ہے

اغلاق ۔ غالب کی طرح مومن کے قارئین کو بھی یہ شکایت ہے کہ ان کے بعض اشعار بے حد غور و فکر کے بغیر سمجھ مین نہین آتے ۔ یہ صورت دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہے جن مین سے ایک معنوی پیچیدگی اور دوسری لفظی عیوب پر مبنی ہے ۔ بعض مواقع پر خیالات کی تہین اتنی زیادہ ہوتی ہین کہ مضمون ان کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے مثلاً ؎

دفن جب خاک مین ہم سوختہ سامان ہون گے   فلس ماہی کے گل شمع شبستان ہون گے

عاشق ناکام کا بعد مرگ زیر زمین دفن ہونا ۔ سوزش دل سے اس مچھلی کے بدن مین آگ لگ جانا جس پر (صنمیات کے بموجب) زمین ٹھہری ہوئی ہے اور اس آگ سے مچھلی کے فلوس کا جل کر عاشق کی شمع مزار کا گل بن جانا ۔ ایسے مقدمات ہین کہ ان کا سمجھنا اور انھین معنوی ترتیب دینا سخت دشوار ہے ۔ اس تمام کوہ کندن کے بعد بھی سامع کو لطف معنی حاصل نہین ہوتا ۔ اسی طرح ایسے کافی اشعار ہین کہ جب تک یونانی صنمیات اور تاریخ ایران قدیم سے واقفیت نہ ہو انکے معنی سمجھنا مشکل ہے ۔ اس پر ستم یہ ہے کہ غور و فکر کے ہفت خوان طے کرنے کے بعد بھی لطف مضمون کا پتہ نہین ملتا ۔ اگر ان اشعار پر بھی کوئی سر دھنے تو فرط اعتقاد کے سوا

---

1 — T.S. Eliott: Essays on Poetry and Criticism.

2 — ایضاً

اور کیا کہہ سکتے ہین ـ[1] ضیا احمد صاحب بدایونی نے بھی رفع اعتراضات کے بہ سلسلہ جو کچھ لکھا محل نظر ہے[2] ـ مختصر یہ کہ غزل کا آبگینہ اس سنگباری کا متحمل نہین ہو سکتا ـ یہی وجہ ہے کہ غزل کے بہترین نمونون کے دوش بدوش کلیات مین اچھے اشعار بھی خاصی تعداد مین ہین جو تغزل کی سے بیگانہ اور معنوی اعتبار سے بے مزہ ہین ـ اصطلاحات و تلمیحات کی یہ کثرت قصیدون مین بالخصوص نظر آتی ہے ـ جس کی بدولت یہ حالت ہے کہ ان مین سے بعض کو شرح و لغات کے بغیر سمجھنا سخت مشکل ہے ـ

معنوی اسقام مین سے ایک یہ بھی ہے کہ مومن کے یہان آفاقی تجربے نہین ملتے ـ وہ دل کی داستان سنانے مین محو رہتے تھے ـ انفرادی تجربات نے انھین کبھی اجازت نہ دی کہ وہ عالمگیر صداقتون پر نظر کرین یا آفاقی حقائق کو شعر کا لباس پہنائین ـ یہی وجہ ہے کہ ایسے اشعار جو ضرب المثل کا کام دیتے ہون مومن کے ہان بہت کم ملتے ہین ـ ان کی نگاہ معاملات عشق پر مرکوز رہتی تھی ـ اس مرکزیت نے ان کے تغزل کو ایک بے بدل نکھار تو عطا کیا لیکن آفاقیت سے محروم کر دیا ـ ایسے اشعار جن مین مسلمہ حقائق نظم کئے گئے ہون یا جنھین زندگی کے واقعات سے ہم آہنگ کر کے عام مواقع پر پڑھ سکین مومن کے ہان بہت کم ملتے ہین ـ مومن کا مطالعہ کرنے والے کو یہ صورت حال پہلے ہی تسلیم کر لینی چاہیئے کہ ان کا مزاج عمومیت کی طرف مائل نہ تھا ـ یہ ایک الگ سوال ہے کہ عمومیت بجائےخود قابل استثناء ہے بھی یا نہین ـ ان کے ایک معاصر (ذوق) کے یہان آفاقیت اور عمومیت تھی لیکن بقائے دوام کی ضامن نہ بن سکی ـ

تعقید معنوی: اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ایک یا دو مصرعے مین طولانی مضمون کھپانا چاہتے ہین وہ کبھی ادق اصطلاحات سے کبھی حذف وایجاز کے ذریعے اور کبھی واقعات و خیالات کی کئی کئی کڑیان چھوڑ کر ادائے مطلب کرتے ہین ـ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیان مین ژولیدگی پیدا ہو کر شعر چیستان بن جاتا ہے جس کی مثالین اس باب مین دی جا چکی ہین (ص ۳۲٦) ـ

لفظی عیوب: مومن زبان کے معاملے مین چندان محتاط نہ تھے ـ شیفتہ کو بھی ان سے یہ گلہ ہے کہ آرائش معنی کے شوق مین تحسین الفاظ سے بے اعتنائی کرتے ہین ـ[3] معترض ان پر

۱ ـ مثلاً * حکیم اعجاز احمد معجز جو ایسے اشعار کو معنی آفرینی کا نمونہ سمجھتے ہین ـ ان کی کتاب مومن و غالب (ص ۱۳ و مابعد) اسی غلط عقیدت کے تحت لکھی گئی ہے (۲) مقدمہ دیوان غزلیات ص ٦۷

۳ ـ کلیات اردو ـ مقدمہ نواب مصطفی خان شیفتہ

تکرار ردیف اعلان نون (تراکیب مین مثلاً "آفت ایمان) اور حشو کے الزام لگاتے ہین — بعض اوقات روز مرہ عوام کی تقلید مین ایسے کلمات نظم کر جاتے ہین جن کا سقم کسی توجیہ سے دور نہین ہوسکتا — مثلاً " ع محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

ـہ کچھ نہ کچھ کر گئے اثر طعنے — کہ ہوا مہربان فلک پہنسے

ع کھا یا کرون امید اثر سم کہان تلک

ان سب مثالون مین لفظی اور نحوی غلطیان بالکل واضح ہین اور ان کی تاویل ممکن نہین — بعض جگہ سوقیانہ محاورات بھی نظر آتے ہین — وہ غزلون مین بعض جگہ اور قصیدون مین اکثر ایسے ثقیل عربی الفاظ لاتے ہین یا ایسی نامانوس فنی اصطلاحین نظم کرتے ہین کہ لغات کے بغیر ان کا سمجھنا دشوار ہے — دختر طیموس — طلسم بطلیموس — ایلاوس وغیرہ تک اکثر اشخاص کا ذہن منتقل ہونا مشکل ہے — با این ہمہ انصاف سے دیکھا جائے تو مومن کی یہ ساری کاوشین ایجاز و اختصار کی خاطر تھین — یون بھی شاعری کی زبان عام مروجہ زبان سے مختلف ہوتی ہے [1] علاوہ ازین مشکل شاعر ہمیشہ ہوتے آئے ہین (۲) اور قاریون سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ عظیم فن کارون کو سمجھنے کے لیے عمومیت کی سطح سے ذرا اونچے ہو کر مطالعہ کرین —

<u>عریانی</u> غزلون اور مثنویون مین بعض مقامات پر عریانی و ابتذال کی فضا چھائی ہوئی ہے — اگرچہ مومن نے بیان معاملات مین تہذیب و متانت سے کام لیا ہے تاہم بعض جگہ ایسے الفاظ و کنایات آ گئے ہیں جو عریانی و رکاکت کا کوئی جواز پیش نہین کیا جا سکتا — دوسری مثنوی قصہ غم کے بعض مقامات بہت عریان و مبتذل ہین — یہی وجہ ہے کہ بعض نقاد یہ الزام لگاتے ہین کہ مومن کا کلام نشاط عشق سے محروم ہو کر بوالہوسی سے معمور ہو گیا ہے (۲)

<u>فرقہ پرستی</u> ایک اور سبب جس نے مومن کی مقبولیت کو نقصان پہنچایا اور جو شریعت شعر مین بھی جائز نہین ان کا بڑھا ہوا مذہبی تعصب ہے — وہ اپنے کلام مین جا بجا شیعون — مقلدون اور اہل بدعت کو ناسزا کہتے ہین — کبھی انھین جیوان — کبھی کج فہم اور کبھی بے دین کہہ کر دل ٹھنڈا کرتے ہین —

<u>تعلی شاعرانہ</u> یہ سنت سقراط ہے [سراز] لیکن نشہ کمال سے سرشار مومن مناسب حدود کی پروا نہ کرتے تھے — وہ غزلون اور قصائد مین اساتذہ سلف اور اپنے معاصرون کو سگان جیفہ خوار اور خشک دماغ کہہ گزرتے ہین —

۱ـ Elizabeth Drew : Discovering Poetry, P. 73

۲ـ IBID : " P. 82

۳ـ اختر اورینوی تنقید جدید ص ۱۱۷

فارسی اور عربی شعراء کا نام حقارت سے لیتے هین — ان تعلیوں کی کتنی هی نرم تاویل کیجیے مومن کے اظہار تفاخر کے لئے جواز پیدا نہین هوتا — یہی وجہ هے کہ شعرا نے معاصر ان کی حد سے بڑھی هوئی خود پسندی سے نالان تھے — مرزا قادر بخش صابر نے ان کی بے پایان صلاحیتون کے پیش نظر اس فخر و مباهات کوجائز ثابت کرنا چاها هے (۱) لیکن حق یہ هے کہ اتنی خود ستائی با کمالون کو زیب نہین دیتی —

کوشش وکاوش کی کمی مومن کی وارستہ مزاجی نے انہین اپنے کلام کی تحسین وز تزئین سے همیشہ غافل رکھا — وہ بالعموم نفسیاتی کیفیات مین کھوئے رهتے تھے — وارستگی کے عالم مین قلم سے جوکچھ نکل گیا اسے ان کے شاگرد اور اعزہ قلمبند کر لیتے تھے کیونکہخود آزادہ رو شاعر کو اپنا کلام جمع کر نے یا ترتیب دینے کا کبھی خیال تک نہین آیا — مختصر یہ کہ وہ کبھی اپنی تخلیق پر نظر ثانی نہ کرتے تھے (۲) — یہان اس محنت اور کاوش کا نکتہ سمجھ مین آتا هے جس سے عظیم فن کار کبھی غافل نہین هوتے اور جسے اقبال " خون جگر " سے تعبیر کرتا هے — مومن کا مقام لاکھ بلند سہی لیکن ان کے فن مین کہین کہین اس نامیاتی حسن کی کمی محسوس هوتی هے جوغالب کے یہان بدرجۂ اتم موجود هے —

---

۱ — گلستان سخن ص ۲۲۳

۲ — شیخ محمد اکرام — حکیم فرزانہ ص ۲۵۳

تصانیف مومن

(۱) کلیات اردو ـ مومن کی تصانیف مین سب سے زیادہ اھمیت ان کے اردو کلیات کو حاصل ھے ـ اس کی ترتیب کا مختصر حال یہ ھے کہ وارستہ مزاجی کے سبب مومن کو کبھی اپنا کلام جمع کرنے کا خیال نہ آیا ـ ۱۲۴۴ھ مین جب ان کی عمر ۲۹ سال تھی نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے مختلف احباب سے تھوڑا بہت کلام فراھم کرکے دیوان ترتیب دیا جس کے اشعار کی تعداد تقریباً چھ ھزار بیت تھی ـ (۱) اس تالیف کا کوئی نسخہ یا اس کا ذکر کسی کتبخانے کی فہرست مین نہین ملتا جس سے یہ اندازہ کرنا درست ھوگا کہ شیفتہ نے اس کو ترتیب تو دیا لیکن طبع نہ کرا سکے ـ اس وقت تک (۱۸۲۸ھ) دھلی مین چھاپہ خانون اور طباعت کی گرم بازاری نہ تھی ـ یہ فن پورب کے اضلاع یعنی کانپور اور لکھنئو تک محدود تھا ـ (۲) مومن اس کے بعد چوبیس سال اور زندہ رھے ـ اس طویل عرصے مین انھون نے بہت کچھ کہا ھوگا جس کی نسبت عبدالرحمٰن آھی نے اشارہ کیا ھے کہ مین اسے شیفتہ کے مرتبہ مجموعے مین داخل کرتا رھا جب حکیم مومن خان ناگاہ مرض الموت مین گرفتار (مبتلا) ھوئے تو آھی نے یہ مجموعہ انتقال سے چند روز پہلے خان موصوف کو دکھایا ـ انھون نے بعض اشعار کی اصلاح و ترمیم کی اور زبان حسرت سے یہ مصرع پڑھ کر

ع
حوالہ باخدا کردیم و رفتیم

وہ مجموعہ آھی کو واپس (لوٹا) دیا ـ (۳) یہی نسخہ مطبع نولکشور کانپور و لکھنئو سے بہ تفصیل ذیل چھ بار شائع ھوا ۔ اکثر مطبعون کے نسخے اسی پر مبنی ھین اور بہ لحاظ ضخامت اس سے بھی کم ھین :ـ

باراول ـ ۱۲۸۴ مطابق ۱۸٦۷ھ ـ مطبع کانپور ـ کاغذ اور طباعت عمدہ ـ کاتب محمد مقصود ـ

۱ـ شیفتہ کا مقدمہ کلیات اردو ص ۵ (۲) عتیق الرحمان ـ ھندوستانی صحافت کی تاریخ ص ۵۹

۳) تلخیص از تقریظ عبدالرحمن آھی ـ نسخہ نولکشور ص ۲۸۸ و مابعد

محمد اسمٰعیل قمر کے اہتمام سے طبع ہوا جو استعداد علوم کے علاوہ خوشنویسی مین بھی دخل رکھتے تھے ۔ خاتمے پر انوار حسین تسلیم کی تاریخ طبع درج ہے ۔ جس کا مصرع " طبع از دیدن آن شادان گشت " ۔ ۱۲۸۴ھ کا اشارہ کرتا ہے ۔ متن کے تین طرف جدول ہے کہ ان دنوں عام انداز یہی تھا ۔

بار دوم ـ ستمبر ۱۸۸۰ء مطبع کانپور کاغذ اور طباعت ادنی ۔

بار سوم ـ نومبر ۱۸۸۵ء ـ مطبع کانپور ـ وزیرخان کاتب ہے ۔

بار چہارم ـ ستمبر ۱۹۰۵ء

بار پنجم ـ ۱۹۱۵ء مطبع لکھنئو ۔

بار ششم ـ دسمبر ۱۹۳۰ء ـ مطبع لکھنئو ـ کاغذ اور طباعت نہایت عمدہ ـ مولانا عبدالباری آسی کی توجہ سے بہت صحت کے ساتھ چھپا ہے ۔ اور یہ اس دور (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳٦ء) کی اکثر مطبوعات نولکشور کی خصوصیت ہے ۔ ان نسخون مین جن کے پہلے پانچ ایڈیشن اغلاط سے پر ہین مختلف اصناف سخن کی تعداد حسب ذیل ہے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض نامعلوم وجوہ سے عبدالرحمن آہی کے مرتبہ نسخے کا معتدبہ حصہ ضائع ہوگیا اور اس وقت کلام مومن کا محض ایک حقیر جز ہمارے ہاتھ مین ہے ۔

صنف	تعداد	تعداد اشعار
غزلین	۲۱۹	۲۵۷۰
مثنویان	٦	۳۰۱۲
ناتمام مثنویان (جہادیہ، نامہ جات وغیرہ)	۲	۲۰۲
قصیدہ	۹	۸٦۷

صنف	تعداد	تعداد اشعار
رباعی	۱۲۹	۲۵۸
مسمطات : مثلث ــ مخمس ــ مسدس (تضمین)	۱۶	۲٦٤
واسوخت (مسدس و مثمن)	۳	۲٦۰
ترجیع بند	۱	۱۲۰
ترکیب بند (مرثیه)	۱	۱۳۲
قطعات (تاریخین وغیره)	۲٤	۲۲۴
متفرق	٦	۱۰

نسخه نولکشور کے علاوہ جو نسخے شائع ہوئے ان کی تفصیل یه هے :-

۱) رفاه عام پریس دهلی ــ ۱۱ / فروری ۱۸۴٦ء ــ به اهتمام مولوی کریم الدین صاحب [۱] نایاب هے ــ

۲) مجلس پریس دهلی ــ ۱۸۵۲ء ــ به اهتمام کنهیا لال ــ مومن کی وفات کے کچھ بعد طبع ہوا ــ نایاب هے ــ [۲]

اس کا ایک نسخه گوجرانواله کی میونسپل پبلک لائبریری مین نظر سے گزرا ــ انتهائی خسته حالت ــ مختصر نسخه هے جس مین نسخهٔ نولکشور کے آدھے اشعار بھی نہین ــ مثنویان شامل نہین هین ــ

۳) انڈین پنچ پریس ۱۸۵۵ء ــ به اهتمام دیبی سہائے ــ

۴) مطبع هاشمی دهلی ۱۸٦۱ء ــ نسخهٔ نولکشور سے کسی قدر مختلف هے ــ اس مین منقبت سیدنا امام حسن ع، نواب وزیر خان اور راجه اجیت سنگھ کی مدح والے قصیدے اور

۱ــ رام بابو سکسینه ــ تاریخ ادبیات اردو مترجم ص ۲۵۸ ــ کلب علیخان فائق کا به حواله قاضی عبدالودود صاحب یه لکھنا که اس سے پہلے بھی دیوان مومن طبع ہوا تھا غلط هے کیونکه قاضی صاحب تردید کرتے هین (۲) مقاله کلب علیخان فائق ــ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۹ء

بحر متقارب والی نا تمام مثنوی شامل نہین ہین ـ غزلون کی تعداد بھی ۲۱۹ کے بجائے ۱۹۸ ہے ـ

قطعات اور رباعیان بھی کم ہین ـ لیکن اس نسخے مین دو مخمس زیادہ ہین ـ جو اور نسخون مین

نہین ملتے ـ یہ مخمس ناسخ اور غالب کی ان غزلون کی تضمین ہین جن کے مطلعے درج ذیل ہین ـ

ناسخ مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجران کا

طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریبان کا

غالب ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

۵) مطبع جوہر ہند دہلی ـ ۱۸۸۱ء ـ مطبع بے نظیر ، تاریخ طبع ہے ـ اس مین مثنویان

نہین ہین ـ ترتیب ناقص ہے ـ

۵) شانتی پریس الہ آباد ـ ۱۹۳۲ء ـ دیوان غزلیات ہے جسے پروفیسر ضیاء احمد صاحب

بدایونی نے ترتیب دیا ہے ـ بہت تحقیق اور صحت کے ساتھ طبع ہوا ہے ـ یہ پہلا نسخہ ہے جس

مین غزلون کی تشریح موجود ہے ـ قصائد ـ مثنویان ـ تاریخین وغیرہ اس مین نہین ـ

فردین اور معمے البتہ ہین ـ یہی نسخہ اسی پریس سے دوبار اور یعنی ۱۹۳۷ء اور ۱۹۵۴ء

مین شائع ہوا ہے ـ دس صفحے کا غلط نامہ (صفحہ ۱۲ تا ۲۲) متداول اغلاط کی تصحیح کے لئے

شامل ہے ـ

٦) کتابی دنیا (اردو مرکز) کراچی ۱۹۵۵ء ـ کلیات اردو ـ جملہ اصناف سخن پر مشتمل

لیکن اغلاط سے پر ہے ـ شروع مین شیفتہ کے مقدمے کے علاوہ ڈاکٹر عبادت صاحب کا دیباچہ بھی ہے

جس مین مومن کی خصوصیات کلام کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے ـ راقم نے حوالون کے لئے اسکو

استعمال کیا ہے ـ

ان مجموعون کے علاوہ ضمیرالدین احمد عرش نے دیوان مومن کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے جو میر حسین تسکین کے پاس تھا اور جوان کی پوتی میمونہ بیگم (دختر عبدالرحمن آہی) کے شوہر سیف الدین نے ١٩٢٨ء کے قریب سید احمد صاحب امام مسجد جامع دہلی کی تحریک سے پیر عبدالصمد کو دے دیا تھا – عرش کا بیان ہے کہ میرے پیہم اصرار کی جواب میں پیر عبدالصمد صاحب نے اس نسخے سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا – [اسه]

مخطوطات میں رضا لائبریری رامپور کے دو نسخوں کا ذکر ضروری ہے جن میں سے ایک تقریباً ١٢٢٢ھ یعنی ١٨٢٩ء کے آس پاس کا اور دوسرا ١٨٥٦ء کا مکتوبہ ہے – ان میں نولکشور کے مروجہ نسخے کے بمقابلہ بعض چیزیں کم ہیں – اول الذکر نسبتاً زیادہ ناقص ہے – اس کی تاریخ کا تعین بھی ازروئے قیاس ان تحریروں سے کیا گیا ہے جو متن اور حاشئے پر درج ہیں اور جو ١٢٢٢ھ کے آس پاس کی ہیں – بعض حسابات بھی درج ہیں – یہ دیوان صرف اس لحاظ سے مفید ہے کہ اس سے منحولہ کلام اور کلام مابعد کے درمیان ایک تاریخی حد بندی کر سکتے ہیں – یہی مقصد گلشن بےخار سے بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ ١٢٥٠ھ کی تالیف ہے –

ان مخطوطات کا مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کرنے پر حسب ذیل پانچ غزلیں مولانا امتیاز علی خان عرشی نے شائع کی تھیں جنھیں محترمی ضیاء احمد صاحب نے شانتی پریس الہ آباد کی طبع سوم میں شامل کر لیا ہے – ان کے مطلعے یہ ہیں :-

١) کوچے میں بستر آپ کے شام اور کا ہوا — اپنا جو تھا مقام مقام اور کا ہوا

٢) غم کو ہم سے ربط ہے مدت سے ہم کو غم سے ربط
ہم اسی سے ربط رکھتے ہیں جو رکھے ہم سے ربط

٣) لوگ کیا جانے ہیں سوز شمع و پروانے کا حظ — کوئی پوچھے ہمارے دل سے جل جانے کا حظ

اسه عرش – حیات مومن ص ٦٢

۴) ترے درد ہجر میں کب تلک پڑے تڑپیں آٹھ پہر تلک
دم صبح سے سر شب تلک سر شب سے لیکے سحر تلک

۵) سینے سے منفعل ہے کھڑا تیر کھینچ کر اک آہ رہ گیا ہے جو خنجر کھینچ کر

اول الذکر دو غزلوں کا ایک ایک شعر مطبوعہ دواوین کی فردیات میں بھی ملتا ہے جس سے شیفتہ کے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ غالب کی طرح مومن نے بھی شیفتہ کے "مرتب کردہ" دیوان پر نظر کرتے ہوئے اپنی بعض غزلیں قلمزد کر دی تھیں[۱]۔ ایک آدھ شعر جو کسی کو یاد رہا وہ بعد ازاں کسی وقت فردیات میں شامل کر لیا گیا۔

۱۔ شیفتہ مقدمہ کلیات مومن

فارسی تصانیف

۱) دیوان مومن فارسی — فارسی غزلون اور قصائد کا مجموعہ ہے جسے ان کے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خان نے ان کی وفات کے تین سال بعد یعنی ۱۴ / ذی قعد ۱۲۷۱ھ (مطابق ۱۸۵۵ء) مطبع سلطانی (لال قلعہ) سے شائع کر کے الفت و قرابت کا حق ادا کیا — کتابت و طباعت معمولی ہے — اس کے مندرجات (۱۹۰ صفحے) حسب ذیل ہین :— قصائد ٦
غزلین ۱۱٦
رباعیان ۱۷۱
تاریخین ۸۷ قطعات ۲

اس مجموعے کی تدوین حکیم احسن اللہ خان کے اصرار سے اس وقت ہوئی جب مومن مرض الموت مین گرفتار تھے اور ان کی امید زیست منقطع ہو چکی تھی — دیوان مین بعض ردیفین خالی تھین جنھین مومن نے اسی روح فرسا تکلیف کے زمانے مین ایک ایک دو دو غزلین کہہ کر پورا کیا — احسن اللہ خان کا بیان ہے کہ شکستہ ہاتھ کردن مین) حائل تھا اور زبان سخن سنجی مین مصروف تھی وہ بولتے تھے — دوسرے لکھتے جاتے تھے —[۱]

۲) انشائے مومن — مومن کے ان رقعات کا تقریظ اور تقاویم کا مجموعہ ہے جو انھون نے مختلف دوستون اور عزیزون کو بھیجے ہین — یہ فارسی مین ہین کہ ان دنون کا ذی علم اشخاص مراسلت کے لئے یہی زبان استعمال کرتے تھے — انہی مین بعض ایسے خطوط ہین جو دوسرے اشخاص نے اپنے متعلقین کو مومن سے لکھوائے ہین یعنی ان کے مطالب مومن نے اپنے قلم سے ادا کئے ہین — یہ مجموعہ بھی مطبع سلطانی سے باہتمام احسن اللہ خان ۱۸۵۵ء (رمضان ۱۲۷۱ھ) مین شائع ہوا —

غالب کے خطوط کی طرح ان رقعات سے مومن کے ذاتی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے — ان کی معاش — تاہل سفر اور بہت سی دوسری معلومات کا ذریعہ یہی خطوط ہین جس کے اقتباسات

۱ — دیباچہ دیوان مومن فارسی از حکیم احسن اللہ خان ص ۲

اور حوالے اس مقالے کے دوسرے باب مین آئے ہین ۔ ان کی زبان اس عہد کے دستور کے مطابق آراستہ اور مقفی ہے ۔ انشاء کے صفحات ۲۵٦ ہین ۔ اس مین تین باب ہین ۔ پہلے باب مین جو ۴۲ رقعات پر مشتمل ہے اکثر خطوط ایسے ہین جو مومن نے اپنے خاص دوستون اور عزیزون کو لکھے ہین ۔ ان مین سے بعض رقعے آٹھ آٹھ دس دس صفحات کے ہین ۔ حکیم احسن اللہ خان کے نام کئی خط ہین جن سے الفت و یگانگت کی خوشبو آتی ہے ۔ دوسرے باب مین ۴۴ خطوط ہین ۔ جن مین سے بعض اتنے مختصر ہین کہ تین سطرون ہی مین ختم ہوگئے ہین ان مین سے ایک خط منظوم بھی ہے ۔ تیسرا باب ایک خطبے، ایک تقریظ اور چار تقویمون کے دیباچون پر مشتمل ہے ۔ یہ تقویمین حکیم احسن اللہ خان کے نام ہین [۱] اور ان مین از روئے نجوم ان واقعات کی پیش گوئیان ہین جو ۱۲۴۸ھ ۱۲۴۹ھ ۱۲۵۰ھ اور ۱۲۵۲ھ مین سرزمین ہند مین رونما ہونے والے تھے ۔ ان مین کوئی تقویم مرزا غالب کے نام نہین حالانکہ ان کے مکاتیب سے ثابت ہے کہ مومن انھین بھی زائچے وغیرہ تیار کر کے بھیجا کرتے تھے ۔

اکثر اشخاص کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ سب خطوط مومن نے اپنے احبّا کو لکھے ہین حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان مین کافی تعداد ان رقعات کی بھی ہے جو مومن نے دوسرون کی فرمائش سے ان کے عزیزون کو تحریر کئے [۲] ۔ کلب علی خان فائق کو " بہ فرزند دلبند " " بہ دختر عزیزم " سے جو مغالطے ہوئے ہین وہ اسی نوع کے ہین ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط کا مضمون ژولیدہ ہے اور مکتوب الیہ کا نام اکثر محذوف ہے ۔ اس لئے غلط فہمی کا امکان بہرحال ہے ۔

۱۔ انشائے مومن ص ۲۰۹ و ۲۱۴ و ۲۲۲

۲۔ مثلاً انشائے مومن ص ۱۲۰ ص ۱۵۹ و ص ۱۳۸

عرش نے سید حامد حسین — بونڈری آفیسر ریاست دتیہ (نبیرہ سید منور علی آشفتہ شاگرد مومن) کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض مومن کے فارسی رقعات الور کے ریاستی کتبخانہ میں موجود ہیں — لیکن عرش کے پیہم اصرار کے باوجود موصوف ان خطوط تک رسائی حاصل نہ کرسکے [۱] — ۱۹۴۸ء میں مولانا غلام رسول مہر کی تحریک سے ابوالکلام آزاد نے بھی الور اور ٹونک کے کتب خانوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی [۲] لیکن جیسا کہ اس مقالے کے پیش لفظ میں بیان ہوا یہ سعی مشکور نہ ہوسکی —

مذکورۂ بالا تصانیف کے علاوہ عرش نے حسب ذیل تالیفات کا بھی ذکر کیا ہے — [۳] جن کا سردست کوئی سراغ نہیں ملتا:—

۱— <u>جان عروض</u> — علم عروض پر ایک رسالہ تھا جسے نواب اصغر علی خان نسیم استاد کی یادگار سمجھ کر بڑی حفاظت سے رکھتے تھے —

۲ — <u>خواص پان</u> — ایک مختصر رسالہ تھا —

۳— <u>شرح سدیدی ونفیسی</u> — طب کی دو مستند کتابوں کی شرح تھی جسے مومن نے قیام سہسوان کے زمانہ میں (۱۲۳۶ھ) حکیم مظہر علی صاحب کے ایماء سے لکھا تھا کہ اس بیکاری و فراغت کے دور میں یہی شغل بہتر تھا —

۱— عرش — حیات مومن ص ۴۲

۲— مکتوب مولینا غلام رسول مہر مورخہ ۱۶ / جنوری ۶۱ء

۳— حیات مومن ص ۶۹

چوتھا باب

مومن کی روایت

دنیا میں تفتیش وسراغ کی جتنی انواع ہیں ان میں یہ نوع سب سے دلچسپ ہے کہ کسی فن کار کی روایت فن کا سراغ لگایا جائے اور اس نے اپنی تخلیقات میں جن اساتذہ کی روش کو مد نظر رکھا ہے یا اس کے متبعین نے جس طرح اس کی قائم کردہ روایت کا اتباع کیا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے۔

مومن کے دوسرے حالات زندگی کی طرح ہمیں ان کے تعلّم اور حدود مطالعہ کا علم بھی بہت کم ہے۔ ان کے مزاج میں بے پروائی وآزادہ روی اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے اپنے مکاتیب تک میں (جہاں بالعموم کاتب و مکتوب الیہ کے درمیان یگانگت و بے تکلفی ہوتی ہے) اپنے حدود مطالعہ کا ذکر نہیں کیا۔ معاصرانہ تذکرے بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ شیفتہ نے کچھ نہیں لکھا۔ کریم الدین اتنا لکھ کر رہ جاتے ہیں کہ فارسی میں "استعداد کامل" ہے اور عربی میں "شرح ملا" تک پڑھا ہے۔[۱] دوسرے تذکرہ نویس مثلاً نساخ[۲] علی حسن[۳] نور الحسن قادر بخش صابر صفیر بلگرامی[۴] اتنا بھی نہیں لکھتے بہ این ہمہ ان کی ذہانت اور بے مثال قوت آخذہ اور حافظہ کے پیش نظر یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ انھیں عربی و فارسی کے ائمہ ادب اور اساتید شعرا کے کلام پر عبور تھا۔

ع ناطقی و جر بر عار ہے مجھ کو ہمسری

یا

ع میرے در کا گدا ہے خاقانی

ان مصرعوں میں گو کچھ مبالغہ سہی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عربی اور فارسی ادب کا

۱؎ طبقات الشعراء ص ۲۲۳ (۲) سخن شعراء ص ۴۶۲ (۳) بزم سخن ص ۱۰۶ (۴) جلوۂ خضر ص ۲۰

بہترین حصہ ان کی نظر مین تھا - عربی کے ائمہ بلاغت نے اسلوب بیان کے جتنے طریقے وضع کئے ہین مومن ان سے واقف تھے اور ان تمام چیزون نے مل کر ان کے کلام مین مختلف محاسن جمع کر دئے تھے جن کی بحث سابقہ باب مین گزری -

اس نظریے کی مزید تائید یون ہوتی ہے کہ ان کا کلام عرب اور ایران کے مستند اساتذہ کے کلام کے ساتھ شرکت مضمون ومعنی رکھتا ہے - مومن کی معاملہ بندی کا خاص جوہر عفت ومتانت ہے - یہی وہ وصف ہے جو انھین اردو کے دوسرے معاملہ بند شعراء مثلاً جرات یا داغ سے متمیز کرتا ہے - یقین سے نہین کہہ سکتے تاہم قرینہ پایا جاتا ہے کہ مومن نے یہ متانت اور احترام معشوق عربی شعراء سے سیکھا ہے جن کے ہان معاملات کا بیان (امراء القیس اور ابونواس کے بعض اشعار سے قطع نظر) عفت وتہذیب کے ساتھ ہوا ہے - حسن و عشق کے معاملات تقریباً ہر جگہ یکسان ہین تاہم عرب عاشق ہر مقام پر غیرت وحیا کا اظہار کرتا ہے - مومن کے چند اشعار پڑھیے جو عربی اساتذہ کے کلام سے مشابہت اور اشتراک مضمون رکھتے ہین -

وانی لاستحییک حتی کانما   علی بظہر الغیب منک رقیب

(مین تجھ سے خود اتنی شرم کرتا ہون کہ گویا نگہبان میری نگہبانی کر رہے ہین)

مومن   ان سے پرّاش کو نہ دیکھے کوئی   مجھ کو مری شرم نے نہ رسوا کیا

دیار اللواتی دارھنّ عزیزۃ

بھد القنا یحفظن لا با التمائم

(وہ ذی عزت خواتین ~~کو~~ جن کے گھر تک رسائی محال ہے کیونکہ ان کے گھرون کی حفاظت تعویذ گنڈون سے نہین بلکہ گندم گون نیزون سے کی جاتی ہے)

مومن　　پہنچے جون ہی القصہ گھر اس کے　　　ہوش گم ہوا ز بہر اس کے

دیکھے نگہبان چشم سے بہتر　　　آنکھ سے ٹپکے خون کبوتر

(مثنوی چہارم)

عرب شعراء نے رات کی تاریکی میں نگہبانوں کی نظر سے بچ بچ کر معشوقہ سے ملنے کی تفاصیل قلمبند کی ہیں ۔ محبوبہ کے خیمے تک پہنچنے کی تمنا یا اس کے قبیلے کے ہمراہ اپنے قبیلے کے خیموں کا برپا ہونا ان کے لئے بہت بڑی وجہ تسکین بن جاتا تھا ۔ ایک شاعر کمال بیتابی سے اپنی تمنا کا بیان کرتا ہے کہ وہ وقت کتنا مبارک ہوگا ۔

اذا دنت الخیام من الخیام

امراء القیس اپنے مشہور لامیہ قصیدے میں کہتا ہے ۔

سموت الیہا بعد ما نام اہلہا　　　سمو حباب الماء حالاً علی حال

(جب محبوبہ کے قبیلہ والے سو گئے تو میں اس کی طرف اس طرح چلا جیسے پانی پر حباب ابھرتا ڈوبتا چلا جاتا ہے)

مومن کو اپنی حیات معاشقہ میں یہ منزل کئی بار پیش آئی تھی ۔ ایک مثنوی میں آدھی رات کے وقت محبوبہ سے ملنے کے لئے جانے کا نقشہ یوں کھینچا ہے

غور تثلیث چشم کوکب میں　　　آرزوئے وصل کی دل شب میں

انتظار سواد روز گزار　　　سرمۂ چشم آرزو شب تار

نیم شب جب ہوئی عنان کش دل　　　جانب منزل مہ کامل

ہوئے آنکھوں سے ڈرتے ~~[illegible]~~ ڈرتے ہوئے　　　لغزش پا تھی جنبش مژگان

تیرہ بختی نے کیا ڈرایا تھا　　　سایہ اپنا پری کا سایہ تھا

محبوب کے ساتھ ناچاقی اور اختلاف و افتراق کے معاملے میں بھی مومن کے ہاں قریب قریب وہی انداز رکھتے ہیں جو بعض عربی شعراء کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف میں بھی وہی حزم وہی قنوطیت اور وہی رکھ رکھاؤ ہے جو عربی عاشق کا خاصہ ہے:۔

فقل لخیال الحنظلیة ینقلب　　　　الیہا فانی واصل حبل من وصل

حنظلیہ (معشوقہ) کے خیال سے کہہ دو کہ پلٹ جا کیونکہ میں صرف اس سے ملا کرتا ہوں جو مجھ سے ملنا پسند کرے۔

عرب عاشق کی یہ خودداری ابن قدامہ کی نظر میں اگرچہ نامحمود ہے لیکن غیرت مندی اور حمیت کے عین مطابق ہے۔ ایرانی شعراء کے برعکس جو اپنے آپ کو "سگ محبوب" کہتے ہوئے نہیں شرماتے[۱] مومن حمیت و خودداری کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہیں اور اگر کہیں محبوبہ سے بات بگڑ جاتی ہے تو دامن جھٹک کر اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں اور مثنویوں میں ایسے مقامات بہ کثرت ہیں ؎

بتخانۂ چین ہو کو ترا گھر　　　　مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

جوں قبلہ نما اگرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر　　　　پر منہ سوئے دیر صنم آرا نہ کرینگے

رکھ لیوین کے پتھر مگر ان سنگدلوں کو　　　　چھاتی سے لگا لینے کی تمنا نہ کرینگے

فارسی کے جن اساتذہ کا ان پر اثر پڑا اور جن سے انھوں نے تازہ عشق و دل سوختگی کے آداب سیکھ کر اپنی غزلیں شخصی آہنگ پیدا کیا [نظیری] وحشی ~~یزدی~~ [یزدی] ہیں ۔ ولی دشت بیاض اور علی قلی میلی ہیں[۲] ان استادوں کے کلام میں جو سوز و گداز اور ایک "مخصوص ذاتی آہنگ" ہے اس کا اندازہ اہل نظر بخوبی کر سکتے ہیں ۔ انداز بیان کی راہیں فغانی نے دسویں صدی ہجری میں

۱۔ شنیدہ ام کہ سگان را قلادہ می بندی　　　　چرا بگردن حافظ نمی نہی رسنے

۲۔ داخلی شواہد کے علاوہ خارجی ثبوت یہ ہے کہ مومن نے انکی غزلوں کو تضمین کیا ہے اور واسوخت میں انکا تتبع کیا ہے۔

نکالین اور بات کو ذرا پیچ دے کر کہنا سکھایا ۔ وحشی اور میلی کو فارسی ادب مین بلند مقام حاصل نہین لیکن قلبی واردات پر سوز وگداز اور پرشتگی کا نمله جیسا ان دونون سے چھوٹا ہے اس کا جواب نہین ۔ فغانی[۱] پہلے فن کا امام ہے اور غزل مین اس کا ایک مخصوص مکتب نگارش ہے جس کا تتبع متاخرین نے کیا ہے ۔ مومن ان سب سے متاثر ہے ۔ انداز بیان کی مشابہت اور اخذ واستفادہ کی بین مثالون کے علاوہ مومن نے ان کی غزلون کی تضمین بھی کی ہے جس سے ان کی فکری زنجیر کی کڑیان نظر کے سامنے آجاتی ہین ۔

مومن نے مذکورہ بالا اساتذہ سے بہت کچھ سیکھا ہے ۔ لیکن انھون نے سب سے زیادہ اخذ واستفادہ جس شخص سے کیا اور جس کی بے مثال طرز نگارش ان کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے وہ عرفی کی ہمہ گیر ۔ عفیف اور عظیم شخصیت ہے ۔ وہ اپنے زمانے مین بھی سر شعراء تھا اور متاخرین مین بھی غالب جیسی نادرہ روزگار ہستی نے اس کا تتبع کیا ہے ۔ مومن اسی عرفی کا معنوی فرزند ہے جسے اس کے ترکۂ فن کا بڑا حصہ میراث مین ملا ۔ خارجی شواہد (تضا مین[۱]) سے قطع نظر ان کے فارسی دیوان اور اردو کلیات سے عرفی پرستی کا ثبوت ہم قدم قدم پر ملتا ہے ۔ یہ اندازہ بہت آسان ہے کہ مومن کا ذہنی ہیولی اسی عظیم استاد کے سانچے مین ڈھلا تھا ۔ ان مین عرفی کا سا فلسفہ نہین ۔ کائنات کے ہر ذرے مین در آنے والی بصیرت نہین ۔ اتنی غم پرستی ۔ عفت اور مذہبیت بھی نہین ۔ لیکن مومن نے عرفی سے جو کچھ حاصل کیا وہ کیا کم ہے ۔ وہ تہ دار انداز بیان ۔ وہ رعنائی خیال اور وہ برجستگی جو ان کے مخصوص اوصاف مین عرفی ہی سے حاصل کردہ ہین ۔ برجستہ تراکیب سے مختصر الفا مین وسیع مفہوم ادا کر دینا ۔ استعارے کے ذریعے ابلاغ واظہار کی راہین نکال لینا اور

۱ـ کلیات مومن ـ اور تضا مین

معاملہ بندی کے بستر عیش پر عفت ومتانت کی نفیس و لطیف چادر ڈال دینا انھون نے عرفی
ہی سے سیکھا ہے ۔ مومن اس کی اداؤن کے اتنے پرستار ہین کہ " انا و لا غیری " کا نعرہ بجانے
اور ہر استاد کی شاگردی کا انکار کرنے کے باوجود[١] انھون نے اپنے تمام فارسی قصیدے عرفی
ہی کی زمینون مین کہے ہین ۔ عرفی کی غزلون کو تضمین کرنا ، اختراع تراکیب مین
پورے پورے مصرعے صرف کر دینا ، استعارے مین وہی نزاکتین ہونا ، یہ سب اس بات کا
واضح ثبوت ہین کہ لذت کوشی کے باوجود ان کی "ذہنی بیعت" کا سلسلہ عرفی کے ساتھ
استوار ہے ۔

اردو مین وہ غالبا" کسی حد تک میر سے متاثر ہین ۔ مثنویون مین غزل کا پیوند لگانا
بھی انھون نے میر ہی سے سیکھا ہے ۔ بعض غزلون اور مثنویون کے اشعار میر کے ساتھ متحد
المضمون بلکہ متحد اللفظ ہین ۔

ع صفحہ جیحون پر جو کبھو ہم سوزش دل لکھواتے ہین ۔

اس غزل کے بیشتر اشعار مین میر کی سپردگی کا نقش نظر آتا ہے ۔ اب پر شاہ نصیر کی شاگردی کی تہمت
بھی ہے اور اگرچہ یہ نسبت چندان قوی نہین تاہم اس سے بالکل قطع نظر کر لینا بھی زیبا
نہین ۔ سب سے زیادہ تاثر انھون نے ایک زمانے مین ناسخ سے لیا تھا ۔ انیسوین صدی کے
عشرہ ثالث مین ناسخ کا رنگ ایسا مقبول ہوا کہ غالب جیسے آزادہ رو بھی نہ صرف غزل کی
ظاہری ہیئت مین[٢] بلکہ انداز کلام مین ان کی تقلید کرنے لگے ۔ " غیر مقلد " ہونے کے

١ـ بجز خالق عقول و نفوس بہ تعلم دیگرے نیاز ندیم نیست ۔ انشا ص ٢٢٦ (٢) مرا سینہ ہے مشرق
آفتاب داغ ہجران کا ۔ غالب نے اس زمین مین غزل لکھی ہے اور مومن نے ناسخ کی اس غزل کو
تضمین کیا ہے ۔ تضمین کا مخمس مروجہ کلیات مومن مین نہین ملتا ۔ مطبع ہاشمی والے نسخے
مین ہے ۔

باوجود مومن بھی کچھ عرصہ اس " احاطہ " لفظ وقافیہ " اورخیال بندی کے چکر مین پھنسے رھے — ایک غزل پر اکتفا کرنے کے بجائے دوغزلہ " سہ غزلہ کہنا اورحتی الامکان تمام قافیون کو نظم کرنے کا شوق ناسخ کی تقلید کا نتیجہ ھے — مندرجہ ذیل مطلعون والی غزلین اس رجحان کی گواہ ھین ؎

لے اڑی لاشہ ھوا لاغر زبس تن ھوگیا ذرۂ ریگ بیابان اپنا مدفن ھوگیا

سوز دل کے ساتھ سے ڈھونڈھون جو دامنِ آب مین
ھووے ھر ھر قطرہ داغ افزائے گلخن آب مین

ان تمام باتون کے باوجود ان کا انداز فکر و بیان ان سب اساتذہ سے مختلف تھا چنانچہ وہ ان سب رھبرون کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دور چل کر جدا ھوگئے جس کا اشارہ عرش گیاوی نے کیا ھے [۱] جبلی عاشق مزاجی ، لذت کوشی اور یکسانروی نے ان کے کلام کو ایک خاص انداز بخشا جس مین خلوص جذبات ، وقوعہ گوئی ، تہ داری اور ذاتی آھنگ کو خاص مقا م حاصل ھے — ان کے استعداد نفس نے (جو کہین کہین غرور کی حد تک پہنچ گیا ھے) انھین اختراع تراکیب اور اظہار و ابلاغ کے راستے دکھائے — نوجوانی کی شوالہید کی الفت نے ان کے اشعار مین شوخی کا عنصر شامل کیا جس سے کہین کہین یقین کی شوریدہ مزاجی کا پرتو پڑتا دکھائی دیتا ھے [۲] مختلف معاشقون مین ناکامی سے ان کے دل مین سوز وگداز پیدا ھوا — غرض ان تمام اسباب نے مومن کی غزل مین وہ اصناف جمع کر دئے جن مین مخصوص شخصی آھنگ اور خلوص جذبات کا مقا م نمایاں ھے —

مقالۂ ھذا کے دوسرے باب مین مومن کے ذاتی حالات کے بہ سلسلہ ان کی حیات معاشقہ بیان ھوچکی ھے — ان معاشقون مین تیز زبان بازاری سے داد و دھد کے معاملات مین وہ اپنے

[۱] حیات مومن صفحہ ۵۵ (۲) اس کی ایک مثال یہ غزل ھے :—

سیماب ھے پہلو مین مرے دل تو نہین یہ غارت کیا اس نے مجھے غارت ھو کہین یہ

دوستوں اور خاص شاگردوں سے پردہ نہ رکھتے تھے۔ شیفتہ، وحشت، عظمت، شیدا وغیرہ ان کے محرم راز تھے۔ تسکین اور عبدالرحمن آہی ان کے مونس وغمگسار اور ہمراز کے واقف تھے بعض حسینان شہر کی محفلوں میں مومن انھیں ساتھ لے کر شریک بھی ہوئے ہوں گے۔ غلام ضامن کرم ان کی دوسری شادی (دختر عظیم اللہ بیگ کیدان ساکن سردھنہ) کے مجوز ومحرک تھے اور انھیں مومن کے مزاج میں جتنا درخور تھا اس کا اندازہ مومن کے فارسی رقعات سے ہو سکتا ہے[۱] ایسے شاگرد جنھیں تلمذ کے علاوہ ہم مذاقی، ہم مزاجی اور ہمرازی کی خصوصیات بھی حاصل ہوں اپنے استاد کے بہت اچھے مقلد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے ۹۲ شاگردوں[۲] میں ان کی فنی روایت کا صحیح وارث ایک بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس مومن کے تلامذہ کی تعداد کمتر ہے لیکن ان کی فنی روایت قائم رکھنے والے شاگرد متعدد ہیں جن میں شیفتہ، نسیم تسکین اور قلق کا نام ممتاز ہے۔ ان صاحبان کا کلام خود شہادت دیتا ہے کہ رنگین نگاری، معاملہ بندی اور تہ داری میں انھوں نے استاد کی روایت سے انحراف نہیں کیا۔ اس یکرنگی کا سبب وہ اتحاد مزاج ہے جو دبستان مومن میں استاد اور شاگردوں کے درمیان موجود تھا۔ عرش نے اسی بنا پر لکھا ہے اور بہت صحیح لکھا ہے کہ "مومن اپنی مے دوآتشہ میں پانی ملانا گناہ سمجھتے تھے" ۔ اور ان کی بحث میں صرف "آن مے کہ دہقان پرورد" کے طالب آتے تھے[۳]۔ اردو غزل کے مختلف مکاتب کو خوب دیکھ لیجیے۔ استاد و شاگرد میں یہ ہم رنگی اور ہم مزاجی جو دبستان مومن میں پائی جاتی ہے کہیں اور نظر نہیں آتی۔

ایک اور خصوصیت جو تلامذۂ مومن میں موجود ہے یہ ہے کہ انھیں اپنے استاد کے ساتھ صرف فن شعر میں تعلق نہ تھا بلکہ دوسرے روابط ومشاغل بھی اس رشتے کو مستحکم کرتے تھے۔

۱؎ انشائے مومن ص ۲۶ و ص ۵۲ (۲) ترتیب و شمار آفاق حسین صاحب نادرات غالب
۳؎ حیات مومن ص ۵۵

حکیم سکھا نند راقم شاعری حکمت اور رمل کے دلدادہ تھے (ظاہر ہے کہ مومن ان فنون کے جامع تھے) حکیم مولا بخش قلق شاعری اور حکمت دونوں سے بہرہ مند تھے۔ شیدا ۔ شورش عشمت وحشت وغیرہ فن شعر کے دوش بہ دوش رنگین مزاجی اور شاہد پرستی میں اپنے استاد کے رفیق تھے صاحب جی حکیم مومن خان کی شاگرد ہونے کے علاوہ علاج معالجے اور مہر والفت کے رشتے میں بھی منسلک تھی ۔ شیفتہ حسن پرستی کے واسطے سے استاد کے ہم فن و ہم قدم تھے۔ اس کے علاوہ علوم معقول و منقول میں بھی ان کا پایہ مسلم ہے۔ مرزا فخرالدین تہور نواب محمد اکبر خان (شیفتہ کے بڑا برادر گرامی) نواب اصغر علی خان نسیم ۔ نواب عباس علی خان بیتاب ۔ مرزا قربان علی بیگ سالک وغیرہ جاگیردار طبقے کے افراد ہونے کے سبب ایک مخصوص ذہنیت کے حامل تھے۔ رام پور کے اکثر خوانیں سید احمد صاحب شہید کی تحریک جہاد و اصلاح کے حامی تھے۔ عبدالرحمن آہی تلمذ کے علاوہ مومن سے خویشی کی نسبت بھی رکھتے تھے۔ یہ عوامل بہت وقیع ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان سب چیزوں نے مل ملا کر اس تعلق کو بہت قوی کر دیا تھا جو عام طور پر استاد و شاگرد کے درمیان پایا جاتا ہے۔

مومن کی خصوصیات فن میں دو چیزیں بالخصوص ایسی ہیں جو ان کے شاگردوں کو نہایت عزیز تھیں ۔ ایک تو وہ رنگین معاملہ بندی جو عفت و تہذیب کا باریک نقاب پڑ جانے سے مومن کی خاص متاع سمجھی جاتی ہے ۔ دوسرے وہ " ذاتی آہنگ" جو شاعر کو دل کی بات کہنے پر راغب کرتا ہے اور سنے سنائے مفروضات الفت نظم کرنے پر مائل نہیں ہونے دیتا ۔ مومن کے شاگرد بالعموم ان دونوں خصوصیتوں کو قائم رکھتے ہیں ۔ جذبات کا رچاو نیز وہ تہ داری جس سے معانی و مطالب خود بخود پھوٹتے ہیں ان پر مستزاد ہے۔ ان سب کے علاوہ انداز بیان ، حذف و ایجاز ، جدت تراکیب ، غرض متعدد شیوے اور بھی ہیں جن کا دلفریب

جلوہ دلی کے شعر فہموں کو مومن کے سوائے اور کہیں بہت کم نظر آتا تھا ـ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے صاحب ذوق مومن کے تغزل کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے ـ اور دوسرے استادوں کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کے باوجود طرز مومن کے عاشق تھے ـ [۱]

انیسویں صدی کا معاشرہ بعض امور میں ہماری موجودہ سوسائٹی سے کافی مختلف تھا ان دنوں آداب واخلاق کے آئین میں استاد پرستی کو فرائض و واجبات کا درجہ حاصل تھا ـ شاگرد اپنے استاد کی خصوصیات کو قائم رکھنا فخر سمجھتا تھا ـ تلامذہ مومن مختلف وجوہ سے جن کا ذکر ہو چکا ہے اپنے استاد کے ساتھ بے حد وابستگی رکھتے تھے ـ اور اس کے مخصوص انداز کو فنی امانت سمجھتے تھے ـ شیفتہ ـ تسکین اور نسیم کا کلام پڑھتے ہوئے بار بار ذہن پر مومن کی دلفریب رنگین شخصیت کا عکس پڑتا محسوس ہوتا ہے ـ حکیم مولا بخش قلق اس رنگ میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ بقول حالی اکثر اشخاص مشاعروں میں ان کی غزل سن کر یہ دھوکا کھاتے تھے کہ وہ مومن سے لکھوا کر لائے ہیں ـ [۲] حقیقت یہ ہے کہ جب کسی استاد کی مخصوص صفات کا جلوہ شاگرد کے کلام میں اس درجے کو پہنچ جائے تو غلط فہمی حق بجانب ہے ـ ان حضرات کے دو دو چار چار شعر پڑھیے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ مومن کا مخصوص رنگ ان کے اشعار میں کیسا رچا ہوا ہے ـ تلامذہ مومن کے ذاتی حالات اور کلام کا مختصر انتخاب اگلی فصل میں درج ہے اور انہیں پڑھتے وقت ان تمام عواطف وعوامل کو نظر میں رکھنا مناسب ہوگا جو اس دائرہ فکر کے ارکان کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتے تھے ـ /

---

۱ ـ مثلاً " راقم الدولہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوق جن کا یہ مقطع مشہور ہے ـ
طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر ... سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

۲ ـ کلیات قلق ـ تقریظ حالی

شاگردان مومن

آشفتہ | سید منور علی آشفتہ — سادات بارھہ سے تھے — ولادت اور تعلیم و تربیت دھلی مین ھوئی — طب مین حکیم غلام حیدر خان (عم مومن) کے اور فن شعر مین مومن کے شاگرد تھے — کچھ عرصہ میرٹھ کی عدالت ضلع مین سررشتہ دار اور ڈگری نویس بھی رہے[۱] کلام مین مومن کے رنگ کی خفیف سی جھلک نظر آتی ھے —

بہت روئے تو اپنی جان کھوئی — کسی کا ہم نے بگڑا ولیا کیا

دیکھین آشفتہ ھمین مرکبھی راحت ھوگی — یا رھیگا یہ غم و رنج والم جان کیساتھ

کانٹا سا ھوگیا تھا مرا سوکھ کر بدن — واتمہ الجھ کے دامن قاتل مین رہ گیا

اکبر | محمد اکبر خان اکبر — مصطفی خان شیفتہ کے برادر اکبر تھے — دھلی میرٹھ اور راول پنڈی مین رھا کرتے تھے — راولپنڈی ھی کی خاک مین آسودہ ھین — سر سید احمد خان ان کی لیاقت اور سخن فہمی کے مداح تھے[۲] — کلام کا انداز یہ ھے :—

سوچئے حضرت ناصح کوئی تدبیر وصال — حیف چارہ نہ کرے آپ سا دانا دل کا

نہ تھا سارا جہان ~~بہت~~ دشمن سارا جہان پھونکا — جہان کو کس لئے اے نالہ آتش فشان پھونکا

آھی | عبدالرحمن خان آھی — خلف میر حسین تسکین — باپ بیٹے دونون مومن کے محرم راز اور ھمدم و دمساز تھے — آھی مومن کی بہن کے داماد بھی تھے — مومن سے بہت محبت و خلوص رکھتے تھے — مروجہ کلیات مومن مین جو تقریظ ان کی موجود ھے اس کے لفظ لفظ

۱— سخن شعراء ص ۲۹ — حیات مومن ص ۴۳

۲— حیات مومن ص ۶۸

سے مہر و محبت کی خوشبو آتی ہے۔ اپنے باپ کی طرح مومن کے مخصوص فن یعنی تغزل کے رچاو کا ورثہ پایا تھا۔[۱] فن معمّٰی اور شعر گوئی و شعر فہمی مین طاق تھے۔ دیوان طبع نہین ہوا۔[۲] دربار رام پور سے متعلق تھے۔ ۱۸۷۵ء کے قریب انتقال ہوا۔ کلام مختلف تذکرون مین موجود ہے۔ استاد کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر — شہر مین چاک کسی کا تو گریبان ہوتا

کھل گیا دروازہ جنت بھی اپنی گور مین — پر دل وحشی یہ کہتا ہے بیابان چاہیے

شکوہ کہان کا کیسا گلہ جی نکل گیا — شرما کے یار نے جونہی نیچی نگاہ کی

مژدہ اے ذوق تپیدن خلق مین ہے آج دھوم — زخم مین خنجر کو وہ اپنے چھپا کر لے گئے

سب کو خبر ہوئی مرے حال تباہ کی — اٹھ جائیے گی جہان سے اب رسم چاہ کی

دل لئے جاتی ہیں حورین نزع مین اے جمد مو — سامنے رکھنی مرے تصویر جانان چاہیئے

برق۔ قاضی نجم الدین برق ۔ سکندر آبادی خلف سراج الدین ۔ بچپین دہلی مین گزرا ۔ آگرہ اور الہ آباد مین امین عدالت رہے ۔ پنشن لینے کے بعد مراد آباد مین وکالت کرتے رہے اور ۱۸۹۹ء مین انتقال کیا ۔ دراز قامت ، شوخ طبع ، بذلہ سنج ، رنگ محفل آدمی تھے۔[۳] مومن کے علاوہ تسکین کو بھی کلام دکھاتے تھے۔ کلام مین چستی اور برجستگی نمایان ہے

گو غیر کی نگاہ ہے پر دیکھتے تو ہین — کیونکر کہین کہ آہ مین اپنی اثر نہین

وان دل مین یہ کہ بوسہ پا تک نہ دیجئے — یان شوق یہ کہ چوسئے انکی زبان تلک

حرم و دیر کے جھگڑے تو رے چھپنے سے ہوئے — تو اگر پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

۱۔ گلستان سخن ص ۱۳۰
۲۔ جلوہ خضر ص ۲۲۲
۳۔ خمخانہ جاوید جلد اول ص ۱۱۶
۴۔ حیات مومن ص ۷۵

بہت ہے مے کا قطرہ بھی جو دے ساقی محبت سے　　غنیمت ہے جو گزرے کوئی دم غفلت مین راحت سے

ترا قامت بنا کر صانع قدرت نے فرمایا　　کہ یہ فتنہ رہے گا دو قدم آگے قیامت سے

وہ بھی نہ رہا جوش محبت مین الہی　　پہلے جو مری آہ مین تھوڑا سا اثر تھا

بیتاب نواب عباس علی خان بیتاب بن نواب عبدالعلی خان — سلسلہ نسب نواب محمد سعید خان سے ملتا ہے — نواب یوسف علی خان ناظم کے نسبتی بھائی تھے — کئی برس دہلی مین رہے مومن سے مشورہ سخن کرتے تھے[۱] — مومن کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے چنانچہ اردوئے معلی مین اپنے دو جگہ انکا ذکر آیا ہے[۲] — ہنگامہ ۱۸۵۷ء مین بہادر شاہ ظفر سے رسم و راہ رکھی — بعد مین گورنر جنرل نے بطور شکایت نواب ناظم سے انکے متعلق باز پرس کی تھی جسے انھون نے بہ لطائف الحیل ٹال دیا — پاکیزہ سیرت — خوش اخلاق — خوش بیان آدمی تھے مومن نے ان کی شادی کتخدائی پر جو قطعہ لکھا ہے وہ دیوان فارسی مین موجود ہے ص ۱۲ کلام کا انداز یہ ہے —

اسی کافر کو سب کا حسن تو نے دیا یا رب　　مگر اب حضرت اللہ پیدا کوئی حسین ہوگا

بیتاب پی خدا نے دیے ہین تجھے بھی ہاتھ　　یہ خم ہے یہ سبو ہے یہ شیشہ یہ جام ہے

بیمار شیخ علی بخش بیمار سنبھلی — طور کلیم — بزم سخن اور خمخانہ جاوید مین انھین مصحفی کا شاگرد لکھا ہے — حسرت موہانی کی تحقیق ہے کہ وہ قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے — نیاز فتح پوری نے نظام شاہ نظام کے تذکرے مین انھین تلامذہ مومن مین شمار کیا ہے[۳] — بہر حال زبان ان

۱؎ بزم سخن ص ۲۲　　۲؎ اردوئے معلی ص ۲۳　نادرات غالب ص ۱۳۲
۳؎ نگار سالنامہ ۱۹۲۸ء ص ۷۷

بہت سلیس ہموار اور شستہ ہے ؎

کون پرسان حال بسمل کا | خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
لب جو کون سیر کو آیا | موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو بیمار | ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

تسکین: میر حسین تسکین دہلوی ـ مومن کے ہمدم و دمساز دوست اور عزیز شاگرد تھے ـ نسیم کی طرح انہوں نے بھی استاد کے مخصوص فن کا ورثہ پایا ہے ـ فارسی میں صہبائی کے اور اردو میں شاہ نصیر کے پھر مومن کے شاگرد ہوئے ـ نسیم اور قلق کی طرح استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ـ مومن کو بھی ان پر اتنا اعتماد تھا کہ اکثر شاگردوں کی اصلاح ان کے سپرد کر دی تھی ـ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے ـ پھر رامپور میں نواب یوسف علی خان ناظم نے از راہ قدر دانی نوکر رکھا ـ [۱] مختصر سا دیوان ۴۲ صفحے کا رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے ـ [۲] مومن سے چند ماہ پہلے ۱۲۶۸ھ میں بہ عمر ۱۵ سال انتقال ہوا ـ اسی سال نواب زین العابدین خان عارف بھی فوت ہوئے ـ

مصرع " ارم میں عارف و تسکین و مومن " سے تینوں باکمالوں کی تاریخ وفات نکلتی ہے ـ بقول عرش گیاوی تسکین نے مومن کی تقلید خوب کی ہے ـ [۳] مومن کا مخصوص انداز ان کے کلام میں ایسا رچ گیا ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز دشوار ہو جائیگی ـ

کیا مجنوں نکل صحرا کو یہ دیوانگی دیکھو | فضائے کوچہ لیلی کو اس نے تنگ ٹھہرایا
بیٹھے تسکین تھے روٹھ کر وہ شوخ | دے کے دو جھڑ کیاں اٹھا لایا
اب یہ حالت ہے کہ ان سا بے درد | میرے جینے کی دعا مانگے ہے
فتنہ محشر کا تھا سب کو گماں | تجھ کو پہچانا تری رفتار سے

---

۱ ؎ گل رعنا ص ۳۲۲ (۲) امداد صابری انجمن اسلامیہ میگزین کراچی مئی ۵۹ء ص ۱۸ (۳) حیات مومن ص ۴۲

۳ ؎ خمخانہ جاوید جلد دوم ص ۵۹

تسکین نے نام لے کے ترا وقت مرگ آہ | کیا جانیے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہین
اس سے بہتر تھا جو دوزخ مین ٹھکانا ہوتا | بزم دشمن مین ترے ساتھ نہ جانا ہوتا
خوبصورت نہ کوئی ہو تو نہ ہو بدنامی | سچ تو یہ ہے کہ برا ہوتا ہے اچھا ہونا
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے | کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

تہور مرزا غلام فخرالدین تہور۔ خاندان شاہی کے فرد اور مرزا قادر بخش صابر کے بھائی تھے۔ بزم سخن اور گلستان سخن[۱] مین ان کی قادر الکلامی کا ذکر ہے۔ حافظ عبدالرحمن خان احسان اور مومن دونون سے اصلاح لی ہے۔ ۱۸۲۸ء کے قریب عالم جوانی مین انتقال کیا۔

سنتے ہی نام غیر تہور بھی ہے عقب | اس جنگجو سے لڑنے کو تیار ہوگیا
لے آئے ذرا خط کا جواب اس سے کسی ڈھب | افسوس کہ قاصد سے اب اتنا نہین ہوتا
آیا نہ ترے کوچہ رندان کے مقابل | شہرہ ہی سنا کرتے تھے ہم دو دعدن کا
اب ہے کیا باقی جو ہے کاوش تری دست جنون | چاک داماں ہوگیا نکڑے گریبان ہوگیا
پھر خدا لائے اسے یاد ش بخیر | کیا تہور بے تکلف یار تھا

رضوان[۱] ممتاز علی بیگ رضوان ۔ نسبت شاگردی کے علاوہ استاد سے محبت کا مل کا رشتہ بھی رکھتے تھے۔ انھون نے رسالہ " عرب سرائے" سوسائٹی " ۱۸۷۲ء مین مومن کے حالات اور شاعری پر چار مضمون لکھے تھے جو اب نایاب ہین۔

سالک مرزا قربان علی بیگ ولد مرزا عالم بیگ ۔ اوزبک ترک تھے۔ والد دکن مین ملازم تھے ۔ سالک

۱۔ گلستان سخن ص ۱۸۲

کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی[1] ۵۷ھ کے ہنگامے میں آپ نے الور میں پناہ لی اور مہاراجہ شیودھیان سنگھ والی الور نے وکالت[2] کی خدمت عطا کی ۔ کچھ عرصہ بعد اپنے چچا رن بہادر خان کی ترغیب سے دکن میں ملازمت کی ۔ حیدرآباد میں ایک رسالہ مخزن الفوائد جاری کیا کچھ عرصہ محکمہ تعلیم میں سررشتہ دار بھی رہے۔

سالک نے پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا ۔ اول حکیم مومن خان سے اصلاح لیتے رہے اور قربان تخلص تھا ۔ پھر جب (مومن کے مرنے کے بعد) غالب سے تلمذ ہوا تو سالک تخلص اختیار کیا ۔ خوش مذاق ذکی اور شعر فہم تھے۔ مرزا غالب کے مرنے کے بعد مرزا کے کافی شاگرد ان سے ہی اصلاح لیتے تھے۔ لالہ سری رام صاحب خمخانہ جاوید لکھتے ہیں کہ سالک نے ۱۸۷۹ء میں وفات پائی ۔ لیکن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء تحریر کی ہے[3] فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ہنجار سالک اور میخانہ سالک دو دیوان طبع ہوئے تھے جواب کمیاب ہیں ۔

سالک جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے ۔ چھوٹی بحروں میں اچھے اشعار نکالتے تھے۔ کلام میں سادگی فصاحت معاملہ بندی اورسوز ہے۔

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی   بیوفا تو بھی اسے لے کے پشیمان ہوگا

ناچار ہوا وادی محشر کو روانہ   جس قتیل نے پایا نہیں رستہ مرے گھر کا

نئی یہ چھیڑ ہے صیاد کی حسرت بڑھانے کی   کہ پر توڑے ہوئے اور ذکر کچھ چھیڑا گلستان کا

یہ اور کون تھا جو تراشتہ جان نہ تھا

ال بعض ہے لکن تھی کوئی نوحہ خوان تھا

۱- سروروشن ص ۵۵۲ (۲) یعنی ریاست کی طرف سے سرکار انگلشیہ میں وکالت و نمائندگی کی خدمت انجمن اسلامیہ میگزین ص ۱۶ جون ۹ ھ بہادر شاہ ظفر ص ۲۷۸ (۳) دلی کا دبستان شاعری ص ۳۶۵

پسند اللہ کو کیا جانیے کیا آجائے اے زاہد | مجھے شرم کہ تجھ کو تکبر ہے عبادت کا

افروختم ز آتش دل شمع آہ را | در سینہ سوختم نفس صبحگاہ را

جانے دے اے تصور جانان نہ کر تلاش | ایسا نہ ہو کہ وہ کہین دشمن کے گھر ملے

کاش اے سپہر تجھ سے ہی رکھتے تو سہل تھین | وہ خواہشین کہ رکھتے ہین اس بیوفا سے ہم

سروش صاحبزادہ عبدالوھاب خان سروش — رام پور کے خاندان ریاست سے تھے۔ مومن کے مرنے کے بعد غالب سے رجوع کیا ۔[۱]

قتل عالم کو کیا ایک نظر مین تو نے | کون باقی ہے کہ شکار جو پرسان ہوگا

بزم سے تونے نہ اعدا کو نکالا ظالم | یہ بھی شاید کہ ہمارا کوئی ارمان ہوگا

سرکا و سر اپنا زانو پہ نہ رکھو | سو بھی رہو جاکر وہین جا کے ہو جہان رات

سکندر سکندر خان ساکن شاھجہان پور — تعلیم حاصل کرنے کے لئے چند سال دھلی مین رہے۔ پھر تکمیل کے لئے لکھنئو چلے گئے — دھلی کے قیام مین اردو شعر کہا کرتے تھے — ایک روز اس شعر پر اپنے استاد سے بحث کر بیٹھے اور ترک مشورہ کیا ۔[۲]

دم لینے مین ہے مجھ کو تو آئینے کا لحاظ | اور یار یہ سمجھتے مین مجھ مین ہی دم نہین

سجھو منشی غلام محمد عرف میاں سجھو — سورت بندر کے باشندہ تھے — ایک قصیدہ کہہ کر اکبر شاہ کی خدمت مین پیش کیا اور خلعت فاخرہ پایا — کچھ عرصہ دھلی رہ کر حیدرآباد

۱؎ نادرات غالب ص ۱۶۰ ۲؎ گلستان سخن ص ۲۷۵

دکن چلے گئے اور وہاں درباری شعراء میں شامل ہوگئے۔ پھر اپنے وطن چلے آئے اور ممتاز الملک نواب حسین نادر مومن خان والی بندر کھمبایت کی طرف سے انگریزی سرکار میں وکیل ہوئے۔[۲]

اکثر علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ لالہ سری رام ان کی اہلیت کے معترف ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "کلام کا رنگ اچھا۔ شعر کا ڈھنگ بالکل نیا تھا۔ مضمون آفرینی میں طاق اور خیال بندی میں شہرہ آفاق تھے۔ کلام میں مومن کا سا بانکپن اور وہی حسین انداز ہے جو غزل کو غزل بناتا ہے" ؎

جام مے میں ہے عکس چہرۂ یار　　　یا چراغ آفتاب میں روشن

آگئی یاد اگر گردش چشم ساقی　　　حشر میں قبر سے اٹھنا ہمیں مشکل ہوگا

آنکھوں میں شکل پھر گئی کس کی کہ مثل شمع　　　شعلے بھڑک کے اٹھے میرے تار نگاہ سے

نعت میں ایک مسمط بھی ان سے یادگار ہے۔ یہاں ایک بند لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

میمیہ تا ری پڑی جوں شانہ مو ہر بال میں　　　زلف خوباں کے پھنسا ہوں بیطرح جنجال میں

کان کے بالے کی مچھلی کی طرح ہوں جال میں　　　ہوں گرفتار بلا سودائے خط و خال میں

یا رسول اللہ پڑا ہوں کب تلک اس حال میں　　　آوں بازار مدینہ میں کچھ اب سودا کروں

(ماخوذ از بحر الفصاحت ص ۹۸)

<u>شورش</u>: غلام احمد ابن محمد اکبر قبالہ نویس۔ کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ شیفتہ سے کمال آشنائی تھی[۱]۔ مہاراجہ بنے سنگھ والی الور کے ملازم تھے۔ مرض استسقا میں بہ عمر ۵۲ سال[۲] انتقال ہوا ؎

۲؎ مخزن شعراء گجرات ص ۲۲ امداد صابری۔ (۲) خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۲۶۲

۱؎ گلشن بیخار ص ۱۱۳　　　۲؎ امداد صابری انجمن اسلامیہ میگزین جون ۱۹۵۰ء ص [illegible]

کھو رکھےگا مجھ کو میرا دیدۂ تر ایک دن ‏— شمع سان گھل جائیگا یہ جسم لاغر ایک دن

کیا قیامت ہے کہ روز حشر ہے شب روز ہجر ‏— تھا قیامت کے لئے یارب مقرر ایک دن

صبر اجودھیا پرشاد صبر دھلوی — قوم کے کایستھ تھے — اول اول شاہ نصیر سے پھر ان کے بعد مومن سے مشورہ سخن کرتے تھے[۲] — بعض اشعار مین مومن کی سی معاملہ بندی اور چستی نظر آتی ہے — بعض غزلین مومن کی زمینون مین کہی ہین جن مین تناسب الفاظ سے مضمون آفرینی کی ہے ؎

ہمین گمان کہ وہ آئے ہمارے قابو مین ‏— انھین یقین کہ مرے ہاتھ اک شکار آیا

دل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح ‏— تیرے نزدیک چھڑانا مگر آسان ہوگا

شیدا میر چھتو خان دھلوی — نواب مصطفی خان شیفتہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے اور بڑی والہانہ محبت رکھتے تھے — مومن سے تلمذ کا فیض اتنا ہے[۱] کہ کلام مین استاد کا رنگ صاف جھلکتا ہے — صاحب گلستان سخن ان کی شوخی ظرافت اور خوش مزاجی کی تعریف کرتے ہین[۲]

شیدا کا انتقال ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۲ء مین ہوا — بندش مین صفائی تھی اور زبان مین شستگی و سلاست — کلام مین فی الجملہ مومن کا انداز پایا جاتا ہے —

تیرے رخسار کو کس چیز سے دیجے تشبیہ ‏— گل مین یہ آب نہین شمع مین یہ تاب نہین

جان کو جائے یہ کب دل سے تپش جاتی ہے ‏— کشتۂ ناز ترا کشتۂ سیماب نہین

سیر عالم نظر آتی ہے ہمین مستی مین ‏— جام جمشید سے کم جام مئے ناب نہین

یہ امتحان ہے کیسا کہ وہ ستاتے ہین ‏— جو ایک بار عدو کو تو لاکھ بار مجھے

مگر عدو سے ہے وعدہ کہ خود بخود شیدا ‏— کچھ اضطراب مین ہین دل کے اضطراب سے ہم

---

[۳] عبدالمجید سالک — مسلم ثقافت ہندوستان مین ص ۲۸۲ ‏ [۱] سخن شعراء ص ۲۶۴

[۲] گلستان سخن ص ۲۸۱

نواب مصطفی خان شیفتہ

مومن کے شاگردوں کا تصور کرتے ہیں ، مصطفی خان شیفتہ کی شگفتہ ذی علم جامعزیب شخصیت نظر کے سامنے آجاتی ہے تو یہ یک وقت مومن کے شاگرد دوست اور محرم راز تھے اور جنہیں مومن کی حیات معاشقہ میں ایک ہمدم و دمساز کی حیثیت سے خاصہ دخل رہا ہے۔

شیفتہ کے والد عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضی خان بنگش تھے جو نواب محمد خان بنگش والی فرخ آباد کے ہم جد تھے[1] ۔ اور ہلکر اور لارڈ لیک کے محاربات میں خدمات شائستہ کے صلے میں انہیں ہوڈل اور پلول کے پرگنوں میں جاگیر ملی ۔ ان کے مرنے کے بعد یہ جاگیر ایسٹ انڈیا کمپنی نے واپس لے لی اور اس کے عوض بیس ہزار روپے سالانہ مقرر کر دیا ۔ جہانگیر آباد کا علاقہ جو ذاتی ملکیت تھا وہ بدستور رہا ۔ شیفتہ ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا ۔ اس کے باوجود شیفتہ نے شوق کے ساتھ تعلیم حاصل کی ۔ تجوید قرآن مولوی محمد ہاشم سے سیکھی ۔ علم ادب اور آداب محفل مولوی اکرام اللہ سے حاصل کیا ۔[2] علم حدیث مولانا نور محمد دہلوی شیخ سراج مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ سے تحصیل کیا ۔ غرض اکثر علوم متداولو سے اچھی طرح واقف تھے ۔[3]

بزرگان دین سے عقیدت کے علاوہ علماء فضلا اور باکمالان وقت کے ساتھ ایسی عزت سے پیش آتے تھے کہ اسے بھی ارادت و عقیدت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ فن شعر میں مومن خان ان کے استاد تھے ۔ شیفتہ کی محبت و مروت کی جتنی تعریف کیجیے کم ہے ۔ ان کے جیتے جی ہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کے اہل و عیال کے ساتھ قابل تعریف سلوک کیا اور اکثر دستگیری کرتے رہے ۔ مومن کی

۱ ۔ انجمن اسلامیہ میگزین جون ۹ ۔ مقالہ امداد صابری ۔ ۲ ۔ اکمل الاخبار ۶ / اکتوبر ۱۸۶۹ء
۳ ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء از انتظام اللہ شہابی ص ۶۲

وفات کے بعد غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ اور یہی حسن سلوک قائم رکھا۔ جن دنوں غالب قید فرنگ کے مصائب میں مبتلا ہوئے شیفتہ نے ہر مرحلے پر ساتھ دیا۔ حالانکہ یہ دور وہ تھا کہ مرزا کے اکثر عزیز اور خاندان لوہارو کے افراد مرزا سے آنکھ پھیر چکے تھے۔

" درجوانی چنانکہ افتد و دانی " شیفتہ بھی پرہیزگاری و اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے۔ آبائی جاہ و ثروت، جوانی کا ہیجان انگیز زمانہ اور بد راہ مصاحبوں کی ترغیب۔ حظ نفس اور عیش کوشی کی طرف راغب ہوئے۔ نارنول کی ایک طوائف نے جو ماہ طلعت[1] ہونے کے علاوہ ذہین و طباع بھی تھی ان کے خانۂ دل میں گھر بنا یا۔ یہ اس کی بادۂ الفت سے ایسے مخمور ہوئے کہ علم و فضل کے دامن کو شراب ناب کے دھبوں سے داغدار کر دیا۔ ۱۸۳۲ء میں جب تذکرہ گلشن بےخار تالیف ہوا ہے اس حسینہ کے عشق کا خمار اس قدر تھا کہ ڈیڑھ صفحہ اس کے بیان سے رنگین کیا ہے۔

با ایں ہمہ شیفتہ بہت جلد سنبھل گئے۔ عیاشی و مے نوشی سے توبہ کر کے نجابت و شرافت کا ثبوت دیا۔ ۳۲ سال کی عمر میں فریضۂ حج ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ دو حج کئے ۱۶/ فروری ۱۸۴۱ء کو اس مبارک و مسعود سفر سے واپس آئے۔

شیفتہ نے سفر حج کے حالات اپنے سفر نامہ " ترغیب السالک الی احسن المسالک " میں لکھے ہیں۔[2] جس کا فارسی نام " رہ آورد " ہے۔ اپنے استاد کے لئے مخمصلہ اور تحائف کے بیت اللہ کی خانہ پاک بھی لائے تھے۔ جس کا شکریہ مومن نے اس رباعی میں ادا کیا ہے[3]

یار آمدہ خوش ارمغان آوردہ است　　　　بہر دل مردہ ہدیہ جان آوردہ است

۱۔ تذکرہ نادری مستورات ص ۱۵۰
۲۔ سلطانہ دہلی دسمبر ۱۹۲۹ء بحوالہ انجمن اسلامیہ میگزین جون ۱۹۵۹ء
۳۔ دیوان فارسی مومن ص ۱۷۱

مانیم و بگرد حسرتی کردیدن | خانہ حر چند انگان آوردہ است

اردو مین شیفتہ اور فارسی مین حسرتی تخلص تھا ۔ دونون زبانون مین ایک ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔

۲۷ سال کی عمر تک مومن سے فیض حاصل کرتے رہے ۔ ان کے مرنے کے بعد غالب سے مشورہ کرنے لگے ۔ ان کا کلام دیکھ لو ۔ دونون استادون کا رنگ جا بجا ملتا ہے ۔ اگر مومن سے انھون نے سلاست، رنگین بیانی، بانکپن اور مشین معاملہ بندی سیکھی تو رعنائی خیال انتخاب الفاظ اور استحکام بیان غالب سے حاصل کیا ۔

ان کی غزلین بالعموم انتخاب اور سراسر ہموار ہین ۔ بعض اشعار ایسے ہین کہ صفائی و برجستگی مین کوئی کمان کے تیر کی طرح نشانے کے پار ہو کر اڑ رہے ہین ۔ بعض شعر ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکے ہین ۔ مختصر انتخاب بیجا نہ ہوگا ۔

کس لئے لطف کی باتین ہین پھر	کیا کوئی اور ستم یاد آیا
وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی	مین کیا کہون کہ رات مجھے کس کے گھر ملے
ہائے اس برق جہان سوز پہ آنا دل کا	سمجھے جو کوئی ہنگامہ جلانا دل کا
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ	اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
ابھی کہون تو کرین لوگ سر مسار مجھے	کہ کس کے وعدے پہ اتنا ہے اعتبار مجھے
جفا کو ترک کرو تم وفا کو مین چھوڑون	کچھ اعتبار تمہین ہو کچھ اعتبار مجھے
قفس مین کوئی ہے تحریک بال جنبانی	نوائے دلکش مرغان شاخسار مجھے
بڑے فساد اٹھین شیفتہ خدا نہ کرے	کہ ان کی بزم مین ہو دخل و اختیار مجھے
لب لعل کو کس کے جنبش ہوئی	ہوا مین ہے کچھ رنگ عتاب کا
محبت نہ ہرگز جتائیں گے	رہا ذکر گل اور ہر باب کا
نہ کیجو خطا پر نظر شیفتہ	کہ افساس شیوہ ہے احباب کا

بعض اشعار مین بلکہ پوری غزلون مین اس انفرادی واردات عشق کا بیان پایا جاتا ہے جیسے صرف ایک شخص

کی ذاتی سرگزشت شوق کہہ سکتے ہین اور جو انکے استاد حکیم مومن خان سے مخصوص ہے — یہ چیز جسے ہم کبھی مخصوص انداز تغزل سے بھی تعبیر کرتے ہین اور جس مین ایک خاص ذاتی شورش محسوس ہوتی ہے مومن اور شاگردان مومن تک محدود ہے — عرش گیاوی اپنے تذکرہ مین اسے " آن ہے کہ دہقان پرورد " سے تعبیر کرتے ہین — شیفتہ کے میخانۂ سخن مین اس شراب کی کمی نہین ہے

پسکہ آغاز محبت مین ہوا کام اپنا	پوچھتے ہین ملک الموت سے انجام اپنا
تپش دل کے سبب سے ہے مجھے خواہش مرگ	کون ہے جسکو نہ منظور ہو آرام اپنا
تاب بوسے کی کسے شیفتہ وہ دین بھی اگر	کر چکی کام یہان لذت دشنام اپنا

بعض غزلون مین مومن کے انداز بیان کا پورا رچاو تراکیب کی ندرت لہجے کی بے نیازی اور زبان کی صفائی اس کمال کو پہنچ گئی ہین کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے

یاد مین اس در دندان کی مواجاتا ہون	کار الماس مرے حق مین گہر کرتا ہے
ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دے گا	وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے
دیکھیے آہ ہماری بھی اثر کرتی ہے	سخن درد سنا ہے کہ اثر کرتا ہے
دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہین مگر مرغ چمن	آج کچھ نالہ بہ الحان دگر کرتا ہے

شاعرانہ خوبیون کے علاوہ جنکی مثالین بیان کی جا چکی ہین ۔ شیفتہ کی تنقیدی صلاحیت بھی قابل داد ہے [۱] گلشن بیخار مین انھون نے جس شاعر کے متعلق اپنے مختصر الفاظ مین جو رائے دی ہے وہ (بہ استثنائے بعض) قطعی جامع و مانع ہے — یہ تذکرہ سوا سو سال سے نقد و نظر کی راہ مین سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے — اگر چہ اس کا انداز تنقید قدیم رنگ کا ہے اور اس مین فن کا تجزیہ جو تنقید جدید کا خاصہ ہے نہین ملتا لیکن اس کا اختصار اور جامعیت داد کی مستحق ہے — اس مین مبالغہ کم ہے — یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء مین مکمل ہوا ہے اور اسکے مشمولہ اشعار سے ہمین مومن ، غالب ، ذوق اور دیگر اساتذہ کی ان غزلون کی تاریخی حد بندی مین مدد ملتی ہے جو ۱۸۳۲ء تک کہی گئی تھین — گلشن بیخار کی تکمیل پر غالب نے بھی دو شعر کا قطعۂ تاریخ بہ طرز تعمیر کہا ہے جو سبد باغ دودر مین درج ہے [۲] —

شعرگوئی مین شیفتہ کا جو مقام ہے اسکو تسلیم کرنیکے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ مومن کی طرح وہ

---

۱ — محمد یحیی مرآۃ الشعراء ص ۵۸۵

۲ — غالب — سبد باغ دودر ص ۱ — غالب کی یہ غیر مطبوعہ کتاب پروفیسر وزیر الحسن صاحب عابدی کی ملکیت ہے اور یہ دنیا مین واحد قلمی نسخہ ہے — اس مین غالب کا متفرق کلام (نثر و نظم) ہے —

بھی غزل مین عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کر جاتے ہین مثلاً "

ماسوی اللہ نہ رہے شیفتہ ہرگز دل مین   خسروی کاخ سزائے خس و خاشاک نہین

خواہان ہون بوئے باغ تنزہ شمیم کا   یارب ادھر بھی بھیج دے جھونکا نسیم کا

بہ این ہمہ مجموعی حیثیت سے وہ مومن کے بہترین شاگرد اور فن شعر مین دوسرے تمام شاگردون سے پیش پیش ہین ــ یہ اور بات ہے کہ مومن کے مخصوص فن کا ورثہ شیفتہ سے کچھ زیادہ نواب اصغر علیخان نسیم کو ملا اور انھی سے تسلیم و حسرت کے ذریعے مومن کی روایت چلی ــ

صاحب | امۃ الفاطمہ عرف صاحب جی ــ دہلی کے ایک ذی جاہ امیر کی لاداشتہ تھی ــ علاج کے بہ سلسلہ حکیم مومن خان سے رشتۂ الفت قائم ہوا ــ [۱] جسکی تفصیل دوسرے باب مین آچکی ہے ــ مثنوی قول غمین جسکا سوز و گداز دلون سے محو نہین ہوتا اسی مہر جمال کے فسانۂ الفت کی تفسیر ہے [۲] عرش گیاوی [۳] اور مولانا ابوالخیر کا بیان ہے کہ دہلی سے چلے جانے کے بعد یہ ماہ طلعت ایک بار پھر آئی تھی اور مومن سے مشورۂ سخن کرتی تھی ــ مرثیہ٭ معشوقہ٭ جو ر شیم والا ترکیب بند جس سے مومن کے مضطرب دل کی دھڑکن آج بھی محسوس ہوتی ہے اسی کی موت پر کہا گیا تھا ــ اشعار سے لذت کوشی اور رنگین مزاجی کا رس ٹپکتا ہے ــ

کھولے ہین اسنے پیرہن یوسفی کے بند   تہ کر رکھے نسیم سے کچھ و قبائے گل

گہ کیا صنم کے نظارے مین زاہد   خدائے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا

برا مانیے مت مرے دیکھنے سے   تمھین حق نے ایسا بنایا تو دیکھا

جو خط جبین کا مرے کاتب ہے اسی کو   دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الہی

صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا   یوسف سا غلام اسکا مجھے دے ڈال الہی

نظر ہے جانب اغیار دیکھئے کیا ہو   پھری ہے کچھ نظر یار دیکھئے کیا ہو

عظمت | پسر عظمت اللہ عظمت بریلوی ولد قدرت اللہ جذب ــ عاشق مزاج رنگین طبع آدمی تھے اور اس نسبت سے مومن کو بہت عزیز تھے ــ چنانچہ ایک مثنوی مین نیز ایک فارسی رقعے مین مومن نے ان سے اظہار الفت و خلوص کیا ہے اور انھین " سر افراز سخن " کہا ہے ــ لیکن یہ سب محبت کی باتین ہین ــ کلام انکا استاد کی خصوصیات سے خالی ہے ــ

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ   کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہون

۱ــ عبدالحی جعفر شمیم سخن ص ۱۷۰   (۲) صفدر مرزاپوری حسن خیال ص ۸۹ ــ گلشن بیخار ص ۱۱۵

۳ــ حیات مومن ص ۷۵   (۴) انشائے مومن ص ۷۵ نیز کلیات مومن ص ۲۸۱

قلق حکیم مولا بخش قلق میرٹھی — بارہ سال کی عمر مین ۱۸۲۶ء کے قریب تحصیل علم کیلئے دہلی آئے —
فارسی کی تکمیل مولانا امام بخش صہبائی سے کی — طب مین حکیم غلام نقشبند خان کے شاگرد ہوئے
شعرگوئی کا میلان طبیعت مین تھا — اسکی تحصیل کیلئے حکیم مومن خان سے تلمذ اختیار کیا اور بہت جلد اس فن
مین کامیاب ہو گئے — جوانی کا زمانہ دہلی مین بسر کیا — ہنگامہ ۱۸۵۷ء مین یہان سے نکل کر وطن چلے گئے
اور باقی عمر وہین بسر کی — میرٹھ مین درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا — طبابت کا شغل بھی تھا — اور
انھی ذریعون سے معاش حاصل کرتے تھے — مزاج مین غیرت و قناعت بہت تھی — حیات مستعار کا باقی حصہ
گوشۂ عزلت مین بسر کرکے ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء مین دنیا سے رخصت ہوئے —[۱] ساری عمر کی کمائی ایک
کلیات اردو ہے جس مین تین سو کے قریب غزلین اور دیگر اصناف سخن ہین — اس کی ضخامت ۳۵۶ صفحات
ہے انکی وصیت کی تعمیل مین انکے بھائی بابو عبداللہ صاحب نے مطبع انصاری دہلی سے ۱۸۸۳ء مین شائع
کیا — اسمین مولانا حالی مولوی سید احمد صاحب دہلوی اور محوی کی تقاریظ مین [illegible] جن سے قلق کی
خصوصیات کلام پر روشنی پڑتی ہے —

حالی کا بیان ہے کہ وہ فن شعر مین اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلتے ہین — مومن کے عزیز شاگرد
تھے — مشاعرون مین پرانے اساتذہ کے مقابلے مین بڑی بیباکی سے غزل پڑھتے تھے — استاد کا انداز غزل مین اتنا
رچا ہوا ہوتا تھا کہ اکثر اشخاص دھوکا کھاتے تھے کہ یہ کلام قلق کا اپنا ہے یا مومن سے کہلا کر لائے ہین —[۲]

مولوی سید احمد صاحب بھی انکی نزاکت خیال شوخی بیان سلاست زبان معاملہ بندی متانت اور
صنائع کی تعریف کرتے ہین —[۳] مومن کا انداز انکے اشعار سے ظاہر ہے — بعض غزلین مومن کے تتبع مین کہی
ہین جن مین کہین کہین افتان خیزان استاد کی سطح تک پہنچ گئے ہین — اسمین کچھ شک نہین کہ
مومن کے مخصوص انداز مین وہ انکے بہترین شاگردون یعنی شیفتہ نسیم اور تسکین کے دوش بدوش ہین —
انداز تغزل کے علاوہ تراکیب کی ندرت معاملہ بندی بندش کی چستی نفسیاتی ژرف بینی اور فکر شاعرانہ مین
بھی وہ مومن کے کامیاب مقلد ہین —[۴] ذیل کے اشعار مین یہ رنگ نمایان ہے —

چراغ دور سے خورشید کو دکھاتے ہین	ہم اپنی شب کا تماشا سحر کو دیکھتے ہین
تری نوید مین ہر داستان کو سنتے ہین	تری امید مین ہر رہگذر کو دیکھتے ہین

---

۱ — محمد یحیی تنہا مرآۃ الشعراء ص ۵۶۳
۲ — کلیات قلق — تقریظ حالی
۳ — کلیات قلق — تقریظ از سید احمد
۴ — اختر منیر — رسالہ صحیفہ دسمبر ۱۹۵۸ء

خوشا وہ لوگ کہ دیر و حرم میں جا بیٹھے ۔۔۔ نہ ایک ہم کہ کشش میں تیرے در کو دیکھتے ہیں

ذیل کی غزل بھی مومن کی زمین میں ہے اور معاملہ بندی کی باریکی نیز لہجے کے سوز میں استاد کی غزل سے ٹکر کھاتی ہے ؎

زور آزمائی کرتے ہیں ناطاقتی سے ہم ۔۔۔ اپنے ہی بار دوش ہیں واماندگی سے ہم

تم ہو نہ اپنے بس میں نہ ہم اپنے ضبط میں ۔۔۔ مجبور تم ہو غیر سے ناچار جی سے ہم

ہے حرم کی جگہ جو کچھ انصاف دل میں ہو ۔۔۔ دامن ترا پکڑتے ہیں کس سادگی سے ہم

ڈالو بھی خاک غیر کی صورت پہ تم کہیں ۔۔۔ مر جائیں تاکہ رشک میں دب کر اسی سے

رستے میں عمر رفتہ کی چھوٹے کر قلق ۔۔۔ اب اپنے بار دوش ہیں واماندگی سے ہم

مومن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنسی معاملات پر متانت و عفت کا ہلکا سا پردہ ڈال دیتے ہیں جس سے عریان یا مکروہ پہلو چھپ جاتا اور ایک لطیف انداز باقی رہ جاتا ہے ۔ تہ داری جو حذف و ایجاز اور ایک مخصوص انداز بیان سے پیدا ہوتی ہے قلق کے کلام میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے ؎

کیا برا تھا وصل میں مرنا کسی انداز پر ؟ ۔۔۔ تھا مگر قسمت میں میری روز ہجران دیکھنا

تھے کعبے میں بھی اپنے ہی یاران روشناس ۔۔۔ تھا کون سا کہ راندۂ پیر مغان نہ تھا

کاظم کاظم علی کاظم ۔ مڈاوری ۔ غیر معروف آدمی ہیں لیکن ان کے بعض اشعار زبان زد ہیں ؎

اے طفل اشک ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں ۔۔۔ اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کر دے

کرم غلام ضامن کرم ۔ دہلی میں نشو و نما پائی ۔ مومن کے دلسوز اور ہمراز دوست تھے ۔ مومن کی دوسری شادی (عظیم اللہ بیگ کیدان کی دختر سے) انہی کے توسط سے ہوئی تھی ۔ انشائے مومن میں کئی طولانی خط انکے نام موجود ہیں ۔ آخر میں حیدر آباد جاکر ملازمت کر لی تھی ۔ مومن کے حین حیات ۱۲۶۵ھ میں بہ مقام پھویال فوت ہوئے ؎

سہو ہیں کے جو ر طاقت و تاب و توان تلک ۔۔۔ لیکن یہ پوچھتے ہیں تجھی سے کہاں تلک

ہاتھ ہووے گا مرا اور ترا دامان ہوگا ۔۔۔ چاک جب صبح قیامت کا گریبان ہوگا

نسیم اصغر علیخان ابن نواب آقا علی خان قاچار ۔ دہلی کے ایک ذی جاہ خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔

جب تک دھلی مین رہےہر ماہ محفل مشاعرہپڑے اہتمام سے منعقد کرتے رہے جس مین ان کے استاد حکیم مومن خان بھی آتے تھے — آزاد نےان مشاعرون مین مومن وارستہ مزاج کو" دردناک لہجے" مین غزل پڑھتےسنا ھے باپ کے مرنے کے بعد بھائیون سےناچاقی ھوگئی تو نسیم ترک وطن کر کےلکھنئو چلے گئے — وھان کچھ عرصہ مطبع نولکشور سے متعلق ھوکر الف لیلہ منظوم کرنے کی خدمت اپنے ذمے لی — ایک بار مطبعے کی طرف سے تقاضا ھوا تو یہ سلسلہ ھی ختم کر دیا — اسی طرح نواب محمد تقی خان افسر کے اصرار سے بوستان خیال کو نظم کرنا شروع کیا لیکن تمام نہ کر سکے[۱] — دیوان کافی ضخیم تھا لیکن وارستہ مزاجی کے ھاتھون اس طرح غارت ھوا کہ حسرت موھانی ھزار جستجو کے بعد صرف چارسو اشعار فراہم کر سکے[۲] ۱۲/ رمضان ۱۲۸۲ھ (۳/فروری ۱۸٦٦ء) کو انتقال ھوا — منشی مظفر علی خان اسیر نے تاریخ کہی ؎

شد بہ حوران ارم از چمن دھر نسیم (۱۲۸۲ھ)

نواب محمد تقی خان افسر نسیم کے شاگرد اور اکثر اخراجات کے کفیل تھے — انھون نے بیوہ کو حج کیلئے بھیج دیا ایک لڑکا تھا وہ بھی ساتھ گیا — حجاز کی خاک دامن گیر ہے دونو ن کو وھین رکھا —

نسیم کے کلام مین ان کے استاد کا سا بانکپن رنگین تغزل اور معنی آفرینی جابجا ملتی ھین — چست ترکیبین اور رنگینی خیال ان کے یہان بھی موجود ھین — انکے شاگرد ون مین عبداللہ خان مہر محمد تقی خان افسر اور منشی امیر اللہ تسلیم زیادہ مشہور ھین — موخر الذکر ھی سے مومن کی روایت تغزل قائم ھوئی — اشعار کا انتخاب درج ذیل ہے جس مین ان کے استاد کا رنگ صاف جھلکتا ھے ؎

نام مرا سنتے ھی شرما گئے — تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

حیا بڑھنے نہین دیتی ارادہ نوجوانی کا — اشارہ ھو کے رہ جاتا ھے ھم پر مہربانی کا

حاجت شمع نہ پروائے چراغ لحدی — پاک احسان سے مزار غریبا ھوتا ھے

اے نسیم چمن آرائے فصاحت تجھ سے — گلشن معنی نو خیز ھرا ھوتا ھے

آنکھون مین ھے لحاظ تبسم فزا ھین لب — شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ھین آپ

ھوتی نہین ھے کم مری ویرانہ دوستی — جاتا نہین ھے سر سے خیال وطن ھنوز

بوئی نے اک طرز بیتابی مرا سیکھا تو کیا — سیکڑو ن باتین ھین ایسی خاطر ناشاد مین

۱؎ حیات مومن ص ۷۰ — نواب محمد تقی خان نے باقی حصہ طوطا رام شایان سے لکھوایا —
۲؎ محمد یحیی تنہا — مرآۃ الشعراء ص ۵۵۷ گل رعنا ص ۲۸۹

وہ اپنے استاد کی طرح مختصر بحرون مین فصاحت کے جوہر زیادہ دکھاتے ہین ۔ یہان ان کی زبان کی سلاست پورے عروج پر نظر آتی ہے ؎

کسی صورت سے دل کو شاد کرنا	ہمین دشمن سمجھ کر یاد کرنا
جنازہ اٹھ چلے میرا تو تم بھی	ادا رسم مبارک بـــاد کرنا
ہاتھ مین خنجر کمر مین تیغ تیز	یہ ارادے ایک مشت خاک پر
سینے مین سے پھر کچھ آتی آواز	پھوٹا کوئی آبلـــہ جگر کا
جی ہی تو ہے کیا عجب بہل جائے	کچھ ذکر کرو ادھـــر ادھر کا
کہے دیتی ہین یہ نیچی نگاہـــین	کہ بالا تیز مین کیا کیا نہ ہوگا

نسیم کے کلام مین لکھنؤ اور دہلی کے رنگ کا دلکش امتزاج ہے ۔[۱] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے بقول لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کا حسن جس اعتدال کے ساتھ ان کے یہان ہے اورکہین نہین ملتا ۔[۲] وہ آتش و ناسخ کے شاگردون کے ہم عصر تھے اور وہان کی محفل شعر مین دہلی کے نام کو روشن کرتے تھے ۔ منشی امیراللہ تسلیم جو ان کے شاگردون مین نامور ہوئے نسیم کے مخصوص دہلوی انداز سے بہت متاثر تھے چنانچہ کہتے ہین ؎

ہم تو ہین تسلیم شاگرد نسیم دہلوی	ہم کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

وحشت | میرغلام علی خان وحشت ولد فرحت اللہ خان مرادآبادی ۔ بنارس اور مرزاپور مین تعلیم پائی ۔ کچھ عرصہ الور مین فوجدار رہے ۔ پھر لکھنؤ چلے گئے ۔ غدر کے بعد سر رشتہ تعلیم مین ملازمت کرلی[۳] ۔ مولوی رشید الدین خان کے داماد شیفتہ کے گہرے دوست عاشق مزاج رنگین طبع آدمی تھے[۴] مومن کے مرنے کے بعد غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے ۔ غالب نے ایک غزل مین ع

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہوین شاید

کی امید ظاہر کی تھی لیکن اتفاق کہ وحشت غالب سے پہلے ہی مرگئے ۔ ان کا کلام گواہی دیتا ہے کہ استاد (مومن) کا خمار محبت اور سوز الفت ان کے اشعار مین بھی ہے ؎

مرگیا وحشت جانباز تری جان سے دور	میرے مرنے کی خبر غیر کو یون دیتے ہین

---

۱ ؎ رام بابو سکسینہ ۔ تاریخ ادب اردو ص ۳۶۲ (۲) دلی کا دبستان شاعری ص ۲۶۲
۳ ؎ یادگار غالب ص ۱۲۸ ۴ ؎ گلشن بیخار ص ۲۳۲

اٹھائیے کو کسی نے پھر نہ میری آستین پکڑی — ہوئے نقش پا اس در پہ جب مین نے زمین پکڑی
تھکا ہے منزلون کا یا پیام یاس لاتا ہے — الہی خیر کیجیو نامہ بر کچھ سست آتا ہے

یاس — خیر الدین یاس دہلوی

وصل کی شب کا سمان ہے آنکھ مین چھایا ہوا — اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

ان تلامذہ کے علاوہ جن کا ذکر ہوا بعض تذکرون مین مختلف غیر معروف شاگردون کے نام بھی ملتے ہین — ان مین سے بعض صاحب دیوان بھی ہین لیکن بارگاہ شعر مین زیادہ روشناس نہین مثلاً " صفدر علی خان آشفتہ دہلوی — اصغر علیخان ولد عبداللہ خان رام پوری — عنایت علیخان رام پوری — خورشید احمد لکھنوی رامپوری حشمت علیخان موجد رام پوری — محمد بخش ثروت — عبدالواحد مسکین خیرآبادی — غریب اللہ غریب — سعادت علی خان راسخ دہلوی — مرزا محمود بیگ راحت دہلوی — میان جان صغیر دہلوی — مرزا خدابخش قیصر دہلوی ان کے علاوہ بعض ایسے اشخاص بھی ہین جو رسمی طور پر کسی اور کے شاگرد ہین لیکن ان کے انداز بیان اور طرز فکر کا سلسلہ مومن سے ملتا ہے — چنانچہ سید ظہیرالدین ظہیر دہلوی (راقم الدولہ) جو خطاطی مین ظفر کے استاد تھے اور بڑا ئے نام ذوق کے شاگردون مین شمار کئے جاتے ہین ۰ طرز مومن کے عاشق تھے اور ان کے انداز بلکہ ان کی زمینون مین غزلین کہہ کر مومن پرستی کا اعلان کرتے تھے — ذیل کے مقطعے اسی رجحان کے آئینہ دار ہین ؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر — سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا نباہی طرز مومن اے ظہیر — طاق ہین لاریب اپنے فن مین ہم

تتمہ

تلامذہ مومن کا بیان ہو چکا۔ یہ وہ لوگ تھے جو عرشی کے بقول " آن کہ دہقان پرورد" کے رسیا تھے – وہ لوگ رخصت ہوئے۔ اب معلوم نہیں موجودہ نسل اس رنگ تغزل کو قائم رکھنے کی سعی کرے گی یا نہیں جسے اب تک حسرت موہانی نے ایک مقدس امانت کی طرح اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا – پر امید اشخاص کا خیال ہے کہ غزل ولی سے میر تک اور میر سے مومن تک بلکہ حسرت تک گرم سفر رہی ہے۔ اس کا مستقبل اب بھی کافی تابناک ہے نیز یہ کہ اگر غزل تصوف تک آتی ہے تو سیاسیات و عمرانیات تک آنے میں کیا مضائقہ ہے۔ بعض صاحبان کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس تلاطم خیز – محشر بہ دامان زمانہ میں جب کہ کسی متنفس کو سکون نصیب نہیں غزل کا دھیما سوز کہاں سے آئے اور وہ شخصی آہنگ جو " دل گداختہ " کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا اس انتشار اور ہلچل کے دور میں کیسے ظاہر ہو۔ ہم مشینی دور میں جی رہے ہیں اور ہماری نئی نسلیں نفسیات اور انانیت کے نظریوں سے آگے بڑھنے والی ہیں – ہر حسّاس آدمی کائنات میں اپنا مقام پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے اور احساس خودی نے اسے سپردگی اطاعت اور غیر مشروط وفاداری سے بیگانہ کر دیا ہے۔[1] اس فضا میں غزل کی سپردگی خود فراموشی – سوز و گداز اور نرم لہجے کی توقع بے محل ہے۔ لہذا قصیدے کی طرح اب غزل کو بھی ماضی کے " حنوط خانے " میں بند کر دینا مناسب ہے۔

ان دونوں مواقف میں بنیادی صداقتیں موجود ہیں – یہ حقیقت ہے کہ اب ذہنوں میں وہ سکون اور سپردگی نہیں ہے جس سے میر یا مومن کام لے کر اپنا بے نظیر فن پیش کرتے تھے۔ اس کے باوجود یہ خیال بھی غلط ہے کہ غزل سراسر نابود ہو جائے گی – انسانی فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتی اور محبت کا نغمہ کسی نہ کسی صورت میں گونجتا ہی رہے گا – اس نغمے کی ہیئت تشکیل بدل سکتی ہے لیکن اس کا مطلق معدوم ہو جانا محال ہے ؎

حدیث بلبل و گل ہست تا چمن باقی است　　　نمی رود اثر حسن و عشق از عالم

۱ـ Drew: Describing Poetry, P. 86.

(الف)

مآخذ

۱ ابن رشیق — العمدہ مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۸ھ

۲ ابو اللیث صدیقی — غزل اور متغزلین

۳ اثر — نواب امداد امام — کاشف الحقائق مکتبۂ معین الادب

۴ اثر — مرزا جعفر علی خان — مزامیر

۵ اثر — میر اثر دہلوی — خواب و خیال

۶ اختر اورینوی — تنقید جدید

۷ ارسطو — بوطیقا — مترجمۂ عزیز احمد — انجمن ترقی اردو ہند

۸ آزاد — محمد حسین — آب حیات طبع شانزدہم — غلام علی اینڈ سنز

۹ آزاد — الیکزنڈر ہیدرلی — دیوان اردو — مقدمہ از طامس ہیدرلی

۱۰ آزردہ — مفتی صدر الدین — تذکرۂ شعراء

۱۱ اعجاز حسین — مختصر تاریخ ادب اردو طبع دوم ۱۹۵۳ء

۱۲ آفاق حسین — نادرات غالب

۱۳ افسر — حامد اللہ میرٹھی — تنقیدی اصول اور نظریے

۱۴ آل احمد سرور — نئے اور پرانے چراغ

۱۵ امداد صابری — حیات آشوب

۱۶ امیر احمد علوی — بہادر شاہ

۱۷ انتظام اللہ شہابی — ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

۱۸ باطن — قطب الدین — گلستان بے خزاں

۱۹ بدایونی — ملا عبدالقادر — منتخب التواریخ

۲۰ براؤن — ای — جی — تاریخ ادبیات ایران — جلد چہارم مترجمہ وہاج الدین احمد

۲۱ بشیر احمد — واقعات دار الحکومت

۲۲ بے جگر — تذکرۂ بے جگر

۲۳ تنہا — عبدالحی — سیر المصنفین

۲۳-ا تنہا — عبدالحی — مرآۃ الشعراء

۲۴ جلال الدین احمد جعفری — تاریخ مثنویات اردو

۲۵ حالی — الطاف حسین — مقدمہ شعر و شاعری ۱۹۲۵ء

۲۶ حالی — الطاف حسین — یادگار غالب — شیخ مبارک علی ۱۹۲۸ء

۲۷ حامد حسن قادری — داستان تاریخ اردو

۲۸ حسن نظامی — پرانی دہلی (ترجمہ سفرنامۂ درگاہ قلی خان)

۲۹ حسن نظامی — وداع ظفر

۳۰ خیال ــ نواب نصیر حسین ــ داستان اردو
۳۱ ذکاء اللہ خان ــ شمس العلماء تاریخ ہند جلد نہم
۳۲ راشد الخیری ــ دلی کی آخری بہار
۳۳ رسوا ــ مرزا محمد ہادی ــ امراؤ جان ادا ــ مکتبہ جدید
۳۴ زور ــ ڈاکٹر محی الدین ــ روح تنقید مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء
۳۵ سالک ــ عبدالمجید ــ مسلم ثقافت ہندوستان میں
۳۶ سردار علی ــ تذکرۂ یورپین شعراء اردو
۳۷ سرسید احمد خان ــ آثار الصنادید ــ نولکشور طبع سوم ۱۹۰۰ء
۳۸ سری رام ــ خمخانۂ جاوید
۳۹ سکسینہ ــ رام بابو ــ تاریخ ادب اردو مترجمہ عسکری نولکشور ۱۹۵۱ء
۴۰ سید محمد ــ ارباب نثر اردو
۴۱ شاہ اسمعیل شہید ــ تقویۃ الایمان
۴۲ شبلی نعمانی ــ شعر العجم جلد سوم شیخ مبارک علی ۱۹۲۷ء
۴۳ شیفتہ ــ گلشن بے خار ــ نولکشور ۱۹۲۵ء
۴۴ صابر ــ مرزا قادر بخش ــ گلستان سخن
۴۵ صدیق حسن ــ نواب ــ شمع انجمن مطبع شاہجہانی بھوپال
۴۶ صفا ــ عبدالحی ــ شمیم سخن
۴۶ الف صفدر ــ صفدر علی ــ بزم خیال
۴۷ عابد علی عابد ــ اصول انتقاد ادبیات مجلس ترقی ادب لاہور
۴۸ عبادت ــ بریلوی ــ مقدمہ کلیات اردو مومن ــ اردو مرکز ۱۹۵۵ء
۴۹ عبادت ــ بریلوی ــ تنقیدی تجزیے
۵۰ عبدالحق ــ ڈاکٹر ــ مرحوم دھلی کالج
۵۱ عبدالحی ــ گل رعنا ــ طبع چہارم ــ اعظم گڑھ
۵۲ عبدالرحمن ــ مرآۃ الشعر
۵۳ عبدالسلام ــ ندوی ــ شعرالہند ــ طبع دوم ــ اعظم گڑھ
۵۴ عبدالکریم ــ گلدستۂ نازنینان
۵۵ عبدالکریم ــ طبقات الشعراء ہند
۵۶ عبداللہ ــ ڈاکٹر سید ــ بحث و نظر
۵۷ عرش تیموری ــ قلعۂ معلی
۵۸ عرش ــ ضمیر الدین احمد ــ حیات مومن
۵۹ عزیز احمد ــ طربیہ خداوندی ترجمۂ ڈانٹے

٦٠ عزیز یار جنگ — غرائب الجمل

٦١ علی حسن — بزم سخن

٦٢ غالب — مرزا اسداللہ خان — اردوئے معلی

٦٣ غالب — مرزا اسداللہ خان — کلیات فارسی

٦٤ غلام حسین — سیرالمتاخرین — نولکشور ١٨٦٦ھ

٦٥ فراق — حکیم — ناصر نذیر — میخانۂ درد

٦٦ فراق — حکیم ناصر نذیر — لال قلعہ

٦٧ فرحت اللہ بیگ — مرزا — دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ

٦٨ فیض الدین — بزم آخر

٦٩ قدرت — مخزن شعراء گجرات

٧٠ قلق — حکیم مولا بخش — کلیات اردو مطبع انصاری دہلی

٧١ کلیم الدین احمد — اردو شاعری پر ایک نظر

٧٢ کیفی — برج موہن دتا تریہ — منشورات

٧٣ گارساں دی تاسی — خطبات مترجم — انجمن ترقی اردو

٧٤ لطف — مرزا علی — گلشن ہند

٧٥ مالک رام — ذکر غالب

٧٦ محمد اکرام — حکیم فرزانہ —

٧٧ مختار الدین احمد — آرزو — احوال غالب

٧٨ مسعود حسن رضوی — ہماری شاعری — نولکشور ١٩٢٢ھ

٧٩ مومن — حکیم محمد مومن خان — انشائے مومن مطبع سلطانی دہلی ١٢٧١ھ

٨٠ مومن — حکیم محمد مومن خان — دیوان فارسی وکلیات مطبع سلطانی دہلی ١٢٧١ھ

٨١ مہر — غلام رسول — سیرۃ سید احمد شہید

٨٢ مہر — غلام رسول — غالب — طبع چہارم ١٩٢٦ھ

٨٣ میر — میر تقی — ذکر میر

٨٤ نادری — تذکرۂ مستورات

٨٥ نذیر احمد — ابن الوقت

٨٦ نساخ — عبدالغفور — سخن شعراء

٨٧ نظامی — قاموس المشاہیر — نظامی پریس

٨٨ نعیم — فضل الرحمن — مومن خان مومن

٨٩ نورالحسن — نواب — طور کلیم

٩٠ نورالحسن ہاشمی — دلی کا دبستان شاعری

۱۱ نور محمد ۔ تحقیقات چشتی
۱۲ وزیر آغا ۔ اردو ادب میں طنز و مزاح
۱۳ وقار عظیم ۔ انتخاب مومن
۱۴ ہاشمی ۔ سید فرید آبادی ۔ تاریخ سلطانان پاکستان و بھارت
۱۵ یوسف حسین ۔ اردو غزل

مخطوطات

۱ مومن ۔ کلیات اردو مکتوبہ ۱۲۲۲ھ ۵۶ گ ۔ رضا لائبریری ۔ رامپور
۲ مومن ۔ کلیات اردو مکتوبہ ۱۸۵۹ء
۵۸ گ ۔ رضا لائبریری ۔ رامپور
۳ غالب ۔ سبد باغ دو در ۔ متفرقات نظم و نثر
مملوکہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی ۔ لاہور

دستاویزات

۱ کپتان سی ۔ ایم ویڈ ۔ پولیٹیکل اسسٹنٹ حکومت پنجاب کے مراسلات بنام ریزیڈنٹ دہلی ۱۸۳۰ء ۱۸۳۱ء مجموعہ ۱۸ (تحریک جہاد سید احمد شہید) آثار قومی ۔ حکومت پنجاب سول سیکریٹریٹ ۔ لاہور
۲ آثار قومی حکومت ہند ۔ نئی دہلی ۔ مخطوطات و اخبارات ۱۸۵۲ء

رسائل

۱ انجمن اسلامیہ میگزین کراچی ۔ مئی ۱۹۵۹ء جون ۱۹۵۹ء
۲ اورینٹل کالج میگزین ۔ نومبر ۱۹۵۹ء
۳ جامعہ ۔ مئی ۲۷ء
۴ صحیفہ ۔ دسمبر ۱۹۵۸ء
۵ علیگڑھ میگزین ۔ غالب نمبر
۶ نگار ۔ جون ۲۷ء
۷ نگار ۔ سالنامہ ۲۸ء ۔ مومن نمبر
۸ نگار ۔ اپریل ۱۹۵۳ء
۹ نگار ۔ سالنامہ ۶۰ء

ENGLISH

1. Dr. Tara Chand : Infkuence Islam on Indian Culture. Indian Press Allahabad 1956

2. Abdul Latif: The influence of English Literature on Urdu Literature.

3. Andrews: C.F.Zakaullah of Delhi.

4. Drew. Elizabeth: Discovering Poe, Oxford University Press.

5. Eliott.T.S. Essays on Poetry and Criticism, Methuen Edition 1890.

6. Elliott.T.S. Poetry and Drama. Oxrd University Press.

7. Encyclopaedia Britannica. 1958 Edition. Vol VII, reg. Delhi

8. Garett: Legacy of India.

9. Ibne Hasan: Central Constructiof Mughal Empire.

10. Irvine: Later Mughals. Calcattaition

11. Jaffar: S.M. Since our Fall.

12. Keene: History of India

13. Spear: Perceival: Twilight of 1 Mugal

....

مومن، مومن خان، ۱۸۰۰ ۱۸۵۱

اردو نظم — نقد و نظر

〃 — سوانح

مقالات — پی۔ایچ ڈی / اردو